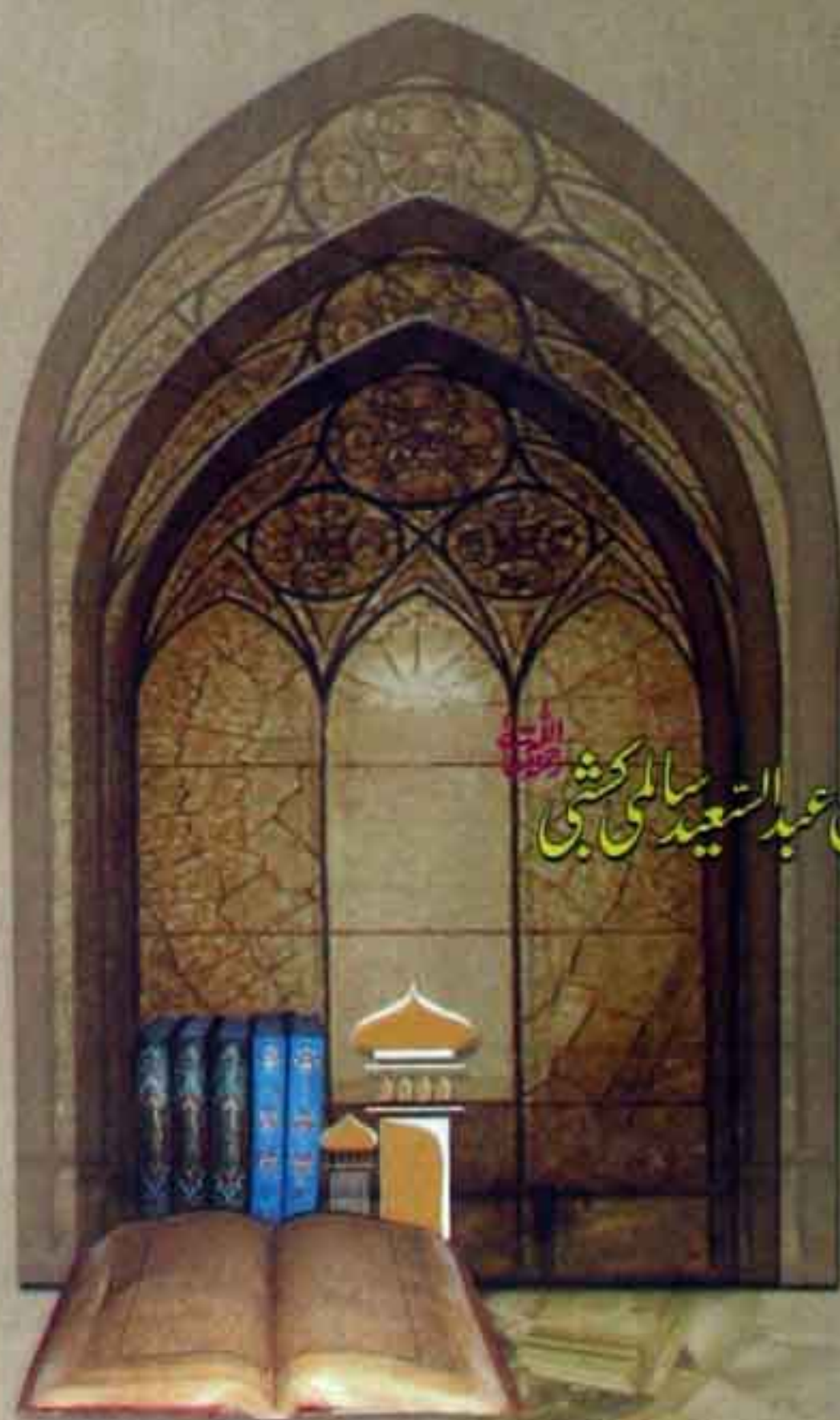


تمہید ابو اسحاق سہروردی

رحمۃ اللہ علیہ
رحمۃ مرعا



تصنیف

امام اہل سنت علامہ ابو اسحاق محمد بن عبد الشعیبہ سہروردی

ترجمہ

مفتی اعظم پاکستان حضرت علامہ

ابوالبرکات تہجد احمد قادری

خلیفہ امام احمد رضا قادری بریلوی رضی اللہ عنہما

فریدنگ پبل

۳۸۸

مَلَکَاتُ آمَنَ بِاللَّهِ وَقَالَتْ کَثِیرًا وَرُسُلِهِ (البقرہ ۲۸۵)

علم عقائد کی وہ قدیم ترین کتاب جس کے مصنف حضرت داتا گنج بخش علی ہجویری کے ہم عصر تھے، امام ربانی مجدد الف ثانی نے اس کے حوالے دیئے اور بابا فرید الدین گنج شکر اس کا درس دیا کرتے تھے (مجموعہ تہذیب)

تہذیب ابوشکر اور سلمیٰ

رحمۃ اللہ علیہ

کتبہ

تصنیف

امام اہل سنت علامہ ابوشکر محمد بن عبدالسعید سلمیٰ کاشی رحمۃ اللہ علیہ
پانچویں صدی ہجری کے نصف آخر کے عظیم عالم

ترجمہ

مفتی اعظم پاکستان حضرت علامہ ابوالبرکات تہجد احمد قادری
خلیفہ امام احمد رضا قادری بریلوی رحمہما علیہما

ناشر

فرید بک ٹرال (رجسٹرڈ) ۳۸۔ اردو بازار لاہور

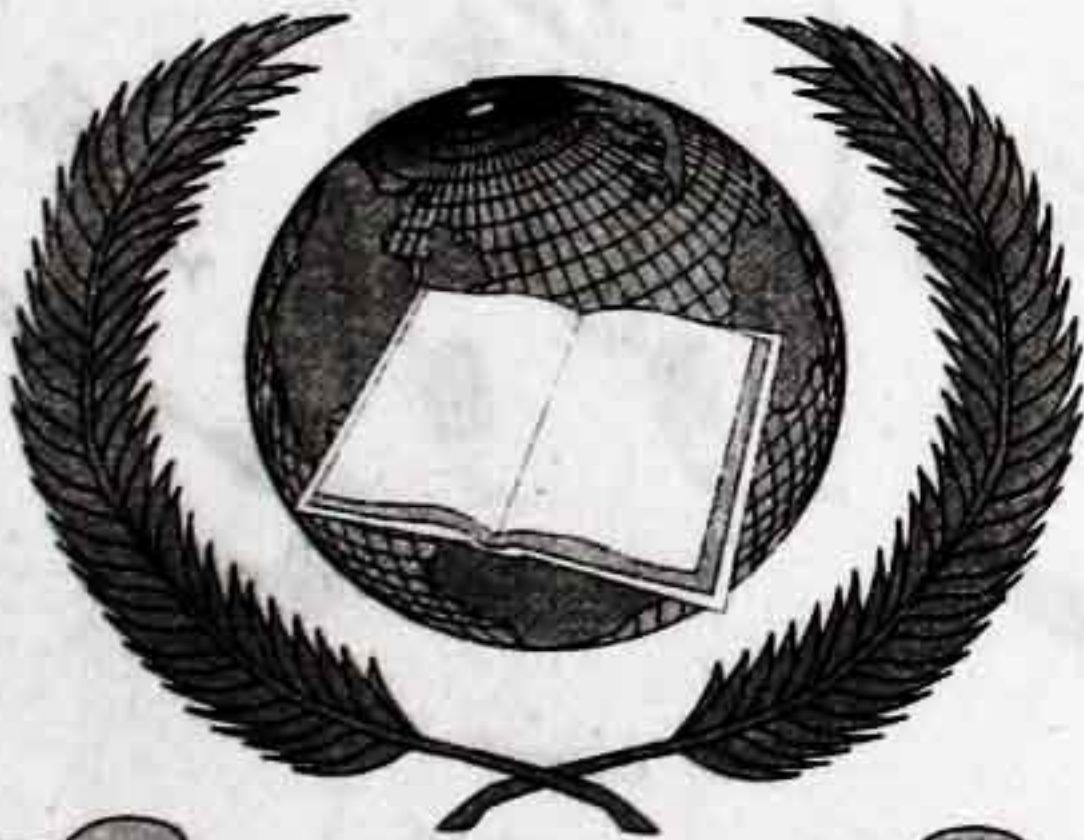
Copyright ©

All Rights reserved

This book is registered under the copyright act. Reproduction of any part, line, paragraph or material from it is a crime under the above act.

جملہ حقوق محفوظ ہیں

یہ کتاب کاپی رائٹ ایکٹ کے تحت رجسٹرڈ ہے، جس کا کوئی جملہ، پیرا، لائن یا کسی قسم کے مواد کی نقل یا کاپی کرنا قانونی طور پر جرم ہے۔



صحیح : حافظ محمد اکرم ساجد عبدالقیوم
مطبع : رومی پبلیکیشنز اینڈ پرنٹرز لاہور
الطبع الاول : جولائی 1428ھ / جون 2007ء
الطبع الثانی : صفر 1430ھ / فروری 2009ء
قیمت : -/220 روپے

Farid Book Stall

Phone No: 092-42-7312173-7123435

Fax No. 092-42-7224899

Email: info@faridbookstall.com

Visit us at: www.faridbookstall.com

فرید بک اسٹال ۳۸۔ اُردو بازار لاہور

فون نمبر ۰۹۲۔۴۲۔۷۳۱۲۱۷۳۔۷۱۲۳۴۳۵

فیکس نمبر ۰۹۲۔۴۲۔۷۲۲۴۸۹۹

ای۔میل: info@faridbookstall.com

ویب سائٹ: www.faridbookstall.com

فہرست

تمہید (ابوشکور سالمی)

صفحہ	عنوان	نمبر شمار	صفحہ	عنوان	نمبر شمار
40	چھٹی تعریف	10	21	عرضِ ناشر	1
40	ساتویں تعریف	11	22	تمہید ابوشکور سالمی لوراس کے مصنف	2
40	آٹھویں تعریف	12	27	امام ابوشکور سالمی رحمہ اللہ تعالیٰ	3
41	نویں تعریف	13	30	تمہید شریف کا ترجمہ	4
41	دسویں تعریف	14	33	پیر محمد حسن کے مکتوب کا عکس	
41	دوسرا قول: عقل کی مقدار کیا ہے؟	15	34	سید صاحب کے ترجمہ کا پہلا صفحہ	5
42	عقل میں مساوات کے دلائل	16	35	سید صاحب کے ترجمہ کا دہمیل صفحہ	6
	اہل سنت و جماعت کے عقل	17	36	سید صاحب کے ترجمہ کا آخری صفحہ	7
43	کے متفاوت ہونے پر دلائل			باب اول	
	عقل کی تعریف میں اختلاف	18	37	عقل کے بیان میں	
43	لفظی ہے		37	قول اول: ماہیت عقل میں	1
	انبیاء علیہم السلام میں درجہ کمال	19	37	تمہید	2
44	کی عقل ہوتی ہے		37	عقل کیا ہے؟	3
	تیسرا قول: عقل کے فائدہ اور	20	38	تحقیق کلام	4
45	اس کے زوال کا بیان		38	عقل کی دوسری تعریف	5
	انبیاء و ملائکہ سے عقل کا زوال	21	39	اس قول کی تردید	6
45	اور قصور ناممکن ہے		40	تیسری تعریف	7
46	چوتھا قول: عقل معرفت کا ذریعہ ہے	22	40	چوتھی تعریف	8
47	ابوالحسن اشعری کا نقطہ نظر	23	40	پانچویں تعریف	9

صفحہ	عنوان	نمبر شمار	عقل عند الخصالہ معرفت ہو صفحہ کی	نمبر شمار
64	فتیح کی قسمیں	44	47	دلیل
64	صورت مسئلہ	45		
	دوسرا باب		47	عقل کا محل
67	محسوس و معلوم کا بیان		49	پانچواں قول: کیا عقل حجت ہے؟
67	پہلا قول	1		چھٹا قول: عقل سے احکام ثابت
68	پانچ حواس کا بیان	2	51	ہونے کی بحث
68	علم کا ذریعہ طبیعت ہے	3	52	معزز لہ کا مذہب
68	عرض بے قرار ہے	4	52	امام ابوالحسن اشعری کا قول
68	فلاسفہ کے نزدیک حس کی تعریف	5	52	اہل سنت و جماعت کا موقف
69	حواسِ خمسہ باطنہ	6	53	اہل سنت ماترید یہ کا موقف
70	پانچ باطنی حواس کیا ہیں؟	7		امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ
70	محسوس اور معلوم میں فرق	8	54	کے ارشاد مبارک کی وضاحت
70	دوسرا قول: طبع اور آلہ کا بیان	9	54	عقل تنہا موجب ایمان نہیں
	(فطرت کائنات) یا طبع کے	10	55	عقل اپنی پہچان سے قاصر ہے
71	بارے میں مختلف مذاہب			عقل کے موجب ایمان نہ بننے
72	نیچر یہ بے وقوف ہیں	11	55	کی دلیل
72	طبیعت حقیقت میں کیا ہے؟	12	56	دلیل کی تعریف
72	مناظرہ کا طریقہ	13	57	ساتواں قول: بچوں کا بیان
74	حکایت	14	60	آٹھواں قول: عقل افضل ہے یا علم؟
74	تیسرا قول: جزا اور کل کا بیان	15	60	عقل والوں کی فضیلت کا بیان
75	مناظرہ کا طریقہ	16	63	جبرئیل افضل ہیں کہ ابو بکر صدیق؟
77	چوتھا قول: روح اور حرکت کا بیان	17	63	فرشتے افضل ہیں یا اولیاء؟
	روح کے بارے میں مسلمانوں	18	64	نواں قول: مستحسنت عقل کا بیان
77	کا عقیدہ		64	حسن و فتح کی قسمیں

صفحہ	عنوان	نمبر شمار	صفحہ	عنوان	نمبر شمار
85	حد کے لغوی معنی	35		جو گروہ روح کے قدیم ہونے	19
85	قدیم کی تعریف	36	77	کے قائل ہیں	
86	دھریوں کا مذہب	37		ان گروہوں کے ساتھ مناظرہ کا	20
86	قدیم و قدم میں فرق	38	79	طریقہ	
86	نعت اور صفت کیا ہوتی ہیں؟	39	79	حرکت کی قسمیں	21
86	صفت کا بیان	40		دوسری تقسیم کے اعتبار سے حرکت	22
	نعت اور صفت کی اصطلاحی	41	80	کی چھ قسمیں	
87	تعریف		80	پانچواں قول: آثارِ علویہ کا بیان	23
	صفت کے بارے میں کرامیہ	42		آسمان اور ستاروں کی گردش حکم	24
87	اور بعض عاشقوں کا مذہب		81	الہی کی پابند ہے	
	نعت و صفت اور فقہاء اہل سنت	43	81	سبب اور علت میں فرق	25
87	و جماعت		81	علم نجوم منسوخ ہو چکا ہے	26
87	اسم کی لغوی تحقیق	44	82	منسوخ پر عمل کرنا باطل ہے	27
87	اسم کا مادہ اشتقاق	45		علم نجوم اور شمس الائمہ حلوانی	28
	محققین اور اصولیوں کے نزدیک	46	82	رحمہ اللہ علیہ کا فتویٰ	
88	اسم کی تعریف			علم نجوم کے بارے میں نبی کریم	29
88	محدث کسے کہتے ہیں؟	47	82	ﷺ کا فرمان مبارک	
88	جوہر کس کو کہتے ہیں؟	48		نجومی اور اس کی تصدیق کرنے	30
	دیگر فرقوں کے نزدیک جوہر کی	49	82	والادونوں کا فرہیں	
88	تعریف		83	ستاروں کی تخلیق کا فلسفہ	31
88	جسم کی تعریف	50	84	علم نجوم کے منسوخ ہونے کی تاریخ	32
88	معزلہ جسم کسے کہتے ہیں؟	51	84	مناظرہ کا طریقہ	33
	اہل سنت و جماعت جسم کس کو	52		چھٹا قول: تعریفات اشیاء اور	34
88	کہتے ہیں؟		85	تخلیق کائنات کا بیان	

صفحہ	عنوان	نمبر شمار	صفحہ	عنوان	نمبر شمار
95	فرق		88	عرض کے کہتے ہیں؟	53
98	دوسرا قول: قدم کا بیان	7		معززہ و محققہ عرض کس کو کہتے ہیں؟	54
98	جہان کا پیدا کرنے والا قدیم ہے	8	89		
98	ایک محل میں دو چیزوں کا جمع ہونا محال نہیں	9	89	صورت ہیئت جثہ اور بدن کے کہتے ہیں؟	55
98	قدیم اور محدث میں چار وجہ سے فرق	10	89	ذات، نفس اور شئی کیا ہیں؟	56
99	تیسرا قول: وحدانیت کا بیان	11	89	کلام کے کہتے ہیں؟	57
100	خدا ایک ہے	12	91	ساتواں قول: حدوث عالم کا بیان	58
100	اللہ تعالیٰ اپنی ذات و صفات میں قدیم ہے	13	91	جاننے کی چند باتیں	59
100	وجہ استحالہ	14	92	عالم کی دو قسمیں ہیں	60
101	دوسری شق پر بات	15	92	عالم کے محدث ہونے کی برہان	61
102	خدا کی وحدانیت پر دلیل	16	92	محدث کی تعریف	62
105	چوتھا قول: ”ضد“ اور ”ند“ کا بیان	17	92	عرض کے خواص و علامات	63
105	ضد کے کہتے ہیں؟	18	92	عرض اور جوہر دونوں کی ابتداء اور انتہاء ہوتی ہے	64
105	ضد کہاں پائی جاتی ہے؟	19	92	حدوث عالم پر ایک اور دلیل	65
105	اضداد کا وجود صرف اعراض میں کیوں ضروری ہے؟	20	94	تیسرا باب	
106	اللہ تعالیٰ ”ند“ سے پاک ہے	21	94	اثبات صانع کا بیان	
106	نظیر کس کی ہو سکتی ہے؟	22	94	علم کی قسمیں	1
107	صورت کے کہتے ہیں؟	23	94	علم حادث کی قسمیں	2
110	دلیل کہ اللہ تعالیٰ کی صورت نہیں	24	95	علم ضروری کی تعریف	3
110	پانچواں قول: اینیت کا بیان	25	95	علم استدلالی کے کہتے ہیں؟	4
				تفصیلی بیان	5
				علم ضروری اور علم استدلالی میں	6

صفحہ	عنوان	نمبر شمار	صفحہ	عنوان	نمبر شمار
	فرقہ شثویہ کے دو خدا "لا ہی"	46	111	جمیہ اور معتزلہ کا نظریہ	26
120	اور "لا ہو" ہیں		111	فرقہ حثشفہ	27
	یہودیوں اور عیسائیوں کا عقیدہ	47	112	توحید تین قسم کی ہے	28
120	الوہیت		112	امام اعظم ابو حثیفہ کا ارشاد مبارک	29
120	اباحیہ اور ممانعیہ فرقوں کا نظریہ	48	113	روئیداد مناظر	30
120	بعض روافض کا عقیدہ	49		ابوشکور سالمی کا فرقہ حثشفہ کے	31
	ساتواں قول: مُتربسی (یعنی	50	113	ساتھ مناظرہ کی روئیداد	
121	مدعی ربوبیت) کا بیان		113	اللہ جسم اور جوہر نہیں ہے	32
	چوتھا باب		114	چھٹا قول: ماہیت کا بیان	33
123	صفات الہیہ کا بیان		114	خدا بے نیاز ہے	34
125	اہل سنت و جماعت کا مسلک	1	115	ماہیت کے کہتے ہیں؟	35
	معتزلہ اور مسئلہ صفات باری	2	115	علت کے کہتے ہیں؟	36
126	تعالیٰ			فرقہ مشبہہ کا ماہیت کے بارے	37
	دوسرا قول: صفات ذاتیہ اور صفات	3	116	میں نظریہ	
127	فعلیہ کا بیان		116	حثشفہ اور نظریہ ماہیت	38
127	حثشفہ کا مسلک	4	117	حثشفہ اور بعض حثویہ کا مسلک	39
127	مصنف کا حثویہ سے مناظرہ	5	117	حثویہ کے نزدیک جسم کی تعریف	40
128	تحقیق مسئلہ	6	118	منجمہ کا نظریہ	41
	تیسرا قول: اس کا بیان کہ اللہ	7	118	فرقہ تناخنیہ کا مسلک	42
129	تعالیٰ ہمیشہ سے خالق ہے		119	"ہو الاول" کی دلیل کا جواب	43
129	اشعریہ اور کرامیہ کا مسلک	8		اللہ کی خالقیت کے بارے مجوسیوں	44
	ابوشکور سالمی (رضی اللہ تعالیٰ عنہ)	9	119	کا عقیدہ	
	کے ایک اشعری سے مناظرہ کی			فرقہ قدریہ کا نظریہ الوہیت و	45
130	روئیداد		119	خالقیت	

صفحہ	عنوان	نمبر شمار	صفحہ	عنوان	نمبر شمار
146	پر ایمان لانے کا بیان		131	چوتھا قول: اللہ تعالیٰ کے علم کا بیان	10
146	معز لہ اور جہمیہ کا مذہب	29	131	اللہ تعالیٰ معدوم کو بھی جانتا ہے	11
148	معز لہ کا مسلک	30		سیدنا امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ	12
	باب پنجم		132	تعالیٰ عنہ کا ارشاد مبارک	
149	اسماء حسنیٰ کا بیان		134	پانچواں قول: سمع و بصر کا بیان	13
149	قول اول: اسماء حسنیٰ میں ہے	1	134	چھٹا قول: ارادہ و مشیت کا بیان	14
150	معز لہ کا مسلک	2	135	اہل سنت و جماعت کا مسلک	15
	دوسرا قول: اسم مسنیٰ کا عین ہے	3		روایت حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ	16
151	یا غیر		136	عنہ	
151	اسم ذات میں اختلاف کا بیان	4	137	غیلان قدری کا واقعہ	17
	اللہ تعالیٰ کے تمام اسماء حسنیٰ	5	138	ساتواں قول: فضل و عدل کا بیان	18
152	ہیں		139	معز لہ کا مسلک	19
	تیسرا قول: اسماء باری تعالیٰ کتنے	6		معز لہ کے نزدیک صفت فضل	20
152	ہیں؟		139	کیا ہے؟	
	اللہ تعالیٰ کی کتابوں اور صحیفوں کا	7	139	فضل کے کہتے ہیں؟	21
153	نام کلام اللہ ہے		139	چار خصوصیات انبیاء کرام	22
154	چوتھا قول	8	140	عدل اور اہل سنت و جماعت	23
154	مشترک اسماء	9	141	معز لہ عدل کے کہتے ہیں؟	24
	وہ اسماء مبارک جو اللہ تعالیٰ کے	10		آٹھواں قول: تکوین و ملکون کا	25
155	لیے خاص ہیں		142	بیان	
	پانچواں قول: نبیوں رسولوں اور	11	143	متصوفین کا مسلک	26
155	فرشتوں کے ناموں کا بیان			نواں قول: باری تعالیٰ کے کتنے	27
	چھٹا قول: لغوی اور معنوی حیثیت	12	144	صفات ہیں؟	
156	سے چیزوں کے ناموں کا بیان			دسواں قول: آیات متشابہات	28

نمبر شمار	عنوان	صفحہ	نمبر شمار	عنوان	صفحہ
13	اجمال کا بیان	156	16	بعض حضرات کا عقیدہ	166
	چھٹا باب		17	بعض معتزلہ کا مذہب	166
	رسولوں پر نزولِ وحی		18	اہل سنت و جماعت اور عصمت	
	کے اثبات کا بیان	158		نبوت	166
1	پہلا قول: اس بیان میں کہ وحی کا		19	انبیاءِ خاتمہ سے مامون ہوتے ہیں	169
	نازل کرنا اور پیغامبروں کا بھیجنا اللہ		20	پہلی شریعتوں میں آزاد کی خرید	
	تعالیٰ کی طرف سے بمقتضائے			و فروخت جائز تھی، ابتداء اسلام	
	حکمت ضروری ہے	158		میں حرکی بیع جائز تھی	169
2	فرقہ وہمیہ اور فکریہ کے نزدیک		21	بعض فقہاء اور مسئلہ عصمت انبیاء	169
	ادراک کی دلیل	159	22	تیسرا قول: انبیاء کرام کے معجزوں	
3	الہامیہ کا مسلک	159		کے بارے میں	170
4	فلاسفہ نیچریہ، منجمہ کا مسلک	160	23	چوتھا قول: اعجاز قرآن اور نبی	
5	اثباتِ وحی کی آٹھ دلیلیں	160		کریم ﷺ کی رسالت کا بیان	173
6	ظلم کسے کہتے ہیں؟	161	24	قرآن غیر مخلوق ہے	175
7	عدوان کی دو قسمیں	161	25	پانچواں قول: اس کا بیان کہ قرآن	
8	حقوق اللہ میں عدوان	161		کا اعجاز نظم سے ہے یا معنی سے	175
9	چور کا ہاتھ کہاں سے کاٹا جائے؟	162	26	چھٹا قول: کتب ماضیہ کا بیان	
10	کتنا مال چوری کرنے پر ہاتھ کاٹا			کتب سابقہ بھی معجز ہیں یا نہیں؟	176
	جائے گا	162	27	سابقہ کتب سماویہ معجز نہیں	177
11	مال کی اقسام	162	28	ساتواں قول: رسول کی پہچان کا	
12	حقوق اللہ میں زیادتی کے احکامات	162		بیان	177
13	دوسرا قول: عصمت انبیاء کا بیان	165	29	آٹھواں قول: نبی اور متنبی کا بیان	
14	اشعریہ	165		(سچے نبی اور جھوٹے نبی کا بیان)	178
15	محققہ اور عقیدہ عصمت نبوت	166	30	نواں قول: نبی اور ولی کا بیان	179

نمبر شمار	عنوان	صفحہ	نمبر شمار	عنوان	صفحہ
31	نبی کے کہتے ہیں؟	179	47	دوسری دلیل پر حجیت اجماع	187
32	ولی کے کہتے ہیں؟	179	48	چودھواں قول: اس امر کا بیان	
33	فقہاء اہل سنت کا مسلک	180		کہ ایک زمانہ میں دو مختلف	
34	ولی کی کرامت اپنے زمانہ کے			شریعتیں مقرر ہو سکتی ہیں یا نہیں؟	187
	نبی کا معجزہ ہوتا ہے	180	49	ایک وقت میں دو مختلف شریعتیں	
35	ولی اور نبی میں فرق	181		کیوں نہیں چل سکتیں؟	188
36	دسواں قول: نبی افضل ہے یا ولی؟	181	50	ایک وقت میں دو امام ہو سکتے	
37	گیارہواں قول: اس کا بیان کہ انبیاء			ہیں یا نہیں؟	188
	کرام بعض بعض سے افضل ہیں	182	51	امام کون مقرر کرے گا؟ نیز امام وقت	
38	بارہواں قول: اس کا بیان کہ کیا			کے فرائض منصبی کیا ہوں گے؟	189
	ولایت اور نبوت سلب ہو سکتی ہے		52	روافض و معتزلہ کی رائے	189
	یا نہیں؟	182	53	اہل سنت و جماعت کا موقف	189
39	ولایت	184	54	اہل سنت کی دلیل	190
40	فاسق ولایت کا اہل نہیں ہوگا		55	صحابہ نے براہ راست حضور سے	
	اسرار الہی پر مطلع ہونا ولایت ہے	185		دین سیکھا	190
41	ولایت کی قسمیں	185	56	پندرہواں قول: صاحب شریعت	
42	تیرہواں قول: اس بارے میں کہ معجزہ			اور صاحب دعوت کا بیان	191
	جب خاص کے لیے ہو تو وہ عام		57	معتزلہ و قدریہ کا عقیدہ اور اس	
	کے حق میں بھی ہوتا ہے یا نہیں؟	185		کی تردید	191
43	یہود و نصاریٰ خاص کے لیے معجزہ		58	صاحب شریعت کے کہتے ہیں؟	191
	ہو تو سب کے لیے کافی نہیں سمجھتے	186	59	جو آدم علیہ السلام کو صاحب شریعت	
44	اجماع اور اجتہاد کی حجیت پر بحث	186		نہ مانے کافر ہے	191
45	اجتہاد اور اجماع حجت ہیں	186	60	صاحب شریعت اور صاحب دعوت	
46	اہل سنت اور حجیت اجماع	186		رسولوں میں فرق؟	192

صفحہ	عنوان	نمبر شمار	صفحہ	عنوان	نمبر شمار
197	اٹھارہواں قول: قرآن مجید اور وحی کے نازل ہونے کا بیان	72	192	کیا آدم علیہ السلام صاحب کتاب و شریعت تھے؟	61
198	امام ابو یوسف اور امام ابو حنیفہ کے درمیان مسئلہ قرآن پر چھ مہینے مناظرہ ہوتا رہا	73	192	سولہواں قول: اس کا بیان کہ صاحب شریعت پر وحی نازل ہونے سے قبل کسی سابقہ شریعت پر عمل کرنا لازم ہے یا نہیں؟	62
199	انیسواں قول: قرآن کیا ہے؟	74	192	احناف اور شوافع کا فتویٰ	63
200	کیا قرآن محدث ہے؟ نہیں تو کیوں؟	75	192	اگر کسی نے لڑکا ذبح کرنے کی نذر مانی تو بکری ذبح کرنا پڑے گی	64
200	جو اللہ کو محل حوادث ٹھہرائے کافر ہے	76	193	وحی ملنے سے پہلے سابقہ شریعت پر عمل کیوں واجب ہوتا ہے؟	65
201	معتزلہ کا مسلک	77	193	حضور ﷺ پر ”انجیل“ کی پیروی واجب نہ تھی	66
201	ابن عباس اور خلق قرآن کا مسئلہ	78	194	کیا آسمان سے اترنے کے بعد حضرت عیسیٰ لوگوں کے امام ہوں گے؟	67
203	کلام، تکلم، تکسیم میں کیا فرق ہے؟	79	194	امام مہدی ہی عیسیٰ علیہ السلام ہیں	68
203	فقہاء اہل سنت کا ارشاد	80	194	نماز پڑھانے سے امام متبوع نہیں ہو جاتا، حقیقی متبوع حضور اقدس ہی ہیں	69
203	اللہ کیسے کلام فرماتا ہے؟	81	195	امام مہدی ہی عیسیٰ علیہ السلام ہیں	70
204	بیسواں قول: سات قراءتوں (قراءت سبعمہ) کا بیان	82	195	فقہاء و ائمہ کی متابعت حقیقت میں حضور کی متابعت ہے	71
204	ساتوں قراءتوں سے نماز جائز ہے	83	195	سترہواں قول: شریعت و کتب کے نسخ کا بیان	71
204	قراءت سبعمہ میں سے کسی ایک کا انکار بھی کفر ہے	84	195	روایت معروف کا انکار کرنے والا فاسق ہے	71
204	قراءت سبعمہ کے علاوہ کسی قراءت کا منکر کافر نہیں ہوگا	85	195	ایسواں قول: قرآن کریم کے	71
205	روایت معروف کا انکار کرنے والا فاسق ہے	86	195		
205	ایسواں قول: قرآن کریم کے	87	195		

صفحہ	عنوان	نمبر شمار	صفحہ	عنوان	نمبر شمار
210	اللہ تعالیٰ کو ساقی اور مہمان نواز نہیں کہہ سکتے	12	205	جمع کرنے کا بیان	88
210	دوسرا قول: استدلال اور تقلید کا بیان	13	205	جمع قرآن کا کام عہد صدیقی میں شروع ہو چکا تھا	
211	اہل سنت و جماعت	14		عہد عثمانی میں قرآن کریم مدون	89
212	تقلید کسے کہتے ہیں؟	15	206	شکل میں منظر عام پر آیا	
212	ایمان میں تقلید جائز نہیں	16		مصنف علی پر صحابہ کا اجماع نہیں ہوا تھا	90
214	روایت	17	206		
215	تیسرا قول: رکن ایمان کا بیان	18		ساتواں باب	
215	مؤمن کے تین درجے ہیں	19	207	معرفت اور ایمان کا بیان	
218	آیت کا صحیح مفہوم	20		پہلا قول: اللہ کے حقیقی عارفوں کا بیان	1
	ایک سجدہ نہ کرنے سے شیطان کا کافر ہونا تو جو پوری نماز ترک کر دیتے ہیں؟	21	207		
219	کبیرہ گناہوں سے ایمان سلب نہیں ہوتا	22	207	معرفت کی دو قسمیں ہیں	2
220	ایمان کی دو قسمیں	23	207	معرفت صفات کی تین قسمیں ہیں	3
221	ایمان مجمل کن چیزوں سے مکمل ہو جاتا ہے؟	24	207	صفات میں تحیر توحید ہے اور ذات میں تحیر کفر ہے	4
222	چوتھا قول: ایمان کی شرائط اور اس کے شرائط کا بیان	25	208	مبتدعین کا نظریہ	5
223	شرائط اور شرائط میں فرق	26	208	خدا کیا ہے؟ اور کیسا ہے؟	6
224	شرائط اور شرائط کے درمیان دوسرا فرق	27	209	معرفت کسے کہتے ہیں یا وہ کیا ہے؟	7
224	پانچواں قول: اس کا بیان کہ ایمان	28	209	معرفت کا ایک اور مطلب	8
				معرفت کا تیسرا معنی	9
				اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات بے کم و کیف ہے	10
				اعضاء کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف بطور نفی بھی درست نہیں	11

صفحہ	عنوان	نمبر شمار	صفحہ	عنوان	نمبر شمار
	ایمان کو غیر مخلوق کہنے والوں کی	46	226	گھٹا بڑھتا ہے یا نہیں؟	
241	دلیل		230	ترجمی بات	29
242	ایمان کے مخلوق ہونے پر دلیل	47		چھٹا قول: ایمان میں شک و شبہ	30
243	ایمان کی دو قسمیں ہیں	48	231	کے بارے میں	
	دسواں قول: ایمان کے محل اور	49	235	ساتواں قول: ایمان میثاق کا بیان	31
243	اس کی بقاء کا بیان		235	چند نظریات	32
	گیارہواں قول: نزاع کے وقت	50	236	بعض فقہاء کا مسلک	33
245	ایمان کا زوال جائز ہے یا نہیں؟			کیا میثاق کے بعد ان پر موت آ	34
246	مرجیہ اور مسئلہ ایمان	51	236	گنی تھی؟	
246	اہل سنت کی طرف سے جواب	52	236	کیا میثاق کا حکم اب بھی باقی ہے؟	35
	خاتمہ بالا ایمان کے لیے بہترین	53	237	استفہام کے دو معنی	36
247	وظیفہ			آٹھواں قول: ایمان اور اسلام	37
	آٹھواں باب		239	میں کیا فرق ہے؟	
248	ایمان کی شرائط کا بیان		239	بعض فقہاء کا نظریہ	38
248	ابلیس جن تھا یا فرشتہ	1	239	رافضیوں کا نظریہ	39
249	ابلیس فرشتہ نہیں تھا	2	239	معتزلہ کا نظریہ	40
	ہاروت و ماروت فرشتے تھے یا	3	240	سب انبیاء کرام کا دین ایک ہے	41
249	آدمی؟		240	خلاصہ کلام	42
249	انبیاء کرام پر عتاب جائز ہے؟	4		درحقیقت مسلمان اور مؤمن کا	43
250	فرشتوں پر عتاب ہو سکتا ہے	5		ایک مطلب ہے اسلام اور ایمان	
250	بعض فرشتے رسول ہیں	6	241	میں صرف لفظی فرق ہے	
	دوسرا قول: اللہ تعالیٰ کی کتابوں	7	241	بظاہر دو آیتوں میں تعارض کا جواب	44
251	پر ایمان لانے کا بیان			نواں قول: ایمان کا بیان (ایمان	45
	اللہ تعالیٰ کی کسی کتاب یا اس کے کسی	8	241	مخلوق ہے یا غیر مخلوق؟)	

صفحہ	عنوان	نمبر شمار	صفحہ	عنوان	نمبر شمار
259	ہے؟		252	فرمان کا انکار کرنے والا کافر ہے	9
259	مکان کی دو قسمیں ہیں	25		کیا اللہ تعالیٰ کی سب کتابیں ایک	
259	مکان حقیقی کسے کہتے ہیں؟	26	252	درجے کی ہیں؟	
	معراج النبی ﷺ اور معتزلہ کا	27	252	چار کتابیں سب سے افضل ہیں	10
260	مسلك			قرآن مجید نے سب کتابوں کو	11
260	ام المؤمنین کی روایت کا جواب	28	253	منسوخ کر دیا	
	حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ	29		کیا سابقہ کتب الہیہ کے احکام	12
260	عنه کی روایت کا مفہوم		253	قرآن سے منسوخ ہو چکے ہیں؟	
264	چھٹا قول: آخرت پر ایمان	30	253	تمام احکام سابقہ منسوخ نہیں	13
264	قیامت کا عجیب مطلب	31	253	تیسرا قول: رسولوں پر ایمان	14
	ساتواں قول: میزان اور صراط و	32	254	انبیاء کرام کی صحیح تعداد کیا ہے؟	15
265	کتاب کا بیان			چوتھا قول: حضور پر نور سید المرسلین	16
	آٹھواں قول: کرانا کا تبین اور	33	255	ﷺ پر ایمان لانے کا بیان	
	حفاظت کرنے والے فرشتوں کا		255	روافض کا عقیدہ کفر ہے	17
269	بیان		256	حشویہ کا عقیدہ	18
269	معتزلہ کا مسلك	34		حضرت علی حضور سے زیادہ علم	19
269	اہل سنت کا مذہب	35	256	رکھتے تھے؟	
	نواں قول: دوزخ میں داخل ہونے	36	257	حضرت خضر کون تھے؟ ولی یا نبی؟	20
270	اور دوزخ سے نکلنے کا بیان			حضرت علی کو حضور سے افضل	21
270	دخول جہنم سے مراد؟	37	257	ماننے والا کافر ہے	
272	خلود اور تابید میں فرق؟	38		حضرت علی کو شریک نبوت ماننے	22
272	ایک کی دوسری توجیہ	39	257	والوں کی دلیل	
	دسواں قول: شفاعت اور فدیہ کا	40	258	پانچواں قول: معراج کا بیان	23
272	بیان			مخلوق کا وجود بغیر مکان کے ممکن	24

صفحہ	عنوان	نمبر شمار	صفحہ	عنوان	نمبر شمار
	جنت و دوزخ ابھی پیدا نہیں ہوئے؟	56	273	41 شفاعت کون کر سکتا ہے؟	41
282	مسئلہ تخلیق جنت و دوزخ اور اہل سنت	57	273	42 معز لہ کے نزدیک اور اہل سنت کی جوابی کارروائی	42
282	اہل سنت	58	274	43 اہل سنت و جماعت اور مسئلہ شفاعت	43
283	جہنم کہاں ہے؟	59	274	44 شفاعت کن کے لیے ہوگی؟	44
	چودھواں قول: جنت و دوزخ باقی رہیں گے یا نہیں؟	60	275	45 حدیث کا صحیح مفہوم	45
283	جنت اور دوزخ کے فنا ہونے پر دلیل	61	276	46 معز لہ کی طرف سے اہل سنت پر اعتراض	46
284	جنت و دوزخ ہمیشہ باقی رہیں گے	62	276	47 شفاعت کے ثبوت پر دلیل	47
286	ایک حدیث شریف کی تشریح	63	278	48 گیارہواں قول: اس کا بیان کہ کیا موت کے بعد بعینہ یہی اجسام اٹھائے جائیں گے؟	48
	جنت و دوزخ کے بارے میں بعض لوگوں کے جداگانہ نظریہ کی تردید	64	279	49 اجساد کے بعینہ زندہ کرنے پر اشکال	49
287	جہنمیوں کے بارے میں بعض مرجیہ کا نظریہ	65	279	50 رفع اشکال کی تقریر	50
287	معز لہ اور جہمیہ کا نظریہ (عقیدہ)	66	281	51 بارھواں قول: سوال منکر و نکیر اور عذاب قبر کا بیان	51
288	عرش سے کیا مراد ہے؟	67	281	52 عذاب قبر پر دلائل منقول از حماد ابن ابی حنیفہ رضی اللہ عنہما	52
288	پندرہواں قول: جنت کی نعمتوں سے نفع اٹھانے کا بیان	68	281	53 عذاب قبر کے تین حصے ہیں	53
289	معز لہ کے مذہب کی تردید	69	281	54 مؤمنوں اور کافروں کے عذاب قبر میں فرق	54
290	ایک اور دلیل	70	282	55 تیرہواں قول: جنت اور دوزخ کی تخلیق کا بیان	55
290	جنت اور اس کی نعمتوں سے نفع اٹھانے کی اباحت پر دلیل				

نمبر شمار	عنوان	صفحہ	نمبر شمار	عنوان	صفحہ
71	کیا جن بھی جنت میں جائیں گے؟	290	87	شیطان کو کس نے پیدا کیا؟	301
72	سولہواں قول: جنت میں اللہ تعالیٰ		88	اللہ کا ارادہ اس کے علم کے خلاف	
	کا دیدار ہوگا یا نہیں؟	294		نہیں ہو سکتا	304
73	”لن“ کے معانی	295	89	جس کا تقدیر پر ایمان نہیں اس	
74	”لن“ کے ہمیشہ کے معنی پر			کی کوئی عبادت قبول نہیں	305
	دلالت نہ کرنے پر دلیل	295	90	اٹھارہواں قول: عبادت و احکام	
75	رؤیت باری پر دلائل	295		کا بیان	307
76	مستحق عقوبت ہونے کی دلیل	296	91	مرجیہ کا مسلک	307
77	رؤیت کے ثبوت پر دلیل	297	92	فرقہ ابا حنیفہ کا مذہب	307
78	دیدار کے لیے چیز کا موجود ہونا		93	بعض لوگوں کا مذہب	307
	ضروری ہے	299	94	بعض دوسرے حضرات کا مذہب	308
79	جوہر کے لیے جنس و نوع ضروری		95	امر و نہی کسی حال میں ساقط نہیں	
	ہے	299		ہوتے	308
80	جنات کو اللہ کا دیدار ہوگا؟	300	96	اموال مشترکہ نہیں ہیں	309
81	فرشتوں کو دیدار ہوگا؟	300	97	جنت نے کیا کہا؟	309
82	مؤمنوں کی قسمیں	301	98	انیسواں قول: اس بارے میں کہ	
83	فرشتوں کے لیے دیدار الہی کے			اللہ عز و جل پر بندوں کی جانب	
	ثبوت یا عدم ثبوت میں بعض			سے کوئی شئی واجب نہیں	309
	فقہاء کا مذہب	301	99	متکلمین اور اصولیوں کی اصطلاح	310
84	کیا حور و غلمان دیدار الہی سے		100	وجوب کی از روئے حکمت کیا	
	مشرف ہوں گے؟	301		تعریف ہے؟	310
85	سترہواں قول: خیر و شر اللہ تعالیٰ		101	جو از روئے حکمت کہتے ہیں؟	310
	کی طرف سے مقدر ہیں	301	102	محال کہتے ہیں؟	310
86	بعض کا مذہب	301	103	معتزلہ کا مسلک	311

صفحہ	عنوان	نمبر شمار	صفحہ	عنوان	نمبر شمار
323	رضی اللہ تعالیٰ عنہ		312	حشویہ	104
324	استطاعت دو طریق کی ہے	19		نواں باب	
324	جبریہ اور مسئلہ جبر و قدر	20	314	دین اور شرائع کا بیان	
324	بندہ مجبور محض ہے؟ جبریہ کے دلائل	21	314	پہلا قول	1
325	جوابات	22	315	دوسرا قول	2
325	دوسری دلیل کا جواب	23	315	محنت و مشقت اور ابتلاء کا بیان	3
325	تیسری دلیل کا جواب	24	316	اہل سنت و جماعت کے دلائل	4
	دسواں باب			دنیا میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے	5
327	تکلیف و طاقت کا بیان		316	بندوں کا امتحان جائز ہے؟	
327	پہلا قول: تکلیف اور طاقت کا بیان	1	316	ابتلاء و امتحان کا فلسفہ کیا ہے؟	6
	اہل سنت و جماعت کی طرف سے	2	317	مصائب و آلام کا راز	7
328	جوابات			ابتلاء و آزمائش کے من جانب	8
328	تیسری آیت کا جواب	3	317	اللہ جائز ہونے پر عقلی دلائل	
329	دلیل کا جواب	4	317	زراعت سے دلیل	9
329	دلیل کا جواب	5	317	نماز و وضو سے دلیل	10
330	تکلیف کی قسمیں	6	318	موسموں سے استدلال	11
330	اور مکلف پہ بھی چند وجوہ پر ہیں	7		تیسرا قول: استطاعت اور تفویض	12
330	اجمال کی تفصیل	8	318	کا بیان	
331	مالا یملکن (ناممکن) سے مراد؟	9	318	جبریہ کا نظریہ	13
	دوسرا قول: زجر و امتناع (ڈانٹنے	10	319	بعض کا مسلک	14
332	اور منع کرنے) کا بیان		319	اہل سنت و جماعت کا موقف	15
333	لعنتی کون؟	11	319	استطاعت کی قسمیں	16
333	لواطت کی حرمت اور سزا	12	319	معز لہ کا قرآن سے استدلال	17
333	متعہ کی حرمت اور اس کا حکم	13		مسئلہ تفویض اور امام ابوحنیفہ	18

صفحہ	عنوان	نمبر شمار	صفحہ	عنوان	نمبر شمار
340	ہے فرمانِ رسول		334	ناچ گانے کا شرعی حکم	14
	حضرت عبداللہ بن عباس و مجاہد	31	334	خبر واحد اور قیاس کا حکم	15
341	رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے دلائل		334	تیسرا قول: حدود و کفارات کا بیان	16
341	ایک اجمال کا بیان	32		چوتھا قول: توبہ اور استعاذہ کا	17
342	جبریہ کا مسلک	33	335	بیان	
343	موت ایک ہے یا زیادہ؟	34	336	معتزلہ کے نزدیک توبہ کا مفہوم	18
	معتزلہ کی طرف سے اعتراضات	35		دعا و صدقہ وغیرہ دنیا میں بے	19
343	اور ان کے جوابات		336	سود ہیں؟	
344	حرام کو رزق کہا جائے گا یا نہیں؟	36		صدقہ و خیرات کے متعلق معتزلہ	20
344	مفروضیہ کا مذہب	37	336	کا مسلک	
	”کل یوم ہو فی شان“ کی	38		”لا حول ولا قوۃ“ کی زبان	21
345	دوسری تفسیر		337	رسالت سے تفسیر	
346	چھٹا قول: قضاء اور ادا کا بیان	39	337	مسئلہ قدر اور امام زفر	22
347	معتزلہ کی ایک بات کی تردید	40		ایک توبہ سب گناہوں کے لیے	23
	ساتواں قول: اس شخص کے متعلق	41	337	کافی ہے	
	جس نے عمداً (جان بوجھ کر)		338	توبہ کی خوبصورت اور جامع تفسیر	24
347	فرائض کو ترک کیا		338	دعا اور صدقہ کے دنیوی فوائد	25
348	معتزلہ کیا کہتے ہیں؟	42	338	زندوں کی دعا مردوں کو نفع دیتی ہے	26
	امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کیا	43		حضور ﷺ نے عالم خواب میں	27
348	فرماتے ہیں؟		338	مصنف ابوشکور سالمی کو تعلیم فرمائی	
348	احناف کا موقف	44		پانچواں قول: سعادت و شقاوت	28
348	خوارج کی دلیل	45	339	کا بیان	
349	معتزلہ کا استدلال	46	340	تقدیر کی اقسام	29
	گیارہواں باب			والدین سے نیکی کرنے اور تبلیغ	30
351	خلافت و امارت کا بیان			دین کرنے سے تقدیر بدل جاتی	

صفحہ	عنوان	نمبر شمار	صفحہ	عنوان	نمبر شمار
	صحابہ کو بعض صحابہ پر فضیلت حاصل ہے		351	پہلا قول: خلافت و امارت کا بیان	1
364				امارت کی مشروعیت و قیام کا قرآن سے ثبوت	2
366	ابوبکر تمام صحابہ سے افضل ہیں	17	351		
367	حضرت عائشہ کی فضیلت	18	352	روافض کا مذہب	3
	فضیلت ابوبکر آیت مصداق ابوبکر	19	352	امام شافعی کا ارشاد	4
368	میں		352	اصل اختلاف کیا ہے؟	5
368	عربوں سے محبت کی تین وجوہ	20	353	فاسق امام بن سکتا ہے	6
	عربوں سے محبت رکھنے والا جنتی	21		بعض حضرات کی طرف سے	7
369	اور بغض رکھنے والا دوزخی ہے			عائد کردہ امامت (کبریٰ) کی	
	ساتواں قول: حضرت معاویہ کی	22	353	شرائط کا بیان اور ان پر بحث و نظر	
	امارت بغاوت اور ان کے پیچھے			دوسرا قول: حضرت ابوبکر صدیق	8
369	لگنے والوں کا بیان		354	رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کا بیان	
369	حضرت معاویہ خطا پر تھے	23	355	اہل سنت و جماعت کے دلائل	9
370	حضرت معاویہ باغی تھے؟	24		مولیٰ علی صدیق اکبر کو خلیفہ بنا کر	10
370	ابو حنیفہ اور حُب علی	25	357	خوش تھے	
371	باغی کسے کہتے ہیں؟	26	357	روافض کے دلائل کا جواب	11
	آنھوں کا قول: حضرت امام حسین	27		سب سے پہلے کون اسلام لائے	12
372	رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کا بیان		359	تھے؟	
373	کیا یزید کو خلافت کا حق تھا؟	28		تیسرا قول: حضرت عمر فاروق رضی	13
374	یزید یوں کو حضور نے باغی فرمایا تھا؟	29	359	اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کا بیان	
374	یزید مستحق لعنت ہے	30		چوتھا قول: حضرت عثمان کی	14
	نواں قول: عباسیوں کو خلافت	31	361	خلافت کا بیان	
375	سوچنے کا بیان			پانچواں قول: حضرت علی کی	15
375	روافض اور مسئلہ خلافت	32	363	خلافت کا بیان	
375	خلافت میراث نہیں	33		چھٹا قول: اس بارے میں کہ بعض	16

نمبر شمار	عنوان	صفحہ	نمبر شمار	عنوان	صفحہ
34	اولادِ علی اور بنی عباس میں سے مستحق خلافت کون؟	376	17	قدریہ کے چند چیدہ چیدہ عقائد باطلہ کی نشان دہی	397
	بارہواں باب		18	نواں قول: فرقہ جبریہ کا بیان	398
	اہل السنّت والجماعت اور بدعتیوں کے رد کا بیان	379	19	دسواں قول: معطلہ کا بیان	401
	پہلا قول: اس بارے میں کہ دین صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے	379	20	گیارہواں قول: مشبہہ کا بیان	404
1	دوسرا قول: بدعت کا حکم کیا ہے؟	381	21	بارہواں قول: کفر و شرک کا بیان	407
2	تیسرا قول: اہل بدعت کے ساتھ مناظرہ کرنے کا بیان	383	22	کفر و شرک میں فرق	407
3	علم کو چھپانے والا بہت بڑا مجرم ہے چوتھا قول: اہل اہواء اور اہل بدعت کی تکفیر کا بیان	384	23	یہود و نصاریٰ کون ہیں؟	407
4	کیا بدعتی پر ٹیکس لگایا جائے؟	385	24	شرک کب شروع ہوا؟	408
5	بدعتیوں کے سرغننے اور لیڈر کو قتل کر دو	387	25	تیرہواں قول: آتش پرستوں کا بیان	411
6	پانچواں قول: فرقوں کا بیان	387	26	دیگر فرقوں کا بیان	412
7	سوادِ اعظم کون ہیں؟	389	27	چودھواں قول: یہودیوں کا بیان	413
8	اہل سنت کون ہیں؟	389	28	یہود کی دوسری قسم	414
9	چھٹا قول: روافض کا بیان	389	29	پندرہواں قول: نصاریٰ کا بیان	415
10	رافضی کہنے کی وجہ	391	30	اختلاف کی دوسری وجہ	416
11	انسان شریف یا شریر کیوں ہوتا ہے؟	391	31	سولہواں قول: تناخیز کا بیان	417
12	ساتواں قول: ناصبیہ کا بیان	393	32	صنف اول کے عقائد و نظریات	417
13	آٹھواں قول: قدریہ کا بیان	394	33	دوسری صنف	418
14	دو خالق ماننا کفر ہے	396	34	تیسری صنف	419
15		397	35	صنف چہارم کے عقائد و نظریات	420
16			36	روح کے مخلوق ہونے پر عقلی دلیل	424



عرض ناشر

فرید بک شال کی ہمیشہ یہ کوشش رہتی ہے کہ وہ معیاری اور اعلیٰ کتب کی طباعت و اشاعت کرے۔ زیر نظر کتاب ”تمہید ابوشکور سالمی“ علامہ ابوشکور محمد بن عبدالسعید سالمی کشتی رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف کردہ ہے جس کا ترجمہ حضرت علامہ سید ابوالبرکات سید احمد قادری رحمہ اللہ علیہ نے فرمایا تھا اور جس کے ترجمہ (مسودہ) کو از سر نو مولانا غلام نصیر الدین صاحب مدظلہ نے تحریر و مرتب کیا ہے۔

ایک دن میں نے ”تمہید“ کا ذکر میاں زبیر احمد صاحب دامت برکاتہم العالیہ سے کیا اور ان سے کتاب شائع کرنے کا اظہار بھی کر دیا تو انہوں نے مجھے تمہید کا ترجمہ پیش کر دیا مسودہ ملنے کے بعد چند مقامات پر جناب علامہ محمد عبدالکلیم شرف قادری صاحب نے حواشی بھی تحریر فرمائے ہیں۔

سوالحمد للہ! تمہید ابوشکور سالمی آپ کی خدمت میں پیش ہے۔

ادراہ میاں زبیر احمد صاحب کی اس پیش کش اور دینی خدمت کے لیے ان کا بے حد

مشکور و ممنون ہے۔

سید محسن اعجاز



تمہید ابوشکور سالمی اور اس کے مصنف

تمہید ابوشکور سالمی علم عقائد و کلام کی قدیم ترین اور مستند کتاب ہے، بقول مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا علامہ ابوالبرکات سید احمد قادری رحمہ اللہ تعالیٰ، امیر مرکزی انجمن حزب الاحناف لاہور اس کے مصنف حضرت قدوة الاولیاء، شمع بزم ولایت داتا گنج بخش سید علی ہجویری قدس سرہ کے ہم عصر تھے، امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اکابر علماء حنفیہ میں سے قرار دیا ہے۔

امام ربانی، حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے، امام غزالی اور علامہ ابن حجر کا حوالہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ ان کا اختلاف خلافت کے سلسلے میں نہیں تھا، بلکہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قصاص کے سلسلے میں تھا۔

ان اقوال کے نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

شیخ ابوشکور سلمی (سالمی) نے جو کہ اکابر علماء حنفیہ میں سے ہیں، فرمایا کہ امیر معاویہ کا اختلاف امیر علی مرتضیٰ کے ساتھ خلافت کے سلسلے میں تھا، کیونکہ نبی اکرم ﷺ نے معاویہ کو فرمایا تھا: جب تم لوگوں کے حکمران بنو تو ان پر نرمی کرنا، اس وقت سے معاویہ کو خلافت کی امید پیدا ہو گئی تھی، لیکن وہ اس اجتہاد میں خطا پر تھے اور حضرت علی مرتضیٰ حق پر تھے، اس لیے کہ ان کی خلافت کا زمانہ حضرت علی مرتضیٰ کی خلافت کے زمانے کے بعد تھا۔

اس کے بعد امام غزالی، علامہ ابن حجر اور شیخ ابوشکور سالمی کے اقوال میں تطبیق دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

ہو سکتا ہے ابتداءً منشا اختلاف قصاص کی تاخیر ہو، اس کے بعد خلافت کی طلب بھی شامل ہو گئی ہو، بہر حال اجتہاد اپنی جگہ واقع ہوا ہے اور مجتہد اگر خطا پر ہو تو اس کے لیے ایک درجہ ہے اور اگر حق پر ہو تو دو درجے بلکہ دس درجے ہیں۔

(احمد سرہندی، امام ربانی، شیخ: مکتوبات امام ربانی، دفتر اول حصہ چہارم فارسی ص ۷۰)

ایک دوسری جگہ ان کا حوالہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

شیخ ابوشکور سلمی (سالمی) نے تمہید میں تصریح کی ہے کہ اہل سنت و جماعت اس امر کے قائل ہیں کہ حضرت معاویہ اور صحابہ کرام جو ان کے ساتھ تھے خطا پر تھے اور ان کی خطا اجتہادی تھی۔ (احمد سرہندی، امام ربانی، شیخ: مکتوبات دفتر اول، حصہ چہارم ص ۶۷)

اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ حضرت بابا فرید الدین گنج شکر رحمہ اللہ تعالیٰ نے نہ صرف دیگر علوم کے ساتھ خود تمہید شریف پڑھی تھی بلکہ اپنے اصحاب علم مریدین کو پڑھایا بھی کرتے تھے، محبوب الہی حضرت خواجہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ بہت سے علوم و فنون پڑھنے اور ”مقامات“ کے چالیس مقامات اور حدیث شریف کی کتاب ”مشارق الانوار“ یاد کرنے کے بعد حضرت بابا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے، قرآن پاک کے چھ پارے تجوید کے ساتھ ”عوارف المعارف“ اور عقائد میں ”تمہید ابوشکور سالمی“ سبقاً سبقاً پڑھیں۔

بابا صاحب نے حضرت محبوب الہی کو اجازت و خلافت سے نوازا اور اس موقع پر عربی زبان میں تفصیلی سند تحریر فرمائی، اس میں تمہید شریف کا بھی خصوصی طور پر ذکر کیا اور فرمایا:

یہ کتاب (تمہید شریف) مجھ سے فرزند رشید صاحب الرائے امام مقبول و برگزیدہ عالم نظام الملۃ والدین محمد بن احمد نے سبقاً سبقاً پڑھی، جو علماء اور ائمہ کی زینت، جلیل القدر بزرگوں اور متقیوں کے لیے باعث فخر ہیں، اللہ تعالیٰ انہیں مزید رضامندی کی جستجو نصیب کرے، ان پر اپنی رحمت کی انتہا کرے اور ان کے درجات بلند فرمائے۔

انہوں نے اول سے آخر تک مکمل تمہید شریف بڑے تدبیر یقین اور انتہائی توجہ سے سمجھ کر پڑھی، دوران تدریس مجھے ان کی علمی استعداد اور غیر معمولی صلاحیتوں کا علم ہوا۔

لہذا میں انہیں اجازت دیتا ہوں کہ یہ کتاب طالب علموں کو پڑھائیں، بشرطیکہ اس کی تقریر و تحریر میں غلطی سے بچیں اور نسخ کی تصحیح اور غلطیوں سے پاک کرنے کی پوری کوشش کریں۔

(محمد محبت اللہ نوری، علامہ: حضرت گنج شکر ص ۱۹-۲۰، حوالہ سیر الاولیاء ص ۲۳۰)

حضرت بابا فرید الملۃ والدین نے اسی سند میں تمہید شریف کے بارے میں یہ کلمات تحریر فرمائے:

”ونعم الكتاب في هذا الفن تمهيد المهدي ابي شكور برد الله مضجعه“ (سیر الاولیاء ص ۲۳۰) عقائد میں مہدی ابوشکور کی تمہید بہترین کتاب ہے، اللہ تعالیٰ

ان کی قبر کو ٹھنڈا کرے۔ (محمد محبت اللہ نوری علامہ: حضرت گنج شکر ص ۵۹-۶۰)

حضرت مفتی اعظم پاکستان مولانا علامہ ابوالبرکات سید احمد قادری کو ”تمہید شریف“ سے بڑی محبت تھی ۱۹۷۲ء میں راقم ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے فرمایا: گزشتہ دنوں پاکستان اور ہندوستان کی جنگ کی وجہ سے دورہ حدیث شریف کے اسباق جاری نہیں رہ سکے کیونکہ ان دنوں کر فیونا فذ ہوتا تھا میں نے فرصت کے ان لمحات میں تمہید ابوشکور سالمی کا ترجمہ کر دیا ہے میں چاہتا ہوں کہ اس کا اصل کے ساتھ مقابلہ ہو جائے تو بہتر ہوگا۔

سلسلہ گفتگو جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ حضرت مصنف حضرت داتا صاحب (قدس سرہما) کے ہم عصر معلوم ہوتے ہیں، لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ ان سے ملاقات ہوئی یا نہیں پھر فرمانے لگے: حضرت امام ابوشکور سالمی رحمہ اللہ تعالیٰ ہر مسئلے میں اتنے مذاہب اور اقوال بیان کرتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے اتنی تفصیل کسی دوسری جگہ شاید ہی ملے اشاعرہ کو بھی اہل سنت کے مقابل ذکر کرتے ہیں مثلاً کہتے ہیں: ”قال اهل السنة كذا وقال الاشاعرة كذا“۔

راقم الحروف نے پوچھا: کیا یہ ماتریدی ہیں؟ فرمایا: ہاں! اسی لیے تو میں اسے زیادہ اہمیت دیتا ہوں طالب علمی کے دور میں ہمیں اس کا ایک نسخہ بدایوں سے ملا تھا جسے ہم نے نقل کر کے پڑھا تھا پاکستان میں سید صاحب نے ہی ”تمہید شریف“ شائع کی تھی اور دورہ حدیث کے طلبہ کو فارغ اوقات میں پڑھایا کرتے تھے۔

(محمد عبدالحکیم شرف قادری: عظمتوں کے پاسبان (الامتاز پبلی کیشنز لاہور ۲۰۰۰ء) ص ۵۸ نوٹ: عظمتوں

کے پاسبان میں ہے کہ راقم ۱۹۷۱ء میں حضور مفتی اعظم پاکستان کی خدمت میں حاضر ہوا تو یہ گفتگو ہوئی ظاہر ہے کہ یہ ہوئے یہ ملاقات ۱۹۷۲ء میں ہوئی تھی۔ ۱۲ شرف قادری)

حضرت مولانا سید حبیب الرحمن شاہ مدظلہ العالی سابق رجسٹرار شریعت کورٹ مظفر آباد نے ایک ملاقات میں بیان فرمایا کہ میں حضرت مولانا عبد القادر شہید رحمہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ۱۹۵۲-۵۳ء میں فیصل آباد سے لاہور حاضر ہوا داتا گنج بخش علی ہجویری رحمہ اللہ تعالیٰ کے مزار پر انوار پر حاضری دینے کے بعد ہم حزب الاحناف (قدیم) دہلی دروازہ میں حضرت مفتی اعظم پاکستان علامہ ابوالبرکات سید احمد قادری رحمہ اللہ تعالیٰ کی زیارت کے لیے حاضر ہوئے

دوران گفتگو میں نے ”شرح عقائد“ خریدنے کی خواہش کا ذکر کیا تو حضرت نے فرمایا: تمہید ابوشکور سالمی علم عقائد کی مستند و معتبر کتاب ہے، یہ خرید لیں، یہ مستند ہونے کے ساتھ آسان اور عام فہم بھی ہے، فقیر کی خواہش ہے کہ علماء اہل سنت اس کو درسِ نظامی کے نصاب میں داخل کر کے ”شرح عقائد“ کی طرح سبقاً سبقاً پڑھائیں۔

(ان کی یہ تحریر نورانی ڈائری میں نوٹ ہے اور اس پر ان کے دستخط ہیں۔ ۱۲ شرف قادری) حضرت مفتی اعظم پاکستان علامہ ابو البرکات سید احمد قادری رحمہ اللہ تعالیٰ نے تمہید شریف عربی میں شائع کی تھی، اس میں بھی انہوں نے اپیل کی تھی کہ اس اہم کتاب کو نصاب میں داخل کیا جائے، الحمد للہ! تنظیم المدارس کے نصاب میں اسے شامل کر لیا گیا ہے۔

اس کتاب کا آغاز بسم اللہ شریف کے بعد ان الفاظ سے ہے:

”الحمد لله ذي المن والآلاء والعظمة والكبرياء والجود والاعطاء

والبهجة والبهاء“۔ (محمد بن عبد السعید امام ابوشکور سالمی: التہمید (مکتبہ اسلامیہ پشاور) ص ۲)

اس کا نام خود حضرت امام سالمی نے یوں تحریر کیا ہے:

وسمیتہ التہمید فی بیان التوحید

وهو هداية لكل مسترشد ورشيد

(محمد بن عبد السعید امام ابوشکور سالمی: التہمید ص ۳)

ظاہر ہے کہ کتاب کا نام صرف وہی ہے جو پہلی سطر میں ہے، دوسری سطر تو کتاب کا تعارف ہے، یعنی کتاب کا نام صرف اتنا ہے: ”التہمید فی بیان التوحید“ چنانچہ حاجی خلیفہ نے ”کشف الظنون“ میں اتنا ہی نام لکھا ہے۔ (حاجی خلیفہ علامہ: کشف الظنون ج ۱ ص ۴۸۴) لیکن مشہور جرمن فاضل براکلمن نے گزشتہ دونوں سطروں کو نام قرار دے دیا ہے، انہوں نے اس طرح نام لکھا ہے: ”کتاب التہمید فی بیان التوحید“ (وهداية لكل مسترشد والرشيد)۔ (براکلمن جرمن محقق: تاریخ آداب اللغة العربیة ج ۱ ص ۴۱۹ نوٹ: کشف الظنون اور جرمن محقق کے یہ حوالے پیر محمد حسن رحمہ اللہ تعالیٰ نے راقم کے نام ایک مکتوب میں تحریر فرمائے تھے۔ ۱۲ شرف قادری)

اس میں چند تسامحات ہیں:

(۱) لفظ ”کتاب“ نام کا حصہ نہیں۔

(۲) بریکٹ میں لکھی ہوئی عبارت تعارفی جملہ تو ہے لیکن نام کا حصہ نہیں۔

(۳) ہدایۃ سے پہلے ایک لفظ ہونقل کرنے سے رہ گیا ہے تمہید میں اس طرح ہے: وہو

ہدایۃ۔

(۴) الرشید میں الف لام زائد ہے تمہید میں ”لکل مسترشد ورشید“ ہے۔

یہ کتاب بارہ ابواب پر مشتمل ہے اور اس میں مسلک اہل سنت و جماعت یعنی اسلام کے اکثر و بیشتر عقائد بیان کر دیئے گئے ہیں ہر باب کو متعدد اقوال (فصلوں) پر تقسیم کیا گیا ہے ابواب کی مختصر فہرست درج ذیل ہیں:

- پہلا باب: عقل کے بارے میں اور اس میں نواقوال ہیں۔
- دوسرا باب: محسوس کے بارے میں اور اس میں سات اقوال ہیں۔
- تیسرا باب: اثباتِ صانع کے بیان میں اور اس میں سات اقوال ہیں۔
- چوتھا باب: اثباتِ صفات کے بیان میں اور اس میں دس اقوال ہیں۔
- پانچواں باب: اسماءِ حسنیٰ کے بارے میں اور اس میں چھ اقوال ہیں۔
- چھٹا باب: رسولوں پر وحی کے بھیجنے کے اثبات میں اور اس میں بیس اقوال ہیں۔
- ساتواں باب: معرفت اور ایمان کے بارے میں اور اس میں گیارہ اقوال ہیں۔
- آٹھواں باب: ایمان کی شرائط کے بیان میں اور اس میں انیس اقوال ہیں۔
- نواں باب: دین اور شرائع کے بیان میں اور اس میں تین اقوال ہیں۔
- دسواں باب: تکلیف اور طاقت کے بیان میں اور اس میں سات اقوال ہیں۔
- گیارہواں باب: خلافت و امارت کے بیان میں اور اس میں آٹھ اقوال ہیں۔
- بارہواں باب: اہل سنت و جماعت کے بارے میں اور اس میں سولہ اقوال ہیں۔

حضرت مفتی اعظم پاکستان علامہ ابوالبرکات سید احمد قادری رحمہ اللہ تعالیٰ نے تمہید شریف پر یہ نوٹ لکھا تھا کہ اس کے مصنف حضرت داتا گنج بخش کے ہم عصر ہیں۔ دوسری بات یہ لکھی تھی کہ اگر کسی صاحب کو ان کے حالات معلوم ہوں تو ہمیں ان کی اطلاع دیں تاکہ آئندہ ایڈیشن میں شائع کر دیئے جائیں آئندہ سطور میں جس قدر حالات میسر ہو سکے ہیں، تحریر کیے جاتے ہیں۔

امام ابوشکور سالمی رحمہ اللہ تعالیٰ

انہوں نے ”تمہید“ میں اپنا نام اس طرح لکھا ہے: ”ابوشکور سالمی و هو محمد

بن عبد السعید بن شعیب الکبشی“۔ (محمد بن عبد السعید ابوشکور سالمی: التہمید ص ۲)

حاجی خلیفہ نے اس طرح ان کا نام لکھا ہے: ”ابو الشکور محمد بن عبد السید

بن شعیب الکبشی السالمی الحنفی“۔ (حاجی خلیفہ علامہ: کشف الظنون ج ۱ ص ۲۸۴)

(۱) انہوں نے کنیت ”ابوشکور“ لکھی ہے جب کہ وہ خود ”ابوشکور“ لکھتے ہیں۔

(۲) والد کا نام عبد السید لکھا ہے جب کہ تمہید میں ”عبد السعید“ ہے۔

(۳) نسبت الکبشی لکھی ہے جب کہ تمہید میں ”الکبشی“ ہے۔

براکلمن نے ان کا نام اس طرح لکھا ہے: ”ابو شکور محمد بن عبد السید بن

شعیب الکتسی الحنفی السالمی“۔ (براکلمن جرمن محقق: تاریخ آداب اللغة العربیة ج ۱ ص ۷۴۳)

صرف نسبت میں اختلاف ہے۔

امام ابوشکور سالمی کی تاریخ پیدائش جائے پیدائش اور تاریخ وفات کسی کتاب سے معلوم

نہیں ہوتی، براکلمن نے اتنا بیان کیا ہے کہ مصنف پانچویں صدی ہجری کے دوسرے نصف

میں تھا۔ (براکلمن: تاریخ اللغة العربیة ج ۱ ص ۴۱۹)

پیر محمد حسن سابق شیخ الادب جامعہ اسلامیہ بہاولپور راقم کے نام ایک مکتوب (تحریر

۲۳ جولائی ۱۹۸۹ء) میں لکھتے ہیں:

براکلمن کے اس قول سے آپ کے بیان کی تصدیق ہوتی ہے کہ مصنف سید علی جویری

کے معاصرین میں سے تھا، مزید برآں ان کو حنفی اور سالمی لکھا ہے اور داتا صاحب بھی حنفی

تھے اس قول کی تائید خود امام سالمی کے ارشاد سے ہو رہی ہے وہ فرماتے ہیں:

میں نے شیخ امام زاہد ابوبکر محمد بن حمزہ سمرقند کے خطیب ۴۶۰ھ کے بعد والی دہائی میں

سنا، میں ان کے پاس علم فقہ پڑھ رہا تھا اور میں نے ان سے ”کتاب السرقہ“ وغیرہ کا درس لیا

تھا۔ (محمد بن عبد السعید ابوشکور سالمی: التہمید (طبع پشاور) ص ۱۹۳)

اس اقتباس سے ان کے ایک استاذ امام محمد بن حمزہ کا پتا چلتا ہے دوسری بات یہ معلوم

ہوئی کہ وہ سمرقند میں پڑھتے رہے تیسری بات یہ معلوم ہوئی کہ وہ ۴۶۰ھ کے بعد والی دہائی

میں طالب علمی کے دور میں گزر رہے تھے چوتھی بات یہ معلوم ہوئی کہ انہوں نے فقہ کی ”کتاب السرقة“ وغیرہ کا درس امام محمد بن حمزہ سے لیا تھا۔

ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں:

میں نے بلخ میں شیخ الاسلام امام الائمہ امام ابوسعید خلیل بن احمد بن اسماعیل سجری کے اپنے قلم کا لکھا ہوا ایک فتویٰ کا جواب دیکھا۔ (محمد بن عبدالسعید ابوشکور سالمی: التہید ص ۱۰۰)

اس سے زیادہ ان کے اساتذہ اور تحصیل علم کے بارے میں کچھ معلوم نہیں البتہ ان کی کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے زمانے کے بڑے متبحر عالم اور امام تھے اور ہر فرقے کے علماء سے مناظرے کرتے اور انہیں لاجواب کرتے تھے تمہید میں ایک جگہ فرقہ متشرفہ کے عالم کے ساتھ مناظرے کا ذکر ہے۔ (دیکھیے ص ۴۲) ایک جگہ کرامیہ کے فرقہ حشویہ کے عالم سے مناظرے کا ذکر ہے۔ (دیکھیے ص ۵۰)

ص ۵۲ پر ایک اشعری کے ساتھ مناظرے کا تذکرہ ہے ص ۵۳ پر ایک مجوسی کا ایک سوال اور اس کا جواب بیان کیا ہے غرض یہ کہ ہر قسم کے فرق باطلہ کے ساتھ نبرد آزما رہتے تھے اور مسلک اہل سنت و جماعت کی حقانیت واضح کرتے تھے۔

حشویہ فرقے کے ایک عالم سے درج ذیل گفتگو ہوئی:

امام سالمی: اللہ تعالیٰ کی صفات فعلیہ کے بارے میں کیا کہتے ہو؟

حشوی: حادث ہیں؟

امام سالمی: اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس صفت کے پیدا ہونے سے پہلے اللہ تعالیٰ صفت کے لحاظ سے ناقص تھا یہ باطل اور محال ہے۔

امام سالمی: وحی سے پہلے انبیاء کے بارے میں کیا کہتے ہو؟

حشوی: وحی سے پہلے وہ نبی نہیں تھے اور منافی عدالت افعال سے معصوم بھی نہیں تھے۔

امام سالمی: اگر وہ ایسا کام کریں جو عدالت کے منافی ہو تو وہ فاسق ہو جائیں گے اگر اس وقت

اللہ تعالیٰ ان پر وحی نازل فرمادے تو یہ ایک فاسق شخص پر وحی ہوگی اس سے اللہ

کے رسول (ﷺ) کا فاسق ہونا لازم آئے گا۔

امام سالمی: جو شخص کلمہ طیبہ ”لا الہ الا اللہ“ پڑھے اور نعوذ باللہ عقیدہ اس کے مخالف رکھے

اس کے بارے میں تم کیا کہتے ہو؟

حشوی: وہ مؤمن ہے۔

امام سالمی: تمہارا دین کیا ہوا؟ یہی ناں کہ رب کریم ناقص ہے، رسول فاسق ہے اور مؤمن منافق ہے۔

اس پر حشوی حیران رہ گیا اور اس کی زبان بند ہو گئی۔

(محمد بن عبد السعید ابوشکور سالمی: التہمید ص ۵۰)

اس سے ان کی مناظرانہ قابلیت، قوت استحضار اور مد مقابل پر چھا جانے کی صلاحیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

ایک دفعہ امام سالمی شیعوں کے زوغے میں آ گئے، انہوں نے پوچھا کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد سب سے افضل کون ہے؟ فرماتے ہیں کہ مجھے بخوبی اندازہ تھا کہ اگر میں نے تسلی بخش جواب نہ دیا تو یہ مجھ پر حملہ کرنے اور زد و کوب کرنے سے بھی باز نہیں آئیں گے، میں نے جواب دیا: صحابہ کرام میں سب لوگوں سے افضل ابو بکر صدیق ہیں اور اہل بیت میں سب سے افضل حضرت علی مرتضیٰ ہیں۔

اس جواب پر وہ خوش ہو گئے، کیونکہ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ حضرت علی مرتضیٰ صحابہ میں سے نہیں بلکہ اہل بیت میں سے تھے اور اہل بیت صحابہ سے افضل ہیں، جب کہ میرا عقیدہ یہ تھا کہ حضرت علی مرتضیٰ صحابہ میں سے بھی تھے اور اہل بیت میں سے بھی اور حضرت ابو بکر صدیق ان سے افضل تھے اور خلفاء راشدین اہل بیت سے افضل تھے رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔

(محمد بن عبد السعید سالمی ابوشکور: التہمید ص ۱۸۱)

ایک دفعہ امام سالمی کو نبی اکرم ﷺ کی زیارت ہوئی، فرماتے ہیں: خواب میں مجھے نبی اکرم ﷺ کی زیارت ہوئی، آپ کے کمرے کے گرد جالی لگی ہوئی تھی، آپ کی نورانیت اور ضیا باری کی فراوانی کی وجہ سے مجھے صرف آپ کے رخساروں کی سفیدی دکھائی دی۔

(محمد بن عبد السعید سالمی ابوشکور: التہمید ص ۱۶۶)

اس تفصیل سے معلوم ہو گیا کہ وہ سنی، حنفی اور ماتریدی تھے، سالمی کہلانے کی کیا وجہ تھی؟ ڈاکٹر پیر محمد حسن نے اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرمایا:

سالمی کے لفظ سے ایک اور بات کی نشاندہی ہوتی ہے وہ یہ کہ وہ سالمی فرقہ سے تعلق رکھتے تھے سالمی صوفیہ کا ایک فرقہ ہے جس کے بانی ابوالحسن احمد بن محمد بن سالم البصری (م ۳۶۰ھ) تھے (ان کے والد) محمد بن سالم البصری ۲۹۷ھ میں فوت ہوئے۔ دائرۃ المعارف اسلامیہ اردو میں (ج ۱۰ ص ۶۱۴) سالمیہ پر ایک مقالہ ہے جو بہت حد تک گمراہ کن ہے۔

(پیر محمد حسن علامہ ڈاکٹر: مکتوب بنام راقم تحریر ۲۳ جولائی ۱۹۸۹ء)

کسی تذکرے یا کسی دوسری کتاب سے نہ تو ان کی تاریخ وفات معلوم ہو سکی اور نہ ہی یہ خبر ملی کہ ان کا مزار کہاں ہے؟ مولانا محمد سعید شبلی نقشبندی قادری رضوی فیروز پوری رحمہ اللہ تعالیٰ (ساہیوال) نے اپنی سرگزشت بیان کرتے ہوئے فرمایا:

حافظ محمد اسماعیل صاحب احقر کے دادا کے چچا زاد بھائی تھے اور وہ چھوٹی عمر میں پڑھنے کے لیے دہلی جا رہے تھے اس زمانے میں ریل گاڑی نہیں تھی وہ پاپیادہ چلتے ہوئے راستے میں خواجہ ابوشکور سالمی سرسوی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر رات بھر درود شریف یا باختلاف روایت الحمد شریف پڑھتے رہے۔ پچھلی رات روضہ سے آواز آئی: اے لڑکے! جس ارادے سے دہلی جا رہا ہے واپس اپنے گھر چلا جا، تیرا مقصد گھر پر ہی حاصل ہو جائے گا واپس آگئے اسی (پہلے) استاد سے پڑھنا شروع کیا سال کے اندر قرآن شریف حفظ کر لیا اور باقی علوم عربی فارسی وغیرہ روحانی کمالات اللہ تعالیٰ کی عطا سے حاصل ہو گئے۔ (محمد سعید شبلی علامہ: فضائل درود و سلام مطبوعہ مجلس رضالہ ہور (۱۳۰۰ھ) ص ۸۶)

مولانا محمد سعید شبلی ابتداءً فرید کوٹ کے رہنے والے تھے ان کے دادا کے بھائی وہاں سے دہلی کے لیے روانہ ہوئے راستے میں خواجہ ابوشکور سالمی کا مزار تھا اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان کا مزار ہندوستان میں فرید کوٹ اور دہلی کے درمیان ہے ان کے نام کے ساتھ ”سرسوی“ کے ضمیمے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مزار سرسہ میں ہے برادر م مولانا محمد عبدالغفار ظفر صابری مدظلہ (فیصل آباد) نے بتایا کہ سرسہ ریاست پٹیالہ میں ہے۔

تمہید شریف کا ترجمہ

اس سے پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ ۱۹۷۲ء میں پاک بھارت جنگ کے دنوں میں دورہ حدیث کے اسباق جاری نہ رہنے کی وجہ سے حضرت مفتی اعظم پاکستان علامہ ابوالبرکات سید احمد قادری رحمہ اللہ تعالیٰ نے تمہید شریف کا اردو ترجمہ کیا اس کے آخر میں لکھتے ہیں:

دس جنوری کو ترجمہ شروع کیا اور آج ۲۴ جنوری ۱۹۷۲ء بروز دو شنبہ شریف ترجمہ تمام ہوا۔

حیرت ہوتی ہے کہ انہوں نے پندرہ دنوں میں ترجمہ کے تقریباً تین سو صفحے کس طرح لکھ لیے اس سے ان کے اعصاب کی قوت ان کے ذوق و شوق، محویت اور ان کے قلم کی برق رفتاری کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

پھر مفتی اعظم پاکستان اور استاذ العلماء ہونے کے باوجود ترجمے کے درمیانی صفحات اور آخر میں بھی لکھا ہے: یہ ترجمہ قابل غور و اصلاح ہے۔

اسی احساس ذمہ داری کے تحت انہوں نے یہ ترجمہ استاذ العلماء مولانا علامہ محمد مہر الدین جماعتی رحمہ اللہ تعالیٰ کو نظر ثانی کے لیے دیا، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس ترجمے میں کہیں کہیں تصرف کیا اور واپس کر دیا، پھر انہوں نے پروفیسر محمد طفیل سالک کو دیا، انہوں نے بھی زیادہ رد و بدل کیے بغیر ترجمہ واپس پیش کر دیا، یہاں تک کہ ۲۰ شوال المکرم بمطابق ۲۴ ستمبر ۱۳۹۸ھ / ۱۹۷۸ء کو حضرت مفتی اعظم پاکستان دنیا سے رحلت فرما گئے، راقم کی درخواست پر ان کے صاحب زادے حضرت مولانا علامہ سید محمود احمد رضوی شارح بخاری نے ترجمے کا مسودہ راقم کو عنایت فرما دیا۔

راقم کی درخواست پر مولانا علامہ غلام نصیر الدین چشتی گولڑوی مدرس جامعہ نظامیہ رضویہ (اب مدرس جامعہ نعیمیہ) نے اس ترجمے کو آسان اور خوش خط کر کے نقل کیا، ان کا نقل کردہ مسودہ ہاتھوں سے اس طرح نکلا جیسے ضائع ہو گیا ہو، مایوس ہو کر مظفر آباد آزاد کشمیر کے مولانا معین الدین حمیدی برکتی کو دوبارہ اس کی خوش خط نقل تیار کرنے پر لگایا، پھر راقم اسے اصل عربی متن اور ترجمہ کے اصل مسودہ سے ملا کر چیک کرتا رہا، جہاں مناسب معلوم ہوا عبارت آسان اور تبدیل بھی کرتا رہا، پھر اس مسودے کو مولانا محمد شاہد اقبال کشمیری صاف کر کے لکھتے، نصف سے زیادہ کتاب کا ترجمہ اس طرح صاف کر کے لکھا گیا، ادھر جناب سید محسن شاہ مالک فرید بک شال نے بتایا کہ ترجمے کا مسودہ میرے پاس ہے اور میں نے کمپوز کرا لیا ہے، تب راقم نے یہ مقدمہ تحریر کیا، تاکہ مرشد گرامی حضرت سید صاحب اور شارح بخاری حضرت علامہ سید محمود احمد رضوی رحمہما اللہ تعالیٰ کا قرض میرے سر سے اتر جائے اور عقائد کی ایک ہم کتاب

کا ترجمہ بردران اہل سنت تک پہنچ جائے۔ فالحمد للہ تعالیٰ علیٰ ذلک

محمد عبدالحکیم شرف قادری

بانی مکتبہ قادریہ لاہور

۲۸ شعبان ۱۴۲۶ھ / ۱۳ اکتوبر ۲۰۰۵ء



باب اوّل

عقل کا بیان

اور اس میں نو قول ہیں:

قول اوّل

ماہیت عقل میں

تمہید

عقل لطیف چیز ہے، اس کی کیفیت کو ہمارے اوہام ادراک نہیں کر سکتے اور ہمارے نزدیک فقہاء کرام سے کوئی قول صحیح ثابت نہیں ہوا کہ عقل کی ماہیت کیا ہے؟ (مہدی ابوشکور سالمی رحمہ اللہ تعالیٰ)

عقل کیا ہے؟

فلاسفہ کہتے ہیں کہ عقل ایک روشن کرنے والا احساس کرنے والا اور مفید جوہر ہے جو روح میں حلول کیے ہوئے ہے اور اس سے روح کی حیات ہے جیسے روح سے جسم کی حیات ہے تو روح کے لیے حیات اور اعمال و احوال عقل سے اتصال کی بدولت ہیں جیسے جسم کی حیات اور اعمال و احوال روح کے اتصال سے ہیں۔

یہ ایک ایسا قول ہے کہ جس کے ثبوت میں بطریق نص اور قیاس کوئی دلیل نہیں۔ اس لیے کہ اگر یہ مان لیا جائے کہ عقل روح سے متصل مظہر حیات اور اس کے معانی کا افادہ کرنے والی ہے تو لازم آئے گا کہ روہیں جسموں سے پہلے قائم و موجود ہوں اور وفات کے بعد باقی و ثابت رہیں۔

اور عقل نے روح سے ملاقات کی حالت میں حالتِ حیات جیسا فائدہ نہیں دیا۔ دلیل یہ ہے کہ عقل مذاکر نہیں ہے کہ اس کے ساتھ محسوس کرے اور نہ ہی ایسا ہے کہ وہ گزرے دنوں کو یاد کرے اور گزرے ہوئے احوال و اعمال میں تمیز کرے تو یہ قول بھی درست نہ ہوا۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر عقل روح کے لیے حیات کا سبب ہوتی تو روح جسم سے پہلے اور جسم کے (زوال) کے بعد بھی عقل والی ہوتی اور پھر روح پر واجب ہوتا کہ وہ ایمان لائے اور احکام کی بھی پابند ہو، حسن و قبح (اچھے بُرے) میں فرق بھی کر سکے اور ہمارا اجماع ہے کہ روح ایسی نہیں ہے تو ثابت ہوا کہ روح کی حیات کا سبب عقل نہیں ہے۔

اور اس لیے کہ تنہا روح درج ذیل اوصاف کی حامل نہیں ہے:

- (۱) اشیاء کو دیکھنا (۲) کسی کو انفرادی طور پر جاننا (۳) خیر اور شر میں تمیز کرنا
(۴) مکلف ہونا (۵) مستحق سزا و عقاب ہونا

ان میں سے کوئی چیز بھی روح کے لیے ثابت نہیں ہے۔

تحقیق کلام

بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو روح اور جسم کے ساتھ وہ زندہ مولود کہلاتا ہے حالانکہ اس میں عقل ثابت نہیں ہوتی، اگر عقل روح سے متصل و مجاور اور ایک ساتھ ہوتی تو پھر چاہیے کہ صبی (بچہ) اور اسی طرح جنین (وہ بچہ جو ابھی شکمِ مادر میں ہوتا ہے) دونوں بالغ کی طرح اشیاء کو جاننے کی عقل رکھتے ہوں اور یہ محال ہے، تو جب عقل نے کوئی فائدہ نہیں دیا تو معلوم ہوا کہ یہ کلام درست نہیں۔

عقل کی دوسری تعریف

بعض فقہاء نے کہا کہ عقل جوہر ہے۔

پہلی روایت: احادیث میں مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب عقل کو پیدا کیا تو فرمایا: آگے ہو! وہ آگے ہوئی، پھر حکم ہوا: پیچھے ہٹ، وہ پیچھے ہٹ گئی، پھر فرمایا: بیٹھ جا، تو وہ بیٹھ گئی، پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اس شخص کے لیے بشارت ہے جسے میں نے عقل دی، تیرے سبب سے دوں گا اور تیرے سبب سے گرفت کروں گا، تیرے سبب سے عبادت کیا جاؤں گا، تیری وجہ سے ثواب دوں گا اور تیری وجہ سے سزا دوں گا۔

دوسری روایت: جب اللہ تعالیٰ نے عقل کو پیدا کیا تو فرمایا: بیٹھ جا، وہ بیٹھ گئی، پھر فرمایا: کھڑی ہو جا تو وہ کھڑی ہو گئی، پھر فرمایا: پیٹھ پھیر، اس نے پیٹھ پھیر لی، پھر فرمایا: بول، وہ بولنے لگی، پھر فرمایا: دیکھ تو وہ دیکھنے لگی، پھر فرمایا: سن تو وہ سننے لگی، پھر فرمایا: مجھے اپنی عزت و جلال اور عظمت کی قسم! میں نے کوئی مخلوق تجھ سے زیادہ عزت والی پیدا نہیں کی، تیرے سبب سے میری عبادت کی جائے گی، تیرے سبب سے میری معرفت ہوگی، تیرے سبب سے میری حمد کی جائے گی، تیرے سبب سے میں مواخذہ کروں گا، تیرے سبب سے دوں گا، تیرے سبب سے سزا دوں گا، تیرے سبب سے ثواب دوں گا۔

تیسری روایت: عقل سے فرمایا: میں کون ہوں؟ عقل چپ رہی، اللہ تعالیٰ نے اسے نور معرفت کا سرمہ عطا فرمایا تو عقل یوں عرض گزار ہوئی: "اَنْتَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ" تو ہی اللہ ہے، تیرے سوا کوئی معبود نہیں، تو واحد اور قہار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مجھے اپنی ربوبیت کی قسم! میں نے تجھ سے زیادہ کوئی اچھی چیز پیدا نہیں کی۔ اس سے ثابت ہوا کہ اگر عقل جوہر نہ ہوتی تو خود قائم نہ ہوتی۔

اس قول کی تردید

ان احادیث مبارکہ سے یہ ثابت کرنا درست نہیں ہے کہ عقل جوہر ہے، اس لیے کہ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی زندہ بولنے والی مخلوق پیدا کر کے اس میں عقل کو رکھ کر اس کے ساتھ کلام فرمایا ہو۔

نیز یہ بات بھی ہے کہ اگر عقل کو جوہر مان لیا جائے تو آدمی سے اس کا الحاق اسی صورت میں متصور ہو سکتا ہے جب کہ وہ ایک الگ آلہ اور گوشت کا ٹکڑا ہو اور پھر اس کا زوال بھی آدمی کے جسم سے گوشت کے اس ٹکڑے کے زوال پذیر ہونے سے ممکن ہو۔

اور یہ تو واضح سی بات ہے کہ عقل ایک ظاہر چیز ہے جو گھٹتی بڑھتی ہے اور بچوں میں بھی پائی جاتی ہے، جب وہ بالغ ہو جاتے ہیں یا جب وہ سوجھ بوجھ والے ہوتے ہیں ایسے ہی دیوانے جب ان کو افاقہ ہوتا ہے۔

اور یہ بھی معلوم ہے کہ وفات کے بعد عقل اپنے حال پر قائم اور باقی نہیں رہتی بلکہ روح کے زائل ہوتے ہی زائل ہو جاتی ہے اور کبھی کبھار تو روح کے زائل ہونے سے پہلے ہی

زوال پذیر ہو جاتی ہے اور عقل کا ظہور روح کے ظاہر ہونے کے بعد ہوتا ہے تو یہ چیز اس پر دلالت کرتی ہے کہ عقل جو ہر نہیں۔

تیسری تعریف

اور بعض فقہاء نے کہا کہ ہم اس کے قائل نہیں کہ عقل جو ہر ہے یا عرض مگر عقل حصول معرفت اور اشیاء کے ادراک کا سبب اور آلہ ہے۔

چوتھی تعریف

اور بعض نے کہا: عقل لطیف شئی ہے دل میں ضیاء بکھیرتی ہے اسے جلا دیتی ہے دل میں اتر کر چیزوں کو دیکھتی اور اعیان کا ادراک کرتی ہے۔

اچھی چیز کو اس کے حسن کی وجہ سے اچھا اور بُری چیز کو اس کے بُرے پن کی وجہ سے بُرا سمجھتی ہے صالح چیزوں اور ان کے اعمال کو واجب گردانتی ہے محالات اور ان کے انداز کی نفی کو واجب قرار دیتی ہے۔ قبولیت اور اس کے مشابہ چیزوں کے تقاضوں کو ثابت کرتی ہے۔ معارف اور اس کے ارکان و آیات کا احاطہ کرنا بھی عقل کا کام ہے اور یہی معتزلہ کا قول ہے۔

پانچویں تعریف

امام ابوالحسن اشعری فرماتے ہیں کہ بعض نے کہا کہ عقل عبارت ہے تمیز و انائی اصلاح معیشت اور فراست سے جس کی وجہ سے خطاب شرعی متوجہ ہوتا ہے۔

چھٹی تعریف

بعض نے کہا کہ عقل ایک معنی ہے جس کی وجہ سے خطاب شرعی متوجہ ہوتا ہے اور اسی معنی کے سبب سے ثواب و عقاب ہوتا ہے۔

ساتویں تعریف

بعض نے کہا کہ عقل ایک آلہ ہے جس کے ذریعے علم اور پہچان حاصل ہوتی ہے اور یہ ممنوعات لہو و لعب اور بُرے کاموں سے روکتی ہے۔

آٹھویں تعریف

بعض نے کہا کہ عقل ایک جسم ہے لیکن آنکھوں سے پوشیدہ ہے۔

نویں تعریف

بعض نے کہا کہ عقل ایک علت کا نام ہے جس سے انسان دانش مند اور جان پہچان والا ہو جاتا ہے۔

اور یہ بات زیادہ درست ہے کہ اگر کہا جائے کہ عقل ایک عرض ہے جو ایک محل میں سرایت کیے ہوئے ہے جو چیزوں کی معرفت حاصل کرنے کے لیے کارآمد ثابت ہوتی ہے اور غائب و نامعلوم چیز کے مشاہدہ کے لیے واضح دلیل بنتی ہے۔
علاوہ ازیں بعض نے کہا کہ عقل کا محل دماغ ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کا بھی ایک ایسا ہی قول ہے ان کی دلیل نبی کریم ﷺ کا ارشاد مبارک ہے: "الْقَرْعُ يَزِيدُ فِي الدِّمَاغِ وَالدِّمَاغُ يَزِيدُ فِي الْعَقْلِ" کدو کھانے سے دماغ کو تقویت ملتی ہے اور دماغ صحت مند ہو تو عقل بڑھتی ہے۔

دسویں تعریف

بعض حضرات کہتے ہیں کہ عقل کا محل دل ہے اور وہ (دل) عقل کا ثمرہ اور نتیجہ ہے اور عقل کی روشنی دماغ کے ذریعے سے حاصل ہوتی ہے یعنی عقل دل و دماغ دونوں کے ذریعے سے فائدہ دیتی ہے اور وہ درخت کی طرح ہے۔

فلاسفہ اس چیز کے قائل ہیں کہ عقل کا محل روح ہے اور اس کا ذکر گزر چکا ہے۔

دوسرا قولعقل کی مقدار کیا ہے؟

عقل کی کمیت اور اس کے کامل و ناقص ہونے کے بارے میں مختلف نظریات ہیں چنانچہ آئندہ سطور میں ان نظریات کو دلائل کے ساتھ بیان کیا جائے گا۔

اہل سنت و جماعت کے نزدیک عقل متفاوت ہے برابر اور ایک درجے کی نہیں ہوتی اور معتزلہ کہتے ہیں کہ عقل مساوی اور ایک جیسی ہوتی ہے اس میں فرق نہیں پایا جاتا۔

عقل میں مساوات کے دلائل

معزز نے مساواتِ عقل پر دلائل دیئے ہیں:

پہلی دلیل: اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں عقل والوں کو آیات سے استدلال اور قیاس کرنے کا حکم دیتا ہے۔

☆ ”فَاعْتَبِرُوا يَا أُولِي الْأَبْصَارِ“ تو اے نگاہ والو! عبرت حاصل کرو۔ (الحشر: ۲)

☆ دوسری جگہ ارشاد فرماتا ہے: ”إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّأُولِي النَّهْيِ“ اور اس میں نشانیاں ہیں عقل والوں کے لیے۔ (طہ: ۱۲۸)

چونکہ آیات سے دلیل اخذ کرنے اور قیاس کرنے کا حکم ہر عقل والے کو شامل ہے۔ لہذا سب کے لیے عقل بھی برابر ماننا پڑے گی اس لیے کہ اگر عقل میں مساوات نہ ہو بلکہ تفاوت ہو تو پھر ہر عقل مند کے لیے آیات سے استدلال کرنا اور قیاس کرنا ممکن نہیں ہوگا۔ دوسری دلیل: اور عقل اللہ تعالیٰ کی حجتوں میں سے ایک حجت ہے اور اس میں فرق بیان کرنا خطابِ الہی میں فرق کا موجب بنے گا اور خطابِ الہی میں تفاوت اور فرق کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بعض کے لیے احکام شریعت مہمل اور بے کار ہو جائیں اور بعض مکلفین احکام کے پابند ہوں۔ تیسری دلیل: نیز یہ کہ عقل کی زیادتی تکلیف اور خطاب کی زیادتی کا سبب ہے اور عقل کا کم ہونا خطاب شرعی اور تکلیف احکام میں کمی کا موجب قرار پاتا ہے اور چونکہ احکام کا مکلف ہونے میں سب عقل والے برابر و مساوی ہوتے ہیں لہذا عقل جو اس مساوات کا سبب ہے اس میں بھی مساوات و برابری ہونی ضروری ہے لہذا عقل میں تفاوت محال ہے۔

امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ عقل آنے کے بعد اگر عاقل اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں لاتا اور اپنے خالق کو نہیں پہچانتا تو اس کی گرفت ہوگی اور عاقل کو اس مواخذہ سے بچنے کے لیے کسی قسم کا بہانہ تراشنے اور عذر پیش کرنے کی اجازت اور کنجائش نہیں ہوگی اور اگر عقل متفاوت ہو تو بعض کے حق میں عذر ثابت ہوگا اور بعض کے لیے عذر ثابت نہیں ہوگا۔

چوتھی دلیل: عقل کے غیر متفاوت اور مساوی ہونے پر یہ دلیل بھی دی جاتی ہے کہ اگر عقل میں زیادتی اور کمی ممکن ہو تو پھر یہ معلوم نہیں ہو سکے گا کہ عقل کی کتنی مقدار پائی جائے اور کس

حد تک وہ حاصل ہو؟ تو انسان خطاب الہی کا لائق اور اہل ہوگا اس لیے کہ عقل کا مشاہدہ تو ہو نہیں سکتا اور نہ ہی یہ دیکھنے میں آتی ہے معلوم ہوا کہ عقل میں تفاوت نہیں ہے۔

اہل سنت و جماعت کے عقل کے متفاوت ہونے پر دلائل

اہل سنت نے عقل کے متفاوت ہونے پر اللہ تعالیٰ کے ارشاد ”فَاغْتَبِرُوا يٰۤاٰنۡسَٰرَ الْاَبۡنَاصَٰرِ“ سے استدلال کیا۔ انہوں نے کہا کہ لوگ چونکہ عقل میں الگ الگ درجے کے مالک ہوتے ہیں لہذا ان کے اعتبار اور قیاس کرنے میں بھی اسی نسبت سے ان میں فرق ہوگا اور حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: پرندوں میں زیادہ عقل والا کبوتر ہے ”اغقل الطيور الحمام“ کبوتر کے لیے بھی ایک قسم کی عقل ثابت کی اگر عقل غیر متفاوت ہوتی یعنی عقل میں سب مساوی و برابر ہوتے تو کبوتر بھی شرايع و احکام میں مخاطب ہوتا اور یہ صحیح نہیں ہے۔ اس لیے کہ لغت میں عقل اس چیز کو کہتے ہیں جو منکرات اور منہیات سے روکے منافع اور نقصانات میں تمیز کرے دوست اور دشمن میں فرق جانتی ہو۔

اور یہ اصل میں ”عقال البعير“ اونٹ کی رسی سے مشتق ہے تو جس طرح رسی سے باندھ کر اونٹ کو پابند کر دیا جاتا ہے اس طرح عقل بھی انسان کو شریعت کے دائرہ میں احکام کا پابند کر دیتی ہے اور اس قدر عقل تو ہر حیوان میں پائی جاتی ہے مگر وہ عقل کہ جس کے سبب خطاب متوجہ ہو وہ عقل اور ہے اس سے مراد تمیز کرنے والی عقل ہے کہ جس کے ذریعے استدلال کیا جاسکے اور اللہ تعالیٰ کی آیات اور نشانیوں میں نظر و فکر کر کے اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرنے کا ذریعہ بنے اور اس سے صفات باری کا علم حاصل ہو۔ عقل سے مراد یہ ہے کہ وہ اچھے اور بُرے میں تمیز کرتی ہو نفع اور نقصان کو جانتی ہو آرام بخش اور دردناک چیزوں کا فرق جانتی ہو نیز انسان کو بے وقوفی اور بے ہودگی سے دور رکھے۔

اور بعض نے عقل کی حد و تعریف یوں بیان کی کہ عقل اس چیز کا نام ہے جو اچھائی کو پسند کرے اور بُرائی سے باز رکھے۔

عقل کی تعریف میں اختلاف لفظی ہے

اور بعض فقہاء اہل سنت نے فرمایا کہ درحقیقت اس مسئلہ میں کوئی اختلاف نہیں اس لیے کہ جو کہتے ہیں کہ عقل میں تفاوت نہیں ہے ان کا مطلب یہ ہے کہ اتنی عقل کہ جس کی وجہ

سے انسان خطاب الہی کا اہل ہو سکے اس مقدار میں سب لوگ مساوی ہیں اس قدر عقل میں تفاوت اور فرق نہیں ہے۔ اسی اعتبار سے امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: عاقل کے لیے اپنے خالق و صانع کی معرفت میں کوئی عذر قبول نہیں کیونکہ اتنی مقدار عقل اس کو حاصل ہو چکی ہے جس سے وہ لائق خطاب ہو۔

لیکن احکام شرع کے واجب ہو جانے کے بعد عقل میں لوگوں کے درجات مختلف ہو جاتے ہیں، بعض کی عقل اسباب و اکتساب اور علم کی باریکیوں کی طرف راہنمائی کرتی ہے اور بعض کی راہنمائی نہیں کرتی۔ ظاہر بات ہے کہ یہ زیادہ عقل اور فہم و فراست کی وجہ سے ہوتا ہے اور بعض فقہاء نے فرمایا ہے کہ وہ عقل جو خطاب کے متوجہ ہونے کا سبب ہے اور غلط و صحیح کے درمیان تمیز کا ذریعہ ہوتی ہے اس میں قصور اور کمی و نقصان پایا جاتا ہے۔

انبیاء علیہم السلام میں درجہ کمال کی عقل ہوتی ہے

عقل کے درجہ کمال تک صرف انبیاء کرام صلوات اللہ وسلامہ علیہم اجمعین ہی پہنچ سکتے ہیں، وہ عقل کے زیادہ ہونے کے محتاج نہیں ہوتے، کمال عقل کی بناء پر ہی وہ صغائر و کبار گناہوں سے معصوم پیدا ہوئے۔

اب رہی یہ بات کہ عقل جس قدر زیادہ ہوتی ہے احکام کی پابندی اور تکلیف بھی انسان کے لیے اسی قدر بڑھ جاتی ہے تو اس سلسلہ میں گزارش یہ ہے کہ عقل جب کمال درجے کی ہو تو پھر احکام کی تکلیف بھی یقینی طور پر زیادہ ہو جائے گی، دیکھئے جیسا کہ انبیاء کرام بعض ایسی چیزوں کے مخاطب تھے جو امت پر لازم نہیں، جیسے حضرت ابراہیم علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کو بیٹے کے ذبح کرنے کا خطاب ہوا اور ہمارے نبی کریم ﷺ پر نماز تہجد فرض تھی جب کہ امت پر فرض نہیں اور اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں مثلاً انبیاء کرام کو جو امتحان اور آزمائشیں پیش آئیں وہ دوسروں کے لیے نہیں اور انبیاء کرام پر بہت سخت اور کڑی ابتلاء و آزمائش کی گھڑیاں گزری ہیں کہ دوسرے لوگوں کے حق میں ان کے تصور کرنے سے بھی رو نکلنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

علاوہ ازیں جب عقل کا فرق بھی ایک جیسا نہیں، کسی میں کم عقل ہوئی اور کسی میں اس سے بھی کم اور کوئی عقل کے بلند درجے پر فائز ہے اور کوئی اس کے منتہا، کمال کو پہنچا ہوا ہے تو

ثابت ہوا کہ عقل کا تفاوت خطاب اور تکلیف شرعی میں کوئی فرق پیدا نہیں کرتا کیونکہ جب عقل میں کمی اور قصور ثابت ہو گیا تو پھر خطاب شرعی کا مخاطب ہونے میں تو سب شریک ہیں عقل خواہ قلیل ہو یا کثیر ہو۔

تیسرا قول

عقل کے فائدہ اور اس کے زوال کا بیان

عقل کے بے شمار فوائد ہیں مگر سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ عقل سے انسان خطاب الہی کا اہل ہو جاتا ہے اور خطاب کے متوجہ ہونے سے پہلے عقل ہی سے انسان اس چیز کا اہل قرار پاتا ہے کہ اس کے ایمان اور اسلام کو صحیح قرار دیا جائے خصوصاً امام ابوحنیفہ کے نزدیک اس لیے کہ عقل مند بچہ بالغ ہونے سے پہلے ایمان لانے کا مخاطب نہیں ہے۔

تاہم اگر عقل مند نابالغ بچہ ایمان لے آئے تو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کا ایمان لانا صحیح ہے اور عدیم العقل شخص کی طرف نہ خطاب متوجہ ہوتا ہے اور نہ وہ احکام شرعیہ کا مکلف ہوتا ہے جیسے مجنون ہے (دیوانہ) کہ وہ خطاب کا اہل ہے اور نہ ہی حقوق اللہ کے ادا کرنے کی اہلیت رکھتا ہے اور اسی طرح دیگر احکام اس کے لیے ثابت نہیں ہوں گے جیسے طلاق، عتاق، نکاح وغیرہ اور دیوانے شخص کا ایمان بھی صحیح نہیں اس طرح غیر عاقل بچہ اگر ایمان لائے تو بالاتفاق اس کا ایمان درست نہیں ہے۔

انبیاء و ملائکہ سے عقل کا زوال اور قصور ناممکن ہے

اسی معنی کے لحاظ سے ہم نے کہا کہ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے حق میں عقل کا زوال اور اس میں قصور اور کوتاہی ممکن نہیں ہے بلوغت سے پہلے اور بعد میں بھی اسی طرح فرشتوں کے لیے حکم ہے کیونکہ نبی بالغ ہونے اور وحی کے نازل ہونے سے قبل بھی اسی طرح ہی نبی ہوتا ہے جس طرح کہ بالغ ہونے کے اور وحی کے نزول کے بعد نبی ہوتا ہے اس پر دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر فرمایا ہے کہ:

”كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا قَالَ إِنِّي عَبْدُ اللَّهِ اتَّانِي الْكِتَابُ وَجَعَلَنِي نَبِيًّا وَ

جَعَلَنِي مُبَارَكًا (مریم: ۲۹-۳۱) عیسیٰ پنگھوڑے میں تھے انہوں نے کہا: میں اللہ کا بندہ ہوں، اسی نے مجھے کتاب دی اور مجھے نبی اور برکت والا بنایا اور جو شخص انبیاء کرام کی عقل کے زائل ہونے کو جائز کہتا ہے وہ نبوت کے زائل ہونے کو بھی مانتا ہے جب نبی کی عقل (نعوذ باللہ من ذلک) زائل ہوگی تو اس کی عبادات و احکام صحیح نہیں ہوگا اور خطاب بھی اس کی طرف متوجہ نہیں ہوگا اور انزال وحی بھی صحیح نہ ہوگا۔ منصب شریعت اور احکام کا بیان کرنا صحیح نہیں ہوگا، یہ امور نبوت کے زوال پر دلالت کرتے ہیں حالانکہ نبوت کبھی زائل نہیں ہوتی اور جو شخص نبوت کے زائل ہونے کو جائز قرار دے وہ کافر ہے اور خشیت الہی کی وجہ سے بے ہوشی انبیاء کرام پر طاری ہو سکتی ہے اور یہ جائز ہے کہ نبی اللہ تعالیٰ جل شانہ کی عظمت اور جلال کی وجہ سے مغلوب ہو جائے جیسے موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی ہیبت اور جلال سے بے ہوش ہو گئے تھے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "وَخَرَّ مُوسَىٰ صَعِقًا" (الاعراف: ۱۴۳) اور موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہو کر گر پڑے۔

یہ ایسی کیفیت ہوتی ہے کہ جس کی وجہ سے احوال ان پر مخفی نہیں ہوتے اور نہ ہی یہ کیفیت ان سے اعمال کو فوت کرتی ہے اس لیے کہ اگر نبی پر کوئی شئی مخفی اور پوشیدہ ہو جائے تو گویا اس پر حق پوشیدہ ہو گیا جب کہ وہ اس کو بیان کرنا چاہتا ہے اور اس سے نبی کی حجت کا بطلان لازم آتا ہے اور یہ ممکن نہیں ہے۔

چوتھا قول

عقل معرفت کا ذریعہ ہے

یہ بات معلوم ہے کہ عقل تمام مقدمات و مصنوعات اور آیات (نشانیوں) مثلاً زمین و آسمان، درخت، پانی، ہوا، آندھی وغیرہ میں نظر و استدلال کے لیے ذریعہ ہے تو ثابت ہو گیا کہ عقل کو صانع کی معرفت حاصل ہوتی ہے اور پھر عقل کے ذریعے ان مصنوعات میں غور و فکر کر کے عارف کو علم حاصل ہوتا ہے۔

لہذا جس طرح معرفت کی نسبت عارف کی طرف کرنا درست ہے اسی طرح عقل کی

طرف بھی اس کی نسبت ہو سکتی ہے کیونکہ عقل حصول معرفت کا سبب اور آلہ ہے۔

ابوالحسن اشعری کا نقطہ نظر

امام ابوالحسن اشعری فرماتے ہیں کہ عقل حصول معرفت کا ذریعہ نہیں ہے کیونکہ معرفت نظر و فکر کے بغیر محض سماع (شرعی طریق سے) حاصل ہوتی ہے، لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے۔

عقل کے آلہ معرفت ہونے کی دلیل

ہم دیکھتے ہیں کہ مثلاً وہ اعضاء جسم جو جس کا محل بنتے ہیں جیسے آنکھ، کان، ہاتھ وغیرہ یہ محسوسات کے ادراک کا ذریعہ و آلہ ہوتے ہیں حالانکہ محسوس کا علم صرف حس سے بغیر عقل کے حاصل نہیں ہوتا اور واسطہ (آلہ) اس چیز سے عبارت ہے کہ جس کو طلب علم کے وقت بروئے کار لا کر علم حاصل کیا جائے اور جب یہ جائز ہے کہ ”حس“ آلہ بن سکتی ہے تو پھر عقل بدرجہ اولیٰ حصول معرفت کا آلہ و ذریعہ قرار پانے کی حق دار بنے۔

سوال: اور اگر یہ کہا جائے کہ عقل آلہ ہے تو پھر اس کا جوہر ہونا ضروری ہے۔

جواب: ہم کہتے ہیں کہ ہمیں یہ بات تسلیم ہے کہ عقل جوہر ہے اور عقل کا جوہر ہونا ہمارے لیے مضرت نہیں اس لیے کہ بعض فقہاء نے عقل کو جوہر کہا ہے۔

اور اگر ہم یہ کہیں کہ عقل عرض ہے یہ بھی ممکن ہے کہ یہ حصول معرفت کا ذریعہ و آلہ ہوگی دیکھئے جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ مفعول فعل سے حاصل ہوتا ہے اور وہ حرکت ہے جو ہاتھ سے ظاہر ہوتی ہے۔

اس کے بعد خوب سمجھ لیجئے کہ مفعول کبھی فعل (جو کہ حرکت ہے) کی طرف منسوب ہوتا ہے، کبھی اس کی نسبت ہاتھ یعنی آلہ کی طرف کر دی جاتی ہے اور کبھی فاعل کی طرف اس کی اضافت ہوتی ہے جو کہ قوت ہے تو ان میں سے ہر ایک مفعول کے حصول کا آلہ اور ذریعہ ہے بالکل اسی طرح ہماری بحث کو سمجھ لیجئے۔

عقل کا محل

عقل کا محل قلب ہے اور عقل کو استعمال کر کے فکر و نظر اور استدلال سے علم و معرفت حاصل ہوتی ہے اور علم و معرفت کبھی قلب کی طرف مضاف ہوتی ہے اور کبھی عقل کی طرف اس پر دلیل اللہ تعالیٰ کا ارشاد مبارک: (۱) ”لہم قلوب لا یفقہون بہا“ (۱۱ اعراف ۱۷۹)

ان کے ایسے دل ہیں جن سے وہ سمجھتے نہیں ہیں (۲) ”لَا يَعْقلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ“ (البقرہ: ۱۷۰) وہ سمجھتے ہیں کسی چیز کو اور نہ ہی وہ ہدایت پاتے اور اس قسم کی بہت سی مثالیں ہیں۔

اشکال: پس اگر یہ اشکال وارد کیا جائے کہ عقل تو تمام اشیاء کو ادراک اور احاطہ سے پہچانتی ہے اور اللہ تعالیٰ اس سے بلند و بالا ہے کہ کوئی چیز اس کا ادراک اور احاطہ و گھیراؤ کر سکے۔

جواب: تو اس سلسلہ میں اولاً یہ گزارش ہے کہ ہم تسلیم ہی نہیں کرتے کہ عقل جس شئی کا ادراک کرتی ہے تو اس کا احاطہ اور گھیراؤ کر لیتی ہے اس لیے کہ عقل عاقل سے زائل نہیں ہوتی کہ شئی کا احاطہ کرے بلکہ تمام اشیاء اپنی حقیقت اور مکمل صفات کے ساتھ عقل سے معلوم ہو جاتی ہیں اور یہ عین ممکن ہے کہ علم بغیر ادراک و احاطہ کے حاصل ہو جیسا کہ ہم یقیناً جانتے ہیں کہ مکہ مکرمہ، کعبہ بصرہ کی معرفت ہمیں حاصل ہے لیکن ان کا ادراک حسی اور احاطہ عقلی ہمیں نہیں ہے اس لیے کہ ادراک کہتے ہیں کہ کسی شئی کو اس طرح جاننا کہ اس کا محل وقوع، طول عرض اور بناء اور رنگ و روغن سب معلوم ہوں۔ پس جب یہ جائز ہے کہ یہ اشیاء بغیر ادراک کے علم و عقل سے معروف و معلوم ہو سکتی ہیں تو اسی طرح اللہ تعالیٰ جل شانہ کی معرفت علمی اور عقلی طور پر حاصل ہو جائے نہ کہ ادراک اور احاطہ کے طور پر۔

دوسرا جواب: دوسری بات یہ ہے کہ علم و معرفت عقل سے حاصل ہوتے ہیں اور معرفت مدرکہ ہے اور علم محاط ہے اگرچہ معلوم اور معروف غیر مدرکہ ہو نیز یہ کہ آلہ کی تعریف یہ ہے کہ جس سے کسی چیز کو حاصل کرنے میں مدد لی جائے اور عقل معرفت اور استدلال سے حاصل ہوتی ہے اس لیے عقل کو آلہ معرفت کہہ سکتے ہیں۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اتنی عقل دی ہے کہ جس سے ہم عبودیت کو پہچانیں، ربوبیت پہنچانے کے لیے نہیں دی۔

حضرت حسن بصری کے قول کے معنی یہ ہیں کہ ہم ربوبیت اور اس کی حکمت کو کما حقہ نہیں پہچان سکتے اور تخلیق کائنات، ایجاد و انشاء، موت و حیات اور احوال کے انجام اور مصالح

اعیان اور شرائع کا نصب۔ پس یہ تمام ایسے معانی نہیں جو اللہ تعالیٰ کے علم اور حکمت خاصہ کا مقتضی ہیں، عقل سے ان اشیاء کا مناسب طور پر ادراک نہیں ہو سکتا۔

لیکن نشاناتِ قدرت اور آیاتِ الہی میں غور و فکر کرنا اور صانع کے وجود اور اس کی معرفت پر جو چیزیں دلالت و رہنمائی کرتی ہیں ان میں نظر و فکر اور تا مل کرنا یہ صفات عبودیت ہیں جو کہ عقل سے حاصل ہوتی ہیں جیسا کہ ہم گذشتہ ابحاث میں بیان کر چکے ہیں۔

یا نچواں قول کیا عقل حجت ہے؟

صورتِ مسئلہ یہ ہے کہ ایک شخص پہاڑ کی چوٹی پر یا کسی ایسے جزیرے میں پیدا ہوتا ہے کہ وہاں کوئی عقل والا نظر نہیں آتا تو ایسی جگہ جب وہ سن بلوغ کو پہنچتا اور جوان ہو جاتا ہے لیکن اسے کسی دین کی جان پہچان نہیں اور نہ ہی معرفت خداوندی کے لیے اس میں قوت استدلال ہے اور اس سے ذاتی و نفسانی مصلحتوں کے سوا کوئی عقل مندوں ایسا فعل ظاہر نہیں ہوتا اور ساتھ یہ بھی ہے کہ وہ کوئی دیوانوں ایسے کام نہیں کرتا۔ ایسے اوصاف رکھنے والے شخص کے لیے کیا حکم ہے؟

معتزلہ نے کہا کہ وہ شخص کافر ہے، اس لیے کہ عقل سے اس پر ایمان لانا واجب تھا اور دراصل یہ مسئلہ ایک دوسرے مختلف فیہ مسئلہ کی فرع اور شاخسانہ ہے، وہ یہ ہے کہ آیا بغیر سماع (شریعت) کے محض عقل ہی موجب ایمان ہے یا نہیں؟ چنانچہ اس سلسلہ میں ہمارے علماء نے فرمایا کہ محض عقل موجب نہیں ہے اور اس کے برعکس معتزلہ نے کہا کہ عقل موجب ایمان ہے، اس کی تفصیل ہم ان شاء اللہ عنقریب ذکر کریں گے۔

ہمارے علماء فرماتے ہیں کہ جو شخص پہاڑ کی چوٹی پر پیدا ہوا اور اسے حق و باطل کے درمیان فرق کرنے والی عقل حاصل نہیں ہے تو اس کو مسلمان یا کافر ظاہر کرنے کے لیے دیکھا جائے گا کہ اگر تو وہ دارالاسلام کی حدود میں ہے تو جب تک اس سے کوئی علامت کفر ظاہر نہ ہو، اس کو مسلمان قرار دیا جائے گا اور اگر وہ کفرستان کی حدود میں ہے تو جب تک اس کے اسلام

پر کوئی دلیل ظاہر نہیں ہوتی اسے کافر قرار دیا جائے گا۔

لیکن تیسری صورت یہ ہے کہ وہ ایسی خالی جگہ رہتا ہے جہاں نہ دارالاسلام کی حد لگتی ہو اور نہ دارالکفر کی تو اس کے کفر و اسلام میں توقف کریں گے اس لیے کہ اس سے انکار و شرک نہیں پایا گیا، لہذا بغیر دلیل اسے کافر نہیں کہیں گے اور اس سے توحید و اقرار نہیں پایا گیا تو بغیر دلیل کے اس کے اسلام کا حکم نہیں کیا جائے گا۔

امام محمد بن حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ بغیر گناہ کے کسی کو عذاب نہیں دیتا۔

اعتراض: اگر کہا جائے کہ امام ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: اگر یہ شخص اسی حالت میں قتل کر دیا گیا تو اس کے قاتل پر نہ قصاص واجب ہے اور نہ دیت اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کافر ہے کیونکہ اگر وہ کافر قرار نہ دیا گیا ہوتا تو قاتل پر قصاص واجب ہوتا یا دیت واجب ہوتی۔

جواب: ہم نے کہا: یہ (یعنی قاتل پر قصاص یا دیت کا واجب نہ ہونا) اس کے کفر پر دلالت نہیں کرتا، اس لیے کہ قصاص یا دیت درج ذیل تین وجہوں میں سے کسی ایک کے پائے جانے سے واجب ہوتی ہے اور وہ تین وجوہ یہ ہیں:

(۱) ایسے شخص کو قتل کرنا جو دارالاسلام میں اجازت لے کر آیا ہو۔

(۲) ذمی و معاہد کو قتل کرنا۔

(۳) کسی مسلمان کو قتل کرنا جو مسلمان ہونے کے سبب مستحق تحفظ تھا۔

اور اس میں تینوں وجہوں میں سے ایک بھی نہیں پائی گئی (اس لیے قاتل پر قصاص یا دیت واجب نہیں، نہ کہ اس وجہ سے کہ وہ کافر تھا)۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ شخص جنتی ہے یا دوزخی؟

چنانچہ اس سلسلہ میں ہمارا موقف یہ ہے کہ ہم اسے دوزخی نہیں کہتے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ جل مجدہ کی شانِ عدل یہ نہیں ہے کہ وہ سبحانہ و تعالیٰ کسی کو بغیر جرم اور کفر کے عذاب دے۔

اور چونکہ اس میں ایمان نہیں پایا گیا اس لیے وہ جنت کا مستحق بھی نہیں ٹھہرتا۔

لیکن کیا بعید ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل بیکراں سے اس شخص کو جنت عطا فرمادے؟ اور یہ کہنا جائز نہیں کہ اللہ تعالیٰ بغیر جرم کے اس کو عذاب دے کیونکہ ایسا اللہ تعالیٰ کی شانِ عدل کے لائق و سزاوار نہیں ہے اور یہ اس حالت میں ہے کہ جب اشارہ و عبارت اور فاعل و مفعول کو نہ جانے، لیکن اگر وہ ان چیزوں کے درمیان فرق محسوس کرتا ہے تو پھر اس کی عقل کا نتیجہ ظاہر ہو گیا اور اسے معذور نہیں سمجھا جائے گا بلکہ وہ قابلِ پرسش اور جواب دہ ہے اس لیے کہ اس نے ذی عقل ہوتے ہوئے جدوجہد اور غور و فکر نہیں کی، حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا" (العنکبوت: ۶۹) کہ جن لوگوں نے ہماری راہ میں آنے کی کوشش کی ہم ضرور انہیں اپنے راستوں کی طرف راہنمائی کریں گے۔

تو اس کے کفر کا حکم نہیں کیا جائے گا لیکن اسے معذور بھی قرار نہیں دیا جائے گا کیونکہ اس نے فکر و تامل کو ترک کیا ہے۔ اسے اللہ تعالیٰ کی مشیت پر چھوڑ دیا جائے گا اور اگر اس نے استدلال کیا اور اپنی عقل سے اس نے دلیل قائم کی اور سمجھنے میں خطا کی اور اس کا اعتقاد کر لیا تو اس کے کفر کا حکم صادر کیا جائے گا اگر اس کا اعتقاد کفر ہے تو اور اگر بدعت کا اعتقاد کیا تو مبتدع ہوگا کیونکہ جب اس نے استدلال کیا اور ایک دین پر اپنا اعتقاد پختہ کر لیا تو معلوم ہوا کہ اس نے صانع کے لیے خوبی و بدی کو واجب کر دیا اور جب خطا کی تو معذور نہ ہوگا کہ یہ اس کی اپنی کوتاہی ہے اس لیے کہ اگر وہ کوتاہی نہ کرتا تو ہو سکتا تھا دین اسلام کی ہدایت ہو جاتی اور وہ صراطِ مستقیم کو پالیتا۔

امام ابوالحسن اشعری رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ وہ بہر حال معذور ہوگا کیونکہ اس کو دلیل سمعی (شریعت) نہیں پہنچی اس کا مفصل ذکر اپنے مقام پر آئے گا۔

چھٹا قول

عقل سے احکام ثابت ہونے کی بحث

اس بات پر امت کا اجماع ہے کہ احکام اللہ تعالیٰ کی طرف سے واجب ہوتے ہیں لیکن اس بارے میں اختلاف ہے کہ وجوب کی دلیل کیا چیز ہے؟

معززہ کا مذہب

چنانچہ بعض حضرات نے کہا کہ عقل ایمان اور احکامات کے واجب ہونے کی دلیل ہے لہذا جو احکام شرعیہ عقل کے مطابق ہیں وہ تو مشروع اور ثابت ہیں اور جو حکم و شرع عقل کے خلاف ہے وہ صحیح نہیں۔

چنانچہ معززہ یہی بات کہتے ہیں کہ جو حکم عقل کے موافق ہو اس کی اتباع کی جائے۔

امام ابوالحسن اشعری کا قول

امام ابوالحسن اشعری فرماتے ہیں کہ وجوب کی دلیل سماع ہے جس نے ایمان و احکام کے امر کو سنا اس پر ایمان اور تعمیل احکام واجب ہے اور جس کو سننے کا موقع ہی نہیں ملا وہ خواہ بت پرستی کرتے ہوئے مر جائے معذور ہے اسے کافر نہیں کہا جائے گا۔

اہل سنت و جماعت کا موقف

اہل سنت کا موقف یہ ہے کہ ہر حکم اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے واجب ہوتا ہے اور احکام کے وجوب کی دلیل سماع یا وہ چیز جو سماع کے قائم مقام ہو جیسے کتابت، اشارہ اور کوئی بھی چیز جو واجبات کے علم کا ذریعہ ہو اس لیے کہ اہل فترت میں سے جو شخص اللہ تعالیٰ پر ایمان لایا لیکن شریعت کے احکامات پر عدم علم کی وجہ سے عمل نہ کر سکا وہ معذور ہے۔

ایسے ہی وہ شخص جو دارالحدیث میں ہو اور اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتا ہے تو اس کا ایمان صحیح ہے مگر عدم علم کی بناء پر احکام شرع یعنی نماز، روزہ وغیرہ بجا نہیں لاتا تو وہ معذور ہے (مگر نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ احکام علم نہ ہونے کی وجہ سے اگر وہ نہیں بجالایا تو وہ اس میں معذور ہے) کیونکہ اس تک دلیل شرعی نہیں پہنچی اور محض عقل سے احکام و شرائع اور ان کی کیفیت معلوم نہیں ہو سکتی۔

لہذا محض عقل کو دلیل بناتے ہوئے اس پر احکام واجب نہیں کیے جائیں گے مثلاً جب وہ دارالاسلام آیا یا کسی مسلمان نے اسے احکام کے بارے میں بتایا تو جو نماز، روزہ وہ نہیں کر سکا اس کی قضاء واجب نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کی معرفت اور وحدانیت کو عقل سے حاصل ہو سکتی ہے لیکن ایمان محض عقل سے واجب نہیں ہوتا اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے واجب کیے بغیر صرف عقل موجب ایمان نہیں

ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے وجوب کی دلیل موجود نہیں اور وہ شخص ایسے حال میں اگر کسی دین پر اعتقاد و ایمان رکھنے میں خطا کر لیتا ہے تو معذور نہیں ٹھہرے گا بلکہ کافر ہوگا۔

اس مسئلہ کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ اگر اللہ تعالیٰ دنیا میں کسی رسول کو مبعوث نہ فرماتا اور تمام انسان کسی دین پر اعتقاد نہ لاتے اور غور و فکر اور استدلال کی قدرت عطا نہ کی جاتی اور اس چیز کی معرفت حاصل نہ کرتے کہ ہم مخلوق ہیں اور نہ اپنے بنانے والے کو پہچانتے بلکہ جانوروں کی طرح بے کار و بے مقصد زندگی بسر کرتے تو ایسے انسان کے لیے کیا حکم ہے؟

اسی مسئلہ کی دوسری صورت یہ ہے کہ ایک شخص جو پہاڑوں میں پیدا ہوا اور اس کی عقل پر پردہ غفلت پڑا رہا تو ایسے شخص کے لیے کیا حکم ہے؟ معزز لہ نے کہا: یہ سب کافر ہیں اس لیے کہ جب وہ صاحب عقل تھے تو ان کے لیے ضروری تھا کہ عقل سے اپنے صانع پر ایمان لاتے اور جب انہوں نے عقل سے کام نہیں لیا تو انہوں نے اپنے اوپر جو چیز لازم تھی اسے ترک کر دیا، لہذا ان کے کفر کا حکم صادر کیا جائے گا، اگرچہ وہ کسی چیز کا اعتقاد نہ رکھتے ہوں۔

ابوالحسن اشعری رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: وہ سب معذور ہیں اگرچہ بت پرستی کرتے ہوں کیونکہ انہیں ایمان لانے اور کفر سے بچنے کا حکم ہی نہیں ملا، لہذا ایسی صورت حال میں وہ معذور ٹھہریں گے۔

اہل سنت ماترید یہ کا موقف

ماترید یہ اس بات کے قائل ہیں کہ ایسے حالات میں اگر وہ ایمان نہیں لائے تو کافر نہیں کہلائیں گے اس لیے کہ ان پر ایمان واجب ہی کب ہوا ہے۔

قرآن کریم میں ہے: ”وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّى نَبْعَثَ رَسُولًا“ (الاسراء: ۱۵) اور ہم عذاب نہیں دیتے حتیٰ کہ رسول بھیج دیں لیکن اگر کفر کریں تو معذور قرار نہیں دیئے جائیں گے اس لیے کہ جو کفر کو جانتا ہے وہ ایمان کو کیسے نہیں جانتا؟ حالانکہ ایمان کی معرفت تو اولیٰ و مقدم ہے۔

بعض حضرات نے کہا کہ اس آیت ”وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّى نَبْعَثَ رَسُولًا“ (الاسراء: ۱۵) کا معنی یہ ہے کہ ”ہم کافروں کو عذاب نہیں دیتے یہاں تک کہ رسول بھیجیں“ اور رسول سے مراد عقل ہے تو ثابت ہوا کہ اگر وہ عقل رکھتے ہوئے کفر کریں تو معذور نہیں قرار

پائیں گے۔

پھر اگر وہ غور و فکر اور تاامل و تدبیر سے استدلال کر کے جان لے کہ وہ مصنوع و مخلوق ہے اور اس کا کوئی صانع اور خالق ہے اور اپنے پیدا کرنے والے پر یقین لائے لیکن زبان سے اقرار نہیں کیا اور نہ ہی وہ اقرار کو جانتے تھے صرف اتنا جانتے تھے کہ ہمارا کوئی صانع ہے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ کے راستہ کے سوا کوئی راستہ نہیں اور اللہ کے دین کے علاوہ کوئی دین نہیں ہے تو عند اللہ (اللہ کے نزدیک) مؤمن ہیں اس لیے کہ اقرار کا تعلق احکام سے ہے اور احکام بغیر سماع (شرع) محض عقل سے معلوم نہیں ہو سکتے اور جب سماع و علم موجود نہیں تو اسے اقرار اور اس کے طریقہ و کیفیت کا علم کیسے ہوگا؟ تو وہ کیسے جانے گا کہ اقرار کس طرح کرتے ہیں اور اس کا طریق و کیفیت کیا ہے؟ لہذا وہ مؤمن ہے جب کہ اپنے صانع کی تصدیق کرتا ہو۔

امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد مبارک کی وضاحت

اور جو امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ عاقل اگر خدا کو نہیں پہچانتا تو وہ معذور نہیں ٹھہرے گا، آپ کے اس فرمان کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ایمان عقل سے واجب ہے بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ عقل والے غور و فکر کریں اور عقل سے استدلال کر کے اپنے اللہ کو پہچاننا ان پر واجب اور ضروری ہے اور جب عقل سے استدلال کر کے اللہ کو پہچانے گا تو عند اللہ وہ مؤمن قرار پائے گا جب کہ اللہ کے دین کے سوا کسی اور دین کا اعتقاد نہ رکھتا ہو اور اگر اس کے باوجود اس نے تاامل و استدلال کو ترک کر دیا اور اللہ تعالیٰ کو نہیں پہچانا تو اس نے خدا کو پہچاننے میں کوتاہی کی ہے تو اس وقت تک اس کے کفر کا حکم صادر نہیں کریں گے جب تک وہ کسی اور دین پر اعتقاد نہ رکھتا ہو۔

غور و فکر چھوڑنے کی وجہ سے معذور بھی نہیں ہوگا۔ لیکن اس کی اس تقصیر و کوتاہی کا معاملہ

مشیت ایزدی کے سپرد ہے جیسے چاہے اس کے ساتھ معاملہ فرمائے۔

عقل تنہا موجب ایمان نہیں

دلیل: عقل بغیر سماع کے ایمان کو واجب نہیں کرتی، اس لیے کہ عقل وجود باری تعالیٰ کو ثابت کرتی ہے اور احکام کی پابندی و تکلیف اللہ تعالیٰ کی طرف سے عقل کے سبب سے ثابت ہوتی

ہے۔

پھر یہ بھی ہے کہ عقل تو اپنے نفس اور اس کی کیفیت کو نہیں جان سکتی یہ کسی اور شئی کو کس طرح واجب کر سکتی ہے؟ لہذا محض عقل موجب ایمان نہیں۔

عقل اپنی پہچان سے قاصر ہے

اس لیے کہ احکام میں فرق اور تفاوت تو اس وجہ سے آتا ہے کہ خطاب میں فرق و تفاوت ہے، عقل کی وجہ سے یہ فرق رونما نہیں ہوتا۔

دلیل: دلیل کے طور پر چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

مثال نمبر ۱: یہ کہ احکام میں تفاوت خطاب میں تفاوت کی وجہ سے ہوتا ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ نماز کے واجب ہونے کا سبب وقت ہے اور نماز مقیم آدمی پر تمام دنوں میں چار رکعت اور مسافر پر دو رکعت فرض ہے۔ ظاہری بات ہے کہ وقت اور عقل میں فرق و تفاوت نہیں ہے اس لیے کہ عقل ایک ہی ہے اور عقل جیسی تھی وہی ہے۔ معلوم ہوا کہ دن اور سبب جب ایک ہے تو یہ تفاوت احکام فقط خطاب میں فرق ہونے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے نہ کہ عقل سے۔

مثال نمبر ۲: ایسے غور کریں کہ ظہر کی نماز تمام دنوں میں خواہ گرمی ہو یا سردی چار رکعتیں فرض ہیں جب کہ جمعہ کے روز دو رکعت ہیں تو یہ تفاوت بھی خطاب کی وجہ سے ظاہر ہوتا ہے، عقل سے یہ دو اور چار کا فرق پیدا نہیں ہوتا اس کی دلیل یہ ہے کہ وجوب کا تعلق خطاب سے ہے عقل سے نہیں ہے۔ لہذا ابتداءً عقل سے شریعت کا قیام ممکن نہیں ہے علاوہ ازیں عقل اس چیز کی راہ نمائی نہیں کر پاتی کہ شریعت کے ارکان و شرائط اسباب و علامات اور ان کی کیفیات اور اس کے دلائل کیا ہیں؟ ایسے ہی عقل قطعاً موجب ایمان نہیں۔

عقل کے موجب ایمان نہ بننے کی دلیل

اس لیے کہ ایمان کے بھی ارکان و شرائط ہیں اور عقل ان معانی کا ادراک کرنے سے قاصر ہے، بلکہ عقل خود اپنی ذات سے بے خبر اور اسے جاننے سے عاجز ہے تو عقل ایمان کی صورت اور اس کے اوصاف کو کس طرح جان سکتی ہے؟ لہذا جب ایمان کے اوصاف اور شرائط و ارکان کو جاننے سے عقل قاصر و بے بس ہے تو وجوب ایمان پر دلیل بھی نہیں بن سکتی۔

دلیل کی تعریف

دلیل اس امر کو کہتے ہیں جو ذات مع الوصف پر دلالت کرے اور جب عقل بغیر سماع کے اوصاف ایمان بیان کرنے سے قاصر ہے تو دلیل کیسے بن سکتی ہے؟ لہذا ہمارا دعویٰ صحیح ثابت ہوا۔

اشکال: اگر کوئی یہ اعتراض وارد کرے کہ عقل اس حیثیت سے کہ اس سے احکام کا تعلق ہوتا ہے حجت الہی قرار پاتی ہے (لہذا آپ اس کے دلیل و حجت ہونے کا انکار نہیں کر سکتے) مثلاً دیکھیں کہ عقل بہت سے مقامات پر دلیل و حجت کا کردار ادا کرتی ہے۔ عقل قیاس، استحسان، استصحاب، حال اور نصوص و احادیث میں تاویلات کی علت بنتی ہے۔ اسی طرح اصل سے فرع کی طرف قیاس عقل کی بنا پر حکم ثابت کرتے ہیں۔

جواب: قیاس حجت عقلیہ نہیں ہے بلکہ حجت شرعیہ ہے اس لیے کہ قیاس کے حجت ہونے کا اعتبار شرع کرتی ہے اور شرع ہی نے قیاس کو اثبات حکم کے لیے حجت قرار دیا ہے۔ دلیل: اس پر دلیل یہ ہے کہ نص میں جو حجت معتبر ہے وہ محض عقل سے جائز نہیں ہے کیونکہ منصوص پر قیاس کے بغیر صرف عقل سے کسی حکم کو ثابت کرنا جائز نہیں ہوتا۔ ہاں! بلاشک و شبہ عقل اللہ تعالیٰ کی حجتوں میں سے ایک حجت ہے اس معنی کے لحاظ سے کہ عقل آلہ و ذریعہ ہے حصول معرفت کے لیے اور اس حیثیت سے کہ استدلال کے لیے واسطہ اور خطاب کے متوجہ ہونے کے لیے سبب بنتی ہے۔

لیکن عقل وجوب کی دلیل اور حجت نہیں ہے یہ (عقل) اسی طرح ہے جیسے وقت نماز کے لیے ہوتا ہے کہ وقت نماز کے لیے حجت ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بایں معنی کہ وقت کے آنے سے نماز واجب ہو جاتی ہے حالانکہ اصل میں دلیل وجوب خطاب الہی سے وقت نہیں ہے اسی طرح ماہ رمضان کا آنا روزے کے واجب ہونے اور نصاب باب زکوٰۃ میں حجت ہے حتیٰ کہ مہینہ اور نصاب وجوب کا سبب بن گئے لیکن دلیل وجوب درحقیقت وہ خطاب ہے نہ کہ سبب ایسے ہی ہمارے قول کو قیاس کرنا چاہیے۔

اور جس چیز کا علم سماع پر موقوف ہے تو سماع اس چیز کے لیے علت ہے اور سماع کا حجت ہونا عقل و فکر سے مستغنی و بے نیاز نہیں ہو سکتا اس لیے کہ بغیر نبی کے سماع صحیح نہیں ہے اور نبی

ومتنبی (جھوٹا نبی) میں بغیر معجزہ کے فرق و امتیاز نہیں ہو سکتا اور معجزہ و خرق عادت میں جو فرق کیا جاتا ہے وہ بھی عقل ہی سے ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ عقل مثبت علم اور حصول معرفت کا ذریعہ و آلہ ہے اور بعض فقہاء نے فرمایا کہ اس مسئلہ کی وضاحت میں واضح سے خطا ہوئی ہے۔ یہ خطا اس لیے ہے کہ سب سے پہلے انسان حضرت آدم علیہ السلام ہیں اور حضور نبی کریم ﷺ نے آدم علیہ السلام سے دعوت و تبلیغ فرمادی۔ اگر اس کے بعد سماع نہ بھی ہو تو یہی سماع کافی ہے اس لیے کہ تمام انسان آدم علیہ السلام کو بطور خبر متواتر اپنے آباء و اجداد سے سنتے آئے ہیں تو جب آدم علیہ السلام کا باپ ہونا تو اتر کے ساتھ سب تک پہنچ گیا تو اس طرح ان کا نبی ہونا بھی بطور خبر متواتر پہنچ گیا تو اہل فترت سب کفار ہیں جس نے بھی کفر کا عقیدہ اختیار کیا اور حضرت آدم اور ان کی رسالت اور فترت سے پہلے کے رسولوں کا انکار کیا وہ بھی کافر ہیں اور ایسے ہی وہ کفار جن کو ہمارے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خبر نہیں پہنچی، معذور قرار نہیں دیئے جائیں گے بلکہ ان کو کافر ہی کہا جائے گا اس لیے کہ ان کو دوسرے انبیاء کرام کی دعوت کی خبر پہنچ گئی یا فقط آدم علیہ السلام کی دعوت کی خبر پہنچ گئی۔

ساتواں قول

بچوں کا بیان

اس میں شک نہیں کہ مؤمنوں کے بچے دنیا و آخرت میں مؤمن ہیں اور وہ جنتی ہیں لیکن سوال کفار اور مشرکین کے بچوں کے بارے میں ہے کہ دنیا اور آخرت میں ان کا کیا حکم ہے؟

تو دنیا میں کفار و مشرکین کے بچے اپنے والدین کی تبعیت میں کافر ہیں اگر کوئی گرا پڑا بچہ مل جائے تو اگر وہ دار الحرب یا کافروں کے علاقے میں پڑا ہوا تھا تو کافر ہے، خصوصاً جب کہ اٹھانے والا بھی کافر ہو، اگر اٹھانے والا مؤمن ہے تو اس صورت میں اختلاف ہے۔ ”کتاب الملقیٰ“ میں ہے کہ وہ چونکہ کافروں کے علاقہ سے ملا ہے لہذا کافر ہے اور ”کتاب الدعویٰ“ میں ہے کہ بچے کے اسلام کا اعتبار کیا جائے گا جب کہ مسلمان پانے والا ہو خواہ وہ بچہ

دارالاسلام سے ملے اور خواہ کفرستان سے بہر حال بچے مسلمان سمجھا جائے گا۔
ابن سماعہ امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ سے روایت کرتے ہیں کہ پانے والے کا اعتبار کریں
گے کہیں سے بھی پائے (یعنی اگر پانے والا کافر ہے خواہ دارالاسلام سے پائے یا کفرستان
سے تو بچہ کافر ہوگا اور اگر پانے والا مسلمان ہے تو بچہ خواہ مسلمانوں کے علاقہ سے ملے یا
کافروں کے علاقہ سے اس کو مسلمان اعتبار کریں گے)۔

سوال: آخرت میں کافروں کے بچے کہاں ہوں گے؟
جواب: معتزلہ اور خوارج کہتے ہیں کہ وہ دوزخی ہیں۔

اور اہل سنت و جماعت نے فرمایا کہ انہیں عذاب نہیں ہوگا۔ بعض نے کہا کہ وہ
”اعراف“ میں ہوں گے۔ بعض نے کہا: اصحاب یمین کے ساتھ ہوں گے۔ بعض
نے کہا: وہ اہل جنت کے خدمت گار ہوں گے اور سیدنا امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ سے
سوال ہوا تو آپ نے فرمایا: میں اس بارے میں اپنی رائے کا اظہار نہیں کرنا چاہتا۔
یہی سوال جب محمد بن حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہوا تو انہوں نے فرمایا کہ میں سمجھتا
ہوں کہ اللہ تعالیٰ عزوجل بغیر گناہ کسی کو عذاب نہیں دے گا۔

اور نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ میں نے ”لاہین“ کے متعلق
اللہ تعالیٰ سے دریافت کیا، صحابہ کرام نے عرض کیا: ”لاہین“ سے کیا مراد ہے؟ رسول اللہ
ﷺ نے ارشاد فرمایا: مشرکین کے بچے۔

دوسری روایت میں ہے کہ میں نے مؤمنوں کے بچوں کے لیے سفارش کی تو میری وجہ
سے ان کو بخش دیا گیا اور جب میں نے مشرکین کے بچوں کی سفارش کی تو ان کو اہل جنت کا
خادم بنا دیا گیا۔

عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ مؤمنین کے
بچے بادشاہ اور مخدوم ہوں گے اور مشرکوں کے بچے اہل جنت کے خدمت گار ہوں گے اور صحیح
ترین بات یہ ہے کہ مشرکین کی اولاد حقیقت میں غیر کافر پیدا ہوئی، لیکن دنیوی احکام کے
ثبوت اور نفاذ قوانین کے لیے ان کو اپنے والدین کے تابع قرار دیا گیا تاکہ ان کے لیے دنیا
میں ولایت، شادی بیاہ، وراثت وغیرہ احکام ثابت کیے جائیں لیکن حقیقت میں وہ کافر نہیں

ہیں اور اگر اللہ تعالیٰ بغیر گناہ اور معصیت کے کسی کو عذاب دے تو یہ اس کی شانِ عدل کے لائق نہیں ہے۔

سوال: اگر یہ اشکال پیدا ہو کہ ام المؤمنین حضرت خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے نبی کریم ﷺ سے دریافت کیا کہ حضور! آپ سے جو میرے بچے پیدا ہوئے ہیں (اور بچپن میں فوت ہو گئے) وہ کہاں ہیں؟ فرمایا: جنت میں۔

عرض کیا: حضور! میرے وہ بچے جو آپ سے نہیں پہلے شوہر سے ہیں؟ فرمایا: وہ جہنم میں اور اگر تو چاہے تو میں آپ کو ان کی چیخ و پکار سنواؤں؟

جواب: اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ حضرت خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا نے اپنے پہلے شوہر سے پیدا ہونے والی بالغ اولاد کے متعلق سوال کیا تھا کیونکہ اس پر قرینہ یہ ہے کہ بالغ پر بھی ”طفل“ (بچہ) کا لفظ بولا جاتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ”ثم نخر حکم طفلاً“ (الحج: ۵) پھر ہم نے تمہیں بچے کی صورت میں پیدا کیا چنانچہ یہاں اللہ تعالیٰ نے بالغوں پر ”طفل“ کا اطلاق فرمایا ہے اور بعض حضرات نے کہا کہ جب بچہ غیر عاقل ہو تو اس کے بارے میں توقف ضروری ہے جیسا کہ سیدنا امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ارشاد گرامی ہے۔

لیکن جب وہ عاقل ہو تو اس پر کفر کا حکم درست ہے جیسے کہ اس کا اسلام صحیح ہے خصوصاً امام ابوحنیفہ اور امام محمد رحمہما اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس لیے کہ عقل مند بچہ جب اسلام لایا پھر (نعوذ باللہ) مرتد ہو گیا تو ان دونوں ائمہ کے نزدیک اس کا ارتداد معتبر ہوگا تو ایسا ہی یہاں حکم ہے۔

اور زیادہ قرین قیاس اور درست بات یہ ہے کہ آخرت کے معاملے میں بلوغ سے پہلے کفر کا حکم نہیں کیا جائے گا اس لیے کہ بے عقل بچہ نہ مخاطب ہے اور نہ معاقب (لائق سزا)۔

مذکورہ بالا تمام بحث اور احکام انسان کے بچوں کے متعلق تھے اور ایسے ہی جنات کے بچوں کا حکم ہے۔

اور شیاطین کے بچوں کے متعلق متقدمین سے کوئی روایت نہیں ملتی اور معتزلہ کے

نزدیک کوئی اشکال نہیں کہ ان کے نزدیک اہل نار سے ہیں لیکن جو بچوں کے لیے عذاب کے قائل ہیں وہ کہتے ہیں کہ شیاطین جب بچے جنتے ہیں تو وہ عاقل بالغ ہوتے ہیں اور پیدا ہوتے ہی کفر اختیار کر لیتے ہیں اور بعض نے کہا کہ یہ بات صحیح طور پر ثابت نہیں ہو سکی کہ شیاطین کی اولاد ہوتی بھی ہے یا نہیں؟ لہذا جواب کی حاجت نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم

آٹھواں قول عقل افضل ہے یا علم؟

اس میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے کہ عقل افضل ہے یا علم؟ بعض نے کہا کہ عقل افضل ہے، حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم فرماتے ہیں کہ عقل افضل ہے اس لیے کہ علم عقل کا محتاج اور عقل علم کی محتاج نہیں۔

صحیح بات یہ ہے کہ علم کئی قسم کا ہوتا ہے مثلاً اللہ تعالیٰ اور کی صفات کا علم، دین اور شراعیع کا علم، یہ علوم عقل سے افضل ہیں اس لیے کہ بغیر عقل کے بندہ کی نجات ہو جاتی ہے جب کہ بغیر علم دین کے بندہ کی نجات نہیں ہوتی۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہر عاقل مخاطب و مامور ہے کہ دین کا علم سیکھے اس کی طلب کرنے، ان علوم کے علاوہ دیگر علوم مثلاً صنعت و حرفت کا علم، اصلاح اشیاء کا علم، نجوم، علم طب، ان علوم سے عقل افضل ہے، اس لیے تمام علوم اصلاح نفس اور اصلاح معیشت کے لیے ہیں، مصلحت عقل میں زیادہ ہے۔

لیکن اللہ تعالیٰ کا علم تمام مخلوق کے علم سے افضل ہے اور اس کا علم غیر مخلوق ہے اور جس شخص نے کہا ہے کہ علم افضل ہے اس سے مراد علم الہی ہے اور علم دین اور علم شریعت و احکام ہے اور جس نے کہا: عقل افضل ہے جیسے مولیٰ علی کرم اللہ وجہہ الکریم نے فرمایا تو اس سے مراد علم کتاب و اصلاح ہے۔ واللہ اعلم

عقل والوں کی فضیلت کا بیان

اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے کہ جن شیاطین سے افضل ہیں اور انسان جن سے

افضل ہے اور اطاعت گزار جن نافرمان انسانوں سے بہتر ہیں۔

انسان کو جن پر اس لیے فضیلت حاصل ہے کہ تمام انبیاء اور رسل علیہم السلام انسانوں میں سے ہوئے ہیں جنوں میں سے کوئی نبی یا رسول نہیں ہوا۔

اولیاء کرام عام مؤمنوں سے افضل ہیں اور انبیاء کرام اولیاء سے افضل ہیں اور رسل کرام انبیاء کرام سے افضل ہیں اور رسولان اولو العزم دیگر رسولوں سے افضل ہیں۔ فرشتوں کے بارے میں معتزلہ کہتے ہیں کہ وہ رسولوں اور نبیوں سے افضل ہیں۔

امام ابوالحسن اشعری فرماتے ہیں کہ انسانوں کے خواص فرشتوں کے خواص و عوام سے افضل ہیں اور عامہ المؤمنین انسان عام فرشتوں سے افضل ہیں۔

امام محمد بن حسن سے مروی ہے کہ انہوں نے ”کتاب الصلوٰۃ“ میں یہ مسئلہ ذکر کیا ہے کہ نمازی جب سلام پھیرنے کا ارادہ کرے تو ملائکہ اور مؤمنین کی نیت کرے اور ان کا دوسرا قول یہ ہے کہ سلام کے وقت مؤمنوں اور فرشتوں کی نیت کرے۔ اہل تاویل نے اس کا مطلب یوں بیان کیا ہے کہ جب امام رحمۃ اللہ تعالیٰ نے دیکھا کہ ملائکہ کو مؤمنین پر فضیلت حاصل ہے تو ذکر میں ملائکہ کو مقدم کر دیا اور جب دیکھا کہ مؤمنین کو فرشتوں پر فضیلت حاصل ہے تو مؤمنین کا ذکر پہلے کر دیا۔

اس مسئلہ کا حاصل یہ ہے کہ مطلقاً یہ جواب صحیح نہیں اس لیے کہ ملائکہ میں وہ بھی ہیں جو رسول ہیں جیسے جبرئیل، میکائیل، اسرافیل اور عزرائیل علیہم السلام اس پر دلیل اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

اللَّهُ يَضْطَفِي مِنَ الْمَلَائِكَةِ
رُسُلًا وَمِنَ النَّاسِ. (الحج: ۷۵) ہے۔

اور یہ محال ہے کہ غیر رسول رسول سے افضل ہو جائے اور انسانوں میں بھی اسی طرح کہ غیر رسل رسل سے افضل نہیں ہو سکتے۔

اور صحیح جواب یہ ہے کہ خواص مؤمنین یعنی انبیاء و مرسلین خواص ملائکہ سے افضل ہیں اور عوام ملائکہ عوام مؤمنین سے افضل ہیں اور جس نے یہ کہا کہ عوام مؤمنین عوام ملائکہ سے افضل ہیں صحیح نہیں اس لیے کہ مؤمن کو ایمان کی وجہ سے فضیلت حاصل ہوتی ہے اور ملائکہ کو بھی

ایمان حاصل ہوتا ہے، تمام اوصاف کے ساتھ۔ پھر مزید برآں یہ کہ ملائکہ کی طاعت مؤمنین سے اکثر زیادہ ہے جب کہ مؤمن سے فسق و فجور متصور ہو سکتا ہے بلکہ کفر کا بھی خوف لاحق رہتا ہے اور مؤمن سے عذاب و حساب اور دخول نار اور سوال قبر ہوتا ہے اور فرشتہ ان تمام معصیتوں سے معصوم اور محفوظ ہوتا ہے، تو یہ مجال ہے کہ مؤمن ان خطرات و خدشات اور بُرے کاموں کے باوجود ملائکہ سے افضل ہو جائے۔

سوال: اگر کہا جائے کہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کے بعض ایسے مقرب بندے ہیں کہ وہ فرشتوں سے بھی افضل ہیں ان میں سے ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں؟

جواب: تو اس سلسلہ میں عرض یہ ہے کہ یہ حدیث بطریق آحاد وارد ہوئی ہے اور فقہاء کرام نے اس کے حجت ہونے پر اتفاق نہیں کیا، لہذا اس حدیث مذکور کو دلیل کے طور پر پیش نہیں کیا جاسکتا۔

دوسری بات یہ بھی ممکن ہے حدیث میں جو مؤمن انسان کی فرشتے سے فضیلت ذکر ہوئی، یہ فضیلت و برتری ایک خاص وقت کے لحاظ سے ہو یا کسی مخصوص شخص کی نسبت سے ہو، مثلاً وہ ایک وقت میں افضل ہے اور دوسرے وقت میں نہیں اور ایک شخص کے لحاظ سے افضل ہے، دوسرے شخص کے لحاظ سے نہیں، تو ہو سکتا ہے کہ ابوذر غفاری ایمان کے بعد ایمان کے سبب افضل ہوں اور وہ ایمان، طاعت اور زہد و تقویٰ کی وجہ سے مقرب ہو گئے ہوں تو وہ دنیا میں ہاروت و ماروت سے افضل ہوں۔

اس لیے کہ ہاروت و ماروت دنیا ہی میں مبتلائے عذاب ہیں اور ابوذر سے آخرت میں سوال کئے جائیں گے اور دنیا میں ان سے سوال نہیں کیا جائے گا۔

لیکن آخرت میں ابوذر ہاروت و ماروت سے افضل نہیں ہوں گے اور تمام فرشتوں سے ابوذر افضل نہیں ہوں گے اور اس لیے کہ ابوذر اسلام سے پہلے کافر تھے اور اسلام کے بعد وہ معصوم نہیں اور خاتمہ سے مامون نہیں اور وہ شخص جس سے کفر حاصل ہوا ہو اس کے بارے میں یہ فیصلہ کیونکر دیا جاسکتا ہے کہ وہ انجام کار کفر سے معصوم و محفوظ ہوگا؟ لہذا وہ ان فرشتوں

سے افضل نہیں ہو سکتا جو کہ مقدس و مطہر اور کفر و عصیان سے معصوم ہیں۔

جبرئیل افضل ہیں کہ ابو بکر صدیق؟

اہل سنت و جماعت کا اس مسئلہ میں کوئی اختلاف نہیں کہ جبرئیل، میکائیل و اسرافیل، عزرائیل علیہم السلام اور رسل ملائکہ حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور دیگر صحابہ کرام سے افضل ہیں۔

مگر بعض محققین نے وفور محبت اور غلبہ عشق کی وجہ سے کہا کہ ابو بکر تمام فرشتوں سے افضل ہیں اور یہ قول ان کی تردید کرتا ہے۔

فرشتے افضل ہیں یا اولیاء؟

کیا باقی فرشتے حضرت ابو بکر صدیق اور دیگر اولیاء کرام سے افضل ہیں یا نہیں؟ تو اس بارے میں علماء کے چند اقوال ہیں:

- (۱) بعض حضرات کہتے ہیں کہ ابو بکر وغیرہ فرشتوں سے افضل ہیں۔
- (۲) اور بعض دوسرے حضرات نے کہا کہ فرشتے افضل ہیں اور یہی بات صحیح ہے اس لیے کہ تمام فرشتے محل نبوت ہیں، کیونکہ معنی نبوت (یعنی انباء، الہام اور وحی خفی) اللہ تعالیٰ کے حکم سے ان سے حاصل ہے تو جس بھی شخص کے ہاتھ اور زبان سے ظاہری و باطنی طور پر انزال وحی جائز ہو تو اس کا حکم نبوت کا حکم ہوگا۔
- (۳) اور اس لیے کہ کسی فرشتے سے بغض رکھنا جائز نہیں، اس لیے کہ سب اللہ تعالیٰ کے خواص، انبیاء اور پیغمبر (سفارت کار) ہیں (ا) اور جو کسی فرشتے سے بغض رکھے کافر ہے۔ (ب) اور کسی فرشتے کو گالی دے کافر ہو جائے گا (ج) فرشتوں پر ایمان لانا واجب ہے، انبیاء کرام اور فرشتے درجہ و مرتبہ میں برابر ہیں تو ثابت ہوا کہ وہ اولیاء سے افضل ہیں۔

سوال: اگر کہا جائے کہ نبی کریم ﷺ نے صدیق اکبر اور بعض دیگر صحابہ کرام کے لیے جنت کی شہادت دی ہے اور یہ شہادت زوال ایمان سے عصمت اور امان کو واجب کرتی ہے۔

جواب: جواباً عرض یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کی شہادت سے وہ نزع کے وقت زوال ایمان سے مامون و محفوظ ہیں، بنیادی طور پر ان میں بزرگی و فضیلت نہیں ہے، اس پر دلیل یہ

ہے کہ ابتداء اسلام میں ان سے کفر بھی صادر ہوا مگر نبی اکرم ﷺ نے ان کے جنتی ہونے کی شہادت دی تو وہ جنت میں داخل ہوں گے لیکن جہنم میں ان کا داخل ہونا بھی ایک لازمی امر ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”وَإِنْ مِنْكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا كَانَ عَلَى رَبِّكَ حَتْمًا مَقْضِيًّا“ (مریم: ۷۱) ”تم میں سے کوئی ایسا نہیں جس کا گزر دوزخ پر نہ ہو تمہارے رب کے ذمہ پر یہ ضرور ٹھہری ہوئی بات ہے“ اگرچہ عذاب نہ دیئے جائیں گے اور انبیاء و ملائکہ ان امور مذکورہ سے معصوم ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم

نواں قول

مستحسنت عقل کا بیان

معترکہ کہتے ہیں کہ جس چیز کو عقل اچھا کہے وہ اچھی ہے اور جسے بُرا کہے وہ بُری ہے اور عام علماء نے فرمایا: حَسَن (اچھی چیز) وہ ہے جس کو شرع اچھا کہے اور قَبِيح وہ ہے جس کو شرع قبیح کہے چنانچہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تفصیل بیان کر دی جائے اس لیے کہ اشیاء میں حسن و قبح کے چند مراتب ہیں۔

حسن و قبح کی قسمیں

(۱) حَسَن لَعِينٌ: وہ اشیاء جن کی ذوات میں حسن ہو جیسے اللہ پر ایمان لانا اس کی عبادت کرنا اور اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرنا۔

(۲) حَسَن لَغِيْرٌ: وہ اشیاء جن میں فی نفسہ حسن و خوبی نہیں ہے مگر ان کے غیر میں خوبی ہے جیسے سراؤں کا بنانا، مساجد کا تعمیر کرنا، اذیت دینے والی چیز کو راستہ سے ہٹانا۔

قبح کی قسمیں

اسی طرح قبح کے چند مراتب ہیں مثلاً

(۱) وہ اشیاء جن کی ذات میں برائی ہے جیسے شرک، زنا، چوری وغیرہ۔

(۲) اور وہ چیزیں جن کی ذات میں قباحت و برائی نہیں لیکن اس سے متعلق دوسری میں قباحت ہے اس کی وجہ سے یہ بھی قبیح ہوگئی۔

تو ہم کہتے ہیں کہ جب کوئی شئی قبیح یا حسن لغیرہ ہو تو اس کا حسن شرع کے اچھا جاننے سے ہوگا اور اس کا بُرا ہونا شرع کے بُرا جاننے سے ہوگا اور اس میں عقل کی مجال نہیں کہ کسی شئی کو حسن یا قبیح کہے اور جب کبھی وہ شئی حسن یا قبیح لعینہ ہو تو ہم کہیں گے کہ یہ حسن، حسن لعینہ ہے (یعنی اس کی ذات میں خوبی ہے) اور شرع نے اس کو پسند کیا ہے اور قبیح، قبیح لذاتہ ہے اور شرع نے اس کو قبیح قرار دیا ہے۔

ایسے ہی امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے کتاب ”العالم والمعلم“ میں فرمایا کہ ظلم قبیح لعینہ ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ وہ عقلاً حسن یا قبیح ہے بلکہ ہم یوں کہیں گے: ہمیں اس چیز کے حسن یا قبیح کا علم عقل سے ہوتا ہے جیسے کہ شرع کی رہنمائی سے ہم کسی شئی کے حسن یا قبیح ہونے کو پہچانتے ہیں یہاں تک کہ اگر شرع اس کے حسن و قبیح کو نہ بھی بیان کرتی تو بھی اسلام و عبادات وغیرہ حسن لعینہ ہوتے اور ظلم و کفر قبیح لعینہ ہوتے۔

اس گفتگو کا فائدہ یہ ہے کہ احسن الحسنات علانیہ طور پر اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا اور اس کا چھپانا قبیح ہے پھر بھی اگر تقیہ (خوف سے) چھپایا تو جائز ہے اور اس کو شرع نے مستحسن قرار دیا اس کی دلیل یہ آیت ہے: ”وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ مِّنْ آلِ فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ إِيمَانَهُ“ (المومن: ۲۸) اور اگر ظاہر کر لے تو جائز ہے اور یہ بہتر ہوگا یہاں تک کہ اگر (اسی اظہار ایمان کی وجہ سے) قتل کر دیا جائے تو اجر پائے گا۔

تو ہم کہتے ہیں کہ یہ حسن کبھی شرع کی رہنمائی سے پہچانا جاتا ہے اور کبھی عقل سے اس کی معرفت ہو جاتی ہے۔ بہر کیف دونوں صورتیں شرعاً پسندیدہ ہیں اور ایسے ہی اگر مجبور کیا گیا کہ فلاں کو ناحق قتل کر دے تو یہ قبیح لعینہ اور دوسرے کی جان بچانا حسن لعینہ ہے۔ اور اگر ناحق طور پر کسی کے قتل کرنے پر مجبور کیا گیا تو بہتر یہ ہے کہ اس کو قتل نہ کرنے یہاں تک کہ مجبور کرنے والے نے اگر اس کو ناحق قتل کر دیا تو یہ مقتول ماجور ہوگا اور اگر قتل کر دیا مکرہ نے تو اس پر قصاص و دیت واجب نہیں اس لیے کہ اپنی جان بچانا دوسرے کی جان بچانے سے اس کے نزدیک احسن ہے۔

اس مسئلہ سے یہ رہنمائی ملتی ہے کہ ایک شئی جائز ہے کہ حسن لذاتہ ہو یا قبیح لعینہ ہو اور یہ دلالت شرع سے معلوم ہوگا پھر ہر وہ شئی جو حسن لعینہ ہو تو شریعت بھی اس کو مستحسن سمجھتی

ہے اور ہر وہ شئی جو قبیح لذتہ ہو شریعت اس کو بُرا کہتی ہے اس لیے کہ ہمیں ایسی مثال نہیں ملتی کہ ایک چیز حسن لذتہ ہو اور شریعت نے اس کو قبیح قرار دیا ہو یا جو چیز قبیح لذتہ ہو شریعت نے اس کو مستحسن قرار دیا ہو، ایسا کہیں نہیں ہاں! شرع قبیح کو اس وقت مستحسن قرار دیتی ہے جب کہ قبیح سے اچھ منعہم ہو جائے۔

صورتِ مسئلہ

مسئلہ کی صورت یہ ہے کہ جس کو قتل کا حکم دیا گیا اور محکوم علیہ بالقتل بھاگ گیا اور بھاگ کر کسی محفوظ مکان میں اطمینان سے جا بیٹھا، پھر اس کو کوئی شخص دیکھ لیتا ہے اور ادھر سے طالب قتل بھی آ جاتا ہے اور اس نے اس شخص سے اس مفرور آدمی کی نسبت دریافت کیا۔ اب یہ شخص یقین کے ساتھ اس کو جانتا ہے کہ وہ فلاں جگہ روپوش ہے اور اس کو علم ہے کہ اگر میں نے اس کی نشاندہی کر دی تو لامحالہ یہ اس کو قتل کر دے گا تو اس کے لیے جھوٹ بولنا جائز ہے، اگرچہ جھوٹ بولنا قبیح لعینہ ہے لیکن اس قبیح کے اختیار کرنے سے جو اچھ ہے منعہم ہو سکتا ہے۔

اور یہ مسئلہ اس شخص کے قول کی واضح طور پر تردید کرتا ہے جس نے حسن و قبیح دونوں کو عقلی قرار دیا (یعنی یہ کہا کہ قبیح، قبیح بالعقل اور یونہی حسن، حسن بالعقل ہے) اس لیے کہ جھوٹ بولنا عقلاً قبیح ہے اور شریعت نے اس معنی کے لحاظ سے مستحسن قرار دیا کہ اس سے ایک انسان کی جان بچ جاتی ہے۔

جھوٹ قبیح یعنی بُرا ہے اور ناحق قتل اچھ یعنی اس سے کہیں زیادہ بُرا ہے اس کے انعدام کے لیے قبیح کو اختیار کرتا ہے۔

اور ایسے ہی کفر اچھ القباح (سب سے زیادہ قبیح) ہے اور اگر کسی شخص کو کلمہ کفر یہ جاری کرنے پر مجبور کیا جائے تو اس کو کلمہ کفر زبان سے کہنا بشرطیکہ قلب اس کا مطمئن ہو تقیہ جائز ہے، اس کو کافر نہ کہا جائے گا۔ دشمن کے خوف سے کلمہ کفر کا اظہار کرنا مباح ہے تو شریعت نے اس کو مستحسن قرار دیا ہے اور عقل کے نزدیک قبیح لذتہ ہے لہذا ثابت ہوا کہ حسن وہ ہے جس کو شرع اچھا سمجھے اور قبیح وہ ہے جس کو شرع قبیح قرار دے، پھر بھی اگر صبر کرے اور قتل ہونے کو اختیار کرے تو یہ بھی جائز ہے اور اجر پائے گا، اس لیے کہ کفر قبیح لعینہ ہے تو ثابت ہوا کہ عقل کی مجال نہیں کہ وہ حسن و قبیح کو پہچانے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

دوسرا باب محسوس و معلوم کا بیان

محسوس و معلوم کے بیان میں سات اقوال ہیں۔

مہتدی ابوشکور سالمی (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے فرمایا کہ اس باب میں جن مسائل کا ذکر ہوگا وہ فلاسفہ اور حکماء یونان کے خود ساختہ اور من گھڑت اور بلا دلیل و حجت ہیں ان مسائل پر کوئی عقلی دلیل دی گئی ہے اور نہ محسوس بلکہ محض تخیلات ہیں جن سے جہلاء ہی دھوکا کھا سکتے ہیں یہ فلاسفہ خود گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں اور اپنے ان جھوٹے تخیلات کو ”حکمت“ کا نام دے رکھا ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے معتقدات کفریہ سے ہمیں محفوظ رکھے۔

اور تقلید ایمان میں مستحسن نہیں تو کفر میں کس طرح مستحسن ہو سکتی ہے؟ اور کفر تمام کا تمام اندھی تقلید سے ہے اور بہت ہی بُرا ہے۔

ہم نے یہ مسائل حقائق کو واضح کرنے اور ہوشی و ہوس کے مارے اور خواہش کے پجاریوں کا پردہ چاک کرنے کی غرض سے ذکر کیے ہیں۔

پہلا قول

حسن اور محسوس کے بیان میں ہے۔ فقہاء کرام کا اس پر اتفاق ہے کہ حسن بنی آدم اور تمام حیوانات میں پائی جانے والی ایک عرض کو کہتے ہیں اور اس سے مراد ”علم“ ہے۔ بعض نے کہا کہ ”حسن“ سے مراد عقل ہے۔

اور زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ حسن کسی شئی کے پالینے اور اس کے احاطہ کر لینے کا نام ہے اور یہ کسی شئی کی دریافت کے سلسلہ میں عقل کا آلہ کار بنتی ہے۔

پانچ حواس کا بیان

حواس پانچ قسم کے ہیں: (۱) سمع (سننے کی قوت) (۲) بصر (دیکھنے کی قوت) (۳) شم (سونگھنے کی قوت) (۴) ذوق (چکھنے کی قوت) (۵) لمس (چھونے کی قوت) ان کو یوں بھی بیان کیا جاتا ہے: حواسِ خمسہ (۱) قوتِ سامعہ (۲) باصرہ (۳) شامہ (۴) ذائقہ (۵) لامسہ اور اعضاء کے استعمال سے حس کا فائدہ ظاہر ہوتا ہے تو اعضاء حس کے لیے آلہ نہیں اور ہر حس کا فائدہ دوسری حس سے جدا ہے۔

اب رہی یہ بات کہ اشیاء کا ادراک کرنے میں حس عقل کے لیے وسیلہ ہے تو یہ اس لیے کہ عقل تمام اعضاء اور اجزائے بدن میں موجود نہیں جیسے ہاتھ، کان، ناک، آنکھ کہ ان اعضاء میں عقل نہیں ہے۔

دلیل: یہ ہے کہ ایسا ممکن ہے کہ عقل زائل ہو جائے اور حس باقی رہے لیکن وہ شخص کہ اس کی حس موجود ہو اور عقل نہ ہو اور اشیاء عقلیہ کو نہیں جانتا۔ مثل حرارت، برودت، گرمی، سردی، میٹھا، کڑوا جیسے مجنون جب اس پر دیوانگی چھا جاتی ہے تو عقل زائل ہو جاتی ہے اور اسی طرح محسوس کا علم بھی جنون طاری ہونے سے زائل ہو جاتا ہے، کسی بھی ذوق اور تکالیف و آلام وغیرہا کا احساس ختم ہو کے رہ جاتا ہے۔

علم کا ذریعہ طبیعت ہے

فلاسفہ کے نزدیک علم کا ذریعہ طبع ہے اور جو چیز طبیعت سے ادراک میں آئے گی تو اس کو علم ہو جائے گا ورنہ نہیں۔

عرض بے قرار ہے

اہل سنت و جماعت کے نزدیک ”حس“ عرض ہے اور عرض دو زمانہ تک باقی نہیں رہتی بلکہ ہر گھڑی اس میں حدوث و تغیر واقع ہوتا رہتا ہے۔

فلاسفہ کے نزدیک حس کی تعریف

فلاسفہ اور نیچر یہ کے نزدیک حس ایک ہی ہے اور وہ روح کی طرح تمام جسم میں ایک لطیف جوہر کی صورت میں موجود ہے۔

اور بعض کہتے ہیں کہ حس ایک معنوی چیز ہے جو جسم کے ساتھ قائم ہے اور ہر ہر انگ میں خود ہی قائم ہے اس لیے کہ تمام محسوسات کو اسی معنی کے ذریعہ جانتا ہے اور یہ کلام بلا دلیل ہے اس لیے کہ اگر معنی حواس کا جوہر ہوتا تو اس کا قیام لذاتہ ہوتا اور وہ اپنے ثبوت کے لیے محل کا محتاج نہ ہوتا اور عالم میں حس اور جسم کے سوا کوئی چیز نہ پائی جاتی اور وہ شنی حرارت و برودت اور حلاوت و کڑواہٹ کو جانتی تو ہم جانتے کہ یہ معنی ہیں حس کے اور جب وہ قائم بذاتہ نہیں تو جوہر بھی نہیں اس لیے کہ جوہر کی کم سے کم تعریف یہ ہے کہ وہ قائم بذاتہ ہو کسی کے سہارے کی اس کو حاجت نہ ہو اور اس کا وجود و ثبوت بغیر محل کے ہو اور یہ معنی حس میں محال ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ جب انسان کا ایک ہاتھ شل ہو جاتا ہے تو اس میں حس باقی نہیں رہتی یا ایک آنکھ خراب ہو جائے یا ایک کان بہرا ہو جائے یا ایک عضو خشک ہو جائے تو ایک عضو میں حس باقی ہے اور ایک عضو میں حس باقی نہیں اور جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ حس ایک عضو میں باقی رہے اور دوسرے عضو میں زائل ہو جائے تو ثابت ہوا کہ حس "شئی واحد" نہیں ہے اور حس جوہر بھی نہیں اس لیے کہ حس کے اگر ایک معنی ہوتے یا حس جوہر ہوتی تو یہ ممکن نہ ہوتا کہ ایک عضو میں حس ہو اور دوسرے میں نہ ہو اور اگر کہا جائے کہ حس تمام اعضاء میں موجود ہے اور قائم بذاتہ ہے مگر اس عضو کے خشک ہو جانے سے اس کا ظہور نہیں ہوتا مانع دور ہو جائے تو حس معلوم ہو جائے تو ہم کہتے ہیں کہ یہ بات مجنون مطبق کہ جس کا جنون انتہاء کو پہنچا ہوا ہو وہ کسی چیز کا ادراک نہیں کر سکتا حالانکہ تمام اعضاء صحیح و سالم ہیں اور بقول تمہارے حس موجود ہے تو عجب بات ہے کہ معنی حس بھی موجود اور اعضاء بھی صحیح و سالم اور کسی چیز کا ادراک نہیں کرتا اور حس کا فائدہ معدوم ہو گیا تو ثابت ہوا کہ تمہارا کلام درست نہیں۔

حواس خمسہ باطنہ

پھر حواس خمسہ ظاہریہ کے علاوہ حواس خمسہ باطنیہ بھی ہیں وہ درج ذیل ہیں:

(۱) خطرہ (۲) فکرہ (۳) ضمیر (۴) علم (۵) کلام

پانچ باطنی حواس کیا ہیں؟

(۱) خطرہ کی تعریف یہ ہے کہ جو فعل یا عمل دل میں گزرے یا رائے اور اجتہاد ہو اور ایک ساعت میں فوراً پارہ پارہ ہو جائے۔

(۲) فکرہ کی تعریف یہ ہے کہ جو خطرہ دل میں بار بار پیدا ہو دو بارہ آئے۔

(۳) ضمیر کی تعریف یہ ہے کہ اشیاء میں خیر و شر کا بار بار تامل کرنے پھر جو صواب و احسن نظر آئے اس کو اختیار کرے۔

(۴) علم کی تعریف یہ ہے کہ شئی پر اسی طرح وقوف حاصل ہو کہ اس کے تمام اوصاف باطنہ معلوم ہو جائیں۔

(۵) کلام وہ ایک معنی ہے کہ جس سے مافی الضمیر (دل کی بات) کا اظہار کر سکے۔

یہ حواس باطنہ ہیں، یہ سب کے سب عرض ہیں، دو زمانہ تک باقی نہیں رہتے، جیسے حس ظاہر عرض ہونے کی وجہ سے دو زمانہ تک باقی نہیں رہتی اور حواس ظاہرہ سے فقط موجودات خارجیہ دریافت ہوتے ہیں اور حواس باطنہ معدوم کی طرف متعدی ہوتے ہیں تو موجود محسوس ہوتا ہے اور معدوم معلوم ہوتا ہے، محسوس نہیں ہوتا۔

محسوس اور معلوم میں فرق

ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ محسوس کی طرف اشارہ حسیہ کیا جا سکتا ہے اور وہ ایک جہت میں ہوتا ہے اور معلوم کی طرف اشارہ نہیں کیا جا سکتا اور وہ ایک جہت میں نہیں ہوتا، اس لیے ہم نے کہا کہ ”اللہ تعالیٰ“ ”معلوم ہے“ محسوس نہیں ہے۔

دوسرا قول

طبع اور آلہ کا بیان

جاننا چاہیے کہ طبع عرض ہے جو نو پیدا اور مجبور ہے اور بذات خود قائم نہیں ہے اور عام مسلمانوں کے نزدیک تمام جواہر و آلات میں اللہ تعالیٰ جل شانہ کے تکلیف دینے سے حلول

کرتی ہے۔

طبائع (نیچریہ) کہتے ہیں: طبع جو ہر لطیف ہے اس کے اجزاء باہم متصل ہیں آپس میں ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں عالم کا کوئی حصہ طبع سے خالی نہیں ہے اس کا ہر جز طبع سے مرکب و مؤلف ہے۔

(فطرت کائنات) یا طبع کے بارے میں مختلف مذاہب

اس مسئلہ میں فلاسفہ کا اختلاف رہا ہے کہ طبع عالم کیا ہے؟

(۱) بعض فلاسفہ نے اسے جوہر بسیط کہا ہے۔

(۲) اور بعض نے کہا کہ ہیولی ہے یعنی ہیئت اولیہ اور مادہ ہے جس سے شاخ در شاخ افعال پھوٹے اور نکلتے ہیں۔

(۳) بعض کہتے ہیں: شے اصلی ہے۔

(۴) علت اصلیہ ہے۔

(۵) بعض کہتے ہیں: قوت اصلیہ ہے۔

(۶) بعض نے کہا کہ طبع قدیم ہے۔

اور ان کا عقیدہ ہے کہ روح طبع کا جز ہے اور عالم کی کوئی شئی روح سے خالی نہیں اس لیے کہ حالت وجود میں طبع سے خالی نہیں اور طبع اصلی سے اور تاثیر افلک سے حیات و حرکت وجود میں ظاہر ہوتی ہیں جب کہ وجود اپنے مرتبہ کمال میں ہو اور شے متحرک قوت طبع سے حرکت کرتی ہے جس قدر قوت طبع اس شے میں اثر کرے حتیٰ کہ بعض چیزیں نشوونما سے متحرک ہیں اور بعض اشیاء زمین پر چلتی ہیں اور بعض آہستہ چلتی ہیں اور بعض دوڑتی ہیں اور چیختی چلاتی ہیں اور بعض کلام کرتی ہیں اور بعض اشیاء میں اتنی قوت تاثیر ہوتی ہے۔

بعض کہتے ہیں: وہ (طبع) جانتی اور سمجھتی ہے اور اسے اس قدر قوت ہوتی ہے کہ حکماء کی طرح تمام کائنات کا علم رکھتی ہے۔

ان حکماء نے یہ بھی کہا کہ انبیاء کرام علیہم السلام اسی قوت طبع سے جو ان میں اثر کرتی ہے تمام علوم اور تمام اشیاء کو جانتے ہیں اور ان کو نہ وحی ہوتی ہے اور نہ وہ خدا تعالیٰ سے علم حاصل کرتے ہیں اور یہ مسئلہ کفر ہے کسی پر مخفی و پوشیدہ نہیں اور جو انبیاء و رسل کو حکیم مانے اور

نبوت کا انکار کرے وہ کافر ہے اور جو سلیمان علیہ السلام کو محض بادشاہ مانے اور نبوت کا انکار کرے کافر ہے اور اسی طرح موسیٰ علیہ السلام اور نبی کریم ﷺ کو بطور حقارت راعی یا یتیم کہے اور نبوت کی نفی کرے تو کافر ہو جائے گا اور اگر حقارت اور نفی نبوت کا ارادہ نہیں کیا تو کافر نہ ہوگا، لیکن راعی و یتیم کہنا مکروہ ہے۔

نیچر یہ بے وقوف ہیں

ہم نے جو طبائع (نیچر یہ) کا کلام ذکر کیا ہے تو یہ بے وقوفوں کا کلام ہے، حکماء ایسی لچر اور احمقانہ باتیں نہیں کر سکتے، لہذا اس کا کوئی اعتبار نہیں۔

طبیعت حقیقت میں کیا ہے؟

در اصل طبیعت وہ ہے جو ودیعت کی گئی ہے، بنی آدم اور حیوانات و بہائم اور جو اہر میں گرمی سردی، خشکی تری ہر ایک دوسرے کی ضد ہے اور اضداد ایک محل میں جمع نہیں ہو سکتیں مگر جبار کے جبر سے جو علیم و حکیم ہو، قادر ہو اور وہ اللہ تعالیٰ ہے اور اگر بوجہ زیادتی اور غلبہ غذا سے کوئی طبع زیادہ ہو جائے اور غذا کی کمی سے کوئی طبع کم ہو جائے تو یہ موجب تعطیل ہے۔

اور تقدیر الہی میں کوئی جوہر عالم گردش و انتقال سے خالی نہیں اور اللہ تعالیٰ کی تالیف سے چاروں طبیعتوں میں تفاوت جائز ہے اور یہ علوم طب و معالجہ سے ہے تو اس مقام پر اس کے بیان کی حاجت نہیں اور جو علم و معالجہ ناواقف اور جاہل ہے، وہ اعتقاد کر لیتا ہے کہ طبع قدیم ہے اور یہی فاعل اشیاء اور جاہل ہے، نشوونما اور وہ جاہل اسی (طبع) کو علوم نفسانیہ، صنعت و حرفت، تیراندازی وغیرہ کا معلم سمجھ لیتا ہے اور یہ کافرانہ عقیدہ ہے۔

مناظرہ کا طریقہ

طبائع کے ساتھ مناظرہ کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ

(i) پہلے ان سے یہ سوال کرو کہ بتاؤ طبیعت کیا چیز ہے؟ اگر وہ جواب دیں کہ یہ ایک اجسام و اشیاء سے مرکب چیز ہے، تو تم کہو کہ وہ عرض ہے، بذاتہ قائم نہیں رہ سکتی تو اس کا وجود بغیر جسم اور ترکیب ثابت نہیں ہو سکتا، وہ اس سے عاجز ہے کہ بغیر جسم و ترکیب کے قائم ہو سکے۔

(ii) اگر وہ کہیں کہ اجسام ہی طبع ہیں، یہ درست نہیں ہے، اس لیے کہ یہ اجسام منعدم ہو سکتے

ہیں اور فنا ہو سکتے ہیں اور فانی قدیم نہیں ہو سکتا۔

(iii) اگر کہیں کہ طبع نے اجسام میں حلول کیا ہوا ہے اور وہ اس صفت پر ہو گئی ہے تو جواب دو کہ جس نے اس شئی کو اس صفت پر کر دیا ہے وہ تمہارے گمان میں طبع ہے اب بتاؤ کہ وہ جوہر ہے یا عرض ہے؟ اگر وہ کہیں کہ عرض ہے تو عرض زائل و فنا ہو جاتی ہے تو وہ قدیم نہیں ہو سکتی بلکہ ایک حال سے دوسرے حال کی طرف بدلتی اور متغیر ہوتی رہتی ہے لہذا یہ بات تو درست نہ ہوئی۔

اور اگر کہے کہ طبع جوہر ہے تو یہ بھی خطا ہے اس لیے کہ طبع بنفسہ قائم نہیں ہوتی اور جوہر بنفسہ قائم ہوتا ہے تو تم کہو: طبع اگر جوہر ہے تو اس کا وجود ثابت ہو گیا اور اس کا قیام دوسرے جوہر کے ساتھ ممکن نہیں تو تمہارا کلام باطل ہو گیا۔

پھر مساحت کے بعد پوچھو کہ جس جوہر کا تم نے ذکر کیا ہے زندہ ہے یا مردہ؟ اگر وہ کہے کہ میت ہے تو اس سے افعال کا صدور ممکن نہیں اور اگر کہے کہ وہ جوہر زندہ ہے تو پھر کہو کہ وہ ارادہ رکھنے والا مرید ہے یا مجبور ہے یا عالم ہے یا جاہل؟ مرکب ہے یا بسیط؟ اگر کہے کہ مرید ہے عالم ہے مختار ہے جاعل و مؤلف ہے حکیم ہے جبار ہے تو یہ تمام صفات اللہ تعالیٰ کی ہوں گی پھر اس کے بعد ذات میں کلام کر کہ وہ مقدر و محدود ہے یا غیر محدود؟ اگر وہ کہے کہ وہ مقدر و محدود ہے تو تم کہو: پھر قدیم نہیں اور یہ بھی دریافت کرو کہ اس کے اجزاء اور حصے بھی ہیں یا نہیں؟ اگر کہے کہ اس کے حصص اور اجزاء ہیں تو اس نے خود ہی اس کے قدیم ہونے کا انکار کر دیا اس لیے کہ اجزاء اور حصوں میں بٹ جانے والی چیز یقیناً حدوث و تغیر کی حامل ہوگی اور یہ صفات قدیم کے نہیں ہو سکتے۔

اور اگر وہ کہے کہ متجزی اور متبعض نہیں ہے اور نہ ہی محدود و متناہی ہے تو کہو: وہ جوہر نہیں اس لیے کہ جوہر ان معانی سے خالی نہیں تو اگر کہے کہ وہ جوہر نہیں بس صانع کو ثابت کر دیا اور اس نے اقرار کر لیا صانع کے وجود کا جسے ہم نے جمیع صفات کے ساتھ ثابت کیا مگر اس نے نام میں خطا کی۔

مسئلہ: اور اللہ تعالیٰ کو جوہر یا عرض یا طبع کے نام سے موسوم کرنا جائز نہیں ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء جامع اور متفق علیہ ہوں یا سماع سے ثابت ہوں جیسا کہ ہم ذکر کریں

گے۔

مسئلہ: جو نام اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے بیان نہیں فرمایا اور اسی طرح جس نام کے جواز میں سب مسلمانوں کا اتفاق نہ ہو ایسا نام رکھنا کفر ہے۔

حکایت

ہارون رشید کے پاس دس زندیق حاضر ہوئے ہارون رشید نے فقہاء کو جمع کیا اور مناظرہ کا حکم دیا تو زنادقہ غالب آئے اور فقہاء مغلوب ہو گئے۔ ہارون رشید کو اس پر بڑا غم ہوا چنانچہ خلیفہ نے بصرہ سے مقاتل بن سلیمان کو پانی کے راستہ سے بلایا جب وہ حاضر ہوئے تو ان کو مناظرہ کا حکم دیا انہوں نے زندیقوں سے سوال کیا کہ بتاؤ ریشم کے کیڑے گائے کے پھڑے ہرن اور شہد کی مکھیاں کیسے پیدا ہوئے؟ تو زنادقہ نے کہا کہ یہ سب طبع سے پیدا ہوئے۔

پھر مقاتل سوال کرتے ہیں: اس کی کیا وجہ ہے کہ شہوت کے پتے اگر کیڑے کھائیں تو ریشم بنتا ہے اور اگر شہد کی مکھی کھائے تو شہد بنتا ہے اور اگر ہرن کھائے تو مشک بنتا ہے اور اگر گائے کھاتی ہے تو گوبر بنتا ہے؟ (اس کی کیا وجہ ہے؟) زنادقہ کہنے لگے: یہ سب طبع کے کرشمے ہیں۔

مقاتل نے فرمایا کہ اگر یہ طبع سے ہوتا تو ضروری تھا کہ بمقتضائے طبع سب کا مشک بنتا یا سب گوبر بنتا یا سب ریشم بنتا، لیکن ایسا نہیں ہے تو معلوم ہوا کہ یقیناً اس کا خالق وہ قادر و قیوم اللہ تعالیٰ ہے۔

یہ سن کر زنادقہ حیران ہو گئے اور ان میں سے دو مسلمان ہو گئے اور باقی اپنی ضد پر رہے ہارون رشید نے ان کو قتل کر دیا۔ باذن اللہ تعالیٰ (یہ بحث بڑی مشکل ہے)

تیسرا قول

جز اور کل کا بیان

فلاسفہ میں سے ایک گروہ طبائع ہے ان کے ساتھ گفتگو کا مدار وہم پر ہے انہوں نے

اپنے اوہام کی بناء پر کلمات فاسدہ کے ساتھ وہم کیا اور بغیر دلیل و حجت کے انہوں نے اعتقاد کر لیا کہ عالم جزو کل ہے، کل بیان ہم کر چکے ہیں۔ ان کے نزدیک جو ہر طبع اصلی سے ہے اور بعض نے کہا کہ عناصر ہیں اور بعض نے کہا کہ افراد ہیں، یعنی جو ہر فرد بسیط ہولانیہ ہے اور اشیاء کلیہ جسمانیہ کے ساتھ جو متصل ہے وہ جزء ہے اور جب شئی فاسد ہو جاتی ہے تو وہ جزء جو اس کے ساتھ ہے اور اس میں قائم وہ اپنی اصل و کل کی طرف لوٹ آتا ہے۔

اس اجمال کا بیان یہ ہے کہ پانی طبعی طور پر تر اور ٹھنڈا ہے اس کی رطوبت (تری) ہوا سے ہے اور برودت (ٹھنڈک) زمین سے ہے، جب پانی زمین پر بہایا جاتا ہے اور مٹی کے ساتھ مل جاتا ہے اور خشک ہو جاتا ہے تو حکماء کہتے ہیں: رطوبت ہوا کی طرف اور برودت زمین کی طرف لوٹ جاتی ہے۔

یہ واضح رہے کہ فساد جو ہر اور محل میں اثر کرتا ہے، طبع اس سے متاثر نہیں ہوتی، تمام اشیاء کا یہی حال ہے۔ ایسے ہی جب حیوانات مر جاتے ہیں تو وہ فنا و معدوم بلکہ ان کا قالب فاسد و متغیر ہو جاتا ہے اور ایسے ہی طبیعت اپنے اصل کی طرف رجوع کر جاتی ہے اور وہ فی الحقیقت باقی ہے۔

انہوں نے مزید کہا کہ روح طبیعت کا جز ہے، جب روح شخص و قالب سے زائل ہوتی ہے تو طبع قدیم کی طرف لوٹ جاتی ہے، پھر دوسرے شخص و قالب کی طرف رجوع کرتی ہے۔ اور انہوں نے کہا: طبع قدیم ہے نیز عالم روحیں اور سب اشیاء طبیعت کے اجزاء ہیں اور قدیم کے اجزاء قدیم ہوتے ہیں اور فلاسفہ کا گمان یہ ہے کہ عالم اور اس کی تمام اشیاء طبعاً قدیم ہیں لیکن وصف کے لحاظ سے محدث و نو پیدا ہیں اور جو ہر جو محل طبیعت ہے، ایک حال سے دوسرے حال کی طرف فساد اور تغیر کو قبول کرتا ہے، حدث کو طبیعت قبول کرتی ہے، اس کی اصل قدیم ہے، یہ کلمات کفر ہیں اور جنہوں نے یہ کلمات کہے ہیں وہ سخت کافر ہیں۔

مناظرہ کا طریقہ

ان کے ساتھ مناظرہ کا طریقہ یہ ہے کہ ان سے دریافت کیا جائے کہ طبع جس کو تم کل کہتے ہو وہ کیا چیز ہے؟ وہ جو ہر ہے یا عرض؟

اگر وہ کہیں کہ جو ہر ہے تو یہ درست نہیں اس لیے کہ جو ہر نو (۹) اعراض سے خالی نہیں:

(۱) مائیت (۲) کیت (۳) کیفیت (۴) مضاف (۵) مکان (۶) زمان (۷) فاعل
(۸) مفعول اور (۹) تغیر جیسا کہ فارسی میں کسی نے اعراض تسعہ کو جمع کر دیا ہے۔

مردے دراز نیکو در شہر خویش امروز آراستہ نشستہ بر کار خویش پیروز

پھر یہ معانی حدوث کی صفات ہیں، قدیم کے لیے صلاحیت نہیں رکھتے تو ثابت ہوا کہ جو ہر قدیم نہیں ہو سکتا، ان میں سے بعض نے کہا کہ طبع فلک ہے۔

ہم نے کہا کہ تمہارا یہ قول بھی ٹھیک نہیں، اس لیے کہ فلک جو ہر فلک مطبوع ہے تو ثابت ہوا کہ طبع اور چیز ہے اور فلک اور ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ فلک کے لیے ضد و ند اور شکل و مثل موجود ہیں تو شک واضح ہوگا کہ فلک یہ ہے یا اس کی مثل یا شکل تو جب شک و شبہ واقع ہو گیا تو نہیں کہہ سکتے کہ فلک کون سا ہے۔

اگر وہ کہیں کہ فلک ایک ہے تو ہم کہیں گے کہ فلک طبیعت کا غیر ہے یا یہی طبیعت ہے، اگر وہ کہے: جو ہر غیر طبیعت ہے تو ان کا کلام باطل ہو جائے گا، اس لیے کہ جو ہر طبیعت کا غیر ہے وہ فساد کو قبول کرتا ہے تو جو طبع فلک میں ہے دوسرے کی لوٹے گی تو پھر جز ہو جائے گا کل نہ ہوگا اور اگر کہیں کہ فلک ہی طبع ہے تو ہم کہیں گے: کل تو نہ ہوا، اس لیے کہ تمہارا گمان یہ ہے کہ اس کے اجزاء ہوتے ہیں اور اس کے اجزاء دوسرے محل میں حلول کیے ہوتے ہیں تو وہ جز جو اس سے جدا ہو کر زائل ہو جائے گا، اس میں نقصان کا موجب ہوگا، جتنے جز جدا ہوئے اتنا ہی کم ہو گیا اور جو ناقص ہو وہ کل نہیں کہلائے گا۔ اس لیے کہ کل عبارت ہے کمال سے اور یہ کامل نہیں ناقص ہے۔ پس اگر کہیں کہ اس سے اجزاء زائل نہیں ہوتے بلکہ وہ اجزاء اس کے ساتھ متصل ہیں اور عالم سب کا سب جو ہر طبیعی ہے، کوئی مکان اس سے خالی نہیں تو ہم کہیں گے کہ پھر کل اور جز کی بات ہی فاسد ہے، اس لیے کہ جب وہ بعض کے ساتھ متصل ہے تو جز ہوا۔

پھر ہم کہتے ہیں: یہ کل اور طبع دونوں کا قدیم ہونا جائز نہیں۔

اور مناظرہ اس مسئلہ میں اور پہلے مسئلہ میں برابر ہے تو ان کا کلام صحیح نہیں۔

چوتھا قول

روح اور حرکت کا بیان

روح کے بارے میں مسلمانوں کا عقیدہ

تمام مسلمانوں کا اجتماعی عقیدہ ہے کہ روح نو پیدا مخلوق ہے مگر اس کو فنا نہیں اس لیے کہ روح جب جسم سے نکلتی ہے تو متقین کی روح جنت دار النعیم میں ہوتی ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

”كَلَّا إِنَّ كِتَابَ الْأَبْرَارِ لَفِي عَلَيْنَ“ (المطففين: ۱۸) ہاں! پرہیزگاروں کے اعمال نامے سب سے اونچے محلِ علیین میں ہیں۔

اور مجرموں کی روح دارالجمیم (دوزخ) میں ہوتی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”كَلَّا إِنَّ كِتَابَ الْفُجَّارِ لَفِي سَجِينٍ“ (المطففين: ۱۷) خبردار! بے شک کافروں کے اعمال نامے سب سے نیچی جگہ سجین میں ہیں۔

اس کے بعد روح کو جسم میں دوبارہ لوٹایا جائے گا اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے قیامت کے روز حساب کے لیے روح جسم کے ساتھ قائم ہوگی اور پھر روح اپنے جسم کے ساتھ جنت میں ہوگی یا دوزخ میں۔

اب رہا یہ مسئلہ کہ موت کے بعد جسم کا کیا حشر ہوگا؟ تو اس کا حکم عنقریب ہم ذکر کریں گے۔

جو گروہ روح کے قدیم ہونے کے قائل ہیں

طبائعہ (نیچریہ) فلاسفہ قرامطہ تناخیزہ براہمنہ اسی طرح عیسائیوں اور روافض کا ایک طائفہ بھی روح کے قدیم ہونے کا قائل ہے یہ لوگ عقل کو قدیم مانتے ہیں۔

بعض کہتے ہیں کہ قدیم کا جز ہے جب کہ بعض دوسرے حضرات اس چیز کے قائل ہیں کہ روح چونکہ نور قدیم سے پیدا کی گئی ہے اس لیے اصل قدیم ہے۔

اور بعض نے کہا کہ روح بایں معنی قدیم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس شخص کو زندہ پیدا کیا تو

اس کا پیدا کرنا اس کا فعل وضع ہے اور اس کا فعل اس شخص میں حلول کیے ہوئے ہے اس لیے کہ فعل وضع صانع سے شروع ہو کر مصنوع میں ختم ہو جاتا ہے یہ تمام طوائف (گروہ) حلولیہ کہلاتے ہیں اور یہ تناخہ کی ایک صنف ہے اور خدا کے فعل و صفت گری چونکہ اس شخص میں حلول کیے ہوئے ہے اس لیے ہر شئی کو سجدہ کرتے ہیں حجر ہو یا شجر پانی ہو یا گھاس مٹی ہو یا سونا درندے ہوں یا چوپائے زندہ ہو یا مردہ سب کو سجدہ کرتے ہیں کہ یہ تمام اس صفت سے مخلوق ہیں کہ خدا کے فعل وضع کا اس میں حلول ہوتا ہے اور اس کا فعل ان میں باقی ہے۔

یہ تمام کلمات کفریہ ہیں جو اس نہج اور طریق سے ان کلمات کا معتقد ہو وہ کافر ہے اس لیے کہ روح اگر قدیم کا جز ہے یا قدیم کا فعل ہے اور اس سے زائل ہو کر اس میں حلول کیا تو قدیم تو اللہ تعالیٰ ہے تو جز کا اس سے جدا ہونا اس کو ناقص کر دے گا اور زوال فعل سے وہ عاجز ہو جائے گا تو دوسرے کا محتاج ہوگا اور محتاج خدا نہیں ہو سکتا پھر یہ کہ روح اگر صانع قدیم کا جز ہے تو جہاں قبائح پائے جائیں گے یہ روح جو کچھ کرے گی وہ خدا کا فعل ہوگا جیسے زنا لواطت وغیر ذلک اور جو یہ اعتقاد کر لے کہ یہ قبائح خدا کا فعل ہے وہ کافر ہے۔

ان لوگوں نے صانع قدیم کو نہیں پہچانا کہ ان صفات ذمیرہ سے صانع کو موصوف کیا حالانکہ یہ صفات حادث و مجبور کی ہیں تو پھر یہ محتاج ہوگا پیدا کرنے والے جبار کا اور اس لیے کہ روح ایک مکان سے دوسرے مکان کی طرف منتقل ہوتی ہے روح اشخاص سے تجاوز کرتی ہے اور ان سے زائل ہوتی ہے۔ تو جو چیز منقول و زائل شدہ ہو وہ نقل کرنے والے اور زائل کرنے والے کی محتاج ہوتی ہے خصوصاً جب کہ منقول میں حیات زندگی اور عقل بھی نہ ہو تو اس لیے کہ زندگی کا سبب و علت روح ہے اور اس کے لیے حیات نہیں اور جب اس میں حیات نہیں ہے تو عقل بھی نہ ہوگی۔ اور جب اس میں عقل نہیں تو ثابت ہوا کہ وہ کسی شئی کو بذاتہ نہیں کرتا بلکہ وہ سبب ہے اور سبب مسبب کا محتاج ہوتا ہے بعض نے کہا: روح قدیم ہے مگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور ہے۔

پھر بعض روحوں نے ظہور آدم علی نبینا وعلیہ السلام سے قبل اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کو نکال کر زمین میں دھنسا دیا جو اس کے بعد اب پھلوں سبزیوں اور کھیتیوں کے ساتھ زمین سے نکلتی ہیں۔

ان حضرات نے قرآن مجید کی اس آیت سے استدلال کیا ”وَ اٰخِيْنَآ بِهٖ بَلَدَةً مِّثْنَا“ (ق: ۱۱) اور ہم نے اس سے مردہ شہر کو زندگی بخشی۔ نیز اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے کہ ”كَيْفَ يُحْيِي الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا“ (الروم: ۵۰) وہ زمین کو اس کی موت کے بعد کیسے زندگی بخشتا ہے؟ انہوں نے کہا کہ تمام اشیاء کی حرکت روح سے ہے پھر چوپائے اور پرندے نباتات اور دانوں کو کھاتے ہیں اور آدمی حلال جانوروں، دانوں اور سبزیوں کو کھاتے ہیں تو اس طرح یہ متفرق اجزاء میں بکھری ہوئی روئیں لوٹ آتی ہیں اور تھکاوٹ و عقوبت پہنچنے کے بعد نفس انسان میں آ پہنچتی ہیں اسی معنی کے لحاظ سے انسان کا نام ”نفس قائم“ رکھا اور اس لیے کہ تمام اشیاء آدمی کی طرف رجوع کرتی ہیں اور اس کے ساتھ قائم ہوتی ہیں اور آدمی کو ”نفس النفوس“ کہا جاتا ہے اور انہوں نے کہا کہ انسان ان تمام اشیاء کے مجموعہ کا نام ہے۔

اس لیے کہ انسان نماز میں کھڑا ہوتا ہے اور قیام درختوں کی صفت ہے پھر رکوع کرتا ہے تو یہ بہائم کی صفت ہے پھر سجدہ کرتا ہے تو پرندوں کے مشابہ ہو جاتا ہے پھر بیٹھتا ہے تو نبات کے مشابہ ہوتا ہے پھر شب کو سوتا ہے تو مچھلی اور سانپ کے مشابہ ہوتا ہے اسی طرح قیاس کرتے جاؤ گے بہر حال ہر شئی سے انسان کو حصہ ملا ہے اس معنی کے لحاظ سے آدمی کا نام ”صورة الصور“ رکھا گیا ہے۔

ان گروہوں کے ساتھ مناظرہ کا طریقہ

درحقیقت ان سے مناظرہ کا طریقہ یہ ہے کہ ہم ان سے محدث و قدیم کی صفات میں کلام کریں جیسا کہ ہم پہلے بیان کر آئے ہیں اور پھر چونکہ یہ تمام صفات محدث ہیں تو ان کا کلام درست نہیں۔

حرکت کی قسمیں

پھر ان میں سے بعض نے حرکت کی دو قسمیں بتلائی ہیں:

(۱) حرکت مستویہ (۲) حرکت مستدیرہ۔

اور حرکت مستویہ کی دو قسم ہیں ایک اوپر سے نیچے کی طرف جیسے بارش اور برف کہ اوپر سے نیچے آتی ہیں اور کوئی چیز اوپر سے گرے اور ایک حرکت نیچے سے اوپر کو ہوتی ہے جیسے آگ اور ہوا کہ نیچے سے اوپر کو جاتی ہے۔

اور حرکت مستدیدہ جیسے چلنے کی حرکت، کرہ اور فلک کی حرکت۔

دوسری تقسیم کے اعتبار سے حرکت کی چھ قسمیں

بعض نے حرکت کی چھ قسمیں کی ہیں: (۱) حرکت کون و فساد یعنی حدوث و عدم (۲) حرکت (۳) زیادة (۴) و نقصان یعنی موٹا پانا اور لاغری، دبلا ہونا (۵) حرکت استحالہ اور وہ کیفیت ہے (۶) حرکت انتقال اور وہ سیر یعنی چلنا ہے۔

یہ سب خطا ہے اس لیے کہ ان تمام چیزوں کی حرکت اللہ تعالیٰ کے ارادہ سے ہے، یہ سب حرکت کرنے میں مجبور ہیں۔

اور اصح یہ ہے کہ حرکت ایک ہے، وہ کسب و اختیار ہے کسی زندہ کے افعال میں اور جو اس سے زیادہ ہے وہ اللہ تعالیٰ کے ارادہ سے تھے۔

پانچواں قول

آثارِ علویہ کا بیان

معلوم ہونا چاہیے کہ جواہر یعنی معاون و مراکز، یواقیت، لوہا، سیسہ، مائعات اور تمام اشیاء ظاہریہ اور باطنیہ میں جو تغیر و تبدل اور کمی بیشی ہوتی ہے، بالا جماع یہ کسی موثر کی تاثیر کا نتیجہ ہے۔ طبائع اور منجمہ نے کہا کہ یہ تبدیلیاں طبع اور ستاروں کی تاثیر سے رونما ہوتی ہیں، اسی طرح زندگی، موت، پیدائش اور ایجاد و نئی توڑ پھوڑ سب کچھ بھی طبع اور ستاروں کی تاثیر سے ہیں۔

انہوں نے کہا کہ فلاں ستارہ جب فلاں برج، فلاں درجہ اور فلاں دقیقہ میں پہنچتا ہے تو کسی کے لیے خیر اور کسی کے لیے شر، کسی کے لیے بیماری اور کسی کے لیے صحت و تندرستی ایسی تاثیرات ظاہر ہوتی ہیں، ایسے ہی پیدائشوں اور اجناس اور پھلوں کی پیداوار، بارشوں کے برسنے میں اور دیگر کائنات میں جو قسم قسم کی تبدیلیاں ظاہر ہوتی ہیں، یہ سب کچھ فلک اور ستاروں کی تدبیر اور طبع کی تاثیر سے ہوتا ہے۔

اس لیے کہ ستارے اور افلاک، ہوائیں زمین اور طبع میں اثر کرتے ہیں پھر ہوا اور طبع ان

اشیاء میں اثر کرتے ہیں اب پھر دو صورتیں ہیں۔ یا یہ حضرات فعل و تدبیر کو من جانب اللہ سمجھتے ہیں اور ان اشیاء کو تدبیر اور حکم الہی کے اظہار کا محض سبب گردانتے ہیں یا فعل و حکم کو غیر اللہ کی طرف سے اور فلک کو صانع گردانتے ہیں۔

پس اگر تو کہیں کہ صنع اور تدبیر و تقدیر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور فلک اور ستارے سبب ہیں تو یہ حقیقت میں مؤمن ہیں لیکن علم نجوم میں زیادہ انہماک کی وجہ سے خطا کار ہیں کیونکہ مقدم و موخر کرنے والا اور کائنات میں تاثیر کرنے والا تقدیر کا مالک تو وہ اللہ تعالیٰ ہے۔

آسمان اور ستاروں کی گردش حکم الہی کی پابند ہے

اور فلک اور ستارے اپنی حرکت و سیر میں مجبور ہیں اور مصلحت عالم کے لیے اللہ تعالیٰ کے حکم سے حرکت کرتے ہیں اور آسمان اور ستاروں کی طرف افعال کی نسبت بطور مجاز کی جاتی ہے اور مسبب حقیقی اللہ تعالیٰ ہے جیسے تم احکام شرعیہ میں کہتے ہو کہ زنا سبب ہے، حد کے واجب ہونے کا اور حقیقت میں واجب کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے، لیکن زنا کو حد کے واجب ہونے کے لیے سبب گردانا گیا ہے، سبب کی طرف ”حد“ کی اضافت مجازاً جائز ہے، اس لیے کہ ظہور حکم کے لیے علامت ہے۔

اسی طرح ستارے اور گردش افلاک ظہور احکام کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے سبب قرار دیئے جائیں تو جائز ہے۔ جیسے طلوع شمس دھوپ کا سبب ہے اور غروب آفتاب رات کے ظہور کا سبب ہے یونہی تمام احکام میں لیکن جائز ہے کہ سبب حکم سے خالی ہو، سبب بھی رہے۔

سبب اور علت میں فرق

اس لیے کہ سبب اور علت میں فرق یہ ہے کہ علت معلول میں حکم کا اثبات کرنے سے خالی نہیں ہو سکتی اور سبب کے لیے جائز ہے کہ اس سے بعض میں حکم کا اثبات ہو بعض میں نہ ہو، اس مسئلہ کا مقام اصول فقہ ہے۔

علم نجوم منسوخ ہو چکا ہے

علم نجوم میں غلو کرنے والے کو خطی اس لیے قرار دیا جاتا ہے کہ علم نجوم حضرت ادریس علی نبینا علیہ السلام کے زمانہ میں مشروع تھا اور پھر بالا جماع منسوخ ہو گیا ہے اور منسوخ میں اشتغال خطا ہے۔

منسوخ پر عمل کرنا باطل ہے

اور اس پر عمل باطل ہے۔

علم نجوم اور شمس الائمہ حلوانی رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ

منقول ہے کہ حضرت شمس الائمہ عبدالعزیز بن احمد حلوانی بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ سے منجم اور علم نجوم کے بارے میں سوال کیا گیا، انہوں نے جواب دیا کہ علم نجوم آسمان میں حق ہے اور زمین میں منسوخ، اس پر عمل کرنا باطل ہے اور منجم مخطی، جو شخص فعل و تقدیر کو غیر اللہ کی طرف سے جانے وہ کافر ہے۔

علم نجوم کے بارے میں نبی کریم ﷺ کا فرمان مبارک

نبی کریم ﷺ سے مروی ہے، حضور ﷺ نے حلوان (شیرینی) کاہن سے منع فرمایا یعنی اجرت کاہن جائز نہیں ہے۔ نیز مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: جو چور کا نام بتانے والے کے پاس آیا، کاہن کے پاس گیا اور اس کی تصدیق کی تو اس نے کفر کیا یعنی اس نے حضور ﷺ پر نازل ہونے والے قرآن کا انکار کیا۔

نجومی اور اس کی تصدیق کرنے والوں کا فرہیں

اس کا مطلب یہ ہے کہ نجومی نے جب یہ کہا کہ فلک یا ستارہ یہ کہتا ہے یا یہ کرتا ہے اور ان کے افعال کو صحیح مانا اور آسمان اور ستاروں کی گردش کو موثر حقیقی جانا تو کافر ہو جائے گا اور جو تصدیق کرے گا وہ بھی کافر ہو جائے گا اور جس نے موثر حقیقی اللہ تعالیٰ کو جانا اور گردش

۱۔ زید بن خالد رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ صلح والے سال ہم نبی اکرم ﷺ کے ساتھ سفر پر نکلے ایک رات ہم پر بارش برسی تو صبح کی نماز ادا فرمانے کے بعد نبی اکرم ہماری طرف متوجہ ہوئے تو فرمایا: اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میرے بندوں میں سے جو مجھ پر ایمان لایا اس پر بھی صبح طلوع ہوئی اور جس نے انکار کیا اس پر بھی (صبح طلوع ہوئی) تو جس نے کہا کہ ہم پر اللہ تعالیٰ کی رحمت، عطاء اور فضل کے ساتھ بارش برسائی گئی تو وہ مجھ پر ایمان لانے والا ہے اور ستاروں کا انکار کرنے والا ہے اور جس نے کہا کہ ہمیں بارش فلاں ستارے سے برسائی گئی ہے تو وہ ستاروں پر ایمان لانے والا ہے اور میرا انکار کرنے والا ہے۔

(صحیح البخاری، کتاب المغازی، باب غزوة الحدیبیہ ج ۲ ص ۵۹۷، مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ، دہلی)

فلک اور ستاروں کے چکر کو محض سبب جانا، مثلاً یہ کہے کہ فلاں ستارہ جب فلاں برج میں 'فلاح' درجہ اور دقیقہ میں پہنچے تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے ایسا ہوگا تو وہ کافر نہیں لیکن مخطی ہوگا جیسا کہ اس کی وجہ ابھی بیان ہوئی ہے۔

ستاروں کی تخلیق کا فلسفہ

حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ستاروں کو تین فائدوں کے لیے پیدا کیا ہے:

- (۱) آسمانوں کی زینت کے لیے فرمایا: "إِنَّا زَيْنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِزِينَةِ الْكَوَاكِبِ" (الصافات: ۶) بے شک ہم نے آسمان دنیا کو ستاروں کی زینت کے ساتھ آرائش بخشی۔
- (۲) رہنمائی کے لیے جیسا کہ ارشادِ خداوندی ہے: "وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُونَ" (النمل: ۱۶) اور ستارے سے وہ راہ پاتے ہیں۔

- (۳) شیاطین کے رجم کے لیے فرمانِ خداوندی ہے: "وَجَعَلْنَا رُجُومًا لِلشَّيَاطِينِ" (الملك: ۵) اور ہم نے ان ستاروں کو شیاطین کے لیے مار بنا دیا۔

اعتراض: اگر کہا جائے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں ذکر کیا گیا ہے کہ آپ نے ستاروں کو دیکھ کر فرمایا: "سَقِيمٌ" (الصافات: ۸۸) یعنی ابراہیم (علیہ السلام) نے ایک نظر ستاروں پر ڈالی اور فرمایا: میں بیمار ہونے والا ہوں۔

جواب: اس کے جواب میں کہا گیا کہ علم نجوم میں دیکھا۔

اعتراض: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "فَالْمُدَبِّرَاتِ أَمْرًا" (النازعات: ۵) ستارے تدبیر کرنے والے ہیں۔

جواب: مدبرات سے مراد جبرئیل، میکائیل و اسرافیل و عزرائیل ہیں، صلوات اللہ علیہم اجمعین۔

سوال: اس پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب ملائکہ (فرشتے) مدبرات ہو سکتے ہیں تو فلک اور ستاروں کا مدبر ہونا بھی جائز ٹھہرا یہ بھی مدبر ہو سکتے ہیں؟

جواب: مدبر حقیقی اللہ تعالیٰ ہے اور فرشتے اللہ تعالیٰ کی تدبیر کا اظہار کرتے ہیں اور اس کی

تقدیر کے مطابق کام کرتے ہیں۔ اسی طرح آسمان اور ستارے اللہ تعالیٰ کے حکم کے پابند اور تابع ہیں تدبیر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔

دلیل یہ ہے: ”يُدَبِّرُ الْأَمْرَ مِنَ السَّمَاءِ إِلَى الْأَرْضِ“ (السجده: ۵) اللہ تعالیٰ ہر کام کی تدبیر فرماتا ہے آسمان سے زمین تک۔ نیز فرمایا: ”وَمَنْ يُدَبِّرُ الْأَمْرَ فَسَيَقُولُونَ اللَّهُ“ (یونس: ۳۱) اور کون کاموں کی تدبیر کرتا ہے؟ تو اب کہیں گے: اللہ تعالیٰ۔

پھر یہ بات اپنی جگہ اٹل ہے کہ فرشتوں سے تدبیر کا ظہور کتاب و سنت سے ثابت ہے اور فلک و نجوم کے سپرد کرنا صحیح نہیں ہے۔

اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ تدبیر امور کا کام فرشتوں کے تفویض کرنا یوں بھی صحیح ہے کہ یہ زندوں کا کام ہے لہذا یہ فرشتوں کو تفویض کرنا تو درست ہے لیکن فلک اور نجوم کی طرف تفویض کرنا جائز نہیں ہے اور ایسے ہی ہر فلک اور نجوم کو تدبیر سو نپنا صحیح نہیں اس لیے کہ فلک و انجم میں حیات نہیں۔

پھر ستاروں کی چال اور فلک کی گردش خالص اللہ تعالیٰ کے ارادہ سے ہے اس میں دنیا جہان کے فوائد اور مصلحتیں مضمحل ہیں۔ تو تم نے جو کچھ کہا وہ سب ناجائز و ناروا کہا ہے صحیح نہیں

علم نجوم کے منسوخ ہونے کی تاریخ

یہ بجا ہے کہ علم نجوم حضرت ادریس علیہ السلام کے زمانہ میں حق تھا لیکن حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں منسوخ ہو گیا۔

بعض فقہاء نے فرمایا: علم نجوم کی معرفت اس بناء پر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو خبر دی ہے کہ فلاں ستارہ جب فلاں برج میں یا درجہ و دقیقہ میں پہنچے گا تو اس کا یہ حکم ہے مگر یہ منسوخ ہو گیا اور اگر منجم اللہ تعالیٰ کے سوا ستارہ کو موثر و فاعل اعتقاد کرے اور فلک کو صانع مانے تو وہ بالاتفاق کافر ہے۔

مناظرہ کا طریقہ

ان کے ساتھ مناظرہ کا طریق یہ ہے کہ حدوث عالم اور اثبات صانع اور اس کی صفات اور اثبات وحی بیان کیا جائے، نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ مراکز و

معادن میں کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا جس دن آسمان و زمین کو پیدا کیا۔

چھٹا قول

تعریفاتِ اشیاء اور تخلیق کائنات کا بیان

یہ باب ان حدودِ اشیاء کی معرفت پر مشتمل ہے جو کہ اجسام و موجودات کو عارض ہوئے یہاں پر حدود کا اسی قدر بیان ہوگا جس قدر فقہاء کو حاجت ہے کہ ان الفاظ کا اطلاق اور اس سے احکام کا اثبات اور اعتقادات اور احکامِ شرعیہ میں جو قیاس کے خلاف ہیں اور خلاف واقع ہیں اور لوگوں کے درمیان ادیان میں مختلف فیہ رہے بیان کیا جاتا ہے۔ اعیان کی تعریف اور ان کے اوصاف کی پہچان میں اس لیے کہ حد کے معنی طرف اور کیت کے آتے ہیں پھر حد ذکر کر کے اس سے اوصاف مراد لیتے ہیں وصف شئی کو حد کہتے ہیں اور وصف حد نہیں۔

حد کے لغوی معنی

حد کا معنی منع کرنے کے آتے ہیں اسی لیے دروازہ کو 'حد' کہتے ہیں کہ وہ لوگوں کو اندر داخل ہونے سے منع کرتا ہے۔ اسی طرح حد محدود کی تعریف میں اس کے غیر کو اور اس کی جنس کو داخل ہونے سے منع کرتا ہے اور حد سے مقصود شے کا اس طرح پہچانا ہے کہ اس شے کے اوصاف ارکانِ حدود و مقدار سب کی معرفت حاصل ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اب ہم یہ بیان شروع کرتے ہیں۔

قدیم کی تعریف

چنانچہ معلوم ہونا چاہیے کہ لغت میں قدیم اس شئی کو کہتے ہیں کہ جو سب سے پہلے ہو اس معنی کے لحاظ سے ہم اللہ تعالیٰ کو قدیم کہہ سکتے ہیں یعنی تمام اشیاء سے اس کو تقدم حاصل ہے اور اس کا یہ تقدم اشیاء پر اس لحاظ سے نہیں کہ وہ پہلے معدوم تھا اب وجود یا پہلے نیست تھا اب ہستی پائی یعنی اس کو عدم سے وجود میں آنے یا نیست سے ہستی ہونے کے لحاظ سے

اشیاء پر تقدم نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے موجود ہے۔

دھریوں کا مذہب

دھریوں نے قدیم کے معنی میں اختلاف کیا ہے، انہوں نے کہا: صانع اس لحاظ سے قدیم نہیں کہ وہ ہمیشہ سے ہے، بلکہ اس کا تقدم ظہور وجود کے لحاظ سے ہے یعنی تمام چیزوں سے پہلے اس کا وجود ظاہر و موجود ہوا، پھر تقدم کی قوت سے اس نے اشیاء کو پیدا کیا، اس کے بعد عدم کی طرف لوٹ گیا جو کہ اس کی اصل ہے اور یہ بین کفر ہے، اس لیے کہ معدوم کا وجود و تکون بغیر موجد (پیدا کرنے والے) کے نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ معدوم سے تو فعل متصور نہیں، لہذا فعل کس سے حاصل ہوگا؟ یا تو قوت ہے یا علت ہے اور یا موجد ہے۔ بہر حال جس سے فعل واقع ہوگا، وہی صانع و خالق ہوگا اور پھر یہ صانع بھی اسی طرح کا ہوا تو یہ بھی محتاج ہوگا یا قوت کا یا علت کا یا موجد کا اور یونہی یہ سلسلہ چلتا رہے گا اور یہ صحیح نہیں ہے تو ثابت ہوا کہ صانع قدیم ہے اور اس کی صفت قدم ہے۔

قدیم و قدم میں فرق

بعض کہتے ہیں کہ قدم اور قدیم میں فرق ہے، یہ دو شئی ہیں جن کا ایک ہی محل ہے اور یہ جائز نہیں یعنی قدم قدیم کی صفت نہیں بن سکتی۔

جواب: ہم کہتے ہیں کہ قدیم ایک زندہ موجود شئی ہے اور قدم اس شئی کی صفت ہے تو ہم یہ نہیں کہتے کہ شئی غیر موصوف ہے بلکہ شئی موصوف ہے، صفت قدم سے اس کا ذکر ہم بعد میں کریں گے جیسا کہ صفت اور نعت میں ہوتا ہے۔

نعت اور صفت کیا ہوتی ہیں؟

اہل لغت کے نزدیک نعت اس شئی سے عبارت ہے جس کے ساتھ شئی آراستہ ہو بایں حیثیت کہ اس کا زوال ناممکن ہو، جیسے آنکھ، ناک، ابرو، ہاتھ کہ یہ شئی کے لیے نعت ہے۔

صفت کا بیان

اور صفت وہ ہے جو عارض ہوتی ہے اور شئی سے زائل بھی ہو جاتی ہے، جیسے رنگ، کلام، سوکھنا، چکھنا اور کاریگری وغیرہ یہ اشارہ نعت کا بیان ہے۔

نعت اور صفت کی اصطلاحی تعریف

اصول اور اصطلاح میں نعت و صفت کی تعریف کہ جس پر اعتقاد کی صحت کا مدار ہے اور یہ کہ جس کی اضافت و نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف جائز یا ناجائز ہو وہ کیا ہے؟ تو واضح رہے کہ سابقہ سطور میں جو نعت و صفت کی تعریفات گزری ہیں، اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف جائز نہیں اور معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی صفات کے ساتھ موصوف ہے اور اپنی نعت کے ساتھ منعت ہے جیسا کہ ہم ان شاء اللہ ذکر کریں گے اسے خوب سمجھ لو۔

صفت کے بارے میں کرامیہ اور بعض عاشقوں کا مذہب

کرامیہ اور محققہ کہتے ہیں کہ صفت وہ شئی ہے کہ ذات اس سے جدا ہو کر ثابت نہ ہو۔ بلکہ بغیر تقدیم جیسے ہی ذات ثابت ہوگی تو ساتھ ہی صفت بھی ثابت ہوگی اور صفت کی نفی سے ذات کی بھی نفی ہو جائے گی گویا کہ ذات اور صفت کے درمیان چولی دامن کا ساتھ ہے آپس میں لازم و ملزوم ہیں۔

نعت: اور نعت وہ ہے کہ ذات کا ثبوت اس کے بغیر بھی جائز اور ممکن ہوتا ہے اور اس کا مفصل ذکر ان شاء اللہ ہم بعد میں کریں گے۔

نعت و صفت اور فقہاء اہل سنت و جماعت

اہل سنت و جماعت کے فقہاء کرام نے فرمایا کہ نعت و صفت میں کوئی فرق نہیں، ان دونوں (نعت و صفت) کی تعریف یہ ہے جس کے ساتھ موصوف اپنے ماسوا دوسری چیزوں سے ممتاز ہو جائے۔

اسم کی لغوی تحقیق

اہل لغت کے نزدیک اسم کی تعریف یہ ہے کہ جس کے ساتھ مسئی کی طرف اشارہ کر سکیں اور یہی علامت ہے۔

اسم کا مادہ اشتقاق

اسم کا مادہ اشتقاق "بِسْمَةِ" ہے جس کے معنی علامت اور نشانی کے آتے ہیں۔

تحققین اور اصولیوں کے نزدیک اسم کی تعریف

اہل تحقیق اور اہل اصول کے نزدیک اسم کی تعریف یوں بیان کی جاتی ہے: اسم وہ ہے کہ جس سے اس کے مسمیٰ کو اپنے ماسوا سے فرق اور امتیاز حاصل ہو جائے۔

محدث کسے کہتے ہیں؟

جوشی تبدیلی کو قبول کر لے محدث کہلاتی ہے اور بعض کہتے ہیں: حدیث کی تعریف یہ ہے کہ عدم سے وجود میں آنا (اس کے مطابق عدم سے وجود میں آنے والی یعنی نیست سے عالم ہستی میں آنے والی شئی کو محدث کہیں گے)۔

جوہر کس کو کہتے ہیں؟

اہل سنت و جماعت کے نزدیک جوہر وہ ہے جو اپنی ذات میں یکتا، مستقل اور بذاتِ خود قائم ہو اور اعراض کو قبول کر لے۔

دیگر فرقوں کے نزدیک جوہر کی تعریف

فلاسفہ طبائع اور کرامیہ کے نزدیک جوہر کی تعریف یہ ہے کہ جو قائم بنفسہ ہو۔

جسم کی تعریف

کرامیہ کے نزدیک جسم وہ ہے جو محل سے مستغنی ہو۔

معتزلہ جسم کسے کہتے ہیں؟

اور معتزلہ کے نزدیک جسم وہ ہوتا ہے جس کے لیے لمبائی، چوڑائی اور گہرائی ہو۔

اہل سنت و جماعت جسم کس کو کہتے ہیں؟

اہل سنت و جماعت کے نزدیک جسم وہ ہے جس کے لیے تالیف و ترکیب ہو اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ" (البقرہ: ۲۴۷) اور اسے علم اور جسم میں کشادگی عطا فرمائی۔

عرض کسے کہتے ہیں؟

اہل سنت و جماعت کے نزدیک عرض کی تعریف یہ ہے جو غیر کو عارض ہو اور محل کی محتاج

ہو اور دو زمانوں تک باقی نہ رہے اسی لیے علت کا نام عارضہ رکھا گیا ہے کہ غیر پر عارض ہوتی

ہے۔

معزلہ و محققہ عرض کس کو کہتے ہیں؟

معزلہ اور محققہ کے نزدیک عرض وہ ہے جو غیر کے ساتھ قائم ہو۔

صورت ہیئت جثہ اور بدن کسے کہتے ہیں؟

اہل سنت و جماعت کے نزدیک صورت و ہیئت و جثہ و بدن کی تعریف یہ ہے کہ جس کے لیے حد نہایت اور تالیف ہے۔

ذات، نفس اور شئی کیا ہیں؟

اہل سنت کے نزدیک موجود بالعلم کو کہتے ہیں، طبائع اور جہمیہ کہتے ہیں: ذات، نفس اور شئی اس کو کہتے ہیں جو حدث کو قبول کرے۔
وجود: وجود کہتے ہیں جو بالذات ثابت ہو۔
عدم: وجود کی ضد ہے۔

حس: مدرك بالطبع کو کہتے ہیں۔

طبع: طبع اس کو کہتے ہیں جس سے لذت و الم معلوم ہو اور جو جمع و تقسیم کی محتمل ہو۔

علم: معلوم جیسا کہ وہ ہے اس پر واقفیت حاصل کرنے کا نام علم ہے، بعض نے کہا کہ شئی جیسی وہ ہو اس پر واقفیت پانے کو علم کہتے ہیں، لیکن یہ تعریف اس لیے درست نہیں ہے کہ معدوم معلوم ہے لیکن شئی نہیں۔

کلام کسے کہتے ہیں؟

اہل سنت کے نزدیک کلام اس معنی کو کہتے ہیں جو سمجھ میں آ جاتا ہے یعنی کلام معنی و مفہوم کا نام ہے اور ابوالحسن اشعری رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ کلام معنی فی الذات کو کہتے ہیں۔ معزلہ نے کہا کہ حروف کو ملا کر جو جدا جدا آوازیں ظاہر کی جاتی ہیں ان کا نام کلام ہے۔ اور حشویہ (جو کرامیہ اور محققہ سے ہیں) نے کلام کی دو طرح سے تعریف بیان کی ہے:

(۱) گفتگو پر قدرت ہونے کو کلام کہتے ہیں۔ (۲) کلام وہ ہے جس سے معنی کا اظہار کیا

جائے۔

قول کیا ہے: کلام کا بیان کرنا اور اظہار کرنا۔

نطق: الگ الگ متفرق حرفوں سے ملا کر جو ایک باضابطہ آواز پیدا ہو اس کو نطق کہتے ہیں۔

صوت: ظہور حرکت کے وقت جو ہر کی قوت کا نام صوت ہے۔

کتابت: کتابت کی تعریف ہے: مکتوب کو ثابت کرنا۔

انسان: جو طبیعت سے زندہ ہے اور جو شہادت کی گویائی پر قدرت رکھتا ہے۔

جنس: معنی کے لحاظ سے دو چیزوں کا موافق ہونا۔

نوع: نوع کی تعریف یہ ہے کہ وہ مفہوم جوشی کے ایک پہلو سے موافق ہو اور دوسری جہت

سے مخالف ہو۔

اس کی قدرے وضاحت یہ ہے کہ مثلاً ”حیوان“ اسم جنس ہے اس میں انسان چوپائے

پرندے اور ہر زمین پر چلنے والا داخل ہے۔ پھر چوپائے ایک نوع ہے حیوان کی اور بکری

چوپائیوں کی ایک نوع ہے اسی طرح اونٹ، گھوڑا، گائے یہ علیحدہ علیحدہ نوع ہیں تو یہ اشیاء

صورت و صفت میں باہم مختلف ہیں اور حیات میں موافق ہیں۔

جوہر: اسم جنس ہے تمام مخلوق کو شامل ہے جمادات، حیوانات، ہوا، پانی وغیرہ سب اس کے

تحت آتے ہیں پھر پھر ایک نوع کا نام ہے مٹی کا ڈھیلا ایک نوع، پانی ایک الگ

دوسری نوع ہے۔

اشارہ سے کیا مراد ہے؟: اہل سنت کے نزدیک فعل کی تعریف یہ ہے: شے کے لانے

میں کوشش کرنا۔ بعض نے کہا کہ شے کے نام لانے کی طاقت کو فعل کہتے ہیں اور محققہ اور

اشعر یہ کے نزدیک جو فاعل سے ظاہر ہو اور مفعول میں اثر کرے۔

مکان کسے کہتے ہیں: جو مشغول کرے اس کے کون کو غیر سے۔

محل: جہاں کوئی اترنے والا اترے، محل کہلاتا ہے۔

ازل: زمانے کی ابتداء کو کہتے ہیں۔

ابد: زمانے کی انتہاء کو کہتے ہیں۔

فنا: شے کا معدوم ہونا۔

بقا: شے کا ہمیشہ رہنا۔

ساتواں قول

حدوثِ عالم کا بیان

جاننے کی چند باتیں

- (۱) کسی شے کا ثابت کرنا محال ہو تو یہ اس کی نفی پر دلیل ہوتی ہے۔
- (۲) اور کسی شے کی نفی کرنا محال ہو تو یہ اس کے ثبوت کی دلیل بنتی ہے۔
- (۳) کسی چیز کا زیرِ عمل لانا محال ہو تو یہ اس کے ترک پر دلالت کرتا ہے۔
- (۴) اور اگر کسی شے کا ترک کرنا محال ہو تو یہ اس کے واجب العمل ہونے کی دلیل ہوگی۔

عالم کی دو قسمیں ہیں

مشکمین کے نزدیک عالم کی قسمیں یہ ہیں: جوہر اور عرض۔
اصنافِ عالم کے سلسلے میں کچھ اور مذاہب بھی ہیں ملاحظہ ہوں:

- (۱) تکوین اور ملکون۔
- (۲) تغیر اور متغیر (متقدمین فقہاء اسی کے قائل ہیں) اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی بھی یہی رائے ہے۔

(۳) بعض کہتے ہیں: حال اور محل ہے۔

(۴) بعض کہتے ہیں: حدوث و محدث۔

اور سب کا مطلب ایک ہے یعنی عالم جوہر و عرض سے عبارت ہے اور جسم جوہر کی نوع ہے پھر عرض کا زائل و معدوم ہو جانا جائز ہے اور ایسے ہی تغیر و تکوین و حدوث اور یہ اشیاء تبدیل ہونے کا احتمال رکھتی ہیں اور بدل اس عین میں حلول کرتا ہے اور مبدل کے زائل ہونے کے ساتھ اس عین پر عارض ہوتا ہے اور یہ بدل و مبدل دونوں کے حدوث کی دلیل ہے اس لیے کہ بدل اس مبدل سے پہلے نہ تھا اور جو پہلے نہ ہو پھر معرض وجود میں آئے تو وہ محدث ہے اور مبدل کبھی بدل کے ساتھ زائل ہو جاتا ہے اور جو چیز زائل ہو جائے وہ قدیم

نہیں ہو سکتی اس لیے کہ اس کا زوال اس کے یقیناً منعدم ہونے کو واجب کرتا ہے اور جس کا معدوم ہونا (خواہ انجام کے اعتبار سے ہو) جائز ہو تو اس کا ابتداء امر میں بھی معدوم ہونا ممکن ہوتا ہے۔

عالم کے محدث ہونے کی برہان

اور قدیم عدم سے پاک ہے بلکہ عدم کے توہم سے بھی منزہ ہے اور عالم کی اشیاء پر عدم کا طاری ہونا جائز ہے تو عالم کا قدیم ہونا باطل ہے اور جب عالم قدیم نہیں تو محدث ہوگا۔

محدث کی تعریف

اس لیے کہ محدث وہ ہے جو عدم سے وجود میں آیا ہو۔

عرض کے خواص و علامات

ایک حالت سے دوسری میں بدل جانا اور قابل زوال ہونا عرض خاص وصف ہیں یعنی تحویل و ازالہ عرض کے خصوصی اوصاف ہیں اور تحویل و ازالہ کا ظاہر ہونا حدوث ہے اور جو حدوث سے ظاہر ہو وہ محدث ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ عرض اپنے وجود میں محل کی محتاج ہے اور اس کا وجود بقاء بغیر محل کے ناممکن ہے اور جو بذاتہ باقی نہ رہے اور اس کا وجود محل کا محتاج ہو تو وہ محدث ہوگا اور اس لیے کہ حلول اس کا محل میں حدث ہے اور حلول سے پہلے بعینہ موجود نہ تھا تو ثابت ہوا کہ محدث ہے اور جب عرض کا محدث ہونا ثابت ہو گیا تو عرض کا حدوث جوہر کے حدوث کو واجب کرتا ہے اس لیے کہ عرض جوہر میں حلول کیے ہوئے ہوتی ہے تو حال جب محدث ہے تو محل بھی محدث ہوگا اس لیے کہ قدیم شئی یا قدیم ذات میں محدث کا حلول جائز نہیں ہے اسی طرح جوہر کا وجود عرض سے پہلے جائز نہیں اس لیے کہ جوہر کا عرض سے خالی ہونا محال ہے اور عرض کا وجود جوہر کے بغیر جائز نہیں۔

عرض اور جوہر دونوں کی ابتداء اور انتہاء ہوتی ہے

عرض کی بدایت بھی ہے اور نہایت بھی جیسا کہ ابھی سابقہ سطور میں ہم ذکر کر چکے ہیں۔ تو ایسے ہی جوہر کے لیے بھی ابتداء اور انتہاء کا ہونا ضروری ہے۔

حدوثِ عالم پر ایک اور دلیل

اور نتیجہ کے طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہر وہ شئی کہ جس کی ابتداء اور انتہاء ہو ضروری بات ہے کہ وہ محدث ہوگا جیسا کہ ہم تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔

سوال: کیا اللہ تعالیٰ حرکت کو بغیر نفس متحرکہ کے پیدا کرنے پر قادر ہے؟

جواب: بے شک اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے اس کی قدرت علی وجہ الکمال ہے مگر اس کے لیے حیز و جود داخل ہونا بغیر محل کے ممکن نہیں اور محل جوہر اور حرکت عرض ہے تو عرض کا وجود بغیر جوہر کے اور جوہر کا وجود بغیر عرض کے محال ہے اور اللہ تعالیٰ عزوجل کی شان اس سے بلند و بالا ہے کہ وہ محال کو پیدا کرے۔ واللہ تعالیٰ اعلم



تیسرا باب

اثباتِ صانع کا بیان

اس میں سات اقوال ہیں۔

مہدی ابوشکور سالمی فرماتے ہیں: جاننا چاہیے کہ علم کی دو قسمیں ہیں:

علم کی قسمیں

علم کی دو قسمیں ہیں: علم قدیم، علم حادث۔

علم قدیم اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اور علم حادث مخلوق کا علم ہے۔

علم حادث کی قسمیں

پھر مخلوق کے علم کی دو قسمیں ہیں: ضروری اور استدلالی۔

علم ضروری کی تعریف

علم ضروری وہ ہے جو جو اس سے حاصل ہو، وہ اس طرح کہ جب کسی چیز کو یا کسی آدمی کو

دیکھا تو یقیناً جان لیتے ہو یہ شئی کیا ہے؟ کیسی ہے؟ کتنی ہے؟ زندہ ہے یا مردہ ہے؟ مرد ہے یا

عورت؟ لمبا ہے یا چوڑا؟

علم استدلالی کسے کہتے ہیں؟

علم استدلالی وہ ہے جو نظر و فکر سے حاصل ہو۔ بعض متکلمین نے کہا کہ علم ضروری اور علم

استدلالی میں کچھ فرق نہیں ہے جب کہ ایسی دلیل سے ثابت جو شک کو زائل کر دے یہی قول

زیادہ درست ہے اس لیے کہ جو علم استدلال سے بہ طریق یقین حاصل ہوتا ہے وہ قبول و عمل

کو ضرور واجب کرے گا اور اس سے حاصل ہونے والا علم قطعی اور یقینی ہوگا تو علم استدلالی علم

ضروری ہو گیا۔

تفصیلی بیان

اس اجمال کا بیان یہ ہے کہ معرفتِ صانع کا علم صانع کے وجود پر دلالت کرنے والی آیات اور نشانیوں میں نظر و استدلال کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔

اور ایسے ہی استدلال و نظر سے وحی و نبوت کا اثبات ہوتا ہے کہ معجزات میں نظر و فکر کی جائے اور قول رسول جب کہ سنے یا اللہ کی طرف سے نقل کرے یا رسول سے بغیر شبہہ کے ایسے ہی اجماع امت تو یہ چیزیں نظر و فکر کے بعد علم قطعی و یقینی کو واجب کرتی ہیں اور یہ علم ضروری ہو جاتا ہے جو بغیر شک و شبہہ کے ایمان اور قبول و عمل کو واجب کرتا ہے اور جو شک کرے گا وہ کافر ہو جائے گا اور یہ ایسے ہے کہ ہم دھوئیں کو دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ یہاں آگ ہے اور یہ علم ضروری کا موجب ہوتا ہے حتیٰ کہ دیکھنے والا جب دھواں دیکھتا ہے اگرچہ آگ نہ دیکھی ہو وہ یقین کر لیتا ہے کہ یہ دھواں آگ سے پیدا ہوتا ہے۔

اسی طرح بنا ہوا کپڑا بننے والے کے وجود پر دلالت کرتا ہے اور سلا ہوا کپڑا درزی کے وجود پر دلالت کرتا ہے اور دلیل کے بعد مدلول کا علم یقین کے ساتھ حاصل ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی بارش دلیل ہے بادلوں کے موجود ہونے پر یہاں تک کہ جب ایک نابینے شخص پر بارش برتی ہے تو اس نے اگرچہ بادلوں کو حواس سے دیکھا نہیں ہوتا لیکن یقین کر لیتا ہے کہ یہ بارش بادلوں سے رسی ہے اس طرح بارش سے وہ بادلوں کے وجود پر یقین کر لیتا ہے اور یہ علم ضروری یقینی ہو جاتا ہے ایسے ہی مکان اپنے بنانے والے پر دلیل ہوتا ہے اور مصنوع صانع پر جیسا کہ یہ مقرر و ثابت ہے۔

علم ضروری اور علم استدلالی میں فرق

علم ضروری اور استدلالی جب کہ بطریق یقین ثابت ہو جانے میں کوئی فرق نہیں ہے اس لیے کہ ”حسن“ بذات خود علم نہیں بلکہ کسی چیز کو جاننے کے لیے دلیل ہے ایسے ہی آیات و علامات دلیل ہیں جو کہ دلالت کرتی ہیں معلوم پر پھر جب عالم معلومات پر واقفیت حاصل کر لیتا ہے تو پھر یہ معلوم خود اس چیز پر دلالت کرتا ہے جو بدلات دلیل دلالت کرتا ہے اسی چیز پر تو پھر ضروری و استدلالی علم میں فرق واقع نہ ہو گا جب کہ ایک دلیل دوسری دلیل پر دلالت کرے اور یہ دلیل دلالت کرتی ہے معلوم پر جب کہ اس میں شبہہ نہ ہو ایسے ہی اگر تین ہو یا

اس سے بھی زیادہ جیسے تم کہتے ہو خبر متواتر میں اور قرآن پاک میں کہ نبی کریم ﷺ سے ہم تک بنقل متواتر منقول ہوا دست بدست اور لوگوں کے زبانی بایں حیثیت کہ ان کے جھوٹ پر جمع ہو جانے کو ہم عقلاً جائز نہ سمجھیں کیونکہ اس سے علم قطعی اور یقینی حاصل ہوتا ہے اور ایسے ہی ”ما نحن فیہ“ میں ہے ”العلم علیہ“ اور تمہارا لوگوں سے سنا ایسے ہی ہے جیسے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے اور ایسے ہی نبی اکرم ﷺ نے خبر دی اللہ تعالیٰ سے اور بسا اوقات جبریل سے وہ میکائیل سے وہ اسرافیل سے وہ اللہ تعالیٰ سے یا لوح محفوظ سے وہ اللہ تعالیٰ عزوجل سے تو یہ خبر تمام وسائط کے اعتبار سے ایسی خبر ہو گئی جیسے تم نے خود حضور ﷺ سے سنا یا اللہ تعالیٰ عزوجل سے سنا اس لیے کہ یہ وسائط جھوٹ وغیرہ کے شبہ اور توہم سے پاک اور خالی ہیں تو اس میں شبہ نہیں ہو سکتا اور اس کی مانند ہے اگر خبر بہ طریق آحاد ثابت ہو تو راویوں میں شبہ ممکن ہے مثلاً یہ کہ راوی کو سہو ہو گیا ہو یا غلطی کی ہو یا ادراک معانی میں غلطی لگ گئی ہو یا جھوٹ کا بھی احتمال ہو سکتا ہے لیکن یہ خبر اس حیثیت سے ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی خبر سے اس میں شک کی گنجائش نہیں لیکن راویوں میں سہو غلط شبہ کا وہم ہو سکتا ہے اس لیے کہ علم قطعی و یقینی کا موجب نہیں ہے تو اسی پر اندازہ لگا کر ہماری اس گفتگو کو سمجھا جا سکتا ہے۔

پانی، درخت، بارش، آسمان، شمس و قمر ہر ایک اس پر دلیل ہے کہ ان کا ضرور کوئی صانع قادر قدیم خالق ہے پھر یہ نشاناتِ قدرتِ اثباتِ صانع پر دلیل قطعی ہیں تو ان دلائل سے نشاناتِ قدرت سے علم و معرفت کا حصول مثل علم ضروری ہے۔ حسی طور پر زوالِ شبہ کے لیے یہ آیاتِ قدرت پر دلالت کرتے ہیں کہ قطعی اور یقینی طور پر ان کے لیے صانع ہے۔

اس کی تحقیق یہ ہے کہ عالم اجزاء مؤلفہ اور اجرام مرکبہ کا نام ہے جو کہ قابلِ تقسیم ہے اور جس میں اندازہ حد وغیرہ متصور ہو سکتے ہیں۔ پھر وجود فعل اپنی جنس سے جائز نہیں اور نہ اجزاء عالم سے جائز ہے جیسے وجود فعل اپنی اصل سے جائز نہیں اس لیے کہ اصل اپنے ظہور اور

۱۔ کہ جب یہ آیاتِ قدرت یقینی اور قطعی طور پر دلالت کرتی ہیں کہ ان کے لیے صانع ہے۔

(۱۲ سیدی ابوالبرکات)

۲۔ جیسے درخت پر پھل لگتا ہے تو نہیں کہہ سکتے کہ درخت نے پھل کو پیدا کیا یا انڈے سے بچہ نکلتا ہے تو نہیں کہہ سکتے کہ انڈے نے بچے کو پیدا کیا۔

حیات سے پہلے شئی ہی نہیں اور حدوث و کینونت ظاہر و موجود ہونے کے بعد وہ زندہ نہیں اور حدوث و احداث دونوں غیر حسی اور بے جان چیز سے متصور نہیں اور شے کے بغیر بھی متصور نہیں اور معدوم عادتہ اور عقلاً حیز وجود میں داخل نہیں تو موجد کا محتاج ہوا۔

تو ثابت ہوا محدثات و موجودات کے لیے موجد و محدث ہے اور ان مقدمات و مکنونات کے لیے مقدر و مکون ہے اور ہر مرکب و مؤلف کے لیے مرکب کرنے والا اور تالیف کرنا لازمی ہے اور جب کہ وہ جسم والا ہے تو جسم دینے والا اور جب وہ صورت والا ہے تو اس کو صورت دینے والا کوئی لازمی ہونا چاہیے تو ثابت ہو گیا کہ عالم کے لیے صانع 'مبدع' موجد' محدث ہے۔

اگر کہا جائے کہ ہمارے مشاہدہ میں آیا ہے کہ مثلاً بانی ایک مکان بناتا ہے تو ہم جان لیتے ہیں کہ ہر عمارت اسی طرح بانی کی محتاج ہے لیکن عالم میں اور اس کی بناء کو دیکھ کر دوسرے عالم کو نہیں دیکھا کہ اس کو کس نے بنایا تھا؟ یہاں تک کہ ہم حاضر پر غائب کو قیاس کر سکیں۔ ہم نے کہا کہ بناء عالم اور غیر عالم کی ایک طریقے اور نہج پر ہے اس لیے کہ بناء کی تعریف ترتیب اجزاء و ترکیب اشیاء یعنی بعض اجزاء کو بعض کے ساتھ ترکیب دینا اور جب کوئی شئی مرکب و مرتب ہوگی تو فرق نہیں پڑتا 'شئی چھوٹی ہو یا بڑی۔ علاوہ ازیں بناء عالم میں جو شاہد ہے 'عالم کی جنس سے ہے اور عالم کا جز ہے اور باوجود اس کے بغیر بانی کے نہیں بن سکتی تو اصل عالم بہ طریق اولیٰ بغیر بانی کے نہیں ہو سکتا۔

سوال: اگر کہا جائے کہ نطفہ قدیم طبع کے لیے ثابت ہے اور جسد قدیم ہے اور وہ اصل پیدائش نبت ہے اور طبع قدیم ہے وہ اصل عالم ہے۔

جواب: جو ابنا گزارش ہے کہ نطفہ قدیم ہو ہی نہیں سکتا اس لیے کہ نطفہ جسد سے نکلتا ہے اور جسد نطفہ سے اور نطفہ جسد سے تو سب سے پہلے جسد کس نطفہ سے ہوا؟ تو یہ سلسلہ الیٰ غیر النہایہ چلتا جائے گا۔

پھر اس پر دلیل کہ نطفہ قدیم نہیں ہے یہ ہے کہ نطفہ تغیر اور متغیر ہے اور تکوین اور متکون اور ہم نے بیان کیا ہے کہ تغیر و متغیر تکوین اور متکون حدث و محدث ہیں اور یہ معنی جسد میں موجود ہے۔

رہا یہ ان کا قول کہ طبع قدیم ہے تو اس سلسلہ میں ان کے ساتھ مناظرہ کا طریقہ یہ ہوا کہ جیسے کہ ”باب الطبائع والفلک“ میں ہم ذکر کر چکے ہیں۔

علاوہ ازیں ہم کہتے ہیں کہ طبع قدیم نہیں ہو سکتی اس لیے کہ اس میں تبدیلی اور انقلاب رونما ہوتا رہتا ہے انقلاب اور تحویل لازمی چیز ہے کہ حرکت سے ہوتا ہے اور حرکت عرض ہے اور عرض محدث ہے تو ایسے ہی محل متحرک بھی لازماً اسی حال پر ہوگا جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں۔

دوسرا قول

قدم کا بیان

جہان کا پیدا کرنے والا قدیم ہے

ہمارا اجماع ہے کہ عالم کا بنانے والا قدیم ہے اس لیے کہ اگر قدیم نہ ہو تو محدث ہوگا اور محدث کے لیے پھر صانع کی ضرورت ہے اس میں بھی یہی کلام جاری ہوگا کہ محدث ہے یا قدیم؟ اور یہ سلسلہ کہیں جا کر رکنے کا نہیں تو ثابت ہوا کہ صانع عالم قدیم سے حادث نہیں ہے۔ سوال: یہ ہے کہ اگر ہم یہ کہیں کہ صانع قدیم ہے تو قدم صفت ہوگی اور صفت و ذات (قدم و قدیم) ایک محل میں دو چیزیں مجتمع ہو گئیں اور ایسا ہونا محال ہے۔

جواب: جواباً عرض ہے کہ یہ جو کچھ تم نے ذکر کیا ہے یہ محدثات کی صفت ہے تو صفت عرض ہوگی وہ محتاج محل ہے اور ذات جو ہر ہے محتاج مکان ہے اور اللہ تعالیٰ کی صفات عرض نہیں اور نہ ذات باری تعالیٰ جو ہر کہ محل و مکان کی محتاج ہو تو ہم کہتے: وہ موجود ہے اور بغیر ممکن و حلول کے موصوف ہے تو یہ سوال ہی صحیح نہیں۔

ایک محل میں دو چیزوں کا جمع ہونا محال نہیں

دو چیزوں کا ایک محل میں پایا جانا محدثات میں محال نہیں ہے اس لیے کہ عرض و جوہر دو شئی ہیں اور وہ دونوں محل واحد میں ہیں پھر دو جوہروں کا وجود بھی ایک مکان میں جائز ہے۔

جیسے پانی مٹی میں حلول کیے ہوئے ہوتا ہے اور مٹی جو ہر ہے بذلتہ مکان میں مشتعل ہے اور پانی اس میں جذب و سرایت اور حلول کیے ہوئے ہے لیکن اسی مکان میں قرب اتصال کی بناء پر اس میں رچا اور سما یا ہوا ہے ایسے ہی روح میں۔

سوال: سوال یہ ہے کہ یہ تو بجا ہے کہ صانع قدیم ہے کیونکہ محدثات کا خود بخود معرض وجود میں آ جانا محال ہے لہذا اشیاء اپنے ظہور اور پیدائش میں پیدا کرنے والے کی محتاج ہیں اور اس قدیم کا ان محدثات و نو پیدائش پر تقدم بھی ضروری یہ سب باتیں مانتے ہیں لیکن صانع قدیم کو اشیاء محدثات پر ایک گھڑی کے لیے تقدم حاصل ہو جائے یہی کافی ہے باقی رہا اس سے زیادہ تو اس پر آخر کون سی دلیل قائم ہے؟ اور کس دلیل سے ثابت ہے کہ صانع قدیم ہے اور اس کو اشیاء پر ہمیشہ سے تقدم حاصل ہے؟

جواب: ہم کہتے ہیں کہ جب صانع کا اپنے قدم و وجود کے ساتھ مصنوعات و محدثات سے تقدم ثابت ہو گیا تو اس کا تقدم ہمیشہ کے لیے بھی ثابت ہو گیا اس لیے کہ اس پر تحویل و حدوث تو جائز ہی نہیں تو وہ بغیر ابتداء اور بغیر انتہاء کے قدیم ہوگا۔

اور علاوہ ازیں ہم یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ محدثات میں سے ایک قدم محدث ہے تو اول مدت اس کے حدوث پر دلالت کرے گی اس بناء پر وہ قدیم نہ ہوگا (پس اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے قدیم اور ہمیشہ قدیم رہے گا) بلکہ اول محدثات ہوگا اور محدث کا محتاج ہوگا تو یہ کہنا صحیح نہیں۔ نیز اس لیے کہ قدیم و محدث میں فرق چار وجہ سے ہوگا۔

قدیم اور محدث میں چار وجہ سے فرق

(۱) اللہ تعالیٰ کو ہم یہ نہیں کہتے کہ وہ اول و آخر ہے بلکہ ہم کہتے ہیں: وہی اول ہے بلا ابتداء اور وہی آخر ہے بلا انتہاء اور مخلوق کے لیے اول و آخر ہے۔

(۲) دوسری وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جنس و نوع سے پاک ہے اور مخلوق کے لیے جنس و نوع ہے۔

(۳) تیسری وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا حال متغیر نہیں ہوتا اور نہ اللہ تعالیٰ کو حال کے ساتھ موصوف کیا جاتا ہے جب کہ مخلوق کا حال متغیر ہوتا رہتا ہے اور مخلوقات حال سے موصوف ہوتی ہیں۔

(۴) اور چوتھی وجہ یہ ہے کہ مخلوق زمان و مکان میں ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ زمان و مکان اور جہات سے پاک و منزہ ہے۔

تو ہماری بات صحیح ہوئی اس کا قدم بلا ابتداء ہے اور ہمیشہ سے وہ قدیم بلا ابتداء ہے اور ہمیشہ باقی رہے گا جس کی کوئی انتہاء نہیں مقرر کی جاسکتی۔

اور اگر ہم یہ کہیں کہ اس کے قدم کی ابتداء ہے یا اس کی ہستی کی اول ہے تو آخر یہ بھی منسوخ ہوگا اس کے حدوث پر اس لیے کہ قبل وجود مقتضی ہے کہ وہ موجود نہ ہو یا نہیں تھا پھر ہوا تو اس صورت میں محدث ہوگا اور ایک دوسرے محدث کی طرف محتاج ہوگا اور یہ صحیح نہیں ہے تو ثابت ہوا کہ وہ موجود ہے بلا اول اور بلا ابتداء اور وہ باقی ہے بلا آخر و بلا انتہاء اور ثابت ہو گیا کہ وہ قدیم ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

تیسرا قول

وحدانیت کا بیان

خدا ایک ہے

جہاں کو پیدا کرنے والا اپنی ذات میں یکتا ہے اس کی صفات قدیم ہیں۔

اللہ تعالیٰ اپنی ذات و صفات میں قدیم ہے

دلیل: یہ ہے کہ ہم نے صانع کو صنع اور حدوث کی ضرورت سے ثابت کیا ہے کہ بغیر صانع مصنوع کا وجود نہیں ہو سکتا۔

اور یہ ضرورت ایک صانع سے مرتفع ہو سکتی ہے تو جہاں اپنے ظہور اور تخلیق میں دوسرے اور تیسرے خالق و صانع کی طرف محتاج نہیں رہتا اور دوسرے اور تیسرے صانع کے اثبات پر کوئی دلیل نہیں۔

سوال: کوئی شخص سوال اٹھاتا ہے کہ یہ تو سبب اور دلیل کا نہ ہونا ہے لیکن یاد رہے کہ سبب یا دلیل کا مفقود ہونا شئی کی نفی کے لیے دلیل قرار نہیں پاسکتی۔

دوسری بات یہ ہے کہ جب کوئی شئی ایک صانع کے اثبات پر دلیل بننے کی صلاحیت رکھتی ہے یا اس کے لیے کون سا امر مانع ہے کہ اسی طرح ثانی اور ثالث کے اثبات کے لیے بھی دلیل قرار پائے جیسے راستہ چلنے والے کے لیے دلیل ہے، اب خواہ اس پر ایک چلنے والا چلے یا دو تین یا زیادہ ایسے ہی سلا ہوا کپڑا درزی کے وجود پر دلیل ہے تو جائز ہے، کپڑے کو ایک شخص سے یا دو تین یا زیادہ۔

جواب: یہ ہم مانتے ہیں کہ کسی شئی کے اثبات پر دلیل اور سبب کا نہ پایا جانا اس شئی کی نفی کی دلیل نہیں ہوا کرتی، مگر جب وہ شئی دلیل سے معلوم و محسوس نہ ہو تو پھر وہ عدم (نہ ہونے) کے حکم میں ہوگی۔

تو جو چیز حکم عدم میں ہوگی اس کا نام بلا دلیل شئی وجود نہیں رکھا جاسکتا اور یہاں کوئی دلیل نہیں ہے تو پھر کہنا واجب نہ ہوا۔

باقی اس بات کا جواب (کہ جب ایک شے صلاحیت رکھتی ہے کہ وہ "صانع واحد" کے اثبات پر دلیل ہو سکتی ہے تو اس میں ثانی اور ثالث صانع کے اثبات پر دلیل بننے کی بھی صلاحیت ہوگی طریق و محیط کی مثل (استہ سلا ہوا کپڑا)) یہ ہے ایسی صورت وہاں ممکن ہوتی ہے جہاں ثانی و ثالث محال نہ ہو، لیکن جب استحالہ ظاہر ہو گیا کہ ثانی و ثالث صانع کا وجود محال ہے تو یہ واجب کرتا ہے اس کی نفی کو اور اس کا اثبات ناجائز ہے اس لیے کہ ہم بیان کر آئے ہیں کہ کسی شئی کے اثبات کا محال ہونا اس کی نفی کا موجب ہوتا ہے اور شئی کی نفی کرنا محال ہو تو یہ اس کے اثبات پر کھلی دلیل ہوتی ہے اور ثانی و ثالث کے اثبات میں استحالہ پایا گیا ہے تو اس سے لازم نہیں آتا جو تم نے کہا۔

وجہ استحالہ

دو خدا نہیں ہو سکتے، دلائل ملاحظہ ہوں:

اس کے محال ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اگر صانع دو خدا ہوں تو دو حال سے خالی نہیں، دونوں ایک دوسرے سے متصل ہوں گے یا منفصل ہوں گے، ایک دوسرے سے پہلی شق

۱۔ لہذا صانع کی وحدانیت سے دوسرے اور تیسرے صانع کی نفی نہ ہوتی تو یہ قول صحیح نہ ہوا۔

اختیار کرتے ہوئے ہم کہتے ہیں کہ اگر دونوں متصل ہیں تو ایک ہی ہوئے اس لیے کہ ان دونوں میں جدائی اور فاصلہ نہیں ہے اور اس وقت ہر ایک کی حد معلوم نہیں ہو سکے گی اور ہر ایک کی طرف اشارہ ممکن نہیں ہوگا تو دوسرے اور تیسرے خدا کے وجود کی بات کرنا محال ہوا ایسا ہونا ہی غلط ہے۔

دوسری شق پر بات

اور اگر دونوں متصل (جدا) ہوں گے تو جدائی اور ملنا دو چیزیں تحدید کو واجب کرتی ہیں اور محدود و مقدر کے لیے جنس و نوع ہوگی تو شبہ پیدا کرے گی پھر یہ بھی کہ محدود کی حد قائم کرنے والے اور مقدر کی تقدیر و اندازہ لگانے والے کی طرف احتیاج و ضرورت پڑے گی تو ایسی صورت میں دو میں سے ایک "خدا" نہیں ہوگا تو ثابت ہوا کہ خدا ایک ہی ہے۔

اعتراض: اگر کہا جائے دو صانع ہوں اور اس طرح کہ ہر ایک دوسرے سے نہ متصل ہے نہ منفصل۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے آپ کہیں کہ صانع (خدا) موجود ہے اور عالم (جہاں) موجود ہے اور صانع عالم نہ عالم سے متصل ہے اور نہ وہ عالم سے منقطع ہے تو ایسے ہی یہاں صورتِ حال ہے۔

جواب: یہ ہے کہ ہاں! یہ تسلیم کہ صانع بھی موجود ہے اور عالم بھی موجود ہے لیکن عالم صانع کی جنس سے نہیں ہے اور صانع عالم کی جنس سے نہیں (یعنی خدا اور جہاں دونوں ہم جنس نہیں ہیں) اور وصل و جدائی دو جنسوں یا دو نوعوں میں ہوتا ہے یا ایک جنس اور ایک نوع میں ہوتا ہے اور یہ اس جگہ نہیں پائے جاتے تو جب یہاں جنسیت و نوعیت نہیں تو ان دونوں میں فصل و وصل بھی ممکن نہیں، برخلاف ہمارے اس مسئلہ کے کہ اگر صانع (خدا) دو ہوں تو ہر ایک دوسرے کے ہم جنس ہوگا اور دو جنسوں میں اتصال جائز ہوگا۔ اب اگر ایک دوسرے سے اتصال ہوا تو ایک ہو جائے گا اور ایک دونوں ہم جنس نہیں ہیں تو اتصال نہ پایا گیا، جب اتصال نہ پایا گیا تو انفصال لازمی امر ہے جب انفصال ہوا تو یہ (انفصال) تحدید کو واجب کرتا ہے جیسا کہ ہم تفصیل سے بیان کر آئے ہیں۔

خدا کی وحدانیت پر دلیل

دوسرے اور تیسرے خدا کے استحالہ سے صانع کی وحدانیت پر دلیل یہ ہے، مثلاً گفتگو اسی طرح جاری کریں گے کہ فرض کرو! اگر دو صانع ہوں تو یہ دو حال سے خالی نہیں یا دو صانع مشترک طور پر ہوں گے یا جدا جدا طور پر تو اگر دو صانع بر سبیل اشتراک ہیں تو ہر ایک مکمل طور پر کارروائی کرنے کا مالک نہیں ہوگا اس لیے کہ جہاں (عالم) کا ہر جز دونوں میں نصف نصف طریق پر مشترک ہوگا اور حکماً ہر چیز میں دونوں صانع تصرف کرنے والے نہیں ہوں گے اس لیے کہ ہر ایک ایک جہت اور پہلو سے تصرف و کارروائی سے ممنوع قرار پاتا ہے اور جو کسی چیز میں تصرف کرنے سے ممنوع ہو وہ مقہور و مغلوب ہوتا ہے اور مقہور و ممنوع خدا نہیں ہو سکتا اور اگر ہر ایک متصرف (کارروائی کرنے والا) ہو ہر جز میں تو اس سے بھی بڑھ کر استحالہ لازم آئے گا اس لیے کہ ان میں سے اگر ایک کسی شخص کو مارنے کا ارادہ کرے اور دوسرا اسی شخص کو زندہ رکھنے کا ارادہ رکھتا ہے تو شخص واحد ایک ہی وقت میں زندہ بھی ہو اور میت بھی زندگی اور موت دونوں سے متصف ہو یہ محال اور ناممکن ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا" (الانبياء: ۲۲) کہ اگر زمین و آسمان میں اللہ کے سوا اور خدا ہوتے تو زمین و آسمان تباہ ہو جاتے۔

اعتراض: اگر کہا جائے کہ جائز ہے دو خدا ہوں اور دونوں میں اختلاف جھگڑا واقع نہ ہو اس لیے کہ حکمتِ کاملہ موجب اختلاف نہیں ہوا کرتی۔ پس دونوں قادر ہیں دونوں علیم ہیں حکیم ہیں صانع و خالق ہیں اور دونوں علی سبیل الکمال کامل ہیں۔

اب حکمتِ کاملہ کا تقاضا یہ ہوگا کہ جس چیز کو ایک چاہے گا اسی کو دوسرا چاہے گا اور جو چیز ایک جائز رکھے گا وہی دوسرا جائز رکھے گا تو اس طرح بمقتضائے حکمتِ کاملہ دونوں میں اختلاف واقع نہیں ہوگا۔

جواب: ہم نے جواب میں کہا کہ جب دونوں صانع قادر عالم حکیم اور کامل ہیں تو ان دو میں سے ایک کا ان صفات سے متصف ہونا کافی ہے تو دوسرے خدا کے ماننے میں کچھ فائدہ نہ ہو اور جب فائدہ نہیں ہوا تو مخلوق اس سے مستغنی ہوگی اور جس کی مخلوق کو حاجت نہ ہو مخلوق اس سے مستغنی ہو وہ خدا نہیں ہو سکتا اس لیے کہ معبودِ برحق جب

کہ تمام اشیاء کا صانع بھی ہو، خالق و رازق بھی ہو تو تمام اشیاء، جمادات، نباتات، حیوانات، جواہر و اعراض سب کے سب محتاج ہوں گے، اس کے قائم رکھنے سے قائم ہوں گے، اس لیے کہ زندہ اس کے زندہ رکھنے سے اور مردہ اس کے مارنے سے اور باقی اس کے باقی رکھنے سے باقی رہے گا اور موجود اس کی ایجاد سے موجود ہوگا اور معدوم اس کے ختم کرنے سے معدوم ہوگا اور تمام اشیاء کبھی بھی اس سے مستغنی نہیں ہو سکتیں، ہر حال میں اس کی محتاج ہیں اور جب کفایت و رعایت ایک خدا سے حاصل ہو سکتی ہے تو دوسرے خدا سے استغناء و بے نیازی ظاہر ہوگی۔ اس سے ہماری بات ثابت ہوگئی کہ دوسرا خدا موجود نہیں ہے، بس خدا صرف ایک ہی ہے وحدہ لا شریک یہ تقریر تو اس شق پر ہو رہی تھی جب کہ دونوں فعل میں مشترک ہوں اور جب دونوں میں افتراق ہو بایں طور کہ ہر ایک علیحدہ علیحدہ مخلوق کو پیدا کرے تو اس میں پہلے سے بھی زیادہ استحالہ ہے اور یہ پہلے سے بھی بہت بُرا ہے، اس لیے کہ بندہ جب جانتا ہی نہیں کہ اس کا خالق (پیدا کرنے والا) کون ہے؟ اس کو کس نے شکل و صورت بخشی ہے؟ اس کو روزی دینے والا کون ہے؟ کس نے اس کو حکم دیا؟ اس کو نیکی کا امر دینے والا کون ہے؟ اس کو بُرے کاموں سے منع کرنے والا کون ہے؟ تو نتیجہ یہ ہوگا کہ شک کی صورت میں (کہ میرا خالق کون ہے اور کون میرا رازق ہے؟) اس کا ایمان صحیح نہ ہوگا اور یہ محال اور ناممکن ہے اور اس پر دلیل کہ جو ہم نے کہا صحیح ہے، یہ آیت کریمہ ہے: "وَمَا كَانَ مَعَهُ مِنْ إِلَهٍ إِذَا لَذَهَبَ كُلُّ إِلَهٍ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَّ بَعْضُهُمْ عَلَى بَعْضٍ" (المؤمنون: ۹۱) اور اس کے ساتھ کوئی دوسرا خدا نہیں ہے اگر ہوتا تو ہر خدا اپنی مخلوق لے جاتا اور یقیناً ان میں سے ایک دوسرے پر با تکلف بلندی چاہتا، تو بطریق ضرورت معلوم ہو گیا کہ صانع ایک ہے، اس کا کوئی شریک نہیں اور اس کا کوئی مثل نہیں (جل جلالہ)۔

چوتھا قول

”ضد“ اور ”ند“ کا بیان

جان لو کہ اللہ تعالیٰ ضد اور ند سے پاک ہے۔

زیادہ بہتر ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کے اضداد و انداد سے پاک ہونے کی بحث اور گفتگو شروع کرنے سے پہلے ہم یہ جان لیں کہ ضد اور ند کسے کہتے ہیں؟
ضد کسے کہتے ہیں؟

ضد کی تعریف یہ ہے کہ وہ اپنی ضد (مقابل ذات) کے منافی ہو جب اللہ تعالیٰ کے لیے ضد ہوگی تو اس کے لیے اپنی ضد کی موجودگی میں باقی رہنا ممکن نہ ہوگا لہذا جس کے لیے ضد ہو وہ خدا نہیں ہو سکتا تو ثابت ہوا کہ خدا ضد سے پاک و منزہ ہے۔

ضد کہاں پائی جاتی ہے؟

ضد کا حکم عرض میں ثابت ہوتا ہے اور عرض میں ضد پائی جاتی ہے۔ جو اہر ذوات اور نفوس میں ضد نہیں پائی جاتی اور اللہ تعالیٰ عرض نہیں کہ اس کے لیے ضد ہو۔

اضداد کا وجود صرف اعراض میں کیوں ضروری ہے؟

اضداد کا وجود صرف اعراض میں اس لیے ضروری ہوتا ہے کہ ضد کا اپنی ضد کے ساتھ ایک ہی ساعت میں ایک محل میں باقی رہنا متصور نہیں ہے مثلاً رات کا دن کے ساتھ بیماری (مرض) کا تندرستی (صحت) کے ساتھ سیاہی کا سفیدی کے ساتھ (جو کہ آپس میں ضدیں ہیں) ایک وقت میں ایک محل میں ممکن اور متصور نہیں ہے۔

ہاں! ایک عین کا عین کے ساتھ باقی رہنا جائز ہے اور اسی طرح جوہر کی بقاء دوسرے جوہر کے ساتھ ایسے ہی نفس اور ذات ایک دوسرے کے ساتھ باقی رہ سکتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اعیان محل کے محتاج نہیں تو ہر عین اور جوہر اپنی شکل اور اپنے دائرہ میں ہوں گے جب کہ اعراض محل کے محتاج ہیں اور بغیر محل کے نہ باقی پائی جاتی ہیں اور نہ باقی رہ سکتی ہیں۔ پھر

جب محل ایک عرض میں مشغول ہے تو اس محل میں دوسرے عرض کا احتمال نہیں اور اگر دوسرا عرض طاری ہوگا تو وہ پہلے عرض کے زوال کا موجب اور باعث بن جائے گا جیسے سفیدی کپڑے میں عرض ہے تو ناممکن ہے سیاہی سفیدی کے ساتھ رہے، اسی ساعت اسی عین میں اس لیے کہ ایک عرض طاری ہوگی تو دوسری جو اس کی ضد ہے یقیناً زائل ہو جائے گی تو ثابت ہو گیا کہ اضداد فقط اضداد میں ثابت اور متصور ہو سکتے ہیں اور اللہ تعالیٰ عرض نہیں تو اس کے لیے اضداد ہوں یہ بھی جائز نہیں۔

اللہ تعالیٰ ”ند“ سے پاک ہے

ند کے کہتے ہیں؟ ند سے مراد شکل، مثل، جنس و شبہ ہے اور یہ سب اللہ تعالیٰ کے لیے محال ہیں اس لیے کہ اگر اس کے لیے مثل یا نظیر ہو، دو حال سے خالی نہیں، یا قدیم ہوگا یا حادث، اگر قدیم ہے تو دو حال سے خالی نہیں، یا اس کے ساتھ متصل و ملازم ہوگا یا اس سے یا مبائن (جدا) و منفصل ہوگا اور اتصال وحدت کو واجب کرتا ہے تو ایک ہو اور اس کی نظیر ثابت نہ ہوئی اور انفصال تحدید کو واجب کرتا ہے اور تحدید سرے سے وصف الوہیۃ ہی کی نفی کرتی ہے (یعنی تحدید معبود اور خدا ہونے کے منافی ہے) تو ثابت ہوا کہ دو قدیم نہیں ہو سکتے۔

اور اگر وہ ”ند“ حادث ہے تو وہ قدیم کی مثل اور نظیر نہیں ہو سکتا اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

”لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ“ (الشوریٰ: ۱۱) اس جیسا کوئی نہیں اور وہی سنتا دیکھتا ہے یعنی اس کی مثل کوئی شئی نہیں ہے۔

نظیر کس کی ہو سکتی ہے؟

علاوہ ازیں اس لیے کہ نظیر جنس کی جہت سے ہوتی ہے یا پھر صورت کی جہت سے ہوتی اور یہ جائز نہیں کہ اس کی جنس ہو، اس لیے کہ جنس ایسی دو چیزوں کے درمیان ہوتی ہے جو صوری اور معنوی لحاظ سے متفق اور ایک ایسی ہوں اور اللہ تعالیٰ کی صورت نہیں کہ کوئی متفق ہو، لیکن معنی تو اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اپنی صفات میں منفرد اور یکتا ہے، کوئی اس کے موافق اور شریک نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کی صفات قدیمہ ہیں اور دوسرے کی صفات حادث ہیں، لہذا حادث و قدیم میں موافق کیونکر ہو سکتی ہے؟ اس معنی کے لحاظ سے ہم کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ واحد ہے نہ اصل عدد سے اور نہ جنس عدد سے اس لیے کہ اس کے لیے جنس نہیں کہ ایک کو گن کر

اس کے ساتھ ملایا جائے اور شمار کیا جائے اس سے نہ وہ قابل شمار اور گنتی ہے اس لیے کہ اس کا ثانی نہیں تو ثابت ہوا کہ نہ اس کی جنس ہے اور نہ نوع۔

اعتراض: اگر کہا جائے کہ کیا یہ بات نہیں اللہ تعالیٰ شئی ہے؟ اور عالم بھی شے ہے تو شئییت (شے ہونے) کے ناطے اور حوالے سے جنسیت ثابت ہوگئی۔

جواب: اس سلسلہ میں عرض یہ ہے کہ عقل کا تقاضا تو یہی تھا کہ اللہ تعالیٰ پر ”نفس“ اور ”شے“ کا لفظ نہ بولا جائے اللہ تعالیٰ کے لیے ان الفاظ کا اطلاق کرنا جائز نہیں مگر دلیل سمعی (شرعی دلیل) یعنی قرآن مجید اور حدیث مبارکہ سے نفس اور شے کا اطلاق ثابت ہے۔

اور شرعی مسئلہ ہے کہ جو صفات متشابہہ دلیل سمعی سے ثابت ہوں ہم پر لازم ہے کہ اسے مانیں اور اس پر ایمان لائیں لیکن اس کی تفسیر ہم نہیں کرتے اور خصم اگر دلیل سمعی سے کچھ کہے تو ہم اس پر ایمان لائیں گے اور اگر نص کا انکار کرے یا سماع کا تو اس کو کوئی حق نہیں کہ ہم پر وہ چیز وارد کرے جس پر ہمارا ایمان نہیں تو ان سے مناظرہ اثباتِ وحی اور شرع کے ساتھ کرنا چاہیے جس کو کوئی متغیر نہ کر سکے تو ثابت ہوا کہ صانع کے لیے جنس نہیں اور جب اس کی جنس نہیں تو اس کا کوئی نظیر اور مثل نہیں اور یہ بھی جائز نہیں کہ اس کے لیے از روئے صورت کے کوئی نظیر ہو۔

صورت کسے کہتے ہیں؟

صورت سے مراد ترکیب و تالیف اور تقطیع ہے صورت کے یہ معنی مراد لینے پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد دلیل ہے: ”فَصُرْهُنَّ إِلَيْكَ“ (البقرہ: ۲۶۰) ”ای قَطْعُهُنَّ“ یعنی ان کو قطع کرو اور قطع (کاٹنا، ٹکڑے کرنا) مرکب و مؤلف (جمع کرنا) محتاج ہیں، مُقَطَّع (کاٹنے والا) مُرْتَب اور مؤلف کی طرف اور ان کا قدیم ہونا صحیح نہیں تو جو کچھ ہم نے کہا ثابت ہو گیا۔

اعتراض: اگر کہا جائے کہ نبی اکرم ﷺ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ ”إِنَّ اللَّهَ تَعَالَى خَلَقَ آدَمَ عَلَى صُورَتِهِ“ کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔ ایک روایت میں ہے: ”عَلَى صُورَةِ الرَّحْمَنِ“ کہ رحمن کی صورت پر پیدا فرمایا ان احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صورت ہے۔

جواب: ہم کہتے ہیں کہ ہاں! یہودیوں نے بھی ایسے ہی کہا تھا۔

اور اس کے کئی جواب ہیں: (۱) تمام انسان نطفہ سے پیدا ہوئے ہیں اور آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے ان کی صورت پر بغیر نطفہ کے پیدا فرمایا۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ ایک آدمی کے پاس سے گزرے وہ اپنے غلام کے چہرہ پر مار رہا تھا اور کہتا جاتا تھا کہ اللہ تعالیٰ تیرا منہ بُرا کرے اور ان کا چہرہ بھی بگاڑ دے جو تیرے چہرہ کے مشابہ ہیں تو حضور ﷺ نے فرمایا: جو شخص اپنے غلام کو مارے تو چہرے پر نہ مارے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو ان کی صورت پر پیدا فرمایا اور مستحق وعید اس لیے ہوا کہ اس نے انبیاء کرام کو گالی دی کیونکہ اس نے کہا: اللہ تعالیٰ اس کا چہرہ بُرا کرے جو شکل و صورت میں تیرے مشابہ ہو۔

تیسرا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو دنیا میں لغزش کے بعد اسی صورت پر بھیجا جو صورت لغزش سے پہلے تھی، صورت بدل کر دنیا میں نہیں بھیجا۔ آپ کی صورت کو نہ بگاڑا نہ بدلا، وہی صورت جو لغزش سے پہلے تھی باقی رکھی اور اب بھی ویسی ہی ہے بخلاف ابلیس، سانپ، مور کہ ان سب کی صورت اور آواز مسخ کر کے ان کو بھیجا۔

اور ”علیٰ صورة الرحمن“ کا جواب یہ ہے کہ اس صورت پر آدم علیہ السلام کو بھیجا جو صورت اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے خاص کر لی تھی۔

اعتراض: اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ حضور نے فرمایا کہ میں نے اپنے رب کو بہترین صورت میں دیکھا، تو اس سے بھی خدا کے لیے صورت ثابت ہوئی۔

جواب: یہ ہے کہ میں بہترین صورت میں تھا کہ اپنے رب کو دیکھا، اس لیے کہ عرب کہا کرتے تھے: ”رَأَيْتُ فَلَانًا رَاكِبًا“ میں نے فلاں کو دیکھا اس حال میں کہ میں سوار تھا یا وہ سوار تھا۔ ”راکبًا“ دونوں سے حال واقع ہوتا ہے۔

بعض نے اس کا جواب یہ بھی دیا ہے کہ دبی (ر کے زیر کے ساتھ) حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے غلام کا نام تھا تو معنی یہ ہوا میں نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے غلام ربی کو بہترین صورت میں دیکھا اور بعض نے کہا ربی راء پر پیش پڑھیں تو جنات

کے تابع کو کہتے ہیں وہ مجھ پر رکاوٹ پیدا کرنا چاہتا تھا، اللہ تعالیٰ نے مجھ کو اس کے شر سے محفوظ رکھا۔

ایک جواب یہ بھی ہے کہ ”رب“ کے معنی سید کے ہیں اور مراد یہاں جبریل علیہ السلام ہیں، معنی یہ ہوئے کہ میں نے جبریل کو بہترین صورت میں دیکھا، اس پر دلیل یہ آیت کریمہ ہے: ”اذْ كُرْنِي عِنْدَ رَبِّكَ“ ”اِنِّى عِنْدَ سَيِّدِكَ“۔

ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: ”رَأَيْتُ رَبِّي فِي سِلْكِ الْمَدِينَةِ وَعَلَيْهِ حَلَّةٌ حَمْرَاءُ وَفِي رِجْلَيْهِ نَعْلَانِ حِرَارَتَانِ“ میں نے اپنے رب (سردار) کو مدینہ کے گلی کو چوں میں دیکھا اور اس پر سرخ جوڑا تھا، اس کے پاؤں میں نری کی جوتیاں تھیں۔

ابو ہریرہ سے کہا گیا کہ ایمان لانے کے بعد کافر ہو گئے ہو؟ اس لیے کہ رب چلنے پھرنے سے منزہ اور پاک ہے، ابو ہریرہ مسکرا دیئے اور فرمایا: حسین ابن علی (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) کو دیکھا تو ثابت ہوا کہ ”رب“ سے مراد سید ہے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”رب“ سے مراد سید ہے اور ”سید“ سے مراد جبریل ہیں۔
اعتراض: اگر کہا جائے کہ حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن تجلی فرمائے گا، ایسی صورت میں کہ اہل موقوف اس کو نہیں پہچانیں گے، پھر دوسری صورت میں تجلی فرمائے گا تو اہل موقوف اللہ تعالیٰ کو پہچان لیں گے۔ اس سے ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی صورت ہے۔

جواب: یہ ہے کہ صورت سے مراد صفت ہے، تجلی جس صفت میں تھی اہل موقوف نہ پہچان سکے، جب دوسری صفت میں تجلی فرمائے گا تو پہچان لیں گے، کیا آپ دیکھتے نہیں عمونا کہا جاتا ہے: اس امر کی یہ صورت ہے، اس مسئلہ کی یہ صورت ہے، اس حادثہ کی یہ صورت ہے؟ یہاں صورت سے مراد صفت ہے، ایسے ہی حضور ﷺ نے صورت فرما کر صفت مراد لی ہے، اس لیے کہ دنیا میں بندے اللہ تعالیٰ کو جو دو کرم، عفو و درگزر کی صفات سے پہچانتے ہیں، قیامت میں اللہ تعالیٰ سیاست اور عدل و انصاف کو ظاہر فرمائے گا جیسے انشاق قمر اور ستاروں کا گرنا وغیرہ تو بندے عرض کریں گے: ان

صفتوں سے ہم نہیں پہچانتے ان صفات سے ہم نہیں پہچان سکتے۔ پھر اللہ تعالیٰ دوسری صفت سے تجلی فرمائے گا کہ اہل موقوف پہچان لیں گے۔ وہ صفت احسان، عفو و کرم، مغفرت ہے جس کے ساتھ اہل موقوف اللہ تعالیٰ کو پہچان لیں گے لہذا جو تم نے کہا وہ صحیح نہیں۔

دلیل کہ اللہ تعالیٰ کی صورت نہیں

دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "هُوَ اللَّهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ" (الحشر: ۲۴) وہی ہے اللہ پیدا کرنے والا بنانے والا اور ہر ایک کو صورت دینے والا اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کو مُصَوِّر فرمایا ہے اور جو مُصَوِّرِ وَاو کے زبر کے ساتھ پڑھے گا وہ کافر ہو جائے گا اس لیے کہ مصور کا محتاج ہوگا تو وہ قدیم نہ ہوگا۔

تو جو ہم نے کہا درست ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صورت نہیں بلکہ مصور ہے (صورت بنانے والا) اور اس کی نہ مثل ہے نہ نظیر نہ ضد ہے نہ ند "لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ" (الشوریٰ: ۱۱)۔

پانچواں قول

اینتیت کا بیان

اینتیت میں لوگوں کے مختلف اقوال ہیں۔ بعض جہمیہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر مکان میں موجود ہے اور جہمیہ نے ان آیات سے استدلال کیا ہے:

(۱) پہلی آیت "وَهُوَ الَّذِي فِي السَّمَاءِ إِلَهٌ وَفِي الْأَرْضِ إِلَهٌ" (الزخرف: ۸۴) اور وہی آسمانوں میں خدا ہے اور وہی زمینوں میں خدا ہے۔

(۲) دوسری آیت "وَهُوَ اللَّهُ فِي السَّمَوَاتِ وَفِي الْأَرْضِ" (الانعام: ۳) اور وہی اللہ ہے آسمان اور زمینوں میں۔

(۳) تیسری آیت: "إِنَّ اللَّهَ مَعَ الَّذِينَ اتَّقَوْا وَالَّذِينَ هُمْ مُحْسِنُونَ" (النحل: ۱۲۸) بے شک

اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ ہے جو ڈرتے ہیں اور جو نیک کام کرتے ہیں۔
 (۴) چوتھی آیت: ”مَا يَكُونُ مِنْ نَجْوَى ثَلَاثَةٍ إِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ إِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ“ (المجادلہ: ۷) جہاں کہیں تین شخصوں کی سرگوشی ہو تو چوتھا وہ موجود ہے اور پانچ کی ہو تو چھٹا وہی ہوتا ہے۔
 ان آیتوں کا جواب یہ ہے:

پہلی آیت کا جواب یہ ہے کہ آسمان اور زمین والوں کا ایک الہ (معبود ہے)۔

دوسری آیت کا جواب یہ ہے کہ آسمان و زمین اللہ تعالیٰ کی تدبیر ہے۔

تیسری آیت کا جواب یہ ہے کہ یعنی مدد و نصرت اور توفیق کے ساتھ۔

چوتھی آیت کا جواب یہ ہے کہ یعنی اللہ تعالیٰ ان کی گفتگو کو سنتا ہے اور ان کے افعال کو دیکھتا ہے، ہم ان آیتوں کا یہ مطلب لیتے ہیں۔ پھر ہم کہتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ ہر مکان میں ہے تو معاذ اللہ وہ حیوانات کے مونہوں میں ہے اور کتوں کے منہ میں اور معاذ اللہ عورتوں کی شرم گاہوں میں بھی ہے اور لونڈیوں کی اندام نہانی میں اور یہ کفر قبیح ہے بدترین کفر ہے نہایت شنیع و غلیظ اور گندی بات ہے۔

جہمیہ اور معتزلہ کا نظریہ

جہمیہ اور معتزلہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ عرش پر ہے اور اس کے اور عرش کے درمیان ہوا ہے اور انہوں نے کہا: اللہ تعالیٰ جسد ہے لیکن جسد کا مطلب انہوں نے نہیں بیان کیا اور یہ کفر ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ عرش پر ہوگا تو یہ موجب تحدید ہے اور تحدید موجب تصویر ہے اور یہ ہم بیان کر چکے ہیں۔

فرقہ متحشفہ

فرقہ کرامیہ کی ایک شاخ متحشفہ ہے وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے عرش پر قرار پکڑا۔ یہ حضرات اپنے دعویٰ پر استدلال کرتے ہیں اس روایت سے جسے کلبی نے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے اس آیت ”الرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰی“ (طہ: ۵) کی تفسیر میں فرمایا: اللہ نے عرش پر استقرار پکڑا ایک روایت میں ”اِمْتَلَا الْعَرْشَ مِنْهُ“ عرش اللہ تعالیٰ سے بھر گیا“ کے الفاظ بھی آتے ہیں کہ عرش اس سے بھر گیا۔

جواب یہ ہے کہ ”اِسْتَقَرَّ الْعَرْشُ مِنْ خَشِيَّتِهِ“ کہ عرش نے خشیتِ الہی سے قرار پایا اور ٹھہر گیا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم سے سوال کیا گیا: ”اَيْنَ كَانَ رَبُّنَا قَبْلَ اَنْ يَخْلُقَ الْعَرْشَ؟“ حضرت علی نے فرمایا: ”اينَ سَوالِ عَنِ الْمَكَانِ؟ كَانَ اللهُ وَلَا مَكَانَ وَهُوَ الْاَنَ كَمَا كَانَ“ کہ لفظ ”اين“ مکان کے بارے میں سوال کے لیے آتا ہے اور اس وقت بھی تھا جب مکان نہ تھا اور وہ ”الآن کما كان“ اب بھی ایسا ہی ہے جیسے پہلے تھا۔

حضرت مالک بن انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کسی نے آیت ”الرَّحْمَنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوَى“ (ط: ۵) کی تفسیر پوچھی، امام مالک نے فرمایا: ”استوی“ غیر مجہول ہے اور کیفیت غیر معقول ہے اور اس پر ایمان واجب ہے اور سوال اس سے بدعت ہے، آپ نے فرمایا: میں تجھ کو (مائل) گمراہ سمجھتا ہوں اور آپ نے حکم دیا کہ یہ شخص گمراہ ہے، اس کو یہاں سے نکال دو، چنانچہ اس کو وہاں آپ کے پاس سے نکال دیا گیا اور کچھ نہ کہا یعنی معاف کر دیا پھر اچانک معلوم ہوا کہ سوال کرنے والا جہم ابن صفوان تھا۔

توحید تین قسم کی ہے

حضرت امام جعفر ابن محمد الصادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: توحید تین قسم پر ہے، معلوم ہونا چاہیے: اللہ تعالیٰ جل شانہ کسی شئی میں نہیں، اور کسی شئی سے نہیں اور کسی شئی پر نہیں۔

امام اعظم ابو حنیفہ کا ارشاد مبارک

ابو مطیع بلخی نے فرمایا کہ میں نے حضرت ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے دریافت کیا: اس شخص کے بارے میں جو یہ کہتا ہے کہ میں نہیں جانتا کہ اللہ کہاں ہے؟ تو امام ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: اس کی تکفیر کی جائے گی اس لیے کہ اس نے اللہ تعالیٰ کو ہر مکان کے ساتھ متصف کیا ہے۔

ابو مطیع نے کہا: کیسے تکفیر کی جائے گی؟ فرمایا: اس لیے کہ اس نے نص کے خلاف کہا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ”الرَّحْمَنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوَى“ (ط: ۵) ابو مطیع نے کہا: کس طرح استوی فرمایا؟ آپ (امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ) نے فرمایا: ”اِمْنُوا بِهَا كَمَا جَاءَ“ جس طرح قرآن مجید میں وارد ہوا اس پر ایمان لاؤ اور جواب یہ ہے کہ وہ ”الہ“ تھا اور مکان نہ تھا۔

ابوشکور سالمی (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) فرماتے ہیں: جائز ہے کہ امام اعظم حضرت سیدنا ابوصیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس لیے تکفیر فرمائی ہو کہ وہ اللہ تعالیٰ کی معرفت سے جاہل رہا، جب ہی تو کہا: ”لَا اَذْرٰی“ اور جو معرفتِ الہی سے جاہل ہے وہ کافر ہے۔
دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے لیے ایبیتہ (مکانیت) کا اعتقاد رکھتا ہو اور وہ یہ نہیں جانتا کہ جو اللہ تعالیٰ کے لیے ایبیتہ کا اعتقاد کرے وہ کافر ہے۔

روسیدا و مناظرہ

ابوشکور سالمی کا فرقہ متحشفہ کے ساتھ مناظرہ کی روسیادا

مصنف (ابوشکور سالمی رضی اللہ تعالیٰ عنہ) فرماتے ہیں: میں نے متحشفہ کے ساتھ اس مسئلہ میں مناظرہ کیا، مجھ سے اس نے پوچھا۔

سائل: اللہ تعالیٰ موجود ہے؟

مجیب: میں نے جواب دیا کہ بے شک وہ موجود ہے لیکن اور موجودات کی مثل نہیں۔

سائل: پھر اس نے سوال کیا کہ جب اللہ تعالیٰ نے اس عالم اور مخلوقات کو پیدا کیا تو اپنے اوپر پیدا کیا یا آگے؟ دائیں یا بائیں؟ یا نیچے؟ اور یہ جائز نہیں کہ کہا جائے: عالم صانع کے اوپر ہے یا اس کے مقابل ہے اس لیے کہ یہ واجب کرتا ہے اللہ تعالیٰ کے عقل میں محدود ہو جانے کو۔

مجیب: جواباً ہم نے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ فوق العالم ہے ارشاد خداوندی ہے: ”وَهُوَ الْقَادِرُ فَوْقَ عِبَادِهِ“ (الانعام: ۱۸) وہ ہی اپنے بندوں پر غالب ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ عالم سے پہلے موجود تھا، تو ہم کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ محدود ہے یا غیر محدود ہے؟ کیونکہ اگر تو کہے کہ اللہ تعالیٰ محدود ہے تو تم نے صانع نہیں پہچانا، اس لیے کہ محدود مقدر ہے اور مقدر مصنوع ہے اور مصنوع صانع نہیں۔

اللہ جسم اور جوہر نہیں ہے

اس کے علاوہ ہم کہتے ہیں کہ جسد جسم اور جوہر کے لیے ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ اس سے منزہ ہے اور جب ثابت ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ غیر محدود ہے تو تمہارا سوال باطل ہو گیا، اس لیے کہ جب اس کے لیے حد و نہایت نہیں تو اس کو فوق و تحت (اوپر نیچے) کے ساتھ موصوف نہیں

کر سکتے اور اصح یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ صانع العالم ہے اور وہ نہ عالم میں ہے اور نہ عالم سے خارج ہے اس لیے کہ اگر ہم کہیں کہ عالم میں ہے تو عالم سے چھوٹا ہوگا اور اس کا مکان و ظرف میں ہونا لازم آئے گا تو یہ کفر ہے اور اگر ہم کہتے ہیں کہ وہ عالم سے خارج ہے پھر سوال پیدا ہوا کہ متصل بالعالم ہے یا منفصل عن العالم؟ تو اگر پہلی شق پر بات کرتے ہیں اور اس کو متصل بالعالم مانتے ہیں تو وہ جنس عالم سے ہے اور وہ عالم ہو اور عالم مع اجناس مصنوع ہو، صانع نہ ہو۔

اور اگر ہم کہیں کہ عالم سے مبائن و منفصل ہے تو بینونت سے مراد قطع اور فصل ہے اور یہ واجب کرے گا تحدید کو اور محدود و مقدر ہے اور مقدر صانع نہیں ہوتا اس لیے ہم نے کہا کہ صانع عالم بلا ایۃ اور بلا کیفیت ہے۔

چھٹا قول

ماہیت کا بیان

جب تم کسی شئی کی پہچان کرنا چاہو تو سب سے پہلے اس کی ماہیت کو معلوم کرو پھر اس کی کیت (تعداد) و کیفیت کو دریافت کرو اس کے بعد اس کی لیت کو دریافت کرو لیکن صانع جل شانہ کی معرفت ان معانی کے بغیر حاصل ہوتی ہے اور وہ ذات ”ہل“ (کیا) اور ”ما“ (کیا) اور ”کیف“ (کیسے) اور ”متی“ (کب) اور ”این“ (کہاں) اور ”لم“ (کس لیے) سے مستغنی اور بے نیاز ہے۔

خدا بے نیاز ہے

دلیل: یہ جو ہم نے کہا کہ وہ ”ہل“ ”ما“ ”این“ ”متی“ ”کیف“ اور ”لم“ سے مستغنی اور بے نیاز ہے یہ اس لیے کہ ہر حادث مصنوع ہے اور محدث و صانع سے مستغنی نہیں ہے اور شئی کی ہلیت و ماہیت سے سوال کی احتیاج وہاں ہوتی ہے جب کہ اس کے ثبوت کے لیے کوئی دلیل نہ ہو یا باوجود آیات کے بھی معلوم نہ ہو اور اللہ تعالیٰ معلوم ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ وہ تمام عالم کا

صانع اور پیدا کرنے والا ہے۔ اپنی آیاتِ قدرت اور دلائلِ صنعت سے وہ معلوم ہے لہذا وہ محتاج نہیں کہ سوال کیا جائے اور ہم کہیں: ”ہل“ ہو؟ اور نہ وہ اس کا محتاج ہے کہ ہم یہ کہیں کہ ”ماہو“؟

ماہیت کسے کہتے ہیں؟

اس لیے کہ ماہیت عبارتِ جسم و جوہر و عرض سے یہ اشیاءِ حادث ہیں اور صانع عالم جل مجدہ حادث نہیں ہے۔

تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ ”ماہو“؟ اور نہ یہ جائز ہے کہ ہم کہیں ”کم ہو“؟ اس لیے کہ کیت واجب کرتی ہے اعداد کو اور عدد واجب کرتا ہے اجناس کو اور یہ محدثات کی صفات ہیں اور صانع کی کوئی جنس نہیں تو ہم نہیں کہہ سکتے ”کم ہو“؟ اور یہ کہنا بھی جائز نہیں کہ ”کیف ہو“؟ اس لیے کہ کیفیتِ ماہیت اور کیتِ دلوں کے ساتھ ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ ان چیزوں سے منزہ ہے اور یہ بھی کہنا جائز نہیں کہ ”لم ہو“؟ کہیں اس لیے کہ لمیۃ طلب علت ہے اس کے اثبات کے لیے اور علتِ اختصاص کے لیے اور تخصیص واجب کرتی ہے جنسیت کو یہاں تک کہ دو جنسوں میں سے ایک کو خاص کریں علت سے اور احد الجنسین اس علت سے مخصوص ہو جائے گی اس لیے کہ جائز ہے کہ اس کی جنس خاص و عام ہونے میں اس کی مثل ہو اور صانع کے لیے کوئی جنس نہیں یہاں تک کہ وہ اپنی اجناس سے تخصیص کے لیے علت کا محتاج ہو اس لیے کہ علت جائزات (ممکنات) میں ہوتی ہے اور اثباتِ صانع بلا علت واجب ہے اور تمام ادیان مسئلہ ماہیت سے نکلے ہیں۔

علت کسے کہتے ہیں؟

فلاسفہ کہتے ہیں: صانع علت ہے مگر قدیم کے لیے نہیں اس لیے کہ مصنوعات کی علت اس کا صنع ہے اور یہ کفر ہے اس لیے کہ علت لغت میں اس حال کو کہتے ہیں جو محل میں حلول کر کے اس کے تغیر کا موجب بنے یعنی حال کے حلول کی وجہ سے محل متغیر ہو جائے۔

اور باری تعالیٰ عز اسمہ کا حلول کسی شئی میں جائز نہیں تو صانع کو ”علت“ کہنا جائز نہیں یہ کہنا بھی جائز نہیں کہ ہر شئی کی علت اس کا صنع ہے اس لیے کہ صنع اس کی صفت ہے جو جدا نہیں ہو سکتی اور کسی محل میں حلول نہیں کر سکتی اور یہ بھی جائز نہیں کہ وہ علت ہو۔

فرقہ مشبہہ کا ماہیت کے بارے میں نظریہ

بعض مشبہہ کہتے ہیں کہ باری تعالیٰ نور ہے چمکدار۔ اس آیت سے دلیل لاتے ہیں:

”اللَّهُ نُورُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ“ (النور: ۳۵) اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے اور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”يَا نُورَ النُّورِ“ اے نور کے نور! اور ارشادِ خداوندی ہے: ”إِنِّي أَنسْتُ نَارًا“ (النمل: ۷) میں نے ایک آگ دیکھی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: ”ذَلِكَ نُورُ رَبِّ الْعِزَّةِ“۔ ہم نے کہا کہ آیت اور حدیث میں ”نور“ بہ معنی منور (روشن کرنے والا) ہے۔ بعض نے کہا: نور بہ معنی ہادی ہے اور رہا ابن عباس کا فرمانا کہ ”نُورُ رَبِّ الْعِزَّةِ“ تو اضافت ایسی ہی ہے جیسے ”نَاقَةُ اللَّهِ، بَيْتُ اللَّهِ“ میں ہے۔

محققہ اور نظریہ ماہیت

محققہ کہتے ہیں کہ صانع جو ہر موجود قائم بذاتہ ہے۔ جو موجود قائم بذاتہ ہو اس کا جوہر ہونا ضروری ہے یہ صحیح نہیں، اگر کوئی اس کا اعتقاد رکھے تو کافر ہے اس لیے کہ جوہر کے لیے شکل و دائرہ ہوتا ہے اور اندرونِ دائرہ اس سے مزاحم ہوتا ہے اور اس کی شکل و محل غیر سے مزاحم ہوتی ہے۔

پھر جوہر کی تعریف یہ ہے کہ جو غلظ و عمق (موٹاپے اور گہرائی) کی صفت سے متصف ہو اور اللہ تعالیٰ اس سے منزہ و پاک ہے کہ اس میں غلظ و عمق (یعنی موٹائی اور گہرائی) ہو اور عمرو بن صفوان (جو بصرہ میں ہوئے ہیں) نے کہا: اللہ تعالیٰ ایک کیفیت ہے جنت میں رؤیت کے وقت ظاہر ہوگی اور یہ کفر ہے اور ان کے ساتھ مناظرہ کا حق یہ ہے کہ ان سے پوچھو کہ جوہر جب کہ زندہ ہے تو بتاؤ کہ مذکر ہے یا مؤنث؟

اور تانیث صفات نقص سے ہے تو واجب ہوا کہ مذکر ہو اور جب مذکر ہوگا تو ضروری ہے کہ اس میں تمام صفات مذکر ہونے کی موجود ہوں، مردوں کا سا جمال، ڈاڑھی، مونچھ، آلہ تناسل، خصیتیں وغیرہ سب چیزیں پائی جانی چاہئیں، جیسے بعض کرامیوں نے تمام صفات خدا کے لیے ثابت کی ہیں اور جو اللہ تعالیٰ کو ان صفات سے موصوف کرے وہ عارف باللہ نہیں ہے اپنے قول میں کافر ہے۔

محققہ اور بعض حشوہ کا مسلک

بعض حشوہ اور محققہ کہتے ہیں کہ صانع جسم ہے اور جسموں کی طرح ہے۔

حشوہ کے نزدیک جسم کی تعریف

ان کے نزدیک جسم کی تعریف یہ ہے: جسم اس کو کہتے ہیں جو اپنے وجود میں منفرد ہو اور محل سے مستغنی ہو۔

ہم نے کہا کہ تم نے جسم کی جو تعریف بیان کی ہے یہ تعریف نہ سماعاً ثابت ہے اور نہ اجماع سے اس کا ثبوت ملتا ہے اور امت وائمہ میں سے کسی نے یہ تعریف نہیں کی اور اس کا فساد نص سے ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسم جنس کا اطلاق کیا اور اس کی طرف اشارہ کیا جس کے لیے ترکیب و تالیف تجزیہ و تبعیض ہے تو جائز نہیں کہ صانع کو جنس کہا جائے۔
اعتراض: اگر کہا جائے کہ شئی جسم ہو اور اس کی ترکیب و تالیف نہ ہو کہ شئی تجزیہ جب ایک ایک جز جدا ہو اور بعض بعض ہو جائے جو محسوس ہو یہاں تک کہ تجزیہ کرتے کرتے اس حال میں ہو جائے کہ اس کی تجزیہ نہ ہو سکے تو جسم ہو گا مگر مرکب و مؤلف نہیں اور قابل تجزیہ نہیں تو ”جز لا یتجزی“ ہو گیا۔

جواب: ہم نے کہا کہ یہ جز اگرچہ قابل تجزیہ نہیں اس لیے کہ بوجہ صغر (چھوٹا ہونے کی وجہ سے) کے تجزیہ نہیں ہو سکتی لیکن جس کی تجزیہ ہو سکتی ہے اس کی جنس سے ہے اور اگر تنصیف نہیں ہو سکتی لیکن اس میں آدھا آدھا ہو جانے کا احتمال اور گنجائش تو ہے۔
اب سنو! ہر وہ شئی جس کے لیے جنس ہو تو ضروری ہے کہ اس کے لیے قطع اور فصل ہو تو وہ محدود ہو گا اور ”الہ“ ہونے کی صلاحیت نہ ہو گی پھر وہ جز جس کی تقسیم نہیں ہو سکتی کم از کم نقطہ ہو گا اور اس کے لیے اس کی مثل جنس ہے اور دو نقطے جب جمع ہو جائیں تو مادہ مثل الف کے بن جائے گا اور اس کی مثل کا بھی احتمال ہے جانب ثانی اور ثالث و رابع میں تو پھر شکل بن جائے گا یا دائرہ تو نقطہ اول اگرچہ قابل تجزیہ نہیں مگر وہ اصل اشکال ترکیب ہے تو جائز نہیں کہ صانع ”جز لا یتجزی“ ہو یا جسموں کی طرح ایک جسم ہے۔
طبائعہ (نیچریہ) کہتے ہیں: صانع وہ طبع و ہوا ہے اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

منجمہ کا نظریہ

منجمہ کی بارہ شاخیں ہیں اور یہ حضرات کہتے ہیں کہ صانعِ فلک ہے۔ بعض کہتے ہیں: فلک ایک ہے اور بعض کہتے ہیں: دو ہیں، پچیس تک ہر ایک نے اپنے اپنے اعتقاد اور عقیدہ کے مطابق افلاک میں سے ہر ایک کا الگ الگ نام رکھا ہوا ہے۔ یہ حضرات کہتے ہیں کہ خیر، شر، سعد، نحس انہی مخصوص ناموں میں سے ہیں۔

بعض نے فلک اثر نام رکھا ہے اس لیے کہ اسی سے تاثیر ہے۔ بعض نے مدبر نام رکھا ہے کہ انتظام و تدبیر اسی سے ہے اور بعض نے محیط نام رکھا ہے کہ ہر شئی کو گھیرے ہوئے ہے اور بعض نے اس کا نام فلکِ اعظم رکھا اور بعض نے فلکِ اعلیٰ اور ان کا ذکر ہو چکا ہے۔

فرقہ تناخہ کا مسلک

تناخہ کہتے ہیں کہ صانعِ روح ہے اور اس کی تین قسمیں ہیں: (۱) کلی (۲) ایک جزئی (۳) ایک مواصلی۔

جزئی وہ ہے کہ جو حیوانات سے متصل ہے اور اس سے حیات، سمع، بصر، عقل و قوت پیدا ہوتے ہیں۔

اور مواصلی وہ نفس ہے جو روح سے متصل ہے جیسے خبر، کل سے متصل ہے، حیات اس کے سبب سے باقی رہتی ہے اس لیے کہ کل سے جز کی طرف حیات پہنچاتی ہے، جب انسان مر جاتا ہے تو جز کل کی طرف لوٹ جاتی ہے اور یہ کفر ہے، ان سب کا جواب پہلے دے دیا گیا، اس لیے کہ جائز نہیں کہ صانعِ متجزی یا کسی شئی میں حلول کرے۔

اور بعض نے کہا کہ اللہ تعالیٰ قدیم نہیں بلکہ قدیم وہ ہے جو اس سے پہلے ہے، اس کا اسم ”الاول“ ہے، اس پر دلیل ”هو الاول“ ہے اس لیے کہ ”اول“ کے ساتھ ”هویت“ کا ذکر کیا ہے اور یہ اشارہ عین سے عین کی طرف ہے۔ پس ثابت ہوا کہ اس سے پہلے ”اول“ تھا اور ”اول“ نے اللہ کو پیدا کیا اور پھر اللہ نے تمام چیزوں کو پیدا کیا اور فعل، صنع و تکلم وغیر سب کو پیدا کیا ہے۔ ”فرقہ الاولیاء“ کا نظریہ ذکر ہوا ہے جو سراسر بدترین کفر ہے۔

”ہو الاول“ کی دلیل کا جواب

اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”ہو الاول“ اس سے ارادہ کیا ہے ”علی سبیل المغابۃ“ اور ذکر بر طریق غائب تعظیم و احتشام کے لیے ہے اور یہ ایسے ہی ہے جیسے تم بھی کہتے ہو کہ ”اِنَّا اَنْزَلْنَا الْيَكِ الذِّكْرَ“ (انحل: ۴۳) اور ہم نے آپ کی طرف ذکر نازل کیا۔ یہاں جمع کے طور پر ذکر فرمایا اور یہ سب کو معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ جمع نہیں اور وہاں تفرقہ نہیں تو جس طرح یہ صیغہ جمع نہیں بلکہ واحد ہے جو معظم لفظ کے طریق پر استعمال ہوتا ہے تو ایسے ہی یہاں ”ہو الاول“ بھی ”ہو“ تعظیم کے لیے ہے۔

اللہ کی خالقیت کے بارے مجوسیوں کا عقیدہ

مجوسیوں کا عقیدہ یہ ہے کہ خیر اور شر دونوں کا خالق (پیدا کرنے والا) الگ الگ ہے گویا کہ ان کے نزدیک دو خدا ہیں ایک برائی کو پیدا کرتا ہے اور دوسرے نے خیر اور نور کو پیدا کیا چنانچہ مجوسیوں نے کہا کہ خیر و نور کو پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے اس کا نام ”یزداں“ ہے اور شر برائی اور تاریکی کا پیدا کرنے والا ابلیس ہے اس کا نام ”انہرمن“ ہے اور یہ کفر ہے اس لیے کہ ابلیس کا خالق شر ہونا اگر مان لیا جائے تو پھر اللہ تعالیٰ کا ”الہ“ ہونا صحیح نہیں ہوگا اس لیے کہ جب وہ شر کا ارادہ نہیں کرتا اور نہ وہ خالق شر ہے لیکن وہ اس پر تو قادر ہے کہ ابلیس کو شر کے پیدا کرنے سے روکے اور بمقتضائے حکمت واجب ہے ملک کو ان باتوں سے محفوظ رکھے جن باتوں کا وہ ارادہ نہیں کرتا اور اپنی ذات سے ان مقالات قبیحہ کو روکے اور کفر و شرک کو اپنے نفس سے منع کرے اور جب وہ قادر بھی ہے کہ اپنے ملک کو ناپسندیدہ چیزوں سے اور مقالات قبیحہ سے روکنے کی اس کو قدرت ہے اور پھر نہیں روکتا تو سفاہت اور بے وقوفی ہے اور اگر وہ ابلیس کو روکنے سے عاجز ہے تو قادر نہ ہوا اور بھی جواب ہے (جو اصل میں فرقہ قدریہ کا رد بھی ہے)۔

فرقہ قدریہ کا نظریہ الوہیت و خالقیت

قدریہ فرقہ والے یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ بندے اپنے افعال کے خالق ہیں (ان کی تردید یہ ہے کہ) اگر بندہ کسی چیز کے پیدا کرنے پر قادر ہوتا تو اپنا مثل پیدا کر لے یا اپنے لیے مال پیدا کر لے اور جب وہ اپنی مثل اور مال پیدا کرنے پر قادر نہیں تو ایسے ہی تمام اشیاء

کے پیدا کرنے سے عاجز ہے۔

فرقہٴ مثنویہ کے دو خدا ”لاہی“ اور ”لاہو“ ہیں

مثنویہ فرقہ کے ماننے والے کہتے ہیں کہ خنزیر (سور) کا پیدا کرنے والا اللہ ہے اور وہ ”لاہی“ ہے جب کہ شرکاً پیدا کرنے والا اس کا غیر ہے اس کا نام ”لاہو“ ہے اس کا جواب پہلے دیا جا چکا ہے۔

یہودیوں اور عیسائیوں کا عقیدہ الوہیت

یہودیوں نے کہا کہ حضرت عزیر اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں اور نصاریٰ کہتے ہیں: حضرت مسیح اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں اور یہ کفر ہے اس کا مفصل بیان ان شاء اللہ عنقریب ہم کریں گے۔

اباحیہ اور ممانعیہ فرقوں کا نظریہ

اباحیہ اور ممانعیہ کہتے ہیں کہ بندہ جب غایتِ محبت کو پہنچتا ہے اور اللہ کی عبادت حقیقتاً کرتا ہے تو اللہ اس میں حلول کر جاتا ہے اس وقت اس کا نام ”ربانی“ ہو جاتا ہے پھر وہ کائنات کے علم جانتا اور غیب کو جانتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”كُونُوا رَبَّانِيِّنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُونَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُونَ“ (آل عمران: ۷۹) یعنی تم اللہ والے ہو جاؤ اس سبب سے کہ تم کتاب سکھاتے ہو اور اس سبب سے کہ تم کتاب پڑھتے ہو اور یہ کفر جلی ہے کسی پر مخفی نہیں۔

حلوئیہ، مانویہ، حقانیات (جو کہ بلادِ ترک میں پائے جاتے ہیں) فرقوں کے عقائد و نظریات حلوئیہ، مانویہ اور حقانیات بلادِ ترک سے ہیں یہ حضرات کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر شاہد میں حلول کیے ہوئے ہیں۔

بعض روافض کا عقیدہ

روافض کی ایک شاخ ہے جسے عالیہ کہا جاتا ہے انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم میں حلول کیا، پھر آسمان کی طرف لوٹ گیا اور یہ کفر ہے۔

ساتواں قول

مُتَرَبِّی (یعنی مدعی ربوبیت) کا بیان

مسئلہ: مخلوق میں سے جو شخص مدعی ربوبیت (یعنی خدائی کا دعویدار) ہو اور بغیر سحر و جادو کے خوارقِ عادات دکھائے اور مخلوق اس کی مثل لانے سے عاجز ہو آیا یہ جائز ہے اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہے یا نہیں؟

جواب: بعض اہل علم نے فرمایا کہ یہ بات خدا کی طرف سے جائز نہیں وہ کسی شخص کو ایسے کھلے بندوں چھوڑ دے کہ وہ خدائی دعوے کے ساتھ شعبدہ بازیاں کرے اور لوگوں کو سحر و جادو کے بغیر خوارقِ عادات امور دکھائے کہ مخلوق عاجز آ جائے اور اس کا مقابلہ نہ کر سکے اس لیے کہ دیکھنے والے کو شبہ ہو جائے گا کہ یہ جادو کے بغیر ایسے امور دکھا رہا ہے تو اس پر حق و باطل مشتبہ (گڈڈ) ہو جائے گا اور اگر وہ خوارقِ عادات دیکھ کر ایمان لے آئے اور اس کی ربوبیت کا اقرار کرے تو وہ معذور ہوگا حالانکہ یہ بات جائز نہیں۔

اور عام فقہاء نے فرمایا: بمقتضائے حکمت جائز ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو جو ربوبیت کا دعویٰ کرتا اور خوارقِ عادات افعال دکھاتا ہے اور لوگ اس جیسی چیز لانے سے عاجز ہوں کیونکہ اس میں مخلوق کا امتحان اور آزمائش ہے۔

دلیل جواز: قصہ فرعون ہے کہ اس نے خدائی کا دعویٰ کیا اور اشارہ سے پانی کو جاری کر دیا وہ پانی جاری ہوا سخت اور نرم ریگستان کی زمین میں اور اشارہ سے اس کو روک بھی دیتا تھا یا حدیثوں میں آیا ہے کہ دجال آخر زمانہ میں ظاہر ہو کر خدائی کا دعویٰ کرے گا اور درخت پتھر، پانی، مٹی، گھاس، پھل وغیرہ جو چیز بھی اس کو دیکھے گی اس کا اقرار کرے گی اور دجال کے استدراجی کرشمے ایک مسلمان عاقل کو شبہ میں نہیں ڈال سکیں گے اور کسی عاقل پر یہ امر مخفی نہیں کہ یہ کذاب ہے اور خدا نہیں ہو سکتا، یہ آدمی کی طرح کھاتا، پیتا ہے، کلام کرتا ہے، اس کے کلام حروف و صوت ہیں (نیز یہ کانا ہے) تو وہ یقیناً جانتا ہے، جسم ہے، مصور و مرکب ہے، اس

کے ہم جنس اور بہت ہیں تو اس کو شک نہیں ہونا چاہیے کہ یہ مُتَسَرِّبِی (خدائی کا دعویٰ کرنے والا) نہ خالق ہے نہ رازق ہے تو پھر شک کیوں ہو۔

سوال: یہ ہے کہ اس میں حکمت کیا ہے؟

جواب: ہم کہیں گے کہ یہ امتحان و ابتلاء ہے اور بندوں کی آزمائش مطلوب ہے اس لیے کہ ہر عاقل بالغ اعتقاد رکھتا ہے کہ وہ حق و صواب پر ہے، خالص دین اللہ تعالیٰ کا ہے اور یہ جہاں امتحان گاہ ہے دنیا آزمائشوں کا گھر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہماری آزمائش کے لیے اس کو یہ قدرت دی ہے تاکہ سچے اور جھوٹے کا فرق ظاہر ہو جائے تاکہ صادق اپنے صدق کو جان لے اور اللہ تعالیٰ سے ثواب کی امید رکھے کہ اس نے اجر و ثواب کا وعدہ فرمایا ہے۔

اور کاذب (جھوٹا) اپنے کذب کو جان لے اور یہ کہ حجت تمام ہونے کے بعد عذاب دیا جائے گا اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کسی کو عذاب نہیں دیتا جب تک اس پر حجت نہ اتارے یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عدل ہے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ محمد وآلہ اجمعین



چوتھا باب

صفات الہیہ کا بیان

مہدی ابوشکور سالمی (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ موجود ہے، قدیم ہے، اپنی صفات کے ساتھ موصوف ہے۔

اور یہ کہنا جائز نہیں کہ قدیم مع صفتہ، اس لیے کہ ”مع“ کا لفظ دو چیزوں کے درمیان مقارنت کے لیے آتا ہے اور صفت موصوف کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں کہ یوں کہا جائے صفت و موصوف علیحدہ علیحدہ دو چیزیں ہیں۔

سوال: اگر کوئی کہے کہ صفت شئی ہے؟ یا غیر شئی؟ پس اگر ہم کہیں کہ صفت شئی نہیں تو موصوف ”لا شئی“ کے ساتھ کیسے موصوف ہوگا؟ اور اگر کہیں کہ صفت بھی شئی ہے اور یہ شئی غیر موصوف ہے تو پھر یہ جائز نہیں کہ یہ بھی قدیم ہے۔

جواب: یہ ہے کہ ”صفت شئی“ ہے، ہم یہ نہیں کہتے کہ شئی ہے یا غیر شئی ہے۔

سوال: یہ ہے کہ صفت قدیم ہے یا غیر قدیم؟

جواب: یہ ہے کہ صفت قدیم ہے، اس لیے کہ ذات موصوف ہے وہ قدیم ہے، اپنی صفات کے ساتھ اور یہ کہنا جائز نہیں کہ صفات قائم بذاتہ ہیں، لیکن ہم یہ کہیں گے: اس کی ذات موصوف بصفاتہ ہے اور یہ کہنا جائز نہیں کہ اس کی صفات قائم بذاتہ ہیں موصوف بالوصف ہے، بلکہ ہم کہیں گے کہ وہ موصوف بالصفہ ہے اس لیے کہ وصف واصف کی صفت ہے اور وہ موصوف ہے، قبل اس کے کہ اس کی صفت بیان کرے اور یہ کہنا بھی جائز نہیں کہ وہ قدیم جمیع صفاتہ ہے اس لیے کہ جمع اور افتراق اس کی صفات میں جائز نہیں، تو ہم یوں کہیں گے: قدیم بصفاتہ ہے اور بعض لوگوں نے صفات و نعوت کا بالکل انکار کر دیا، انہوں نے کہا: صفت و نعت وہ ذات باری تعالیٰ تو

ہیں نہیں تو ضروری ہوا کہ ذات کا غیر ہوں اور جب غیر ہوں گی تو یا قدیم ہوں گی یا
حادث و محدث اور یہ ہو نہیں سکتا کہ حادث و محدث ہوں اس لیے کہ پھر یہ کہنا پڑے
گا کہ حادث و محدث قدیم میں حلول کیے ہوئے ہیں اور یہ کفر ہے۔

اور معتزلہ نے کہا کہ یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ صفت و نعت قدیم ہیں اس لیے کہ اگر
صفات قدیم ہیں تو پھر یہ کہنا واجب ہو گا دو یا تین یا اس سے بھی زیادہ قدیم ہیں اور یہ "تعدّد
قدّماء" محال ہے انہوں نے پھر کہا کہ اللہ تعالیٰ حی، قادر، علیم، سمیع، بصیر، مرید بذاتہ ہے۔
معتزلہ نے مزید کہا کہ یہ جائز نہیں کہ اس لیے کہ وہ الہ ہے رب ہے، صانع ہے اور جب
صانع کا عالم ہونا ثابت ہو گیا تو یہ مقتضی ہے کہ تمام اشیاء کو جانے اور تمام احوال کو تمام اوقات
اور تمام اماکن (جگہوں) کو جانے اور جب وہ تمام اشیاء کو جانتا ہے تو تمام اشیاء اس کی معلوم
ہوئیں اور بغیر علم کے ناممکن ہے کہ شے عالم کی معلوم بنے، اس لیے کہ معلوم مقتضی علم ہے،
لا محالہ تو ثابت ہوا کہ علم سے اس کا معلوم ہے۔ پس واضح ہو گیا کہ نفی علم مستلزم ہے نفی عالم کو اور
اثبات علم اثبات عالم کو مستلزم ہے، اللہ تعالیٰ پر تو ہم نے کہا: صحیح ہے اور اس کی تائید اس سے
ہوتی ہے عالم وقوف علم جب معلوم پر ہوتا ہے تو معلوم اس کا معلوم بنتا ہے اور جب علم ہی نہ
ہوگا تو معلوم بغیر وقوف کیسے معلوم بن جائے گا؟ اور جب معلوم پر وقوف علم نہ ہو تو وہ کسی شے
کو نہ جانے گا تو ثابت ہوا کہ عالم کا علم جب معلوم پر واقفیت پاتا ہے تو وہ معلوم بنتا ہے اور
جب وقوف علم علی المعلوم نہ ہو، عالم نہ ہو اور جب عالم نہ ہو تو صانع نہ ہو اور یہ محال ہے۔
اعتراض: اگر کہا جائے باری تعالیٰ جل شانہ تمام اشیاء کو بالذات جانتا ہے اور تمام معلومات
اس کے معلوم بذاتہ ہیں تو کہنا یہ ہے کہ ذات عالم ہے تو نفی صفات موجب نفی ذات
نہ ہوتی۔

جواب: ہم جواب میں کہیں گے کہ عالم اگر تمام اشیاء کو بالذات جانتا ہے تو معلومات اس
کے بالذات ہوئے تو ذات علم ہوگی اور علم ہی ذات ہوگی اس لیے کہ معلوم معلوم

تو ثابت ہوا کہ جب عالم کا علم معلوم پر واقفیت پالیتا تو وہ معلوم بن جاتا ہے اور جب وقوف العلم
علی المعلوم نہ ہوگا تو وہ عالم نہ ہوگا اور جب عالم نہ ہوگا تو صانع نہ ہوگا اور یہ باطل ہے۔

(۱۱۲ ابوالبرکات)

نہیں ہوتا بغیر اس پر وقوف کے اور بغیر علم کے تو ہر وہ شئی کہ جس کے ساتھ معلوم کا وقوف ہو وہ عالم ہے۔ پھر اگر کہا جائے کہ صانع صفت سے موصوف ہے تو یہ کہنا پڑے گا کہ دو تین یا اس سے بھی زیادہ قدیم ہیں اس لیے کہ صفت حادث و محدث تو ہو نہیں سکتی اور اگر ہم کہیں کہ قدیم ہے تو اس صورت میں دو تین اور اس سے بھی زیادہ قدیم ثابت ہو جائیں گے۔

ہم نے کہا کہ یہ لازم نہیں آتا اس لیے کہ ہم نے تو یہ کہا ہے کہ صفت موصوف کا غیر نہیں ہے کیونکہ صفت عرض نہیں اور جب عرض نہیں تو موصوف کا غیر کہنا صحیح نہیں اور موصوف کا غیر نہیں تو اس کے ثابت کرنے میں دو تین قدیموں کا ثابت کرنا لازم نہیں آتا اور کبھی ہوتا ہے کہ صفت صفت ہو اور عرض نہ ہو جیسے کہ یہ جائز ہے کہ ذات موجود ہے اور جوہر نہیں تو جب ذات جوہر نہیں ہو سکتی تو صفت عرض نہیں ہو سکتی تو صفت کے قدیم ماننے سے متعدد قدیموں کا ماننا لازم نہیں آیا۔

حیات یا قدرت یا علم یا سمع یا بصر ہو کیونکہ یہ اشیاء اس کے لیے ان صفات سے موصوف ہونے کی علت ہو جائیں گی اور یہ جائز نہیں کہ اس کے لیے علت ہو یا اس کی صفت علت پھر دو حال سے خالی نہیں یا موصوف ہو گا یا غیر ہو گا اور یہ دونوں محال ہیں۔

اہل سنت و جماعت کا مسلک

اور اہل سنت و جماعت نے کہا کہ اللہ تعالیٰ موصوف و منعوت ہے ازل سے ابد تک یعنی ہمیشہ سے موصوف و منعوت ہے اور ہمیشہ موصوف و منعوت رہے گا۔

پھر ہم (اہل سنت و جماعت) کہتے ہیں کہ صفات باری نہ ذات ہیں اور نہ غیر ذات بلکہ یہ اس کی صفات ہیں۔ اس کا بیان یہ ہے کہ صفت اگر غیر موصوف ہے تو بذاتہ قائم ہوگی اس لیے کہ شئی جب کسی شئی کے ساتھ قائم ہوگی تو اس کے ساتھ ممکن (جگہ اور گنجائش نکال کر) اور حلول کے ساتھ قائم ہوگی جیسے عرض جوہر میں ہوتی ہے اور جس کے لیے حلول و ممکن جائز ہوگا تو انتقال اور نزول بھی جائز ہوگا اور یہ حادث کی صفت ہوتی ہے تو ثابت ہوا کہ صفت موصوف کا غیر نہیں اور لیکن ہم نے جو کہا کہ صفت موصوف نہیں ہے اس لیے کہ اگر

صفت وہی موصوف ہے تو یہاں تک پہنچا دے گا کہ دو خدا ہوں یا تین یا زیادہ اس لیے کہ موصوف صانع ہے اور وہ علم، قدرت، حیات وغیرہا صفات کے ساتھ موصوف ہے تو جب صفت و موصوف ایک ہوئے تو صفت صانع ہو جائے گی۔

تو پھر علم بھی صانع اور حیات بھی صانع، قدرت بھی صانع اور ہر صفت علیحدہ علیحدہ صانع ہوگی اور یہ محال ہے، تو پھر صحیح ہوا کہ صفات عین موصوف نہیں ہیں اور نہ وہ غیر موصوف ہیں تو اس معنی کے اعتبار سے ہم نے کہا کہ صفت ذات نہیں اور نہ صفت غیر موصوف ہے۔

معزلہ اور مسئلہ صفاتِ باری تعالیٰ

معزلہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے لیے کوئی صفت نہیں تو ہم کہیں گے کہ صفت کی نفی کرنا موصوف کی نفی کرنا ہے، اس لیے کہ صانع اگر عالم نہیں تو وہ اشیاء اور احوال کو بھی نہیں جانتا اور جو کسی شئی کو پیدا کرے اور وہ نہیں جانتا کہ کس کو پیدا کیا؟ اور وہ موصوف بالجمہل ہوگا اور موصوف بالجمہل صانع نہیں ہو سکتا تو یہ محال ہے۔ پس ضروری ہوا کہ صانع، عالم ہوتا کہ جائز و صحیح ہو۔ میں نے کہا: جب وہ ایسا فعل کرے جو سقوطِ عدالت کا موجب ہے تو وہ فاسق ہو گیا۔ پھر اللہ عزوجل اس پر وحی نازل فرمائے، اسی فسق کی حالت میں تو وہ ایک فاسق آدمی پر نازل ہوگی تو معاذ اللہ رسول فاسق ہوا، میں نے یہ بھی کہا کہ جو شخص ”لا الہ الا اللہ“ پڑھتا ہے اور اعتقاد اس کے خلاف ہے، اس کے بارے میں کیا کہتے ہو؟ اس نے کہا: وہ مؤمن ہے۔

میں نے کہا: تمہارا دین نہیں ہے مگر یہ کہ تمہارا رب ناقص اور رسول فاسق اور مؤمن منافق اور سنو! اللہ و رسول ان خرافات سے پاک و منزہ ہیں تو وہ متحیر ہو گیا اور چپ رہا، کلام نہ کر سکا اس لیے کہ باطل حق کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ”الحق یغلبو ولا یغلبی“ حق غالب ہوتا ہے، مغلوب نہیں ہوتا۔

تو ان دلائل سے ثابت ہوا کہ صفت نہ عین ذات ہے اور نہ غیر ذات اور جب یہ بات ”علم“ (صفت علم) میں ثابت ہوگئی تو جمیع صفات میں بھی ثابت ہوگئی، جیسے قدرت، حیات، سمع، بصر وغیرہ میں کہ نہ یہ عین ذات ہیں نہ غیر ذات۔ واللہ تعالیٰ اعلم

دوسرا قول

صفاتِ ذاتیہ اور صفاتِ فعلیہ کا بیان

ابوالحسن اشعری رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ صفاتِ ذاتیہ قدیم ہیں اور وہ درج ذیل آٹھ صفات ہیں: حیات، قدرت، علم، کلام، سمع، بصر، ارادہ، قدم اور ان کے سوا تمام صفات مقتضیاتِ قدرت و علم ہیں اور جو تحتِ قدرت ہیں وہ سب صفاتِ فعلیہ ہیں، حادث ہیں۔

محققہ کا مسلک

محققہ جو کرامیہ کا ایک گروہ ہے، کہتا ہے کہ صفاتِ ذاتیہ قدیم ہیں اور وہ پانچ ہیں: حیات، قدرت، علم، سمع، بصر اور ان کے سوا نعمت ہیں، صفات نہیں اور یہ محدث ہیں اور بعض نے کہا کہ حادثہ ہیں اور یہ عقیدہ کفر ہے، محال ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ان کے زعم کے مطابق ان صفات کے حدوث سے پہلے ناقص ہوگا اور ان صفات کے حدوث کے بعد کامل ہوگا اور صفت زائد ہوگی اور جس کا یہ عقیدہ ہو کافر ہے۔ اس لیے کہ حدوث و احداث موجب تغیر ہے کہ ایک صفت دوسری صفت کی طرف متغیر ہو جائے اور ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف پھر جائے اور اللہ تعالیٰ جل مجدہ پر تغیر جائز نہیں۔

مصنف کا حشو یہ سے مناظرہ

امام مہدی ابوشکور سالمی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: میں نے حشو یہ فرقہ (جو کرامیہ میں سے ہے) کے ساتھ مناظرہ کیا، میں نے ان سے کہا: صانع اور اس کی صفات فعلیہ کے بارے میں کیا کہتے ہو؟ اس نے کہا: وہ حادثہ محدثہ ہیں۔ میں نے کہا کہ صانع اس صفت کے حدوث سے پہلے ناقص ہوگا اور یہ محال ہے۔

دوسرا سوال میں نے انبیاء کرام علیہم السلام کے بارے میں کیا۔ میں نے پوچھا: بتاؤ! انبیاء کرام وحی سے قبل معصوم تھے یا نہیں؟ اس نے کہا: قبل وحی نبی ہی نہ تھے اور نہ ہی ان

چیزوں سے معصوم تھے جن سے عدالت ساقط ہو جاتی ہے۔

تحقیق مسئلہ

مسئلہ کی تحقیق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تخلیق کائنات سے پہلے بھی تھا اور اب بھی ویسا ہی ہے جیسا تھا، نہ گھٹا نہ بڑھا تو بے شک ابتدائے آفرینش میں بھی وہ اس صفت کا مستحق ہے، پیدا کرنے سے پہلے بھی مستحق تھا اور وہ یہ کہ اگر ہم یہ کہیں کہ اللہ تعالیٰ مخلوقات کے وجود سے خالق نہ تھا تو یہ مقتضی ہوگی اور چاہے گی کہ بندوں کے معرض وجود میں آنے سے پہلے وہ معبود بھی نہ ہو اور بندوں کے موجود ہونے سے پہلے ”إِلٰہ“ بھی نہ ہو اور مریات (دکھائی دینے والی اشیاء) کے وجود سے پہلے وہ بصیر بھی نہ ہو اور معلومات کے پائے جانے سے پہلے وہ عالم بھی نہ ہو تو پھر اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کی نفی واجب ہوگی اور یہ صریح کفر ہے۔

اعتراض: اگر کہا جائے کہ جب تک فعل کا ثبوت نہ ہو اس صفت کے ساتھ کسی کو موصوف نہیں کیا جاسکتا جیسے جو لاہا (بافندہ) یا درزی اور اسی کی مانند جب تک سینا نہیں سیکھتا اور یہ عمل نہیں کرتا، اس کو اس صفت (سینے یا بننے) سے موصوف نہیں کریں گے۔

جواب: ہم کہتے ہیں کہ جب اس نے درزی کا کام سیکھا اور یہ کام جانتا ہے مگر کام ترک کر دیا تو اس کو درزی کہا جائے گا، اسی صفت اور نام سے اس کو یاد کیا جائے گا، اس لیے کہ وہ اس کام کی قدرت اور علم رکھتا ہے، اسی طرح صانع عالم جل شانہ (جہاں کا پیدا کرنے والا) عالم قادر تھا جب کہ مخلوق ابھی پیدا نہ ہوئی تھی۔

ایسی ایک مثال دیکھیں کہ اگر کوئی مارنے کے لیے تلواری بنائے تو قطع و ضرب (مارنے کاٹنے) سے پہلے اس کو ضارب و قاطع کہا جاتا ہے کیونکہ اس میں ضرب و قطع (مارنے اور کاٹنے) کی صلاحیت ہے تو ایسے یہاں سمجھ لیجئے کہ کسی چیز کو پیدا کیا یا نہ کیا، وہ ہمیشہ سے خالق ہے۔

اعتراض: اگر کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے خالق ہے تو یہ مقتضی ہے کہ مخلوق بھی ہمیشہ سے ہو؟ اس لیے کہ صفت خالقیت تخلیق سے ہے تو لامحالہ تخلیق کا تقاضا ہے کہ مخلوق پائی جائے تو عالم و دہر کا قدیم ہونا لازم آئے گا اور یہ محال ہے کہ عالم و دہر قدیم ہو۔

جواب: یہ ہے کہ ایسا نہیں ہے جو تم نے ذکر کیا، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ صفت خالقیت کے ساتھ

موصوف ہے۔

تیسرا قول

اس کا بیان کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے خالق ہے

اہل سنت و جماعت فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے خالق ہے وہ صفت خالقیت اور دیگر صفات ذاتیہ اور صفات فعلیہ سے موصوف ہے۔

اشعریہ اور کرامیہ کا مسلک

اشعریوں اور کرامیوں نے کہا کہ جب تک مخلوق کو پیدا نہ کرے وہ خالق نہ ہوگا اور یہ کفر ہے۔

اور ہم (اہل سنت و جماعت) کہتے ہیں باری عز اسمہ خالق ہے اور ہمیشہ سے صفت خالقیت سے موصوف ہے اسی طرح تمام صفات مثلاً صفت خالقیت 'رزاقیت وغیرہ سے موصوف ہے مخلوق کے پیدا کرنے سے پہلے بھی خالق اور اب بھی خالق ہے اس لیے خالق فاعل و صانع کا موصوف ہونا قادر و عالم ہونا اور مرید ہونا ضروری ہے کہ وہ عاجز نہ ہو اور جو صفت کو جانتا ہے اور بنانے پر قادر ہے اگرچہ اس نے اپنی صفت کا اظہار نہ کیا ہو اس کو اس صفت سے موصوف ماننا ضروری ہے خصوصاً جب کہ وہ صیغہ مخصوص ہو اور اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں تکرار نہیں ہوتی کہ ہم یہ کہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ایک یہ کام کیا اور اس سے فارغ ہو کر دوسرا کام شروع کیا اور جب وہ کسی صفت کا اظہار کرے تو اس کو موصوف مانا جائے اور جب صفت کا ظہور نہ ہو تو اس کو موصوف نہ کیا جائے اللہ تعالیٰ اس سے منزہ و پاک ہے اس کو شغل و فراغت کے ساتھ موصوف کرنا جائز نہیں ہے اور نہ ہی اس کو تکرار و اعادہ ایسی صفات سے موصوف کیا جاسکتا ہے۔

ہم یوں کہیں گے: اللہ تعالیٰ فاعل ہے ایک ہی فعل سے اور جمیع مفعولات ایک ہی فعل کے مفعول ہیں اور یہ فعل اس سے زائل نہیں ہوا کہ دوسرا فعل پیدا ہو اور تمام صفات اسی طرح

ہیں ”اللہ لا یشغلہ شأنٌ عن شأن“ یہاں تک کہ اگر اس نے ایک ساعت یا ایک لمحہ میں کسی کو پیدا کیا، کسی کو بخش دیا، یا کسی کو زندہ کیا، کسی کو مارا، کسی کو رزق دیا تو اس کی تمام صفات اثر کرتی ہیں بغیر شغل و فراغ کے، یہ صفات اس کی مراد ہوتی ہیں اس لیے کہ وہ اسی ساعت میں موصوفہ جمع صفات ہے اور جب اس کو اس صفت سے فراغ نہیں تو پھر زوال صفت واجب نہیں ہوتا، اس لیے کہ وہ ایک حال سے دوسرے حال کی طرف متغیر نہیں ہوتا، لیکن تاثیر صفت اس وقت ظاہر ہوگی جب وہ پیدا کر لے گا اور تخلیق سے قبل خالقیت ہے، تاثیر کا ظہور نہیں ہے۔ اسی طرح صفت صانع کو سمجھنا چاہیے اور دلیل یہ ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”وَاللّٰهُ سَرِیْعُ الْحِسَابِ“ (البقرہ: ۲۰۲) اور اللہ تعالیٰ جلد حساب لینے والا ہے اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت سرعت حساب بیان فرمائی ہے اور حساب قیامت میں ہوگا تو حساب سے قبل اسم صفت کا اثبات صحیح ہوا تو ایسے صفت خالقیت خلق (پیدا کرنے) سے قبل ثابت کرنا جائز ہے۔

مناظرہ

ابوشکور سالمی (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کے ایک اشعری سے مناظرہ کی روئداد

حضرت ابوشکور سالمی فرماتے ہیں: ایک اشعری سے میرا مناظرہ ہوا، اس نے کہا: تمہارا وضو اور نماز کیا ہے؟ سنو! تمہارے ہاں وضو اور نماز یہ ہے کہ ایک شخص پر نالہ کے نیچے بیٹھ جائے اور چہرہ دونوں ہاتھ سر اور دونوں پاؤں تر ہو جائیں تو پھر اٹھ کر کبوتر کی بھیٹ بچھائے اور اس پر کھڑا ہو جائے اور فارسی زبان میں کہے: ”اے خدائے بزرگ“ یعنی ”اللہ اکبر“ اور فارسی میں ایک آیت پڑھے اور کہے: ”دو برگ سبز“ یعنی ”مدھامتان“ پھر رکوع و سجود خاموشی سے کرے اور مقدار تشہد بیٹھ جائے اور بیٹھے بیٹھے گوز مارے (ہوا خارج کر دے) یہ تمہاری نماز ہے۔

ابوشکور سالمی فرماتے ہیں کہ یہ بات دراصل اس (اشعری) نے سیدنا امام اعظم ابوحنیفہ اور آپ کے اصحاب (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) پر طعن کے طور پر کہی۔ میں نے اس کو جواب دیا کہ تم عقیدہ رکھتے ہو کہ اللہ تعالیٰ مخلوق کے پیدا کرنے سے قبل نہ خالق تھا نہ رازق تھا نہ معبود تھا اور اسی طرح مخلوق سے پہلے نہ گناہ بخشنے والا تھا اور نہ ثواب و عقاب دینے والا اور رسول معاذ اللہ نہ اب رسول ہے نہ قبل وحی رسول تھا اور مؤمنین کا گناہ سے ایمان کم ہو جاتا ہے اور معبود تم

جس کو معبود کہتے ہو تو معبود و رب نہ تھا، اب مخلوق پیدا ہونے کے بعد وہ معبود ہے اور رسول رسول نہ تھا، پھر رسول ہوا ازاں بعد معزول ہو گیا اور مؤمن کے بننے سے اس کا ایمان کم ہو گیا، اسی قدر کافی ہے عبادت سے۔

چوتھا قول

اللہ تعالیٰ کے علم کا بیان

جہمہ جو معزز لہ ہی کی ایک شاخ ہے، کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ پیدا کرنے سے پہلے کسی شئی کو نہیں جانتا اور وہ معدوم کو بھی نہیں جانتا، یہ کفر ہے اس لیے کہ اگر وہ پیدا کرنے سے پہلے اشیاء کو جانتا نہیں تو جب وہ کسی شے کو پیدا کرنا چاہتا ہے تو کس طرح پیدا کرے گا اور کیسے جانے گا کہ اس کو پیدا کروں اور کتنی پیدا کروں اور کب پیدا کروں اور کیسے پیدا کروں؟ تو اس عقیدہ میں خدا کا الوہیت سے معطل ہونا لازم آتا ہے اور یہ کفر ہے اور صحیح یہ ہے کہ اللہ عزوجل کامل طریقے سے ہر چیز کو جانتا ہے، پیدا کرنے سے پہلے ہو خواہ بعد اور تمام معدومات و موجودات کو جانتا ہے۔

ہمارا یہ کہنا کہ موجودات کو پورے اکمال و اتمام کے ساتھ جانتا ہے، اس میں تو کسی کا اختلاف نہیں ہے۔

اور ہمارا یہ کہنا کہ وہ معدوم کو بھی جانتا ہے یعنی من حیث المعدوم جانتا ہے کہ یہ معدوم ہے اور وہ جانتا ہے کہ معدومات میں سے کون عدم سے وجود میں آئے گی اور وہ کیسی ہوگی؟

اللہ تعالیٰ معدوم کو بھی جانتا ہے

دلیل: یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ معدوم کی خبر نہ دیتا حالانکہ اللہ تعالیٰ نے معدوم کی خبر دی ہے اور یہ بھی خبر دی ہے کہ وہ معدوم جب موجود ہوگا تو اس کی کیفیت کیا ہوگی؟ چنانچہ فرمایا: "إِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيمٌ" (الج ۱) بے شک قیامت کا زلزلہ بڑی سخت چیز ہے اور فرمایا: "وَتَرَى النَّاسَ سُكَارَىٰ وَمَا هُمْ بِسُكَارَىٰ وَلَٰكِنَّ عَذَابَ اللَّهِ شَدِيدٌ"

(الحج: ۲۱) اور آپ لوگوں کو نشے کی حالت میں گمان کریں گے حالانکہ وہ نشے میں نہیں ہوں گے لیکن اللہ تعالیٰ کا عذاب سخت ہوگا اور اپنے رسول مکرم ﷺ کو خبر دی تو فرمایا: "لَتَدْخُلَنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ إِنْ شَاءَ اللَّهُ آمِنِينَ" (الفح: ۲۷) اللہ تعالیٰ نے چاہا تو تم پر امن طریقے پر ضرور مسجد حرام میں داخل ہوں گے تو جیسی خبر دی ویسا ہی ہوا۔ اس سے ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ اشیاء کو وجود میں لانے سے پہلے جانتا ہے اور یہ بات مخلوق میں بھی پائی جاتی ہے، مثلاً انسان ذکر کرتا ہے ایک محل کا کہ اس کا طول و عرض اتنا ہوگا اس کا صحن اس کی دیواریں اس کی چھت اس کے دروازے ایسے ہوں گے حالانکہ اس محل کا ابھی وجود نہیں پھر جب محل تیار ہو جاتا ہے تو اس معدوم کے مطابق محل موجود ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے حق میں تو بطریق اولیٰ ہوگا یعنی اشیاء کے وجود سے پہلے اس کو علم ہوتا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "قُلْ لَا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ الْغَيْبَ إِلَّا اللَّهُ" (النمل: ۶۵) فرمادیں کوئی نہیں جانتا جو آسمانوں اور زمین میں پوشیدہ ہے مگر اللہ تعالیٰ کو اس کا علم ہے۔

سیدنا امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ارشاد مبارک

امام ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ مسئلہ پوچھا گیا تو آپ نے جواب میں فرمایا: اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے عالم تھا اور ہمیشہ عالم رہے گا اور وہ عالم الغیب ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وَلَوْ رُدُّوا لَعَادُوا لِمَا نُهُوا عَنْهُ" (الانعام: ۲۸) اور اگر واپس بھیجے جائیں پھر وہی کریں گے جس سے منع کیے گئے تھے اور حضرت نوح علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام سے فرمایا: "وَلَا يَلِدُوا إِلَّا فَاَجْرًا كَفَارًا" (نوح: ۲۷) اور نہ ہوگی اولاد مگر بدکار بڑی ناشکر اور اس کے بکثرت نظائر ہیں۔

پھر اللہ تعالیٰ کے علم میں سہو غلطی اور نسیان ناجائز ہے اس لیے کہ اگر اس کے علم میں سہو و غلطی اور نسیان کا امکان ہو تو آیات و احکام و اعمال و اخبار سب معطل ہو جائیں اس لیے کہ ہو سکتا ہے رسالت حضرت علی کو دینی تھی، غلطی سے حضور اقدس (ﷺ) کو دے دی، معاذ اللہ، ثم معاذ اللہ نیز گناہ تو کیا کسی نے اور غلطی سے سزا دے دی دوسرے کو اور یہ بھی امر محال ہے جو سہو و نسیان خطا و غلطی کا قائل ہو وہ قطعاً کافر ہے۔

ابوشکور سالمی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ایک مجوسی نے مقام "مزو" میں مجھ سے سوال

کیا کہ کافر جب کافر مرے گا تو کیا اللہ تعالیٰ جانتا تھا کہ یہ کفر کی حالت میں مرے گا؟ میں نے کہا: ہاں! یقیناً جانتا تھا اس نے کہا کہ جب اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ کافر مرے گا تو یہ کافر مرنے سے قبل ایمان لانے پر قادر ہے یا نہیں؟ اگر تم کہو کہ وہ قادر ہے تو علم الہی میں خطا واقع ہو جائے گی اور اگر کہو کہ وہ قادر نہیں ایمان نہیں لاسکتا تو یہ جبر ہوا۔

میں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ یہ کفر کی حالت میں مرے گا اور اللہ تعالیٰ کے علم سے وہ مسلوب القدرت نہیں ہوا بلکہ وہ قادر ہے ایمان لانے پر جس طرح وہ قادر ہے کفر پر قدرت موجود ہے صلاحیت رکھتا ہے کہ ایمان لائے جیسے قدرت اور صلاحیت رکھتا ہے کفر پر قائم رہنے کی، لیکن باوجود قدرت کے ایمان نہیں لایا اور اللہ جانتا ہے کہ ایمان نہیں لائے گا اور اللہ تعالیٰ تمام اشیاء کو جانتا ہے جیسی اور جس حالت میں وہ ہیں اور اس کے مثل کو بھی وہ جانتا ہے۔

سوال: اگر سوال کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ اپنے مثل کو جانتا ہے یا نہیں؟ اگر کہو کہ وہ اپنی مثل نہیں جانتا تو اللہ کی طرف جہل کی نسبت ہوئی اور اگر کہو کہ اللہ تعالیٰ اپنی مثل کو جانتا ہے تو تم نے اللہ تعالیٰ کے لیے مثل مان لیا۔

جواب: ہم کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جانتا تھا کہ اس کی مثل نہیں اور اللہ تعالیٰ کی نہ شکل و صورت ہے نہ ضد ہے نہ ند ہے۔

جہم ابن صفوان سے اسی طرح کا سوال ہوا کہ اللہ تعالیٰ دوزخیوں اور جنتیوں کے انفاس (سانسوں) کی انتہاء و غایت کو جانتا ہے یا نہیں؟ اگر کہو کہ نہیں جانتا تو تم نے اللہ تعالیٰ کی طرف جہل کی نسبت کر دی اور اگر کہو کہ جانتا ہے تو جنت و دوزخ کا فنا کرنا ثابت ہو گیا تو اس نے اختیار کیا کہ ہاں نہایت عدد انفاس اہل جنت و اہل نار کو اللہ تعالیٰ جانتا ہے اسی بناء پر اس نے کہا کہ جنت و نار فنا ہو جائیں گے۔

اور صحیح یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ اہل جنت و اہل نار کے سانسوں کی تعداد کو اور اس کے انتہاء نہ ہونے کو کہ ان سانسوں کی نہایت نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم

پانچواں قول سمع و بصر کا بیان

معزلہ اور جہمیہ تمام صفات کا انکار کرتے ہیں جیسے 'سمع'، 'بصر'، 'معزلہ' و 'جہمیہ' کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سمیع و بصیر ہے مگر اس کے لیے سمع و بصر نہیں ہے۔

بعض معزلہ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نہ سمیع ہے نہ بصیر نہ رائی نہ مرئی بلکہ وہ ان تمام صفات کو جانتا ہے۔ ان کا یہ عقیدہ کفر ہے اس لیے کہ انہوں نے نص قطعی کا انکار کیا۔

ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ ایک قوم کے پاس سے گزرے وہ اللہ کو بلند آواز سے پکار رہے تھے حضور نے فرمایا: اتنی آواز بلند نہ کرو جس کو تم پکارتے ہو وہ نہ غائب ہے نہ بہرا ہے۔ پھر علاوہ ازیں سمع و بصر کی نفی موجب ذم ہے۔ اس پر دلیل حضرت ابراہیم علی نبینا وعلیہ السلام کا قصہ ہے۔ انہوں نے اپنے والد (چچا آزر) سے فرمایا تھا: "لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِي عَنْكَ شَيْئًا" تم اس کو کیوں پوجتے ہو جو نہ دیکھے نہ سنے اور نہ ہی تم کو کسی چیز سے بے پرواہ کر سکتا ہے؟

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "قَدْ سَمِعَ اللَّهُ قَوْلَ الَّتِي تُجَادِلُكَ فِي زَوْجِهَا وَتَشْتَكِي إِلَى اللَّهِ" (المجادلہ: ۱) بے شک اللہ تعالیٰ نے سنی اس کی بات جو تم سے اپنے شوہر کے معاملہ میں بحث کرتی ہے اور اللہ سے شکایت کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ اس نے زمانہ ماضی میں سنا اور وہ مستقبل میں سنتا ہے اور وہ اب سنتا ہے اور جو اس کا انکار کرے وہ کافر ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

چھٹا قول

ارادہ و مشیت کا بیان

لوگوں نے اس مسئلہ میں اختلاف کیا ہے۔ قدریہ 'معزلہ' جہمیہ فرقوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ

شر و قبائح کا نہ ارادہ فرماتا ہے اور نہ حکم دیتا ہے۔

اور بعض کہتے ہیں: سب کچھ اللہ تعالیٰ کی مشیت سے ہے 'حسن و قبح' 'خیر و شر' 'کفر و ایمان' 'طاعت و معصیت' 'پھر خیر و حسن اس کی مشیت و ارادہ سے ہوتا ہے اور قبائح اللہ تعالیٰ کی مشیت سے ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ارادہ سے نہیں ہوتے کیونکہ ارادہ میں محبت و رضا (یعنی پسندیدگی اور خوشنودگی) کا دخل ہوتا ہے (اور اللہ تعالیٰ قبائح سے راضی نہیں)۔

اور بعض کہتے ہیں کہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے ارادہ اور مشیت اور قضا سے ہوتا ہے، لیکن قبائح اس کے حکم سے نہیں ہوتے، اس لیے کہ حکم جبر و تسلط کو واجب کرتا ہے اور بعض کہتے ہیں: سب کچھ اللہ تعالیٰ کے ارادہ و مشیت سے ہوتا ہے لیکن اس کی مشیت و ارادہ قرآن کی مانند مخلوق ہیں یعنی بندے کا مشیت و ارادہ خدا کی طرف مضاف ہوتا ہے یعنی تملیک کے طور پر اس کی نسبت خدا کی طرف ہوتی ہے۔

اہل سنت و جماعت کا مسلک

اہل سنت و جماعت کہتے ہیں: خیر و شر اللہ تعالیٰ کی قضا، اس کی قدر و مشیت، ارادہ و علم اور حکم سے ہوتا ہے، پھر خیر و طاعت اس کے امر اور مرضی سے ہوتے ہیں اور شر و معصیت نہ اس کے امر سے ہوتا ہے اور نہ اس کی مرضی سے۔

دلیل یہ ہے کہ حضرت عبد اللہ ابن عمرو بن العاص فرماتے ہیں: ہم حضور اقدس ﷺ کے دربار میں بیٹھے ہوئے تھے، ہم نے ایک آواز سنی کہ ابو بکر و عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی آوازیں بلند ہو رہی ہیں، حضور کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں، بہت سے آدمی بھی ان کے ساتھ ہوتے ہیں، حضور دریافت فرماتے ہیں کہ تم دونوں اونچی اونچی کیوں بول رہے تھے؟ تمہاری آوازیں کیوں بلند ہو رہی تھیں؟

ابو بکر عرض کرتے ہیں: حضور! ایک مسئلہ میں گفتگو کرتے ہوئے ہمارا اختلاف ہو گیا، میں یہ کہتا ہوں کہ خیر و شر سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ حضرت عمر عرض کرتے ہیں: حضور! میرا موقف ہے کہ خیر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور شر بندوں کی طرف سے ہوتا ہے، اب حضور! آپ فیصلہ فرمائیں، ہم میں سے کس کا قول صحیح ہے؟

حضور (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: میں وہ فیصلہ کروں گا جو حضرت اسرافیل نے، جبریل

اور میکائیل کے درمیان کیا تھا۔

اے عمر! جبرئیل تو تمہاری طرح کہتے تھے اور اے ابوبکر! میکائیل تمہاری طرح کہتے تھے۔ جبرئیل علیہ السلام نے فرمایا: ہم نے اس مسئلہ میں اختلاف کیا تو زمین والے اس مسئلہ میں اختلاف کرتے ہیں یہاں تک کہ جبرئیل و میکائیل نے حضرت اسرافیل علیہ السلام کو حکم بنایا، حضرت اسرافیل نے لوح محفوظ میں اللہ تعالیٰ کی قضاء کے مطابق فیصلہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا: اے ابوبکر! تمہارے قول کے مطابق اور اے عمر! تمہارے قول کے موافق حکم نہیں فرمایا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کی: حضور! میں اللہ سے توبہ کرتا ہوں اور حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے حضور سرور کائنات ﷺ سے سوال کیا کہ حضور! اللہ تعالیٰ شرکی قضاء فرماتا ہے، پھر بندوں کو عذاب دیتا ہے۔ حضور انور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُونَ“ اللہ تعالیٰ جو کرتا ہے اس سے پوچھا نہیں جاتا اور بندوں سے پوچھا جائے گا۔ خدا تعالیٰ جو کچھ کرتا ہے اس سے پوچھا نہیں جاتا اور بندوں سے پوچھا جائے گا۔

روایت حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ

روایت ہے کہ ایک شخص حضرت مولیٰ مشکل کشا علی کرم اللہ وجہہ الکریم کی خدمت میں آیا اور کہنے لگا کہ مجھ کو قدر کی خبر دیجئے؟ فرمایا: اندھیرا راستہ ہے، اس کے بارے میں نہ پوچھ۔ پھر اس نے ایک ساعت چپ رہنے کے بعد یہی سوال کیا کہ مجھ کو قدر کے متعلق خبر دیں، فرمایا: بحر عمیق ہے، بڑا گہرا سمندر ہے، اس میں داخل نہ ہو۔ ایک ساعت کے لیے چپ رہا، پھر عرض کی: ”أَخْبِرْنِي عَنِ الْقَدْرِ“ مجھے بتائیے کہ قدر کیا ہے؟ فرمایا: یہ اللہ کا راز ہے، زمین میں اس کو افشا نہ کر۔ پھر ایک ساعت خاموش رہا، پھر یہی سوال دہراتا ہے: مجھ کو قدر کی خبر دیجئے۔ تو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس سے سوال کیا کہ یہ بتا تیری مشیت اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے یا تیری مشیت اللہ تعالیٰ کی مشیت کے خلاف جدا ہے؟ تو وہ شخص حیران و ششدر ہو کر عرض کرنے لگا کہ آپ ہی فرمائیے؟ مولیٰ علی نے فرمایا: اگر تو یہ کہے کہ میری مشیت اللہ تعالیٰ کی مشیت کے ساتھ ہے تو تو نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ مشارکت کی اور اگر تو کہے کہ میری مشیت اللہ تعالیٰ کی مشیت سے برتر اور اوپر ہے تو تو نے الوہیت کا دعویٰ کیا۔

اب اس سے تجھ کو معلوم ہو جانا چاہیے کہ تیری مشیت اللہ تعالیٰ کی مشیت کے تحت ہے یہ سن کر اس شخص نے توبہ کی اور جب جانے کے ارادہ سے اٹھا تو حضرت علی نے اپنے اصحاب مجلس سے فرمایا کہ اٹھو! اس سے مصافحہ کرو کہ یہ اب مسلمان ہوا ہے۔

تو اس سے ثابت ہوا کہ جو قدر کا منکر ہے کافر ہے اور حضور اقدس ﷺ نے فرمایا: قدر یہ میری امت کے مجوسی ہیں، اگر بیمار ہو جائیں تو عیادت و بیماری پر سی نہ کرو اور اگر مر جائیں تو جنازہ کے ساتھ نہ جاؤ اور یہ دجال کا گروہ ہے اور حق ہے اللہ پر کہ ان کو دجال کے ساتھ ملا دے اس لیے کہ انہوں نے نص کا انکار کیا کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ”وَمَا تَشَاءُ وَاِنَّا اِلَّا اَنْ يَّشَاءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعَالَمِيْنَ“ (التکویر: ۲۹) اور تم کیا چاہو مگر یہ کہ چاہے اللہ تعالیٰ سارے جہاں کا رب۔

سوال: یہ ہے کہ اگر ایسا ہی ہے تو پھر یہ ہونا چاہیے کہ اگر بندہ چاہے کہ یہ گھاس سونا بن جائے تو اسے سونا ہو جانا چاہیے اس لیے کہ تم کہتے ہو: بندہ وہی چاہتا ہے جو اللہ تعالیٰ چاہے۔

جواب: ہم کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ بندہ اس طرح چاہے تو بندہ نے ایسا چاہا اور اگر اللہ چاہے کہ گھاس سونا ہو جائے تو یقیناً سونا ہو جائے گا۔

غیلان قدری کا واقعہ

روایت ہے کہ غیلان قدری بصرہ سے کوفہ آیا اور وہاں کے فقہاء سے مناظرہ کیا، غیلان فقہاء پر غالب آ گیا۔ حضرت ابوحنیفہ جو ان تھے حضرت حماد کے ہاں آیا جایا کرتے تھے۔ حضرت حماد نے حضرت ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا: اے جو ان! تم اس شخص کے پاس جاؤ اور اس سے مناظرہ کرو۔

حضرت امام ابوحنیفہ بادشاہ کے دروازہ پر پہنچے اور اندر داخل ہوئے اور بعد ازاں مناظرہ کیا جس میں امام صاحب غالب آئے اور غیلان مغلوب ہو گیا۔ غیلان نے امام صاحب سے درج ذیل سوال کیے۔

غیلان: اے ابوحنیفہ! یہ بتائیے کہ ابلیس نے فرعون سے کیا چاہا؟
امام اعظم: اس نے فرعون سے کفر چاہا۔

غیلاں: موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے کیا چاہا؟

امام اعظم: موسیٰ علیہ السلام نے ایمان چاہا۔

غیلاں: اللہ تعالیٰ نے فرعون سے کیا چاہا؟

امام اعظم: اللہ تعالیٰ نے فرعون سے کفر چاہا۔

غیلاں: آپ نے اللہ تعالیٰ کی مشیتِ ابلیس کی مشیت کے موافق کر دی اور موسیٰ علیہ

السلام کی مشیت کو اللہ تعالیٰ کی مشیت کے موافق نہیں کیا اور چاہے یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ

کی مشیت موسیٰ علیہ السلام کی مشیت کے موافق ہوتی۔

امام اعظم: اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ ابلیس فرعون سے کفر چاہے اور اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ موسیٰ علیہ

السلام فرعون سے ایمان چاہیں اور اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ فرعون اپنے نفس کے لیے کفر

چاہے تو یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی مشیت سے ہوا اور یہ مسئلہ ایک نقطہ کی طرف لوٹتا ہے

وہ یہ ہے کہ کفر و شر دونوں مخلوق اللہ ہیں یا غیر کی مخلوق ہیں؟ تو اگر کہا جائے کہ اللہ کی

مخلوق نہیں غیر کی ہیں تو اللہ تعالیٰ کے سوا دوسرا خالق و صانع ثابت کیا تو اللہ کے

ساتھ شرک کر کے کافر ہوا اور اگر کہے کہ کفر و شر اللہ کی مخلوق ہے بغیر اس کے ارادہ و

مشیت کے تو پھر یہ اعتقاد کیا کہ اللہ تعالیٰ ان کے پیدا کرنے میں مجبور و مکرہ ہے اور

یہ کفر ہے تو ثابت ہوا کہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے ارادہ و مشیت، قدرت اور قضاء سے

ہے اور جو قدر کا انکار کرے کافر ہے۔

ساتواں قول

فضل و عدل کا بیان

معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ صفتِ فضل و عدل کے ساتھ موصوف ہے اس میں کسی کا

اختلاف نہیں اور نہ ہی اس میں کسی کو شبہ ہے کہ اس کا فضل بغیر میل (جانب داری و جھکاؤ)

کے اور عدل بغیر جو رستم کے ہوتا ہے ہاں! البتہ اس میں اختلاف ہے کہ عدل و فضل کی تاثیر

کیا ہے؟

اہل سنت و جماعت نے فرمایا کہ فضل کی صفت اور اس کی تاثیر اللہ تعالیٰ کی طرف سے زیادتی لطف ہے جو کہ فقط مؤمنین کے لیے ہے، غیر مؤمنین کے لیے نہیں ہے اور وہ (زیادتی لطف) ایمان کے لیے انشراح صدر اور ہدایت و رہنمائی ہے اور درست باتوں کو مؤمنین کے دلوں میں ڈال دینا، اس کو قبول کرنے کی صلاحیت دینا اور طاعت و عبادت پر توفیق اور احسان و اختصاص کرامت و ولایت کے ساتھ یہ سب چیزیں مؤمنین کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے محض فضل اور زیادتی لطف و کرم سے حاصل ہیں جو غیر کے لیے نہیں ہیں۔

معتزلہ کا مسلک

معتزلہ کہتے ہیں کہ یہ فضل نہیں بلکہ میل ہے اس لیے کہ تمام انسان اللہ تعالیٰ کے غلام اور لونڈی ہیں، بس اگر کسی کو بغیر سب کچھ عطا فرمائے اور دوسرے کو بلا وجہ محروم رکھے تو یہ اس کے حق میں نجس (نقص) ہوگا اور پہلے کے حق میں میل (جانب داری) ہوگا اور پھر یہ حکمت کے خلاف ہے۔

معتزلہ کے نزدیک صفت فضل کیا ہے؟

ان کے نزدیک صفت فضل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو عاقل، مرید، مختار اور فاعل کی صفات کے ساتھ پیدا فرمایا، پھر ان کے لیے دلائل و احکام سے راستہ بیان کر دیا اور یہی ہدایت کے معنی ہیں۔

فضل کسے کہتے ہیں؟

معتزلہ کے نزدیک فضل یہ ہے کہ جو ایمان لایا اور اطاعت کی تو اجر و ثواب پائے گا اور جس نے انکار کیا اور نافرمانی کی تو وہ سزا پائے گا اور اس کے سوا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے لیے کچھ نہیں اور صحیح وہی بات ہے جو ہم نے ذکر کر دی ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کو تمام مخلوق میں مختص کیا اور چار چیزوں سے ان کو خاص کیا۔

چار خصوصیات انبیاء کرام

اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کو چار چیزوں سے خالص کیا:

(۱) ایک تو یہ کہ ان کے اجساد پاک و طیب مٹی سے گوندھے گئے۔

(۲) اور ان کی روہیں روح القدس سے پیدا کی گئیں۔

(۳) اور تائید و عصمت سے ان کا اکرام کیا۔

(۴) اور ان کو حلال غیر مشتبہ روزی دی، اس سے بڑھ کر ان کو وحی و رسالت سے فضیلت

دی تو جب انبیاء کرام صلوات اللہ علیہم اجمعین کو بغیر علت و سبب کے زیادہ لطف و تائید

اور عصمت و نبوت سے نوازنا جائز ہے تو ان کے غیر کو بھی ان کی قدر سے زیادہ دینا

محض فضل اور لطف و کرم سے جائز ہوگا۔

اور ان کا یہ کہنا کہ اگر دوسرے کو منع کرے گا تو نجس (یعنی نقص) ہوگا تو ہم کہتے ہیں کہ

ایسا نہیں ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ پر بندوں کے لیے کوئی شئی واجب نہیں، اگر وہ کسی کو مال و

دولت عطا فرمائے تو یہ اس کا فضل ہوگا بغیر وجوب کے اور جائز ہے کہ کسی کو اپنے ارادہ سے

زیادہ بھی عطا فرمادے اور پھر کسی کو کچھ نہ دے اور جو دوسرے کو دیا ہے اس سے منع کرے تو یہ

منع واجب کا منع کرنا ہے، یہاں تک کہ اس کو نجس (یعنی نقص) کہا جائے، بلکہ اس سے عدل ہو

گا، اس لیے کہ اس پر کچھ واجب نہیں اور اس پر ہمارا اجماع ہے کہ ہدایت اللہ کی طرف سے

جائز ہے، لیکن عنایت تو بعض کہتے ہیں کہ جائز ہے اور بعض کہتے ہیں: جائز نہیں، اس لیے کہ

عنایت بہر حال میل (جانب داری) سے خالی نہیں ہے اور صحیح وہی ہے جو ہم نے ذکر کیا ہے

کہ بندوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے معونت ہے اور ہم نہیں کہتے کہ عنایت ہے، اس

لیے کہ یہ لفظ سماعاً وارد نہیں اور نہ ہی اہل علم اس پر متفق ہیں اور نہ یہ موجبات ضرورت سے ہے

تو ہم بھی اس کے قائل نہیں۔

عدل اور اہل سنت و جماعت

اہل سنت و جماعت کے نزدیک صفت عدل کا بیان چھ چیزوں میں ہے:

(۱) ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ذرہ برابر ظلم نہیں کرتا ہے۔

(۲) دوسرے یہ کہ بندے کی نیکیوں میں ذرہ برابر نجس (یعنی کمی) نہیں کرتا۔

(۳) تیسرے یہ کہ بغیر گناہ کیے کسی کو عذاب نہیں دیتا۔

(۴) چوتھے یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو دکھ نہیں دیتا بغیر غرض صحیح کے اور بہت بڑے عوض

کے بھی۔

(۵) پانچویں یہ کہ اللہ تعالیٰ کسی کو معصیت پر مجبور نہیں کرتا۔

(۶) چھٹی یہ کہ اللہ تعالیٰ کسی بندے کو طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔

سوال: اگر کہا جائے کہ کیا یہ جائز ہے کہ اللہ تعالیٰ جہنم میں ایک مخلوق پیدا کرے اور اس کو بغیر معصیت کے عذاب دے؟

جواب: ہم کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے بلند و برتر اور ارفع و اعلیٰ ہے کہ کسی شخص کو بغیر جرم و خطا اور بغیر گناہ کے عذاب دے اور اگر کوئی مخلوق جہنم میں پیدا کرے تو جہنم اس کے لیے عذاب نہ ہوگا اور اگر بغیر جرم و گناہ اس کو عذاب دے تو عدل نہ ہوگا اور اللہ تعالیٰ جو کچھ کرتا ہے فضل و عدل سے کرتا ہے، دلیل اس کی یہ ہے: "كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ" (المدثر: ۳۸) ہر نفس (شخص) اپنے عمل کے بدلے گروہی ہے۔ دوسری آیت: "جَزَاءٌ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ" (الاحقاف: ۱۳) بدلہ ان کاموں کا جو وہ کرتے تھے۔

معتزلہ عدل کسے کہتے ہیں؟

معتزلہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا عدل یہ ہے کہ وہ کفر و شرک کو پیدا نہ کرے اور ضرر کو بھی پیدا نہ کرے اور نہ ان چیزوں کی قضاء (فیصلہ) کرے اور وہ مصالح (بھلائی اور بہتری) جن کے بندے محتاج ہیں اللہ پر واجب ہے اور اگر مصالح عباد کو منع کرے تو عدل نہ ہوگا۔ انہوں نے کہا کہ صفت عدل یہی ہے، یہاں تک کہ اگر اللہ تعالیٰ کفر و شرک کو پیدا کرے اور پھر بندوں کو عذاب دے تو یہ ظلم و جور ہوگا۔ سنو! یہ اعتقاد کفر ہے اس لیے کہ بندہ جب اپنے لیے کفر کا ارادہ کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ بندے سے توحید کا ارادہ کرتا ہے تو جس چیز کا بندہ نے ارادہ کیا ہوگا اور خدا نے جس چیز کا ارادہ کیا وہ نہ ہو تو بندہ کا ارادہ اللہ تعالیٰ کے ارادہ پر غالب ہو گیا اور یہ محال ہے اور ہمارا اس پر اجماع ہے کہ کفر اللہ تعالیٰ کے علم سے ہے، وہ جانتا ہے اور قادر ہے کہ اس کو منع کر دے جبراً اور اگر منع نہ کرے تو یہ معتزلہ کے نزدیک عدل نہ ہوگا اس لیے کہ جو چیز بندوں کے حق میں اصلح اور اصوب ہو اللہ تعالیٰ پر اس کا پیدا کرنا واجب ہے اور کفر میں نہ فلاح ہے نہ صواب ہے اور ایسے ہی ان کے زعم میں اصلح و اصوب اللہ تعالیٰ

کے حق میں اولیٰ ہے کہ اس پر واجب ہو اور بندہ جب ترک کر دے اس چیز کو جو بندوں کے حق میں برائی ہے اور عدل نہ ہوگا اس بندہ کی طرف سے اور عیب لوٹے اس کی طرف اور ایسے ہی اللہ تعالیٰ کے حق کہ جب جانتا ہے کہ بندہ کفر و شرک کرے گا اور اس نے اصلاح و اصوب کو ترک کیا اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور جبراً منع کرنے پر قادر ہے اور منع نہ کرے تو عیب اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹے گا اور یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عدل نہیں ہوگا اور یہ جائز نہیں۔ پھر ہمارا اس پر اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کو بغیر نبی کے کفر اور قبائح سے جبراً منع نہیں کرتا باوجودیکہ اس کو علم و قدرت ہے اور صفت فتح بندے کی طرف لوٹے گی اور ایسے ہی اگر اللہ تعالیٰ کفر و شرک اور فتح کے پیدا کرنے کا ارادہ کرے تو عیب بندے کی طرف لوٹے گا جیسے علم میں۔

سوال: اگر کہا جائے گا کہ از روئے حکمت یہ کیسے جائز ہے کہ کفر و شرک کا ارادہ اپنے حق کر لے اور شروع اپنے نفس کے لیے ارادہ کرے؟

جواب: ہم کہتے ہیں: جیسے جائز ہے از روئے حکمت کہ کسی نفس کو پیدا کرے اور جانتا ہے کہ یہ کفر و شرک کرے گا اور بُرا کام کرے گا باوجود اس کے کہ اسے علم ہو اس کو پیدا کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو ایسے ہی یہ مسئلہ ہے اس لیے کہ جائز ہے کہ شرک اللہ تعالیٰ کے ارادہ سے ہو اور عیب بندے کی طرف لوٹے جیسے علم میں۔

آٹھواں قول

تکوین و ملکون کا بیان

امام ابو الحسن اشعری اور کرامیہ کہتے ہیں کہ تکوین و ملکون ایک ہی چیز ہے اور اہل سنت و جماعت کہتے ہیں کہ تکوین ملکون کا فعل ہوتا ہے اور ملکون (واو کی زبر کے ساتھ) تکوین کی تاثیر کو کہتے ہیں چنانچہ تکوین اور ملکون الگ الگ دو چیزیں ہیں۔

اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ فلاں بندہ کفر کرے گا تو یہ عیب صرف بندے کی طرف راجع ہوگا۔

صورتِ مسئلہ یہ ہی ہے کہ ان کے نزدیک ملکون (پیدا کرنے والا) جب کسی شئی کو پیدا کرتا ہے تو فعل اس سے زائل (جدا) ہو کر ملکون (مفعول) میں حلول کرتا ہے اور اس میں سما جاتا ہے اور اہل سنت و جماعت کے نزدیک فعل فاعل سے جدا ہو کر مفعول میں حلول و رایت نہیں کرتا اور تکوین (تخلیق) ملکون (خالق) سے جدا نہیں ہوتی اور یہ مسئلہ دراصل ایک دوسرے مسئلہ کی فرع ہے وہ (اصل) مسئلہ یہ ہے کہ ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی صفات حادث و محدث ہیں اور اہل سنت کے نزدیک صفات باری تعالیٰ ہونا جائز نہیں ہے جیسا کہ پہلے ہم ذکر کر چکے ہیں تو جب ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی صفات و افعال حادث ہیں تو انہوں نے کہا: فعل، صنع اور تخلیق و تکوین اس سے شروع ہوتے ہیں پھر اس سے زائل (جدا) ہو جاتی ہیں یعنی تفعلیل و تکوین اور تخلیق کے وقت اس سے جدا ہو کر ملکون و مفعول میں حلول کر جاتی ہیں اور یہ کفر ہے۔

اس لیے کہ یہ دو حال سے خالی نہیں یا یہ فعل و صنع حادث ہوں گے یا غیر حادث؟ اگر کہیں کہ حادث ہیں تو انہوں نے اللہ تعالیٰ کے محل حوادث ہونے کا اعتقاد کیا اور اس پر تغیر و تکوین اور تحویل جائز ہوگا اور یہ کفر ہے۔

اور اگر کہیں: فعل غیر محدث ہے بلکہ صفت قدیم ہے تو محدث میں صفت قدیم کے حلول کا اعتقاد کیا، اب قدم اور بقائے دھران کا عقیدہ ٹھہرا، اس لیے کہ ان کے نزدیک دھرقدیم کا محل ہوگا اور قدیم کا محل قدیم ہونا ضروری ہے اور یہ کفر ہے۔

متصوفین کا مسلک

بعض متصوفین کہتے ہیں کہ ہر شئی علت اس کی صنعت ہے اور یہ بھی صحیح نہیں اس لیے کہ صنع علت ہے تو وہ معلول میں حلول کرے گی تو یہ اور پہلا مسئلہ برابر نہیں۔

سوال: پھر اگر کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ آیا اپنی صفت کو بدلنے پر قادر ہے؟

جواب: تو ہم کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ قادر ہے کمال پر لیکن تغیر جائز نہیں اللہ تعالیٰ کی صفات میں اس کا وجود محال ہے اور اللہ تعالیٰ محال سے منزہ ہے۔

صفت الہی کا بدلنا محال ہے اور محال تحت قدرت نہیں کہ یہ مقدور بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا (تو قابل کا نقص ہے فاعل کا نہیں) اور اس کا سوال کرنا کفر ہے اس لیے کہ اس نے

صفات باری میں تغیر کو جائز مانا اور یہ کفر ہے۔

نواں قول

باری تعالیٰ کے کتنے صفات ہیں؟

اہل سنت و جماعت فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی صفات نہ مکرر ہیں اور نہ وہ متعدد ہیں، بیان اس کا یہ ہے کہ اللہ عزوجل فعل واحد کا فاعل ہے اور جمیع مفعولات کو ایک فعل سے کرتا ہے۔

اور وہ ”حی“ ہے حیات واحد سے، سمیع ہے سمیع واحد ہے، جمیع مسموعات کو سنتا ہے اور وہ ایک کلام سے متکلم ہے، تمام صفات کو اسی طرح سمجھ لو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات قدیمہ ہیں اور عدد و تکرار محدثات کی صفت ہے اور اگر ہم کہیں کہ اللہ تعالیٰ کی صفت حد تکرار میں داخل ہیں تو پہلی صفت زائل ہوگی اور دوسری صفت پیدا ہوگی، یہاں تک کہ مکرر ہو جائیں گی اور یہ کفر ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے اور یہ معنی تمام صفات میں مؤثر ہوں گے۔
اعتراض: اگر کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات سب کی سب صفت واحدہ ہیں یا ہر صفت علیحدہ علیحدہ پہلی صفت کے علاوہ ہے؟

جواب: تو ہم کہیں گے کہ ہمارے بعض اصحاب فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ صفت حیات، صفت قدرت اور علم سے موصوف ہے اور اسی طرح باقی تمام سے ہر صفت سے علیحدہ علیحدہ موصوف ہے۔

اور ہمارے اصحاب میں سے بعض کہتے ہیں کہ سب کی سب صفات صفت واجب ہیں اور اس میں یہ ہے کہ جو ہم کہتے ہیں کہ صفات الہی حقیقت میں ایک ہیں، وہ عدد کے تحت داخل نہیں ہیں، لیکن اس کی تاثیر اور اسماء معدودہ ہیں، اس لیے کہ جس نے اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے کسی صفت کا انکار کیا تو وہ کافر ہو جائے گا اور کسی صفت کو زیادہ کیا تو کافر ہو جائے گا تو صفات باری تعالیٰ جل مجدہ تاثیر اور اسم کے اعتبار سے

معدودہ ہیں اور ایمان کل پر واجب ہے اور صفات درحقیقت ایک ہیں۔
 اگر کہا جائے کہ قدرت اور حیات دوشکی ہیں یا دو عدد ہیں یا اثناں ہیں تو کافر ہو جائے
 گا تو ہم کہتے ہیں کہ حیات اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اور قدرت اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اور
 قدرت حیات نہیں اور نہ وہ غیر حیات تو یوں کہیں گے: ”لا ہی ولا ہی غیرھا“ اور ایسے
 ہی علم مع الارادہ اور سمع مع البصر اور ہر صفت کے ساتھ ہم کہیں گے: ”لا ہی ولا ہی
 غیرھا“ جیسے صفات ذات میں اس لیے کہ صفات معدودات سے نہیں ہم کہیں گے کہ اہل
 سنت کا مذہب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ واحد بصفاتہ ہے۔ جب ہم نے ثابت کر دیا کہ صفات باری
 مکرر اور معدودہ نہیں ہیں تو ایسے ہی واجب ہے کہ متضاد اور متناقض بھی نہ ہوں۔

جیسے ہم سخط (ناراضی) اور رضا (خوشنودی) کے بارے میں کہتے ہیں: اللہ کی رضا اس
 کی سخط (ناراضی) نہیں اور نہ ضد سخط ہے اور اس کا سخط اس کی رضا نہیں اور نہ ضد رضا تو ہم
 کہیں گے کہ ”لا ہی ولا ہی غیرھا“ اور وہ رضا و سخط کے ساتھ موصوف ہے اور یہ جو
 کہا کہ رضا ضد سخط نہیں اس لیے کہ رضا سخط سے زائل نہیں ہوتی اور نہ مشغول کر کے سخط سے
 اور اس کا سخط اس کی رضا کو زائل نہیں کرتا اور نہ اس کو مشغول کرتا ہے اور اس کی صفت کسی حال
 میں اس سے زائل نہیں ہوتی اور تضاد و تناقض اس وقت ظاہر ہوتا ہے جب ایک صفت دوسری
 سے مشغول کرے یا اس کی ضد اس سے زائل ہو اور اثبات مشغول بھی صفات باری میں جائز
 نہیں اور کوئی صفت اس سے زائل نہیں ہوتی اور اس کی صفت میں نفی کی اضافت نہیں ہو سکتی
 اور اثبات کی اضافت بھی نہیں ہو سکتی تو ثابت ہوا کہ اس کی صفات میں تناقض و تضاد نہیں۔

سوال: یہ ہے کہ آیا اللہ تعالیٰ کی صفات میں مکر اور مخادعہ جائز ہے یا نہیں؟

جواب: ہم کہیں گے کہ یہ معانی ردیہ ہیں اور صفات قبیحہ تو قبیحہ اور ردیہ صفات نہیں ہو سکتیں
 لیکن بہ طریق مکافات (بدلے) و مجازات (جزاء) جائز ہے اپنے دشمنوں کو ان کے
 مکر و مخادعت اور استہزاء بمثل افعالہم یعنی جیسا ان کا فعل ویسا اس کو بدلہ دینا اور یہی
 معنی ہیں ”اللہ یتہزیئ بہم“ (البقرہ: ۱۵) اور ”و مکرناہم مکرًا“ (النمل: ۵۰)
 اور ”ینخادعون اللہ“ (البقرہ: ۹) ”وہو خادعہم“ (النسا: ۱۳۲) تو ان آیتوں میں
 ان کے افعال کی جزاء مراد ہے۔

دسواں قول

آیاتِ متشابہات پر ایمان لانے کا بیان

اہل سنت و جماعت فرماتے ہیں: متشابہات پر ایمان لانا واجب ہے اور اس کی تفسیر جائز نہیں اور اس کی تاویل واجب نہیں اور یہ کہنا جائز نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس صفت سے موصوف ہے بلکہ یہ کہیں گے کہ یہ کلام اللہ ہے اور ہمارا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا اس سے جو ارادہ فرمایا اس پر ہمارا ایمان ہے۔

جیسا کہ حضور اقدس ﷺ سے مروی ہے کہ فرمایا: ”ان لله یدین کلتاہما یمینان“ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”بَلْ يَدَاهُ مَبْسُوطَتَانِ“ نیز فرمایا: ”الرَّحْمَنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوَى“ اور اس قسم کی جو آیات و احادیث ہیں ان پر اس طرح ایمان لانا واجب ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور اس کے رسول کا کلام ہے اور اس میں تاویل واجب نہیں ہے۔

معززہ اور جہمیہ کا مذہب

معززہ اور جہمیہ کہتے ہیں کہ ان آیات و احادیث کی تاویل واجب ہے انہوں نے کہا کہ ”ید“ کے معنی قوت و نعمت ہے اور یہ درست نہیں اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”بَلْ يَدَاهُ مَبْسُوطَتَانِ“ اور جائز نہیں کہ ہم کہیں کہ اللہ تعالیٰ کے لیے دو قوتیں ہیں اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”لَمَّا خَلَقْتُ بِيَدِي اسْتَكْبَرْتُ“ (ص: ۷۵) جسے میں نے اپنے ہاتھ سے پیدا کیا، کیا تو متکبر ہو گیا؟ اور اگر ”ید“ سے مراد قوت ہوگی تو ابلیس یہ کہے گا کہ میں تیری قوت و نعمت سے مخلوق و پیدا شدہ ہوں تو ثابت ہوا کہ ”ید“ سے مراد قوت نہیں اور اس لیے بھی کہ اگر تاویل واجب ہوتی تو اول حضور اقدس ﷺ پر تاویل واجب ہوتی اس لیے کہ حضور ﷺ مبین بنا کر مبعوث ہوئے ہیں اور جب حضور نے اس کے معنی بیان نہیں کئے اور تاویل نہیں کی تو معلوم ہوا کہ تاویل واجب نہیں اس لیے کہ تاویل تفسیر سے اقویٰ و واضح ہے اس لیے کہ تاویل وہ ہے جو مراد کی طرف لوٹتی ہے اور اگر تاویل واجب و مشروع ہوتی تو وہ تاویل ہم تک منقول ہوتی، جیسے قرآن اور تفسیر و قراءتیں منقول ہوئی ہیں اور جب صحابہ کرام اور

تابعین سے تاویل منقول نہیں تو ثابت ہوا کہ تاویل واجب نہیں۔

اور ابو الحسن اشعری اور متقدمین مشائخ بخارانے کہا: مشابہات اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں بغیر تفصیل و تشریح و کیفیت کے اور انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ صفت ید صفت وجہ صفت نزول و قدم سے موصوف ہے آیات و احادیث میں جو جو صفات ذکر ہوئی ہیں اللہ تعالیٰ ان سب صفات سے بلا کیف موصوف ہے۔ یہ بھی درست نہیں اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: "وَأَخْرَجْنَا مَثَابَهُ" (آل عمران: ۷) اور دوسری مشابہ آیات ہیں اور اس سے اشتباہ معانی مراد ہیں یعنی اللہ تعالیٰ نے ارادہ فرمایا ہے کہ لوگوں پر اس کے معانی مشتبه ہو گئے ہیں۔ اگر ہم کہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں تو حد اشتباہ سے نکل کر مفسر ہو جائے گی۔

امام محمد ابن حسن سے مروی ہے کہ ان سے اسی قسم کی آیات و احادیث کے متعلق سوال کیا گیا تو فرمایا کہ جس طرح نازل ہوئی ہیں اور جو ان سے اللہ تعالیٰ نے ارادہ فرمایا ہے اس پر ایمان لاؤ اور حضرت سفیان ثوری حضرت ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ علم قرآن چار قسم کا ہے:

- (۱) ایک قسم وہ ہے جس سے جاہل رہنا جائز ہے اور وہ حلال و حرام کا علم ہے۔
- (۲) اور ایک قسم علم کی وہ ہے جس کو عرب جانتے ہیں وہ علم اسماء ہے اور علم تفسیر وہ علم قصص اور شان نزول۔

(۳) اور ایک علم وہ ہے کہ اس کو اللہ ہی جانتا ہے جیسا کہ فرمایا: "وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ" اور اس کی تاویل سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی نہیں جانتا۔

اور مشائخ سمرقند فرماتے ہیں کہ مشابہہ وہ ہیں جن کے معنی ہم پر مشتبه ہیں تو ہم ان پر ایمان لائے اور اقرار کرتے ہیں یہ کلام اللہ ہے اور خبر رسول اللہ کا کلام ہے اور ہم اللہ کے کلام پر اور اس کے رسول کے کلام پر ایمان لائے اور جو انہوں نے ارادہ فرمایا اس پر ہمارا ایمان ہے۔

سوال: اگر کہا جائے کہ آیا از روئے حکمت یہ جائز ہوگا کہ مثلاً اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو بھیجے اور اس پر کتاب نازل کرے اور احکام اتارنے پھر بعض چیزیں اپنے رسول پر مخفی و پوشیدہ رکھے جس کے معنی وہ نہ جانتا ہو؟

جواب: ہم کہتے ہیں: بمقتضائے حکمت جائز ہے کہ علم الہی پر کوئی علی وجہ الہام مطلع نہ ہو دلیل

اس پر یہ ہے کہ احادیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قلم کو حکم دیا کہ لکھے لوح محفوظ میں کہ فلاں سعید ہے "اِنْ شِئْتُ" یعنی اگر میں چاہوں تو فلاں سعید ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ لوح و قلم اور فرشتے جو لوح میں دیکھ رہے ہیں وہ بھی جمیع علوم الہی کو نہیں جانتے تو یہ راز ہے تو جب یہ لوح محفوظ میں ہے تو دیگر کتب میں بھی جائز ہے جو احکام اور جن چیزوں کی مخلوق کو حاجت ہے وہ تو واضح کر دیئے جائیں اور جس چیز کی مخلوق محتاج نہیں ہے تو جائز ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا راز ہو۔

معزلہ کا مسلک

پھر معزلہ کے نزدیک تشابہات کی تاویل واجب ہے اور اہل سنت کے نزدیک غیر واجب ہے، لیکن جائز ہے کہ تشابہ میں تاویل کریں اس لیے کہ مشبہ نے ظاہر آیتوں کو لے کر کہا کہ اللہ تعالیٰ کے لیے ید (ہاتھ) اور انگلی دیگر مخلوقات کی طرح ہیں اور اس کا انہوں نے اعتقاد کیا اور یہ کفر ہے تو تاویل جائز ہے، تشبہ کے وقت نفی خطا، اور زوال شبہ کے لیے، لیکن ساتھ ہی ہم یہ نہیں کہتے کہ جو تاویل کی ہے یہی مراد متکلم ہے بلکہ یوں کہیں گے، ممکن ہے اس سے مراد یہ ہو لیکن حقیقی تاویل ہمیں معلوم نہیں، اس کی حقیقی مراد اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔

واللہ اعلم بالصواب والحق



باب پنجم اسماءِ حسنیٰ کا بیان

اس بارے میں چھ اقوال ہیں:

اول: اسماءِ حسنیٰ کا بیان۔

دوم: اسمِ مستحکم کا عین ہے یا غیر؟

سوم: اللہ کے اسماءِ حسنیٰ کتنے ہیں؟

چہارم: اللہ تعالیٰ کو ان اسماء سے پکارو جو سماع یعنی شرع سے ثابت ہیں۔

پنجم: نبیوں، رسولوں اور فرشتوں کے اسماء کا بیان۔

ششم: چیزوں کے لغوی اور معنوی نام۔

قول اول اسماءِ حسنیٰ میں ہے

مہدی ابوشکور سالمی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: ہمارا اہل سنت و جماعت کا اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ اسماءِ حسنیٰ کے ساتھ مدعو ہے دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "وَلِلّٰهِ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنٰی فَادْعُوهُ بِهَا" (الاعراف: ۱۸۰) اور سب سے اچھے نام اللہ ہی کے ہیں تو انہی ناموں سے اسے پکارو۔ "قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوْ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ اَيًّا مَا تَدْعُوا فَلَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنٰی" (الاسراء: ۱۱۰) تم فرماؤ اللہ کو پکارو یا رحمن کو پکارو تو کسی نام سے پکارو اسی کے لیے اچھے نام ہیں۔

ہمارا اجماع ہے کہ وہ مذکور ہے اپنے نام کے ساتھ دلیل یہ ہے کہ ”فاذ کرونی اذکرکم“ (البقرہ: ۱۵۲) تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ”وَلِذِكْرِ اللَّهِ اَتْكِبْرُ“ (العنکبوت: ۲۵) اللہ تعالیٰ کا ذکر بڑا ہے۔ اس میں اختلاف ہے کہ وہ اپنے ناموں سے مسمیٰ ہے یا نہیں؟

معز لہ کا مسلک

معز لہ کہتے ہیں کہ یہ جائز نہیں کہ وہ اپنے ناموں سے مسمیٰ ہو اس لیے کہ اسم اشارہ کے لیے ہے اور اشارہ اجناس میں تمیز کے لیے ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ اسم جنس سے منزہ ہے تو اسم اور اشارہ کا محتاج نہیں تو اس کا اسم نہیں ہوگا اور جب اس کے لیے اسم نہیں تو وہ مسمیٰ بالاسم نہیں ہوگا اور اہل سنت و جماعت کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے اسماء کے ساتھ مسمیٰ ہے اور اسماء اللہ ہی کے اسماء ہیں دلیل یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے ننانوے (۹۹) نام ہیں جس نے ان اسماء کو یاد کیا اور پڑھا جنت میں داخل ہوگا اس حدیث سے ثابت ہوا کہ اسماء اللہ ہی اللہ کے اسماء ہیں۔

پھر اسم کبھی تو اشارہ کے لیے ہوتا ہے اور یہ محدثات کے اسماء ہیں اور کبھی افادہ کے لیے ہوتا ہے نہ کہ اشارہ کے لیے اور وہ اللہ کا نام ہے اور یہ ہم نے کیوں کہا: اسماء اللہ تعالیٰ افادہ کے لیے ہیں اشارہ کے لیے نہیں؟ اس لیے کہ اسماء اللہ تعالیٰ سب کے سب ایک معنی ہیں اس لیے کہ وہ تمام معنی جو اسماء میں ذکر کیے گئے وہ سب ایک اسم میں مذکور ہو جاتے ہیں۔

بیان اس کا یہ ہے کہ جب تو نے ”اللہ“ کہا تو اللہ کا اسم ذکر کرنے سے رحمن رحیم، علیم حکیم، حلیم اور تمام اسماء کا معنی مذکور و موجود ہو گئے اور اسی طرح تمام اسماء کا حال ہے کہ کسی ایک اسم کا ذکر کرو تو تمام اسماء کے معانی اس میں آ جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اسم کا مسمیٰ ہے نہ کہ تسمیہ کے ساتھ مسمیٰ ہے اور وہ ایسا ہے جیسا اس نے اپنا نام رکھا اور کسی دوسرے نے اس کا نام نہیں رکھا۔

دلیل اس کی یہ ہے کہ وہ مسمیٰ بالاسم ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ اس کی وحدانیت پر ایمان لائیں تو ایمان بالذات واجب ہے اور ہم ایمان لانے میں اس کے نام کا ذکر کرتے ہیں تو اگر ذات مسمیٰ بالاسم نہ ہوتی تو دنیا میں کسی کا ایمان صحیح نہ ہوتا۔

اور تقریر کلام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کی ہمیں پہچان کرائی تو اپنی صفات و اسماء سے اور اس سے مراد معرفت ذات ہے تو اگر وہ اپنی صفات سے موصوف اور اپنے اسماء سے مسمیٰ نہ ہوتا تو اس کی تعریف اس کی طرف سے صفت و اسم سے نہ ہوتی تو جب اس نے اپنی معرفت ہمیں اسم کے ذکر سے کرائی تو ثابت ہوا کہ وہ اپنے اسم کے ساتھ مسمیٰ اور اپنی صفت سے موصوف ہے۔

دوسرا قول اسم مسمیٰ کا عین ہے یا غیر

اشعریہ اور حشو یہ کہتے ہیں کہ اسماء کے تین مرتبے ہیں:
(۱) اسماء الذات (۲) اسماء الصفات (۳) اسماء الافعال
اسماء الذات: جیسے حی، شئی، قدیم، نفس، ذات اور جو اس کے شایان شان ہے۔
اسماء صفات: جیسے قادر، حکیم، مرید، سمیع، بصیر، متکلم۔
اسماء افعال: جیسے خالق، رازق، غافر و نحو ذلک۔

اسم ذات میں اختلاف کا بیان

انہوں نے اسم جلالت ”اللہ“ میں اختلاف کیا ہے، بعض نے کہا: اللہ اسم ہے اسم ذات اور یہ اسم موضوع ہے اور بعض کہتے ہیں: اللہ صفاتی نام ہے اور یہ اسم مشتق ہے پھر ان کا مذہب یہ ہے کہ اسماء ذات قدیم ہیں نیز اسم اور ذات ایک ہے اور اسماء صفات قدیمہ ہیں ”لا ہو ولا غیرہ“ اور اسماء افعال محدثہ ہیں اور اسم غیر مسمیٰ ہے۔

معتزلہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے تمام اسماء اس کا غیر ہیں اور سب کے سب مخلوق ہیں اور اہل سنت و جماعت کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے تمام اسماء قدیمہ ہیں ”لا ہو ولا غیرہ“ اور اسماء میں تفضیل و تعریف جائز نہیں، جیسے صفت میں اور یہ جائز نہیں کہ اسماء حادث ہوں یا اس کی صفات حادثہ ہوں بلکہ اللہ تعالیٰ جل شانہ اپنی صفات اور اسماء کے ساتھ قدیم ہے۔

اللہ تعالیٰ کے تمام اسماءِ حسنیٰ ہیں

اللہ تعالیٰ کے تمام اسماءِ حسنیٰ ہیں اور اسماء میں سے ایک بھی غیر حسنیٰ نہیں اور یہ جو ہم نے کہا کہ وہ قدیم ہے اپنے اسماء کے ساتھ اس لیے کہ اس نے اپنے کلام میں اپنے نام بیان فرمائے اور حدیث جائز نہیں نہ اس میں نہ اس کے کلام میں اور یہ جو ہم نے کہا کہ اس کے اسماء ”لا هو ولا غیرہ“ اس لیے کہ اسم ہی اگر مسمیٰ ہے تو یہ قول مفطیٰ ہے کہ مسمیات دس ہیں یا اس سے بھی زائد ہوں اس لیے حکماً معدود ہیں اگرچہ اصل عدد اور جنس عدد سے نہیں۔

لیکن ہمارے نزدیک حکماً وہ معدود ہیں اور اگر مسمیٰ ہی اسم ہو اور اسم مسمیٰ ہو تو مسمیٰ اسم کی مانند معدود ہو جائے گا تو اس میں آئینہ کا اثبات ہوگا اس لیے کہ یہ اسماء اسماء اللہ تعالیٰ ہیں اور یہ محال ہے کہ متعدد آئینہ ہوں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر اسماء ہی مسمیٰ ہوں تو پھر اللہ تعالیٰ ہمارے منہ میں ہوگا اور یہ مقتضیٰ ہے کہ ذات جو مسمیٰ ہے ہمارے ذہن میں ہو اور یہ محال ہے اور اگر ہم یہ کہیں کہ اسم غیر مسمیٰ ہے تو دنیا میں کسی مؤمن کا ایمان صحیح نہ ہو اور کبھی کسی رسول کی رسالت صحیح نہ ہو اس لیے کہ ہم مثلاً اللہ عزوجل پر ایمان لاتے ہیں اور اللہ نام ہے ہمارے خالق کا تو اگر اسم غیر مسمیٰ ہو تو اللہ غیر خالق ہوگا تو خالق پر ایمان نہ ہو اور یہ محال ہے کہ اللہ خالق نہ ہو۔

اسی طرح محمد ﷺ نام ہے رسول کا اور ہم محمد (ﷺ) پر جو کہ رسول ہیں ایمان لائے ہیں تو اگر اس مسمیٰ کا غیر ہو تو محمد ﷺ غیر رسول ہوئے تو پھر ان پر ایمان لانا صحیح نہ ہوگا اور قطعاً درست نہیں تو ثابت ہوا کہ اسم نہ مسمیٰ ہے اور نہ غیر مسمیٰ ہے تو ہم کہیں گے: ”لا هو ولا غیرہ“ صفت کی مانند۔

تیسرا قول

اسماءِ باری تعالیٰ کتنے ہیں؟

اہل سنت و جماعت کے فقہاء کا اتفاق ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء بے حد اور بے شمار اور غیر متشابہہ ہیں لیکن ہمارا ذکر کرنا اور ہمارے الفاظ اور ہماری عبارتیں ان اسماء کے بارے میں

محدود و معدود ہیں پس اسم ذکر کے اعتبار سے یہ معدود ہے اور ایمان ایک ہے حقیقت و عبارت میں اور یہ ایسے ہی ہے جیسے ہم کہتے ہیں: قرآن پاک کا متن کہ قرآن کلام اللہ ہے، غیر مخلوق ہے اور نہ مخلوق ہے نہ حادث ہے نہ حدیث ہے نہ محدث ہے اور اس کے لیے نہ حد ہے نہ نہایت اور اس کے لیے نہ قطع ہے نہ فصل اور نہ اس کی ابتداء ہے نہ انتہاء لیکن ہمارا پڑھنا اور تلاوت کرنا محدود و معدود ہے۔ قطع و فصل اور بدایت و نہایت کے ساتھ۔ اسی طرح تمام اسماء باری تعالیٰ معنی میں اسم واحد ہے غیر مخالف اور غیر مختلف ہیں نہ محدود ہیں نہ معدود لیکن حکم و عبارت میں ہر اسم علیحدہ ہے حتیٰ کہ اگر اللہ کا اقرار کیا اور رحمن و رحیم کا انکار کیا تو کافر ہو جائے گا تو ہر اسم علیحدہ اسم ہوگا ذکر و ایمان میں معدود ہوگا۔ پس ایمان واجب ہے جمع اسماء پر جزایں نیست کہ ہم نے کہا کہ اسماء عبارت و حقیقت میں ایک ہیں اس لیے کہ اگر ایمان لایا مسکمی پر اور ایک اسم کا ذکر کیا تو اس کا ایمان صحیح ہے اور گویا اس نے تمام اسماء کا ذکر کیا اس لیے کہ تمام اسماء ایک اسم میں جمع ہیں اور ایسے ہی اگر کہے کہ اللہ عبارت میں غیر رحمن یا غیر رحیم ہے تو کافر ہو جائے گا تو صحیح وہ ہے جو ہم نے کہا۔

دوسری بات یہ ہے کہ اسم اللہ غیر رحمن نہیں ہے اور رحمن غیر رحیم نہیں ہے تو ہم کہتے ہیں کہ ”لا هو ولا غیرہ“ ایسے ہی سمیع بصیر کا غیر نہیں اور بصیر سمیع کا غیر نہیں تو ہم کہتے ہیں: ”لا هو ولا غیرہ“ جیسے ہم اسم و مسکمی میں کہتے ہیں کہ ”لا هو ولا غیرہ“ اور ایسے ایک صفت دوسری صفت کے ساتھ جیسا کہ ہم نے ذکر کیا۔

اللہ تعالیٰ کی کتابوں اور صحیفوں کا نام کلام اللہ ہے

اللہ تعالیٰ کی کتابوں اور صحیفوں کے نام ”تورات“ ”انجیل“ ”زبور“ ”فرقان“ سب کے سب کلام اللہ ہیں اور کلام اللہ واحد ہے پھر قرآن کریم وغیرہ کا علی سمیل التکرار اتارا جانا قول میں تکرار کا موجب نہیں بن سکتا۔

☆ اسم میں اختلاف ہو تو یہ مسکمی موجب اختلاف نہیں ہوتا۔

☆ قرآن مجید اللہ کا کلام ہے۔ ”توریت“ ”انجیل“ ”زبور“ اور صحائف ”اللہ کا کلام ہیں۔“

☆ اور قرآن ”تورات“ کا غیر نہیں اور نہ وہ ”تورات“ ہے تو مطلب وہی ہوا کہ ”لا هو

هُوَ وَلَا هُوَ غَيْرُهُ“

☆ اور اسی طرح ”انجیل“ وہ ”تورات“ کا غیر نہیں اور نہ ہی ”انجیل“ تورات ہے تو مطلب یہ ہو گیا ”لا ہو ولا ہو غیرہ“۔

☆ اور اسی طرح تمام کتب و صحائف کلام اللہ ہیں اور کلام اللہ ایک ہے اور وہ معدود نہیں اور اسی طرح اسماء باری تعالیٰ معدود نہیں تاکہ کلام میں عدد واجب نہ ہو اور واحد بھی نہیں کیونکہ ہر کتاب پر ایمان لانا ضروری ہے، اگر ایک کا بھی انکار کرے گا کافر ہو جائے گا جیسے کہ اسماء و صفات میں کسی ایک کا انکار کرے تو کافر ہو جاتا ہے۔

چوتھا قول

اس بارے میں کہ جو نام قرآن و حدیث سے مسوع نہیں، ان ناموں سے اللہ تعالیٰ کو یاد کرنا کیسا ہے؟ اس پر ہم سب کا اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو نام اپنے لیے ذکر نہیں فرمایا اور نہ خبر سے ثابت ہے اور نہ معنی ربوبیت کے موافق ہیں، ان ناموں سے خداوند قدوس کو یاد کرنا اور خدا کا نام رکھنا کفر ہے۔

اور ایسا نہ ہو کہ نہ قرآن میں مذکور ہے نہ حدیث میں لیکن معنی ربوبیت کے موافق ہے تو بعض کہتے ہیں جائز ہے اور بعض کہتے ہیں جائز نہیں۔ اصح یہ ہے کہ اگر ایسے لفظ کے ساتھ خدا کا نام رکھا جو بندوں کے ناموں کے ساتھ مشابہ ہے اور اس میں عبودیت کے معنی پائے جاتے ہیں تو ہرگز جائز نہیں اور اگر وہ خصائص ربوبیت اور الوہیت سے ہے تو جائز ہے۔

مشترک اسماء

بیان اس کا یہ ہے کہ ایسے اسم سے اللہ تعالیٰ کو یاد کرنا کہ جس میں عبودیت کے معنی کے ساتھ مشابہت ہو جائز نہیں ہے، جیسے صاحب،^۱ سید، حاکم، عالم، رحیم وغیرہ یہ اسماء مشترک ہیں اس لیے کہ ان ناموں سے بندوں کو پکارتے ہیں، لیکن اشتراک حقیقی نہیں ہے۔ اگر یہ اسماء حدیث میں نہ آئے ہوتے تو ہم ہرگز ان ناموں سے خدا کو پکارنے کی اجازت نہ دیتے۔

۱ جیسے بہت جہلاء نے ترجمہ قرآن میں لکھا: اللہ صاحب۔

وہ اسماء مبارک جو اللہ تعالیٰ کے لیے خاص ہیں

وہ نام جو اللہ تعالیٰ کے لیے خاص ہیں جیسے اللہ رحمن، خالق، قدیم یہ اسماء ربوبیت ہیں اور اس کے مثل تو ہمیں جائز ہے کہ ان کے ساتھ خدا کا نام لیں اگرچہ سماع سے ثابت نہ ہوں اس لیے کہ یہ وہ اسماء ہیں کہ ان میں معنی ربوبیت پائے جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ان ناموں کے ساتھ اپنا نام رکھا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "وَلِلَّهِ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ" (۱۱۱ احزاب ۱۸۰) اللہ تعالیٰ کے اچھے اچھے نام ہیں، لیکن خلاف واقع ہوا ہے لفظ میں اس لیے کہ لفظ اسماء میں مسموع نہیں ہوئے تو ہم نے کہا کہ ان الفاظ کا اطلاق جائز ہے اس لیے کہ لفظی اختلاف معنوی اختلاف کا موجب نہیں ہوتا جب کہ خطا و غلطی کا وہم نہ ہو جیسے ہم کہتے ہیں: جو شخص ایمان لائے اللہ پر فارسی، ترکی، ہندی یا کسی زبان میں تو جائز ہے اور اس کا ایمان صحیح ہے حالانکہ ایسے لفظ سے اللہ کا ذکر کرتا ہے جو نص سے مسموع نہ ہو اور باوجود اس کے جائز ہے کیونکہ یہ غلطی اور خطا کے موہم نہیں اور نہ اس سے معنی میں تبدیلی اور تغیر رونما ہوتا ہے تو ایسے "مانحن فیہ" ہے جب کہ معنی صحیح کے ساتھ اس کا نام لے تو جائز ہے۔

پانچواں قول

نبیوں، رسولوں اور فرشتوں کے ناموں کا بیان

ہمارا اجماع ہے کہ فرشتوں کے اسماء دو معنوں کے لیے ثابت ہیں: ایک معنی افادہ اور دوسرے معنی اشارہ اور یہ جو ہم نے کہا کہ افادہ کے لیے کیونکہ ملائکہ کے نام اللہ تعالیٰ کے امر سے ثابت ہوئے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے اس کی خبر دی تو وحی ہوئی اور ان پر ایمان لانا واجب ہے اور ان ناموں کو بدلنا اور متغیر کرنا جائز نہیں۔

اور یہ جو ہم نے کہا کہ اسماء اشارہ کے لیے ہیں یعنی ہم جنسوں میں تخصیص و تعیین کے لیے اور انبیاء کرام کے جو اسماء نص سے ثابت ہیں ان پر ایمان لانا بعینہ واجب ہے اور ان میں تغیر و تبدل جائز نہیں اور جو نص سے ثابت نہیں تو مسکمی پر ایمان لانا واجب ہے۔

رہا نام بدلنا جائز ہے یا نہیں؟ تو بعض کہتے ہیں: جائز اور بعض کا خیال ہے: جائز نہیں

ہے۔

اصح یہ ہے کہ جو ہم کہہ رہے ہیں کہ ان کے اسماء بدلنا جائز نہیں، نہ وفات کے بعد اور نہ وفات سے پہلے، اگر نام بدلا اور بدلے ہوئے نام کے ساتھ معروف و مشہور ہو جائے تو دیکھیں گے کہ اگر اس میں کوئی عیب یا حقارت نہ پایا جائے تو نام بدلنا جائز ہے اور اگر تغیر سے تحقیر و تنقیص مراد ہو تو ناجائز ہے اور حقارت سے بدلنے والا کافر ہو جائے گا۔

چھٹا قول

لغوی اور معنوی حیثیت سے چیزوں کے ناموں کا بیان

اس پر ہمارا اتفاق ہے کہ لغت سے جو اسماء وضع کیے گئے ہیں معتبر و مقبول ہیں اور احکام جیسا کہ حقائق پر مبنی ہوتے ہیں اسی طرح ناموں پر ان کا دار و مدار ہوتا ہے۔

اس مسئلہ کا اصل مقام ”اصول فقہ“ ہے۔

سوال: لغت کے خلاف اسم کا بالمعنی ثابت کرنا کیسا ہے؟

جواب: کسی اسم کو لغت کے خلاف بالمعنی ثابت کرنے میں دیکھا جائے گا اگر وہ اسم نص یا خبر

یا اجماع سے ثابت ہے تو یہ اسم معتبر ہوگا اور یہی اس شے کا اسم ہو جائے گا اور پھر لغت

کا اعتبار نہیں ہوگا۔

اور اگر وہ نام قرآن، حدیث اور اجماع سے ثابت نہیں تو نام رکھنا معتبر نہیں۔

اجمال کا بیان

اس اجمال کا بیان یہ ہے کہ صلوة، لغت میں دعا کے معنی میں آتا ہے اور شریعت میں

صلوة کے معنی ارکان مخصوصہ کے ساتھ عبادت مخصوصہ کے ہیں، اب اگر کوئی فرضیت صلوة کا

انکار کرے اور کہے کہ میں نے تو صلوة سے اس کے لغوی معنی (یعنی دعا) مراد لیے تھے تو اس

کی بات نہیں مانی جائے گی، نماز کی فرضیت کا انکار کرنے سے کافر ہو جائے گا اور ایسے ہی اگر

قسم کھائی کہ میں نماز نہیں پڑھوں گا اور پھر کہے کہ میں نے صلوة سے دعا مراد لی تھی تو اس کا

قول معتبر نہ ہو گا یہاں تک کہ اگر ایک کامل رکعت پڑھی تو قسم ٹوٹ جائے گی (اور کفارہ واجب ہوگا) ایسے ہی زکوٰۃ کے معنی لغت میں نماء (بڑھنا) اور زیادتی کے ہیں اور شریعت میں زکوٰۃ کے معنی نصاب کامل سے سال گزرنے کے بعد ایک مقررہ مقدار نکالنا آتے ہیں۔ پھر اگر فرضیت کا انکار کرے اور کہے کہ میری مراد زکوٰۃ سے نماء (بڑھنا) و زیادتی تھی تو اس کی تصدیق نہیں کی جائے گی اور کافر ہو جائے گا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اسماء اشیاء علامت و دلیل ہے اور شریعت سے جب دلیل و علامت ثابت ہو جائے تو پھر حقیقت لغویہ کا اعتبار نہیں کیا جائے گا تو جب لغت کے خلاف نام رکھا تو شریعت کے مقابلہ میں لغت کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔



چھٹا باب

رسولوں پر نزولِ وحی کے اثبات کا بیان

اس میں بیس قول ہیں۔

پہلا قول

اس بیان میں کہ وحی کا نازل کرنا اور پیغامبروں کا بھیجنا اللہ تعالیٰ کی طرف سے بمقتضائے حکمت ضروری ہے

حضرت ابوشکور سالمی نے فرمایا: جاننا چاہیے کہ شریعت میں وحی اور پیغامبروں کا بھیجنا اللہ تعالیٰ کی طرف سے بمقتضائے حکمت واجب ہے اور اس کا ترک فتنج ہے پھر تمام مسلمانوں کے نزدیک رسالت ثابت قائم اور صحیح ہے اور اس پر یہود و نصاریٰ نے بھی اتفاق کیا ہے۔ اور ایسے ہی مجوس نے متنبی (جھوٹا مدعی نبوت) کی پیروی کی جس کا نام زردشت ہے پھر باوجود اسلام کا انکار کرنے کے اس پر متفق ہیں کہ وحی ثابت اور جائز ہے کیونکہ کہ وہ متنبی کے پیرو ہیں۔

بہر کیف ان کی متابعت سے یہ امر ثابت ہوتا ہے کہ وہ وحی کو جائز مانتے ہیں اس کو عنقریب ہم ذکر کریں گے اور بعض لوگوں نے وحی کا انکار کیا ہے اور وہ وہم یہ اور فکر یہ ہیں ان کا کہنا ہے کہ وحی نا جائز ہے لوگ وحی و رسالت سے بے نیاز و مستغنی ہیں اس لیے کہ لوگ خدا کو عقل سے پہچانتے ہیں پھر جب کہ عقل منعم کی معرفت کے لیے آلہ (ذریعہ) ہے تو شکر منعم جو کہ اصل عبادت ہے وہ بھی عقل سے حاصل ہو سکتی ہے اس لیے کہ معرفت منعم اصل ہے اور عبادت اس کی فرع ہے جب معرفت جو اصل ہے وہ عقل سے حاصل ہوتی ہے تو فرع

بہ طریق اولیٰ حاصل ہو جائے گی۔

فرقہ وہمیہ اور فکر یہ کے نزدیک ادراک کی دلیل

ان کے نزدیک دلیل ادراک وہم و فکر ہے تو ہر وہ شئی جو وہم سے متوہم ہو اور دل میں خطرہ گزرے اور تفکر اس کا مستحسن (اچھی چیزوں) کو پسند کرنا اور بُری چیزوں سے باز رہنا، نتیجے سے پرہیز کرنا ان کے نزدیک واجب ہے اس کا اتباع ان کے نزدیک کفر ہے۔

الہامیہ کا مسلک

ان میں سے بعض الہامیہ ہیں وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کا ہمیں الہام کیا کہ وہ ایک ہے اور اسی طرح اپنی نعمتوں کے شکر کا الہام کرتا ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ تفکر و الہام تین حال سے خالی نہیں:

(۱) یا بلا واسطہ من جانب اللہ ہوگا (۲) یا فرشتے کے واسطہ سے (۳) یا الہام خود بخود ہو

گا۔

اعتراض: تو اگر وہ کہیں کہ الہام اللہ کی جانب سے بلا واسطہ ہوتا ہے تو اس سے وحی ثابت ہو گی اور خطاب اپنے نفس کے لیے اس لیے کہ الہام ہی تو وحی خفی ہے اور وحی و الہام کے ایک ہی معنی ہیں وہ یہ کہ قول یا فعل سے کسی شئی پر دلالت کرنا۔

سوال: اگر کہیں کہ الہام بواسطہ فرشتہ ہوتا ہے تو پھر ہر شخص کے لیے علیحدہ علیحدہ رسول ثابت کیا اس لیے کہ فرشتہ رسول و مبلغ وحی ہوتا ہے اور ان کا کلام وحی کی نفی کرتا ہے یہ دلیل درست نہیں۔

اگر کہا جائے کہ الہام من تلقاء نفسہ (اپنے نفس کی طرف سے) ہوتا ہے تو اس میں ربوبیت کا ادعا ہے اور امر و نہی کو اپنے لیے ثابت کیا تو کافر ہو گیا اور ان میں سے آفاقیہ تناختیہ براہمہ اور اباحتیہ ہیں۔ انہوں نے کہا کہ عبادت شکر منعم ہے اور وہ تفکر سے حاصل ہوتا ہے جو فکر و حرمت و تعظیم شکر کے ارکان و احکام نہیں لہذا مہین و معلم کی ضرورت نہیں لطافت روح اور صفائی قلب سے یہ بات حاصل ہو جاتی ہے۔

اور انہوں نے کہا کہ آفاق میں ہر شے کے لیے بہ طریق اشارہ خطاب ہے اس لیے کہ آگ بالطبع جلاتی ہے اور بہ طریق اشارہ لوگوں سے کہتی ہے کہ میرے قریب نہ

آنا جل جاؤ گے اور منظور و مباح ہر شے میں ایک معنی ہیں جو کہ بہ طریق عقل سمجھے جاتے ہیں یہ بھی خطا ہے اور اس کا اعتقاد کفر ہے۔

فلاسفہ نیچر یہ منجمہ کا مسلک

فلاسفہ نیچر یہ اور منجمہ کہتے ہیں کہ بندے پر سوائے معرفتِ صانع کے کچھ واجب نہیں اور یہ عقل سے معلوم ہو سکتی ہے تو وحی و رسالت کی ضرورت نہیں اور یہ عقیدہ بھی کفر ہے۔ ہمارا یہ کہنا کہ اثباتِ وحی اور رسالت حق ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بمقتضائے حکمت یہ جائز نہیں کہ اپنے بندوں کو اوامر و نواہی سے معطل چھوڑ دے حالانکہ بندے اس کے محتاج ہیں اس لیے کہ بندوں سے زد و کوب، سب و شتم اور قتل و ظلم عادیہ اور طبعاً پائے جاتے ہیں اور حکمت میں یہ امور ناجائز ہیں اور حکمت کا اقتضاء ہے کہ دنیا میں زجر و مکافات اور آخرت میں عقوبت و سزا اور بدلا دیا جائے یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عدل ہے اور اگر خدا کی طرف سے امر و نہی نہ ہو تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں پر کوئی حجت نہیں تو پھر نہ دنیا میں مکافات و بدلا ہے اور نہ آخرت میں سزا و جزا۔

پھر جب امر و نہی بہ طریق حکمت واجب ہو تو وہ بغیر خطاب کے ہوگا اور خطاب بغیر سفراء کے نہیں ہو سکتا اور وہ (سفراء) انبیاء و رسل ہیں (علیہم السلام)۔

اثباتِ وحی کی آٹھ دلیلیں

وحی کے اثبات پر آٹھ وجہ سے استدلال کیا جاتا ہے:

- (۱) ان میں سے ایک ظلم و عدوان کی حد کا بیان (۲) دوسری وجہ ظلم و عدوان سے انزجار و منع ہے (۳) تیسری وجہ ایجاب مکافات زجر عاجل ہے (۴) مکافات اور زواجر و تعزیر کی حدیں (۵) پانچویں وجہ دنیا میں نعمتوں اور مباحات کا بیان اور شکر منعم کے واجب ہونے کا بیان (۶) چھٹی وجہ شکر و عبودیت کی حد کا بیان (۷) ساتویں وجہ حقوق و مصالح کا بیان (۸) آٹھویں وجہ حسن و قبح کے اظہار کا بیان۔

اور ہم نے کہا: بیان حد ظلم و عدوان دلیل ہے نبوت و رسالت کے اثبات پر اس لیے کہ ظلم کا پہلا درجہ گالی ہے اور یہ دو وجہ پر ہے ایک تو وہ جو اپنے نفس پر واقع ہوتی ہے اور دوسرے وہ جو عزیز و اقارب کے متعلق واقع ہوتی ہے اور ان دونوں سے چشم پوشی نہیں کی جا

سکتی اس لیے کہ یہ دونوں ننگ و عار کے موجب ہیں تو عقل و حکمت کا تقاضا ہے اور زجر و مکافات کی حاجت ہے تو ضروری ہے کہ زجر و مکافات بھی از روئے عیب کے اس کے جرم سے ابلغ ہو اس لیے کہ اگر زجر و توبیخ ادون (گھٹیا) ہو یا مساوی ہو تو بسا اوقات زجر پذیر نہ ہو گا، کمینہ اور خسیس الطبع ہونے اور کم عقلی کی وجہ سے۔

پھر اگر کسی انسان کو گالی دی اس کی ذات میں تو تعزیر واجب ہے یا پہلو تہی؟ اور اگر گالی دی اس کے اہل کو تو حد واجب ہے اور اس کی حد قیاس و عقل سے مدرک نہیں ہو سکتی اور ظلم و عدوان کی قسم ہے 'ضرب یعنی زد و کوب ہے اور یہ بھی دو وجہ پر ہے: (۱) خطاء (۲) عمدا اور ہر ایک پھر دو وجہ پر ہیں ایک تو وہ جو درد و الم کا موجب ہو دوسرے وہ کہ موجب ہلاک و تلف ہو تو ہر موضع میں زجر و مکافات بقدر عمل ہونا چاہیے تو اگر ضرب خطاء تھی اور اس سے ہلاک ہو جائے تو دیت و کفارہ واجب ہے اور اگر ضرب عمدا ہے تو قصاص واجب ہے۔

ظلم کسے کہتے ہیں؟

ظلم کہتے ہیں: "وضع الشئی فی غیر موضعه" (کسی چیز کو بے مقام کر دینا ظلم ہے) کسی شئی کو اپنے محل میں نہ رکھنا ظلم ہے۔ عدوان کسے کہتے ہیں؟ اور عدوان کی تعریف کسی فعل کا غیر کی طرف ناحق متعدی ہونا ہے۔

عدوان کی دو قسمیں

تعدی کبھی تو حقوق اللہ میں ہوتی ہے اور کبھی حقوق العباد بندوں کے حق عدوان بندوں کے حق میں عدوان ضرب و شتم، قتل اور ناحق کسی کا مال لے لینا چوری، ڈاکہ زنی (رہزنی) اور غضب وغیرہ۔

حقوق اللہ میں عدوان

اللہ تعالیٰ کے حق میں عدوان ارتکاب محرمات ہے جیسے زنا، لواطت، شرک، شراب نوشی اور جھوٹ بولنا وغیرہ تو ہر موضع (جگہ) میں ہر بقدر جرم زجر و توبیخ کی حاجت ہے اور یہ واجب کرتا ہے حد مکافات بقدرہ اور یہ ایسے ہی ہے جیسے ہم کہتے ہیں: چوری کے باب میں کہ یہ عدوان ہے آدمیوں کے حق میں اور فساد عالم میں اسی کے اثرات ہیں۔ اس لیے کہ قوی طاقت و وضعیف و کمزور کا مال زبردستی اور قوت سے لیتا ہے اور وضعیف و کمزور قوی و طاقت ور

کا مال خفیہ اور پوشیدہ طور پر لیتا ہے تو اس چیز کی ضرورت ہے کہ ان دونوں صورتوں کو زاجر و مانع ہو اور قوی ضعیف سے ابلغ ہے (یعنی زیادہ رسائی والا ہے) اس لیے کہ قوی کا فساد اکثر ہے، پھر ضرورت ہے کہ مال مسروقہ (چوری شدہ مال) کی مقدار معلوم کی جائے اور یہ بھی ضروری ہے کہ زجر و مکافات کی حد بھی معلوم ہو تو اس سلسلہ میں ہماری گزارش یہ ہوگی تو یہ کہتے ہیں کہ جس نے علانیہ کسی کا مال لیا تو اس کا داہنا (دایاں) ہاتھ اور بائیں پاؤں قطع کیا جائے گا اور جس نے چوری کی (یعنی خفیہ کسی کا مال لیا) تو دایاں ہاتھ کاٹا جائے۔

چور کا ہاتھ کہاں سے کاٹا جائے؟

یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ چور کا ہاتھ کس جگہ سے کاٹا جائے گا؟ قطع یہ کے مقام کا جاننا اس لیے ضروری ہے کہ ہاتھ کا اطلاق انگلیوں سے لے کر کندھے تک ہوتا ہے تو ہم نے کہا کہ چور کا ہاتھ کلائی سے کاٹا جائے گا اس لیے کہ چوری اس سے کی ہے۔

کتنا مال چوری کرنے پر ہاتھ کاٹا جائے گا؟

امام ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نزدیک مال مسروق کی مقدار ایک دینار ہے اور امام شافعی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نزدیک ربع دینار (۳/۴ دینار)۔

مال کی اقسام

پھر مال بھی دو قسم کا ہوتا ہے ایک تو وہ کہ اس کے سبب سے بقاء عالم ہے اور دوسرا یہ کہ اس کے سبب سے بقاء عالم نہ ہو۔ تو اگر کسی نے بہت سا مال چرایا اس قدر کہ جس سے بقاء عالم ہے تو یہ موجب زجر و قطع ہے اور اگر وہ مال لیا جس سے عالم کی بقاء نہیں ہے یا بالتبع مال ہو خود مال نہ ہو تو یہ قطع کو واجب نہیں کرتا بلکہ تاوان و ضمان دلا یا جائے گا جیسے طعام جلانے کی لکڑیاں (اینڈھن) گھاس اور فواکہات وغیرہ۔

حقوق اللہ میں زیادتی کے احکامات

اللہ تعالیٰ کے حقوق میں عدوان و زیادتی مثلاً شراب نوشی، حث میمن (قسم توڑنا) ظہار، لعان، زنا تو یہ موجب زجر ہے وہ حد و کفارہ ہے اور ان چیزوں کی مقدار عقل و قیاس سے معلوم نہیں ہو سکتی پھر زنا سب سے زیادہ قبیح اور فحش ہے اور شرعی نقطہ نظر سے بھی اور عقلی طور پر بھی ان سب سے زیادہ بُرا ہے اس لیے کہ زنا سے نفی انساب اور فقدان قرابت اور عدم ارحام ہے اس

لیے کہا: اگر زنا محظور و ممنوع نہ ہوتا اور نکاح مشروع نہ ہوتا تو کوئی اولاد نہ پہچانتا اور کسی کا نسب ثابت نہ ہوتا، ولاء پر ولایت ثابت نہ ہوتی اور جب نسب ہی معلوم نہیں تو بسا اوقات انسان اپنی بہن بیٹی سے صحبت کر سکتا ہے جب کہ اس کو معلوم ہی نہیں کہ یہ میری بہن بیٹی ہے یا کسی اور کی ہے۔

اسی طرح میراث معطل ہو جائے گی اس لیے کہ جب انسان کا انتقال ہوگا تو اس کے مال کا کوئی مستحق نہیں ہوگا کیونکہ نسب و قرابت معلوم نہیں ہے تو یہ فساد عالم کا موجب ہوگا لہذا زجر و منع کی ضرورت و حاجت پائی گئی اور زجر و منع اس مقام پر زیادہ ہونا چاہیے حتیٰ کہ جب کسی نے زنا کیا اور وہ غیر محسن ہے تو اس کو سو کوڑے لگائے جائیں اور اگر وہ محسن (یعنی شادی شدہ) ہے تو اس کی سزا سنگسار کرنا ہے، یہ چیزیں عقل و قیاس سے دریافت نہیں ہو سکتیں اور اسی طرح اللہ کی نعمتیں اور اس کا وجوب شکر اس کی حدود اس کے ارکان اور کیفیت و کمیت (کتنا کیسے) قیاس سے دریافت نہیں ہو سکتے اس لیے کہ نعمتیں قسم قسم کی ہیں، نعمت مالیہ اور نعمت بدنیہ تو تفاوت نعمت کی وجہ سے شکر بھی متفاوت ہوگا۔ پھر اصل وجوب شکر اور زجر تو عقل سے مدرک ہو سکتا ہے یعنی اس کا قبح اور برائی اس لیے کہ اس کی طرف ضرورت و حاجت واقع ہوتی ہے یا اس کی اچھی حالت ہے، لیکن کیفیت و کمیت اور حدود عقل سے معلوم نہیں ہو سکتے اور ہر شخص صواب تک پہنچ نہیں سکتا اس لیے کہ عقول متفاوت و مختلف ہیں۔ اس دلیل سے کہ اعمال متفاوت ہیں اور آراء بھی مختلف ہیں، ہر شخص اپنی رائے سے عمل کرتا ہے تو اگر امر (معاملہ) ان کی رائے اور مرضی کے سپرد کر دیا جائے تو ہر شخص جو چاہے گا کرے گا، جس طرح چاہے جتنا چاہے، جس وقت چاہے اپنی عقل کے تقاضا کے مطابق کرے گا اور پھر کسی کو منع کرنے کا حق نہ ہوگا اور کسی کو جائز نہ ہوگا کہ وہ کسی کی اقتداء کرنے اس لیے کہ عقل اس کی کفالت کرتی ہے کہ جب کہ وہ اپنی عقل کی رائے کے حوالے اور سپرد ہے اور یہ اولیٰ و بہتر ہے دوسرے کی تقلید کرنے سے تو خلاف اور تفاوت واقع ہوگا عالم میں تفاوت رائے اور تفاوت اجتہاد سے۔

تو ہر ایک کا طریقہ ایک دوسرے کے خلاف ہوگا جیسے ادیان مختلفہ میں تو فساد و خلاف واقع ہوگا، اعمال میں بھی بہ سبب اختلاف ادیان تو پھر عالم میں فساد پیدا ہوگا تو اگر ان امور کا کوئی بیان کرنے والا اور سکھانے والا نہ ہو اور ان احکام و معانی اور وسائل کا بتانے والا کوئی نہ ہو تو یقیناً خلق معطل ہوگی اور وہ احکام ضائع ہو جائیں گے۔

اور حکیم مطلق (جل شانہ) سے یہ بات ناجائز ہے کہ اپنی مخلوق کو معطل و ضائع کر دے اور جب ہم اپنے ذاتی معاملات میں اور اپنے گھریلو حالات میں صحیح حکم نہیں کر سکتے تو پھر ہمیں کیونکر معلوم ہو سکے گا کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے شکر ادا کرنے کا یہ کون سا صحیح طریقہ ہے اور اس کا حکم یہ ہے؟ اور یہ ایسے ہی ہے جیسے ہم کہتے ہیں: روزہ، نماز، زکوٰۃ اور حج ہیں کہ ہر ایک عبادت کے لیے ارکان و شرائط اور سنن و آداب ہیں جیسے نماز میں قیام، رکوع، سجود، تشہد اور اس کے مفسدات و محظورات اور مکروہات ہیں اور ہر عبادت میں اسی طرح شرائط و ارکان و سنن و واجبات و مفسدات و مکروہات ہیں تو یہ چیزیں عقل و قیاس سے معلوم نہیں ہو سکتی۔ یوں ہی تعداد رکعات، مقادیر زکوٰۃ اور اس کے ارکان، یہ عقل و قیاس سے معلوم نہیں ہو سکتے، پھر مصالح جس کے وہ محتاج ہیں جیسے نکاح، طلاق، بیع، شراء، اجارہ، مزارعت، ایداع، استیداع، اعارہ، استعارہ، حوالہ، کفالہ، وکالت، خصومات و دعاوی، صلح، شہادت، گواہ، انکار، اکراہ یہ تمام وہ ہیں کہ لوگوں کے ہاں ان کے اندر عادت، جھگڑا اور خیانت واقع ہوتی ہے، ان میں تنازعات واقع ہوتے ہیں، دعوے دائر کیے جاتے ہیں تو ان سب کے احکام منجانب شریعت ہونے چاہئیں برخلاف اس کے کہ جو دوسری جگہ ہوتا ہے اور جو حادثہ اور اختلاف واقع ہوتا ہے، یہ سب چیزیں دقت معانی کی وجہ سے اور علامات و امارات کی کثرت کے سبب جو کہ احکام کے مختلف ہونے کا موجب ہوتے ہیں، قیاس اور استدلال عقل سے نہیں پہچانی جاتیں۔

ایک ہی مسئلہ میں دو حکموں کا جمع ہونا جائز نہیں ہے، پھر حالت حیض میں صحبت کرنا، پانی (مادہ منویہ سے مراد ہے) کا ضائع کرنا ہے کہ اس سے اولاد نہیں ہوتی اور علوق نہیں ہوتا اور غرض صحیح وطی میں ثبوت نسب ہے اور حصول اولاد و نسل ایک مدت تک بقاء عالم کے لیے مطلوب ہے تو جب حالت حیض و نفاس میں مقصود حاصل نہیں ہوتا تو ضروری ہوا کہ ان حالتوں میں وطی سے منع کیا جائے اور اس کے احکام کا جاننا بھی ضروری ہوا اور اس کے ایام معلوم کرنا بھی ضروری ہوا، تاکہ حیض و استحاضہ میں فرق کر سکیں اور اسی طرح وصیت و فرائض و میراث اور اس کے حساب کا اختلاف اس لیے کہ اصحاب فرائض مختلف ہیں تو ان ضروری اسباب و وجوہات کی بناء پر عقل اور حکمت کی رُو سے واجب ناگزیر ہوا کہ کوئی معلم و مبتدیان ہو جو ان احکام و اسباب احکام کو بیان کرے اور ان کی تعلیم دے اور اسہام و حصص کی پہچان

رکھنے والا ہو اور احسان و تعبد کے ساتھ امر کرنے والا ہو اور مشکوک و متردد اور قبائح سے ڈانٹنے والا منع کرنے اور روکنے والا ہو۔

پھر اس آمر و مانع اور زاجر اور مُبْتَن احکام و معانی اور مقادیر فی الاحکام کے لیے جائز نہ ہوگا کہ اپنی طرف سے کچھ کہے یا کرے اس لیے کہ وہ قول و فعل دوسرے سے اولیٰ نہ ہوگا کیونکہ ہر عاقل اپنے حال کو دوسرے کی نسبت خوب اچھی طرح سے جانتا ہے تو لازم و ضروری ہوا کہ وہ آمر و مانع (حکم دینے والا اور منع کرنے والا) بہ تعلیم الہی حکم کرے تو اس سے وحی کی ضرورت ثابت ہوگئی اور ملحدین و فلاسفہ اور منجمہ کا قول باطل ہو گیا کہ تعبد و شکر عقل سے دریافت ہو سکتا ہے وحی کی ضرورت نہیں۔ ہماری تقریر سے ان کی خطا اور ان کا عقیدہ باطل ہونا یقیناً ثابت ہو گیا اس لیے کہ دنیا میں کوئی شخص ایسا نہیں پایا گیا جس نے شریعت قائم کی ہو اور اپنی طرف سے مسائل و احکام دین بیان کیے ہوں اور وہ مسائل و احکام ان احکام کی مثل ہوں جو انبیاء کرام صلوات اللہ وسلامہ علیہم اجمعین نے بیان فرمائے اور ان میں کوئی فساد نہ ہو اور نہ ہی ان پر کوئی اعتراض ہو سکتا ہے۔

اور جو کچھ انبیاء کرام نے بیان فرمایا وہ اپنی طرف سے نہیں فرمایا بلکہ انہوں نے وحی سے یا بتائے وحی یا دلالت آیات سے بیان کیا اور اگر وہ نری عقل سے بیان کرتے تو ان کا قبول کرنا واجب نہ ہوتا اور اسی طرح منتشر ہو جاتے جیسے تمام اقاویل منتشر ہو گئے خطا و کفر کی وجہ سے اور اگر احکام شریعت میں کوئی نقص و خلل ہوتا تو کوئی قبول نہ کرتا۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(نوٹ: حضرت سید صاحب قبلہ تحریر فرماتے ہیں: اس بیان کو پھر ترجمہ کے مطابق کر لیا جائے شاید مصنف کا مفہوم ادا نہ ہو سکا ہو۔)

دوسرا قول

عصمت انبیاء کا بیان

اشعریہ

جان لو! عصمت انبیاء میں لوگوں نے کلام کیا ہے۔ اشعریہ کہتے ہیں کہ انبیاء و رسل وحی

و انباء سے قبل نہ رسول ہیں اور نہ انبیاء اور سوائے کفر کے وہ معاصی سے بھی معصوم نہیں اور ایسے ہی وفات کے بعد وہ انبیاء نہیں یہ خطائے عظیم ہے۔

معتشفہ اور عقیدہ عصمت نبوت

کرامیہ میں سے معتشفہ نے کہا کہ نبی قبلِ وحی نبی نہیں ہوتا مگر معصوم ہوتا ہے اس لیے کہ وہ ولی ہوتا ہے۔ پھر جو گناہ موجب حد و تعزیر اور موجب عار و ثا ہوا ان سے معصوم (محفوظ) ہوتا ہے اور جو گناہ موجب سقوط عدالت ہے اس سے قبلِ وحی معصوم نہیں اور بعدِ وحی معصوم ہوتا ہے۔

بعض حضرات کا عقیدہ

- (۱) اور بعض کہتے ہیں: قبلِ وحی معصوم نہیں ہوتے بعدِ وحی معصوم ہوتے ہیں۔
- (۲) بعض کہتے ہیں: قبلِ وحی اور بعدِ وحی معصوم نہیں ہوتے۔
- (۳) بعض کہتے ہیں: رسولِ وحی کے بعد معصوم ہوتا ہے نبی معصوم نہیں ہوتا۔

بعض معتزلہ کا مذہب

معتزلہ میں سے بعض کہتے ہیں: نبی قبلِ وحی نبی ہوتا ہے اور معصوم ہوتا ہے اور بعض کہتے ہیں: نہ نبی ہوتا ہے اور نہ معصوم۔

اہل سنت و جماعت اور عصمت نبوت

اہل سنت و جماعت فرماتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام قبلِ وحی انبیاء ہوتے ہیں اور معصوم واجب العصمة اور رسول قبلِ وحی رسول و نبی ہوتا ہے اور مامون ہوتا ہے اور ایسے ہی بعد وفات۔

دلیل اس کی اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا قول ہے 'عیسیٰ علیہ السلام کی خبر دی اور تصدیق فرمائی' جب کہ وہ مہد پرورش میں تھے: "قال انی عبد اللہ اتانی الکتاب وجعلنی نبیا" (مریم: ۳۰) عیسیٰ نے کہا: میں اللہ کا بندہ ہوں اس نے مجھے کتاب عطا فرمائی ہے اور مجھے نبی بنایا ہے اور معلوم ہے کہ بچوں کو وحی نہیں ہوتی اور کتاب نہیں ملتی مگر نبی و رسول کو یہ نص قطعی ہے بغیر تاویل و تعریض کے اور اس کا انکار کرنے والا کافر ہے۔

نبی محترم ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ آپ کس وقت نبی تھے؟ فرمایا: میں اس وقت نبی تھا کہ آدم علیہ السلام آب و گل میں تھے اس کے معنی یہ ہیں کہ انبیاء کرام کے لیے عصمت قبل وحی موجبات ضروریہ سے ہے اور بعد وحی تو بہ طریق اولیٰ عصمت ضروری ہے اس لیے کہ اگر انبیاء وحی سے پہلے جھوٹ اور گناہوں سے معصوم نہ ہوں گے تو ان کے دعویٰ نبوت میں شبہ ہوگا۔

اور جب کہ وہ جھوٹ بولنے میں معروف ہے یا اس سے کذب صادر ہونا جائز ہو تو اس کا صدق بھی کذب پر محمول کیا جاسکتا ہے 'عادۃً وظننا بنا بر ارشاد نبی کریم ﷺ کہ جو جھوٹ بولنے میں مشہور ہو اس کا سچ بھی جھوٹ ہوتا ہے اور باوجود شبہ واقع ہونے کے اس دعویٰ نبوت میں اور ایسے شخص پر وحی نازل کرنا جائز نہیں جو کاذب ہو اور دعویٰ میں شبہ ظاہر ہو اور اس لیے کہ اگر وحی سے قبل جھوٹا دعویٰ نبوت کرے اور پھر بعد وحی وہ سچا دعویٰ نبوت کرے تو پہلے کی طرح یہ بھی قبول نہیں کیا جائے گا اس لیے کہ اگر وہ ایسے گناہوں سے معصوم نہ ہو جو سقوط عدالت کا موجب ہیں تو وہ فاسق ہوگا اور فاسق اہل شہادت سے نہیں کیونکہ شبہ اس میں گھر کر گیا ہے متمکن ہو گیا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ جب اس میں اتنی دیانت بھی نہیں کہ فسق سے باز رہے اور منع کرے تو بسا اوقات وہ جھوٹ اور کذب سے بھی احتراز نہیں کرے گا اس لیے ہم نے کہا کہ حکمت کے خلاف ہے کہ جھوٹے اور فاسق شخص پر وحی نازل کی جائے تو نہ صرف جواز بلکہ واجب ہے کہ وہ وحی سے پہلے معصوم ہو اس لیے کہ جو چیز جواز میں ہے تو اس میں نبی غیر نبی امت سب مساوی ہیں کہ جائز ہے کہ وہ معصوم ہو اور جائز ہے کہ معصوم نہ ہو تو عصمت انبیاء بہ طریق وجوب ثابت ہوگئی نہ کہ بہ طریق جواز تو جب نبی قبل وحی واجب العصمت ہوئے تو ثابت ہوا کہ وہ نبی تھے اس لیے کہ غیر کا معصوم ہونا واجب نہیں تو جب ثابت ہو گیا کہ انبیاء کے حق میں عصمت واجب ہے تو ضروری ہوا کہ وہ معصوم ہوں صغائر و کبار سے اس لیے کہ اگر ہم کبیرہ کو جائز قرار دیں تو ان سے کفر بھی جائز ہوگا اور اگر ہم ان سے صغیرہ کا صدور جائز کہیں تو ان سے کبیرہ بھی جائز ہوگا اس لیے کہ صغیرہ قصد و نیت سے کبیرہ ہو جاتا ہے اور یہ جائز نہیں تو واجب ہوا کہ وہ صغیرہ و کبیرہ اور نیت صغیرہ سے بھی معلوم ہوں۔

اعتراض: اگر کہا جائے کہ ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے خبر دی، جب انہوں نے اپنے رب کو پکارا: "وَاجْنُبْنِي وَبَنِيَّ أَنْ نَعْبُدَ الْأَصْنَامَ" (ابراہیم: ۳۵) مجھے اور میرے بیٹوں کو بتوں سے دور رکھ اور ایسے ہی "فَلَمَّا رَأَى الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هَذَا رَبِّي" (الانعام: ۷۸) جب انہوں نے چاند کو چمکتے ہوئے دیکھا تو کہنے لگے: یہ میرا رب ہے اور ایسے ہی سورج اور ستاروں کو دیکھ کر فرمایا اور حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے رب سے دعا کی اور کہا: "تَوَفَّنِي مُسْلِمًا" (یوسف: ۱۰۱) مجھے اسلام کی حالت میں وفات عطا فرما اور برادرانِ یوسف نے یوسف علیہ السلام کو فروخت کیا "بَاعُوهُ بَشْمَنٍ بَخْسٍ" اور معلوم ہے کہ آزاد کا بیچنا حرام ہے تو اگر قبل وحی انبیاء کے حق میں عصمت واجب ہوتی تو وہ قبل وحی نبی ہوتے تو ان سے یہ باتیں ظہور میں نہ آتیں۔

جواب: ہم کہتے ہیں: "ہذا ربی" کے معنی ہیں: "اھذا ربی؟" کیا یہ میرا رب ہے؟ یعنی

استفہام کے طور پر کہا کہ اس کو میرا رب ٹھہراتے ہو؟

اور بعض نے اس کی توجیہ یوں کی کہ یہ آپ نے استہزاء کے طور پر فرمایا یعنی کافروں سے استہزاء فرمایا کہ یہ میرا رب ہے "ہذا اکبر" یہ تو بہت بڑا ہے۔

اور بعض نے کہا کہ جب ابراہیم علیہ السلام نے چاند کو روشن دیکھا تو فرمایا: اس کے لیے بھی رب ہے جس نے اس کو پیدا کیا "ہذا ربی ای خالق ہذا ربی" کہ اس کا پیدا کرنے والا ہی میرا رب ہے اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: میں نے کسی شئی کو نہیں دیکھا مگر اس میں مجھے خدا نظر آیا یعنی میں نے دیکھ کر پہچانا کہ اس کا بھی پیدا کرنے والا اللہ ہے تو ثابت ہوا کہ انہوں نے اس کے خالق کا ارادہ فرمایا اور "وَاجْنُبْنِي وَبَنِيَّ أَنْ نَعْبُدَ الْأَصْنَامَ" اور "تَوَفَّنِي مُسْلِمًا" یہ دعا ہے اور دعا انبیاء کرام کے لیے جائز ہے اس لیے کہ انبیاء کرام کی معرفت اقوی و آکد ہے کیونکہ انہوں نے جس چیز کا معائنہ کیا وہ انہی کا حصہ ہے کسی اور نے یہ معائنہ نہیں کیا۔

انبیاء خاتمہ سے مامون ہوتے ہیں

اور ان کو اللہ عزوجل کی عظمت و ہیبت وہ حاصل ہے جو کسی کو نہیں اور انبیاء مرسلین صلوات اللہ علیہم خاتمہ سے مامون ہیں اور انباء سے خوف عبودیت سے زائل نہیں ہوتی تو اللہ عزوجل کے خوف و ہیبت اور جلال سے وہ دعا کرتے ہیں۔ تم دیکھتے نہیں کہ حضور ﷺ نے قبر کے عذاب سے پناہ مانگی اور معلوم ہے کہ قبر کا عذاب انبیاء کرام کو نہیں ہوگا (اور یہ دعائیں تعلیم امت کے لیے ہیں) دوسرے معنی ”وَاجْتَنِبِي وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ“ کے یہ ہو سکتے ہیں کہ اس سے مراد اولاد و ذریت ہے اپنی طرف نسبت اس لیے کی کہ یہ اصل ہیں اور وہ فرع ہیں اور ”تَوْفِيِّيْ مُسْلِمًا“ کا معنی ہے: یعنی ”سَالِمًا عَنِ الْاِمَارَةِ وَاشْبَاهِ ذٰلِكَ“ کہ اے اللہ! مجھے اس حالت میں اپنے پاس بلانا کہ میں بادشاہت اور اس کی مثل اشیاء سے محفوظ ہوں۔

پہلی شریعتوں میں آزاد کی خرید و فروخت جائز تھی، ابتداء اسلام میں حرکی بیع جائز تھی

اور بردران یوسف کا حضرت یوسف علیہ السلام کو فروخت کرنا، یہ ان کی لغزش بلا قصد ہے دوسری بات یہ تھی کہ سابقہ امم میں آزاد کا بیچنا جائز تھا، بہ سبب سرقہ اور دین و اقرار وغیرہ اور نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ ابتداء اسلام میں ایک عورت کو دین کے بدلے فروخت کرنے کا حکم تھا، پھر منسوخ ہو گیا۔ ایسے ہی بردران یوسف نے اقرار و سکوت کی وجہ سے تاویل کی اور یہ ان کی اجتہادی خطا تھی اور ان سے لغزش واقع ہوئی، لہذا ان پر الزام نہیں آسکتا۔

بعض فقہاء اور مسئلہ عصمت انبیاء

بعض فقہاء کہتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام بغیر شرط کسب کے معصوم ہوتے ہیں یعنی اگر ان سے کوئی فعل بغیر قصد کے صادر ہو جائے تو ان کے حق میں ذلت و لغزش ہے اور ہمارے حق میں معصیت ہے اور وہ صغیرہ کی مثل ہوتا ہے اور یہ فعل ان سے قصداً نہیں ہوتا اور اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم اور رحمت سے ان کو معاف فرمادیتا ہے اور اس کے معنی یہ ہوئے کہ ان

سے صغیرہ گناہ ہو سکتا ہے تو جائز ہے کہ ان سے کبیرہ بھی صادر ہو اور جب معاذ اللہ کفر کا صدور جائز ہوا تو یہ شرائع اور احکام اور دین سب کے بطلان کا مقتضی ہے، اس لیے کہ کفر عمل کے بطلان کا موجب ہے اور پھر ان کے کفر کی وجہ سے ساری امت کی تکفیر لازم ہوگی اور یہ محال ہے اور اس لیے کہ انبیاء کرام مخلوق پر اللہ کی حجت ہوتے ہیں اور حجت نہ باطل ہوتی ہے اور نہ ٹوٹی ہے تو صحیح وہی ہے جو ہم نے کہا اور اس لیے کہ رسول حق کے مدعی ہوتے ہیں لامحالہ اور اپنے دعویٰ کی صحت پر معجزہ ظاہر کرتے ہیں اور معاذ اللہ اگر ان سے کفر کا صدور ممکن ہو تو پھر ہر وقت ہر آن جائز ہوگا تو پھر کفار اگر معجزہ طلب کریں اور وہ اس وقت معاذ اللہ اللہ کے ساتھ کفر کر رہا ہے تو منکر و مدعی میں اس وقت کیا فرق ہوگا؟ اور دعویٰ نبوت کسی طرح صحیح نہ ہوگا کیونکہ اس کے دعویٰ میں جواز کفر کا شبہ ہے۔

اور نیز یہ حکمت کے بھی خلاف ہے کہ ایسا رسول بھیجا جائے کہ جو کفر سے مامون نہ ہو تو پھر وہ اور منکر انجام میں برابر ہوں گے اور یہ کسی طرح جائز نہیں اور علامۃ القہماء کے نزدیک انبیاء سے لغزش (ذلت) جائز ہے اور بعض معتزلہ کے نزدیک جائز نہیں ہے اور صورت مسئلہ یہ ہے کہ صغیرہ بغیر قصد صادر ہو۔

تیسرا قول

انبیاء کرام کے معجزوں کے بارے میں

آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ نبوت کا ثبوت اور صحیح ہونا معجزہ کے ذریعے معلوم ہوتا ہے اور معجزہ کی تعریف ہے: دلیل کے مطالبے یا نبوت کے دعویٰ کے بعد ایسے خلاف عادت کام کو ظاہر کرنا جو کسی بھی طرح باطل نہ ہو اور اگر لوگ سخت کوشش کے باوجود اس کی مثال لانے سے عاجز رہیں اور لوگ ایسے کام میں مہارت اور دسترس بھی رکھتے ہوں اور امت جس معجزہ کی درخواست کرے وہ اسی وقت اس کے سامنے کر دیا جائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب یہ معجزہ کسی بھی وجہ سے باطل نہ ہو اور جس چیز میں معجزہ کا سوال کیا گیا ہے اس میں اور اس کے غیر میں یہ معجزہ دلیل قطعی ہو اور معجزہ کے ثبوت کا یہ حکم عین (موجود فی الخارج) اس کی ضد

(عدم) کی طرف بھی جائے گا اور فی الفور ثابت کیا جائے گا اور اس کے بعد بھی باقی رہے اور یقینی اور قطعی طور پر حکم کیا جائے گا یہ معجزہ اور برہان ہے دعوائے نبوت کے صحیح ہونے کے لیے۔

ہم نے کہا کہ ”دلیل کے مطالبے اور دعوائے نبوت کے بعد اس کو ظاہر فرمانا واجب ہے“ اس کی دلیل یہ ہے کہ جب امت نے نبوت کا دعویٰ کرنے والی ہستی سے حجت طلب کی اور اس مدعی نے اس میں بہت زیادہ تاخیر کر دی تو اس سے تلاش رزق جعل سازی دھوکہ اور حیلہ سازی کا وہم ہو گیا لہذا شبہ لازم آئے گا اور یہ جائز نہیں ہے۔

اور ہم نے کہا کہ ”وہ عادت کو توڑنے والا ہو“ اس کی دلیل یہ ہے کہ اگر وہ معجزہ ایسا ہوا جس کی لوگوں کو عادت ہے تو شبہ پہلے سے بھی زیادہ ہوگا اس لیے کہ ہر کوئی اس کی مثل لا سکے گا تو اس کے دعویٰ کا قطعی اور یقینی طور پر علم لازم نہیں آئے گا۔

ہم نے کہا کہ ”وہ کسی بھی وجہ سے محال نہ ہو“ اس لیے کہ اگر انہوں نے اس سے باطل چیز کا مطالبہ کیا تو اس پر اس کا ظاہر کرنا واجب نہ ہوگا مثلاً معصیت اور اللہ تعالیٰ کے غیر کی عبادت تو ایسی چیز کو طلب کرنا جس کا وجود اور پیدائش جائز نہ ہو جیسے کہ وہ بغیر جوہر کے عرض کو طلب کریں یا ایک ہی وقت میں زندہ اور مردہ شخص کا مطالبہ کریں یا اس سے اللہ تعالیٰ کی مثل چاہیں تو ان اشیاء کا وجود ہر لحاظ سے باطل و ناممکن ہوگا۔

ہم نے کہا کہ ”لوگ حیلہ سازی اور سخت کوششوں کے بعد بھی اس کی مثل لانے سے عاجز ہوں“ اس لیے کہ اگر لوگ حیلہ سازی کے ساتھ عاجز نہ ہوں تو مدعی نبوت سے بھی حیلہ سازی کا وہم ہو سکتا ہے۔

ہم نے کہا کہ ”جب وہ اس کام میں مہارت بھی رکھتے ہوں“ جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم جادوگری میں بہت ماہر تھی اور وہ لوگ اس انتہاء کو پہنچ چکے تھے کہ باقی مخلوق سے ان جیسے کاموں کا جعل سازی جادوگری اور حیلہ سازی کے ساتھ وہم بھی نہیں کیا جاسکتا تھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزوں میں سے ایک معجزہ عصا مبارک کا حقیقہ سانپ بن جانا اور بغیر کسی حیلہ کے پھر اپنی اصلی حالت کی طرف لوٹ جانا تھا ان کی قوم نے آپ کے

یعنی یہ وہم پیدا ہوگا کہ دنیا کمانے کے لیے نبوت کا دعویٰ کیا گیا ہے۔

معجزے کی طرح لائھیوں اور رسیوں کو بنا دیا تھا، جو ان کے جادو کی وجہ سے چلتے پھرتے سانپ نظر آتے تھے تو جب انہوں نے آپ کے عصا کو حیلہ کے بغیر سانپ بنتے اور پھر جادو گروں کے تمام جھوٹ اور فریب کے پلندوں کو ننگتے ہوئے اور اس کے بعد کسی کمی بیشی کے بغیر پھر عصا بنتے دیکھا تو انہیں یقینی طور پر معلوم ہو گیا کہ یہ جادو اور حیلہ سازی نہیں ہے تو یہ کسی مخلوق کا کام نہیں ہو سکتا بلکہ ان کی وسعت اور عادت کے خلاف ہے، اس طرح حقیقی اور یقینی طور پر حجت ثابت ہوگی اور وہ اللہ رب العزت پر ایمان لے آئے، اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی قوم طب میں بہت ماہر تھی، وہ یہاں تک پہنچ گئے تھے کہ حیلہ کے باوجود کوئی انسان علاج و معالجہ اور دوائیوں میں ان سے زیادہ ماہر نہ تھا تو اللہ تعالیٰ نے علاج اور دوائیوں کے بغیر مادرزاد اندھوں اور کوڑھ زدہ لوگوں کو ٹھیک کر دینے اور مردوں کو زندہ کرنے جیسے معجزے آپ کو عطا فرمائے تو انہوں نے قطعی طور پر معلوم کر لیا کہ یہ کام کسی مخلوق کی حیلہ بازی کا نتیجہ نہیں ہو سکتا بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کے حکم ہی سے ہو سکتا ہے اور یہ اسے ہی حاصل ہو سکتا ہے جو حق پر ہو، ایسے ہی عرب والے عربی نظم و نثر، معنی، لغت اور نحو میں بہت فصیح و بلیغ تھے حتیٰ کہ وہ اس امر کی انتہاء کو پہنچ چکے تھے یہاں تک کہ اس زمانہ میں مخلوق میں سے کوئی بھی ان سے زیادہ فصیح و بلیغ نہ تھا تو اللہ تعالیٰ نے ہمارے نبی اکرم ﷺ کو ایسے کلام کا معجزہ عطا فرمایا جو اپنی نظم و نثر اور معنی کے لحاظ سے اس حد تک فصیح و بلیغ تھا کہ اس کی مثل لانے سے تمام مخلوق عاجز آگئی تو انہوں نے یہ کلام ایسی ہستی سے سنا جس سے عادتاً اپنے درجے کی فصاحت و بلاغت صادر نہیں ہو سکتی، وہ ایسا کلام تھا کہ اس جیسا کلام مخلوق کا نہیں ہو سکتا کیونکہ کلام اور معنی میں فصاحت تعلیم ہی سے ممکن ہو سکتی ہے حالانکہ نبی اکرم علیہ السلام اُمی تھے، کسی انسان کے آگے زانوائے تلمذ طے نہیں کیا، جس سے عادتاً فصاحت و بلاغت صادر نہیں ہوتی، مگر اس سے فصاحت و بلاغت کا صادر ہونا بلاشبہ حیرت انگیز ہے تو انہوں نے یقین کر لیا کہ یہ مخلوق کا کلام نہیں اور نہ ہی اس کی جنس سے ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا ہے، لہذا ہمارا دعویٰ ثابت ہو گیا۔

ہم نے کہا کہ ”جس معجزہ کی گزارش کرے گی اسی وقت اس کا اظہار واجب ہوگا“ اس لیے کہ جب وہ محال نہ ہو کیونکہ اگر وہ معجزہ ہمیشہ ایک ہی چیز کی جنس سے ہو اور ایک ہی چیز

سے متعلق ہو تو اس سے یہ تہمت پیدا ہو سکتی ہے کہ اس ہستی کا حیلہ اس چیز میں ہی کارگر ہے اور دوسری میں نہیں یا اس شخصیت کو اس جیسی جنس میں مہارت ہے اور کسی دوسری جنس میں مہارت میں یہ ایسے ہے جیسے تم حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں کہو کہ آپ کے عصا کے علاوہ بھی مختلف قسم کے معجزے تھے جیسے ید بیضاء، دریا کو پھاڑ کر اس میں راستہ بنانا، چھوٹے سے پتھر سے بارہ چشموں کا جاری کرنا، خشک پتھر سے بہت سارے پانی کا بہانا اور اسی طرح تختیاں جن پر تورات لکھی ہوئی تھی اور تورات پھر عصا تو حیرت انگیز معجزہ تھا کہ کبھی تو سانپ بن جاتا، کبھی اونٹ، کبھی ہاتھی اور کبھی درخت اور پھل وغیرہ بن جاتا تھا اور یہ ہی مطلب ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس مقولے کا جسے اللہ تعالیٰ نے بطور حکایت بیان فرمایا ہے: ”وَلِي فِيهَا مَارِبٌ أُخْرَى“ اور میرے لیے اس میں دوسرے بہت سے فوائد ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات بھی ایسے ہی تھے جیسے ایک ہی گھڑے سے مختلف قسم کے رنگ نکالنا وغیرہ اور ہمارے نبی اکرم ﷺ کی بہت سی روشن نشانیاں اور ناقابل تردید دلائل تھے مثلاً چاند دو ٹکڑے ہونا، کھجور کے تنے کا آپ کے فراق میں رونا، آپ کے دستِ اقدس میں کنکریوں کا تسبیح پڑھنا، آپ کی دعا کی برکت سے تھوڑے کھانے کا زیادہ ہونا، بھنے ہوئے گوشت کا گنفلگو کرنا، درخت کا اپنی جگہ سے جڑوں سمیت اکھڑ کر آپ کی خدمت میں حاضر ہونا پھر اپنی جگہ پر لوٹ جانا، اسی طرح قرآن پاک ایک قطعی معجزہ ہے جیسے کہ ہم آئندہ بیان کریں گے۔

چوتھا قول

اعجازِ قرآن اور نبی کریم ﷺ کی رسالت کا بیان

معلوم ہونا چاہیے کہ قرآن مجید بارہ وجہ سے معجزہ ہے:

- (۱) نظم و معنی کے لحاظ سے کیونکہ اس کی نظم (یعنی الفاظ) شعراء کے مقطع کی طرح نہیں اور نہ نثر انسانوں کے کلام کی مثل ہے بلکہ نظم خاص ہے جو غیر معمولی اور طبیعت سے ماوراء

- اور فطرت سے فوق و برتر ہے اور شرعاً عادت سے جدا و منفرد اور یکتا ہے۔
- (۲) دوسری وجہ لغت کے طریقے سے بھی ہے، وہ مختلف لغات کا اجتماع عربی اور دوسری لغتوں کے معروف الفاظ ہیں، مثل رومی، فارسی، حبشی، بربری اور لغات عربی، غیر قرشی بایں حیثیت کہ نقص و نقض عربیت و معانی میں واقع نہیں ہے۔
- (۳) تیسری وجہ الفاظ میں ایجاز و اختصار ہے اور قلیل الفاظ میں معانی کثیرہ مجتمع ہیں۔
- (۴) چوتھی وجہ مستعار الفاظ کا استعمال اور ضمائر کثیرہ کے باوجود محل معنی نہیں۔
- (۵) پانچویں وجہ الفاظ کی تقدیم و تاخیر اور تقطیع و تفصیل اور معانی میں ترتیب ہے۔
- (۶) الفاظ میں قراءت سب سے لحاظ سے تغیر ہونے کے باوجود حکم اور معنی میں توافق قائم رہتا ہے۔

(۷) الفاظ کا علی سبیل المجاز استعمال اور پھر بھی معنی مرادی کے تحقق میں کوئی کسی قسم کا عیب اور نقص پیدا نہیں ہوتا۔

(۸) الفاظ میں جمع و توافق ہے مگر احکام معانی متفرق ہیں۔

(۹) افہام کے قریب اور درک و بیان سے دور۔

(۱۰) آسان و سہل اور معروف الفاظ کا ذکر اور مخلوق کے ذہنوں سے علم سلب کر لیا اور وہ تشابہات ہیں۔

(۱۱) کسی کو طاقت نہیں اور کسی کی وسعت میں نہیں ہے تغیر و تبدیل اور تحویل اور زیادہ و نقصان یا نقیض کی۔

(۱۲) علم غیب کا بیان اور کائنات کا علم جیسے ارشاد فرمایا: "لَتَدْخُلَنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ"

(الفتح: ۲۷) تم ضرور مسجد حرام میں داخل ہو گے اور جیسے فرمایا: "فَتَمَنُّوا الْمَوْتَ اِنْ

كُنْتُمْ صَادِقِينَ" (البقرہ: ۹۳) (اے یہودیو!) اگر تم سچے ہو تو موت کی آرزو کرو

"وَكَانُوا لَا يَتَمَنُّونَهُ اَبَدًا" اس لیے کہ "تورات" میں مذکور ہے کہ اگر یہ موت کی تمنا

کریں گے تو اسی وقت مرجائیں گے اور ایسے ہی یہود و نصاریٰ کے ساتھ مہلبہ ہے۔ ارشاد

فرمایا: "فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَاءَنَا وَ اَبْنَاءَكُمْ اِلَىٰ اٰخِرِ الْاٰيَةِ" (آل عمران: ۶۱) آپ فرما

دیجئے کہ آؤ ہم اپنے اور تمہارے بیٹوں کو بلائیں اس لیے مہلبہ میں حاضر نہیں ہوئے

ان کی کتابوں میں لکھا تھا کہ اگر حاضر ہوئے تو ملعون ہو جائیں گے اور ایسے ہی قرآن پاک میں قصص ماضیہ کی خبر دی، حالانکہ نبی کریم ﷺ نے کسی استاد کے سامنے زانوئے تلمذ طے نہیں کیا اور کتابیں نہیں پڑھیں تو جو کچھ فرمایا اور خبر دی وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تھی اور اس پر دلیل کہ قرآن کریم معجز ہے اور مخلوق اس جیسی آیات لانے میں عاجز ہوئی حالانکہ اللہ تعالیٰ نے چیلنج کیا اور تحدی فرمائی کہ ”قُلْ فَاتُوا بِي كِتَابٍ مِّنْ عِنْدِ اللَّهِ“ (القصص: ۴۹) فرمادے کہ اللہ کے ہاں سے کوئی کتاب لاؤ، جب عرب اس جیسی کتاب لانے سے عاجز ہو گئے تو فرمایا: ”فَاتُوا بِعَشْرِ سُورٍ مِّثْلِهِ مُفْتَرِيَاتٍ“ (حمود: ۱۳) اس کی مثل خود ساختہ سورتیں لے آؤ، یعنی دس سورتیں سورہ بقرہ سے سورہ حمود تک لے آؤ، جب اس سے بھی عاجز رہے تو فرمایا: ”فَاتُوا بِسُورَةٍ مِّنْ مِّثْلِهِ“ (البقرہ: ۲۳) کہ اس کی مثل ایک سورت ہی لاؤ، یعنی طویل سورت مثل سورت بقرہ کے یا مختصری سورت مثل سورت کوثر کے، جب اس سے بھی عاجز رہے تو پھر فرمایا: ”قُلْ لَإِنِ اجْتَمَعَتِ الْإِنْسُ وَالْجِنُّ عَلَىٰ أَنْ يَأْتُوا بِمِثْلِ هَذَا الْقُرْآنِ لَا يَأْتُونَ بِمِثْلِهِ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيرًا“ (بنی اسرائیل: ۸۸) آپ فرمادے کہ اگر انسان اور جن اس قرآن کی مثل لانے پر اکٹھے ہو جائیں تو وہ اس کی مثل نہیں لائیں گے اگرچہ وہ ایک دوسرے کے مددگار بن جائیں۔

قرآن غیر مخلوق ہے

تو یہ دلائل ہیں کہ قرآن مجید مخلوق نہیں، اس لیے کہ اگر مخلوق ہوتا تو اس کی مثل لانے سے دنیا عاجز نہ ہوتی تو ان دلائل صحیحہ سے ثابت ہوا کہ قرآن من جمیع وجوہ معجز ہے۔

پانچواں قول

اس کا بیان کہ قرآن کا اعجاز نظم سے ہے یا معنی سے

بعض لوگوں نے کہا: اعجاز قرآن نظم قرآن کے لحاظ سے ہے اور بعض نے کہا کہ اعجاز معنی کے لحاظ سے ہے اور اصح یہ ہے کہ اعجاز نظم و معنی دونوں کے لحاظ سے ہے اس لیے کہ اگر

ہم کہیں کہ اعجاز معنی کے لحاظ سے ہے تو پھر یہ کہنا پڑے گا کہ تمام کتب ماضیہ معنی کے لحاظ سے معجز ہیں اور یہ صحیح نہیں ہے اور اگر کہیں کہ اعجاز خاص طور پر الفاظ کے لحاظ سے ہے تو لفظ و نظم جب معنی سے خالی ہوں تو کلام لغو ہوگا اور یہ محال ہے تو ثابت ہوا کہ نظم و معنی دونوں کے لحاظ سے قرآن معجزہ ہے۔

پھر اس میں اختلاف کیا ہے کہ اعجاز انہی الفاظ متلوہ و قراءت سب سے ساتھ مقصور و مخصوص ہے یا غیر بھی معجز ہوگا؟

حضرت امام محمد شیبانی اور امام شافعی رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اعجاز انہیں الفاظ ”منزل من السماء“ اور قراءت سب سے ساتھ مقصور و مخصوص ہے اور اسی وجہ سے وہ نماز میں سوائے نظم منزل کے فارسی وغیرہ زبان میں جائز نہیں رکھتے اور امام ابوحنیفہ و امام ابو یوسف فرماتے ہیں کہ اعجاز موجود ہے خواہ کسی زبان میں ہو فارسی ہو یا عربی ”منزل من السماء“ ہو یا نہ ہو جب کہ اس میں صفت اعجاز باقی رہے اسی وجہ سے قرآن پاک غیر عربی میں فارسی وغیرہ زبان میں نماز میں بھی جائز رکھا۔ پھر صفت اعجاز ابوحنیفہ و ابو یوسف رحمہما اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایجاز الفاظ جب کہ اس کے کثیر معانی ہوں اور امام محمد و امام شافعی کے نزدیک لفظ و نظم اور ترتیب شرط ہے صفت اعجاز میں۔

چھٹا قول

کتب ماضیہ کا بیان، کتب سابقہ بھی معجز ہیں یا نہیں؟

بعض لوگوں نے کہا کہ سابقہ آسمانی کتابیں بھی معجز ہیں، بایں معنی کہ وہ کلام اللہ ہیں اور یوں ہی قرآن حکیم کلام اللہ ہے اور کل ایک ہیں۔

پھر قرآن پاک جب کہ معجز ہے بایں معنی کہ وہ کلام اللہ ہے تو اسی طرح تمام آسمانی کتب و صحف معجز ہونے چاہئیں کہ کلام اللہ ہونے میں قرآن اور دیگر کتب ساویہ و صحف آسمانی میں کچھ فرق نہیں۔

سابقہ کتب سماویہ معجز نہیں

اور صحیح تر وہ ہے جو ہم کہتے ہیں کہ صحف اور تمام آسمانی کتابیں اگرچہ اللہ کی طرف سے ہیں لیکن معجز نہیں اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ”يُخَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَنْ مَوَاضِعِهِ“ (المائدہ: ۱۳) وہ کلمات کو اپنی جگہ سے بدل دیتے ہیں کہ ”انجیل“ میں جا بجا تحریف کرتے اس کی جگہ سے ہٹا دیتے اور اگر معجز ہوتیں تو تحریف ناممکن تھی اور صحف و کتب سب کلام اللہ ہیں لیکن جائز ہے کہ ایک شئی ایک زمانہ میں موصوف بہ صفتِ اعجاز ہو اور دوسرے زمانہ میں نہ ہو ایک شخص کے ساتھ معجز ہو اور دوسرے کے ساتھ معجز نہ ہو جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا ان کے زمانہ میں اور ان کے ہاتھ میں معجزہ تھا لیکن وہی عصا دوسرے کے ہاتھ میں ہو اور کسی اور کے زمانہ میں ہو تو معجز نہیں اسی طرح یہاں سمجھنا چاہیے۔

ساتواں قول

رسول کی پہچان کا بیان

لوگوں کا اس میں بھی اختلاف ہے۔ اشعریہ کہتے ہیں: ہم نے اللہ تعالیٰ کو رسول کے ذریعے پہچانا۔

اہل سنت و جماعت کہتے ہیں کہ ہم نے رسول کو پہچانا اللہ تعالیٰ کے ساتھ بہ سبب اعجاز اور یہ مسئلہ ایک دوسرے مسئلہ کی فرع ہے۔ وہ یہ ہے کہ عقل آلہ ہے صانع کی معرفت کے حصول کے لیے نظر و استدلال کے ساتھ اہل سنت کے نزدیک تو وہ اللہ تعالیٰ کو بدلیل عقل پہچانتے ہیں پھر رسول کو بہ طریق اعجاز پہچانتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔

اشعریہ کہتے ہیں کہ عقل معرفتِ الہی کے لیے آلہ نہیں ہے انہوں نے عقل سے خدا کو

۱ ”تورات و انجیل“ وغیرہ صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں معجز تھے اور جب تک یہ صحف اور کتابیں ان کے ساتھ تھیں کسی کو تحریف کی مجال نہ تھی اور ان کے زمانہ مبارک کے بعد یہود و نصاریٰ نے تحریف و تعحیف اور ان میں تبدیلی کر دی۔

(۱۲ سیدی ابوالبرکات)

نہیں پہچانا اس لیے کہ رسول نے خبر دی ہے ان کو اللہ تعالیٰ کی تو وہ رسول کے خبر دینے سے اللہ کو پہچانتے ہیں اور یہ ضعیف قول ہے۔

حضرت حماد ابن ابی حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ انہوں نے اپنے والد ماجد امام ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے سوال کیا کہ ہم نے اللہ تعالیٰ کو رسول کے واسطے سے پہچانا محمد ﷺ کو اللہ کے ذریعہ پہچانا تو حضرت امام اعظم نے فرمایا: تم کیا کہتے ہو اس بارے میں؟ حضرت حماد نے عرض کی: میرے دل میں تو یہ ہے کہ ہم نے اللہ کو حضور کے ذریعہ پہچانا ہے اس لیے کہ حضور نے ہمیں بتایا ہے۔ امام صاحب نے فرمایا: یہ خطا ہے، ہم نے محمد ﷺ کو اللہ کے ذریعہ پہچانا کہ وہ نبی ہیں اس لیے کہ اللہ نے ہمارے دل میں ڈالا کہ وہ ایک ہے اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ اس مسئلہ کا معنی یہ ہے کہ کافروں نے حضور کی نبوت و رسالت کا انکار کیا، لیکن اتنا جانتے تھے کہ ان کا الہ و صانع ہے۔ دلیل یہ ہے کہ بعض کافروں نے اصنام کو خدا بنایا اور بعض نے چاند سورج اور ستاروں کو خدا بنا لیا اور بعض نے کہا: ”ہؤلاء شفعاءنا عند اللہ“ (یونس: ۱۸) کہ یہ اللہ کے ہاں ہمارے شفیع ہیں تو ثابت ہوا کہ خدا کو پہچانتے تھے اور نبی کو نہیں پہچانتے تھے مگر معجزہ سے اور اعجاز حقیقت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے تو رسول کو اللہ کی طرف سے اعجاز سے پہچانا۔

آٹھواں قول

نبی اور متنبی کا بیان (سچے نبی اور جھوٹے نبی کا بیان)

امت کا اس پر اجماع ہے کہ جھوٹے نبی کے ہاتھ پر معجزہ کی مثال ظاہر ہونا جائز نہیں، جو ناقض عادت اور خارج طبیعت ہو کہ اس کی مثل لانے سے لوگ عاجز ہوں بوجہ من الوجوہ تو لوگوں کے نزدیک صحیح و ثابت ہو کہ یہ نبی ہے اور متنبی نہیں تو شرائط معجزہ کے ہوتے ہوئے شبہ زائل ہو جائے گا اور لوگوں پر ایمان کا لانا واجب ہو جائے گا اس لیے کہ ان کے نزدیک حجۃ قاطعہ موجبہ للعلم ثابت ہوگئی قطعاً و یقیناً بہ طریق عقل اور اگر اس پر ایمان لائے تو وہ معذور ہوں گے اس لیے کہ ان پر اللہ کے لیے کوئی حجت باقی نہیں کہ جو ان کے لیے ممکن تھا اور جس

کی وہ طاقت رکھتے تھے وہ کیا اور شرائط معجزہ کے موجود ہونے کے ساتھ وہ نبی پر ایمان لائے اور شرائط معجزہ کے باوجود اگر شک کریں نبی اور متنبی میں تو یہ ابطال حجت کا موجب ہوگا اور یہ محال ہے من جمیع الوجوہ۔

دوسرے یہ کہ متنبی کے پاس معجزہ نہیں ہوتا بلکہ خرافات اور نظر بندی ہوتی ہے اور اس کا نفاذ نہیں ہوتا مگر اسی حیلہ میں اور اس کی ذات و صفات میں اور اللہ کی طرف سے جائز نہیں کہ معجزہ متنبی کے ہاتھ سے ظاہر ہو کسی حال میں تو ثابت ہوا کہ متنبی کے لیے معجزہ و برہان نہیں۔

نواں قول

نبی اور ولی کا بیان

نبی کسے کہتے ہیں؟

نبی وہ ہے جو انباء کا مدعی ہو، اظہار معجزہ کے ساتھ یا رسول کے خبر دینے یا وحی یا الہام یا رؤیائے صالحہ یا تفہیم احکام وغیرہ کے ساتھ اور وہ قطعاً و یقیناً حکم کرتا ہے کہ یہ نبی ہے اور ہر کرامت جو اس سے ظاہر ہوگی وہ اس کے دعویٰ کی صحت پر معجزہ ہوگی جو ناقض عادت وغیرہ ہوگی۔

ولی کسے کہتے ہیں؟

ولی کے بارے میں کلام کیا ہے؟ معتزلہ کہتے ہیں کہ ولی سے کرامت کا ظہور جائز نہیں یعنی جو خارج طبیعت و ناقض عادت ہو اس لیے کہ یہ معجزہ کی مثال ہو جائے گی۔ کرامت دیکھنے والا جب ولی سے کرامت کو دیکھے گا اور نبی سے معجزہ دیکھے گا تو اس کو شک ہو جائے گا کہ یہ نبی ہے یا ولی یعنی دعویٰ نبوت کرنے سے قبل دیکھنے والے کو نبی اور ولی میں شک واقع ہو جائے گا تو اس سے نبوت میں شک ہوگا اور اللہ تعالیٰ اس سے بلند و برتر ہے کہ نبوت کی حجت و برہان کو شبہہ کے ساتھ ملادے شبہہ بھی ایسا کہ نبی اور ولی میں فرق نہ کر سکے اور پھر یہ کہ شبہہ کے ہوتے ہوئے اپنے بندوں کو عذاب دے کہ تم نبی پر ایمان کیوں نہیں لائے؟

فقہاء اہل سنت کا مسلک

عام فقہائے اہل سنت و جماعت فرماتے ہیں کہ ولی کے لیے کرامت جائز ہے جو خارقِ عادت اور خارجِ طبیعت ہو اور اولیاء کی کرامت نبی کی نبوت میں شبہ نہیں پیدا کرتی اور نہ اس کے معجزہ میں شبہ پیدا کرتی ہے بلکہ ولی کی کرامت تو صحتِ نبوت اور معجزہ نبی پر دلیل ہوتی ہے۔

ولی کی کرامت اپنے زمانہ کے نبی کا معجزہ ہوتا ہے

اس لیے کہ ولی کی کرامت اس زمانہ کے نبی کا معجزہ ہے اور اس کے نبی ہونے کی تحقیق اور اس کی صحت پر دلیل یہ ہے کہ اگر اولیاء کے لیے کرامت ثابت کرنا جائز نہ ہو تو انبیاء کے لیے بھی کرامت کا ثابت کرنا جائز نہ ہوگا اس لیے کہ نبی اظہارِ نبوت اور وحی سے قبل ولی ہوتا ہے یعنی لوگوں کے روبرو وہ ولی ہوتا ہے اگرچہ اللہ کے نزدیک تو اس وقت بھی نبی ہی ہوتا ہے اور قبلِ ظہورِ نبوت اظہارِ کرامت جائز ہے جیسے ہمارے نبی مکرم حضور پر نور سرکارِ دو عالم ﷺ اور حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ وغیرہم صلوات اللہ وسلامہ علیہم اجمعین کے لیے جائز ہے کہ ظہورِ نبوت و قبلِ وحی لوگوں نے نزدیک ولی اور خدا کے نزدیک نبی تھے اور اگر ولی کے لیے اثباتِ کرامت نا جائز ہو تو پھر وحی سے قبل نبی سے بھی کرامت کا ظہور جائز نہ ہو تو اس میں کرامت کی نفی نبی سے بھی ہو جائے گی اور یہ محال ہے۔

اعترض: اگر کہیں کہ نبی کی نبوت اللہ تعالیٰ کے علم میں قبلِ وحی ثابت ہے اور ہم یہی کہتے ہیں تو اس سے نبی کے لیے اظہارِ کرامت ہے اور کرامت قبلِ وحی مقدماتِ وحی و نبوت سے ہے۔

جواب: تو کرامت مقدمہٴ نبوت ہے مقدمہٴ ولایت نہیں۔ ہم نے کہا: اس میں اور بھی زیادہ استحالہ ہے اس لیے کہ کرامت اگر خصائصِ مقدماتِ نبوت سے ہو تو اس میں قبلِ وحی اور قبلِ دعویٰ نبوت اس پر ایمان لانا واجب ہوگا اس لیے کہ نبی کے لیے اگر کرامت نہ ہو تو بدون نبوت کے تو قبلِ وحی ظہورِ کرامت سے یقیناً علم ہو جائے گا کہ یہ نبی ہے اور لوگوں پر فرض ہوگا کہ ایمان لائیں۔

اور ہمارا اس پر اجماع ہے کہ قبلِ وحی اور دعویٰ نبوت سے پہلے اس پر ایمان لانا فرض

نہیں بلکہ جائز نہیں اور بغیر دعویٰ کے اس کو نبی نہیں کہا جائے گا تو پھر وہ لوگوں کے نزدیک ولی ہوگا اور عند اللہ نبی۔

پھر اس سے جیسا کہ ہم کہتے ہیں: ولی سے ظہور کرامت ثابت ہو گیا، لیکن ان کا یہ کہنا کہ ولی کی کرامت دعویٰ نبوت سے پہلے نبی کی نبوت میں شبہ پیدا کرتی ہے، ہم کہتے ہیں کہ یہ لازم نہیں آتا اس لیے کہ دعویٰ نبوت سے پہلے لوگوں کے نزدیک ولی اور نبی میں کچھ فرق نہیں اس لیے کہ دعویٰ نبوت سے پہلے اس پر ایمان لانا واجب نہیں پھر جب دعویٰ کرے گا تو شبہ باقی نہ رہے گا تو اعتراض لازم نہ آیا۔ پھر نبی اور ولی میں چند وجوہ سے فرق ہے۔

ولی اور نبی میں فرق

- (۱) ایک تو یہ کہ نبی اپنی نبوت کو جانتا ہے کہ میں نبی ہوں اور وہ اپنے نبی ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اور ولی کو اپنی ولایت کا علم نہیں ہوتا کہ میں ولی ہوں اور نہ وہ دعویٰ کرتا ہے۔
- (۲) اور نبی اپنے معجزہ پر قطعاً اور یقیناً حکم کرتا ہے اور ولی اپنی کرامت پر ثبات کا حکم نہیں کرتا اور اس لیے کہ جائز ہے کہ استدراج ہو اور نبی کا معجزہ خاص طور پر اپنے لیے ہوتا ہے جب کہ ولی کی کرامت اس کے نبی کا معجزہ ہوتی ہے پھر نبی پر ایمان لانا فرض ہے پھر نبی کو اپنے رؤیا اور الہام پر ایمان لانا ضروری ہے جیسے اپنی نبوت پر اور ولی پر واجب نہیں کہ الہام و رؤیا پر ایمان لائے۔

دسواں قول

نبی افضل ہے یا ولی؟

اہل سنت و جماعت فرماتے ہیں کہ نبی ولی سے افضل ہے اگرچہ درجات نبوت میں اس کا درجہ ادنیٰ ہو۔

کرامیہ میں سے محققین نے کہا کہ ہو سکتا ہے کہ ولی نبی سے افضل ہو اور یہ کفر ہے اس لیے کہ انبیاء کرام علیہم السلام خاتمہ کے خوف سے معصوم و مامون پیدا کیے گئے ہیں اور جس نے کہا: ولی نبی سے افضل ہے تو اس نے اعتقاد کیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی خفیہ تدبیر سے آمن ہے

اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ”فلا یامن مکر اللہ الا القوم الخاسرون“ (الاعراف: ۹۹) اللہ کی خفیہ تدبیر سے صرف نقصان اٹھانے والے ہی بے خوف رہتے ہیں۔

اور نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ جس نے کہا: میں قطعی جنتی ہوں تو اس نے مامون ہونے کا دعویٰ کیا اور جو مامون ہونے کا دعویٰ کرے اس نے کفر کیا۔

گیارہواں قول

اس کا بیان کہ انبیاء کرام بعض بعض سے افضل ہیں

اہل سنت و جماعت کا اس پر اتفاق ہے کہ رسل کرام انبیاء علیہم السلام سے افضل ہیں اور رسل بعض بعض سے افضل ہیں اور صاحب کتاب اس سے افضل ہیں جو صاحب کتاب نہیں۔ پھر اولوالعزم افضل ہیں اور ان میں سب سے افضل و اعلیٰ محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔

اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ حضرت محمد ﷺ کو آدم علیہ السلام پر اس لیے فضیلت دینا جائز نہیں کہ حضور اقدس کا ارشاد ہے: میں اولادِ آدم کا سردار ہوں اور یہ نہیں فرمایا کہ میں آدم علیہ السلام سے بھی افضل ہوں انہوں نے کہا کہ ہم اس لیے کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ اولادِ آدم علیہ السلام سے افضل ہیں۔

صحیح تر یہ ہے جو ہم کہتے ہیں کہ سرورِ انبیاء محمد رسول اللہ ﷺ جملہ مخلوقات سے افضل و اعلیٰ برتر و بالا ہیں اور کسی کو حضور پر فضیلت دینا جائز نہیں انبیاء ہوں یا فرشتے سب پر حضور کو فضیلت ہے۔

بارہواں قول

اس کا بیان کہ کیا ولایت اور نبوت سلب

ہو سکتی ہے یا نہیں؟

اہل سنت: اہل سنت و جماعت کہتے ہیں کہ نبوت کسی ذنب (گناہ) کی وجہ سے زائل نہیں

ہو سکتی اور کسی نبی کا نبوت سے معزول ہونا جائز نہیں۔

محققہ: اور محققہ کہتے ہیں کہ نبی گناہ کے سبب نبوت سے معزول ہو جاتا ہے اور ایسے ہی موت کے ساتھ نبوت سلب ہو جاتی ہے یہ قول کفر ہے۔

اشعریہ: اشعریہ کہتے ہیں کہ نبوت موت سے زائل نہیں ہوتی ہاں! ذنب (گناہ) سے زائل ہو جاتی ہے۔ یہ عقیدہ بھی خطا عظیم ہے اس لیے کہ اگر نبوت گناہ اور لغزش سے زائل ہو جائے تو کفر و اسلام میں فرق نہ رہے گا اس لیے کہ جو غیر نبی پر ایمان لائے وہ کافر ہے اور یہ شخص واحد ایک ہی دن میں جس وقت نبی ہوگا اس پر ایمان لانا ضروری ہوگا یہی شخص جب نبوت سے معزول ہوگا تو اس کا انکار واجب ہوگا تو ایک ہی دن میں ایک شخص کئی دفعہ ایمان لائے گا اور کئی بار انکار کرے گا اور دونوں حالتوں میں وہ معذور ہوگا اور یہ بات محال ہے اور ایسے ہی اگر نبوت موت سے زائل ہو جائے تو اس حالت میں نہ وہ نبی ہے اور مبلغ احکام اور جب یہ شخص نبی و رسول نہ ہوا، مگر وقت تبلیغ کہ جس وقت خدا تعالیٰ وحی فرمائے کہ وہ نبی ہے اور جب وحی سے سکوت و فراغ ہو تو وہ نبی نہیں تو ایک شخص ایک ہی دن میں کئی بار نبی ہوگا اور کئی بار نبی نہ ہوگا۔

تو جس وقت اللہ تعالیٰ وحی بھیجے اور وہ تبلیغ احکام کرے گا نبی ہوگا اور جب وحی نازل نہ ہو اور تبلیغ احکام سے معزول ہو جائے تو نبی نہ رہے یہ بالکل عقل و حکمت کے خلاف ہے اس لیے کہ نبوت جیسا کہ ہم نے بیان کیا انبیاء سے نزول وحی سے قبل ثابت ہوتی ہے تو بعد الوفا نبوت زائل نہیں ہوتی اور اس لیے کہ نوم (نیند) بھی قائم مقام موت کے ہے جیسا کہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا ”النوم اخ الموت“ کہ نیند موت کی مانند ہے ہم سب اس امر پر مجتمع اور متفق ہیں کہ نیند کے ساتھ انبیاء کی نبوت سلب نہیں ہوتی اور نبوت سے معزول نہیں ہو جاتے تو اسی طرح موت کے ساتھ بھی معزول نہیں ہوتے اور اس لیے کہ انبیاء کرام وفات کے بعد بھی موجود ہیں اور اس لیے کہ انبیاء کرام پر ان کی وفات کے بعد ایمان لانا واجب ہے جیسا کہ وفات سے پہلے ان پر ایمان لانا واجب ہے۔

پھر اگر نبوت موت سے زائل ہو جاتی تو ”محمد رسول اللہ“ کہنا صحیح نہ ہوتا یعنی محمد اللہ کے رسول ہیں۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے تھا کہ ”کان محمد رسول اللہ“ محمد اللہ کے

رسول تھے اور اس پر ہمارا اجماع ہے کہ یہ کہنا درست و صحیح ہے کہ ”محمد اللہ کے رسول ہیں“ تو جو کچھ ہم نے کہا: وہ صحیح ہے کہ موت اور نوم (نیند) سے نبوت زائل نہیں ہوتی بلکہ وفات و نوم (نیند) کے بعد بھی بدستور نبی ہیں اور اسی طرح اذان میں ہم کہتے ہیں: ”أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللَّهِ“ کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ محمد اللہ کے رسول ہیں۔

اور اس لیے کہ نبوت کا حکم ثابت ہے جیسے ایمان کا حکم ثابت ہے بلکہ اقویٰ و اولیٰ ہے تو موت کے ساتھ انسان کا ایمان زائل نہیں ہوتا اور مرنے کے بعد وہ ایمان سے خارج نہیں ہوتا بلکہ انسان مؤمن رہتا ہے اسی طرح انبیاء کرام وفات کے بعد انبیاء ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”كُلُّ أَمْنٍ بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهِ“ (البقرہ: ۲۸۵) اور مؤمن (بھی) سب ایمان لائے اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر (یہ کہتے ہوئے کہ ہم ایمان لانے میں) فرق نہیں کرتے کسی کے درمیان اس کے رسولوں میں سے اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان کو موت کے بعد رسول ہی فرمایا ہے یعنی وفات کے بعد بھی وہ رسول ہی ہیں حیات و ممات (زندگی و موت) میں رسول ہونے میں کچھ فرق نہیں ہوتا تو جو کچھ ہم نے کہا: وہ صحیح ہے۔

ولایت

پھر ولایت میں بھی اختلاف کیا ہے۔

- (۱) بعض کہتے ہیں: ذنب (گناہ) سے ولایت سلب و زائل ہو جاتی ہے۔
- (۲) بعض دوسرے حضرات کہتے ہیں کہ گناہ سے ولایت زائل نہیں ہوتی۔
- (۳) بعض نے کہا کہ گناہ کبیرہ کے ارتکاب سے ولایت زائل ہو جاتی ہے اور صغیرہ سے زائل نہیں ہوتی۔

اور صحیح تر یہ ہے کہ جس گناہ سے عدالت ساقط ہو جاتی ہے ولایت بھی ساقط ہو جاتی ہے۔

فاسق ولایت کا اہل نہیں ہوگا، اسرارِ الہی پر مطلع ہونا ولایت ہے

کیونکہ فاسق جب انسانوں کے سرائر یعنی شہادت کا اہل نہیں اور وہ مردود الشہادت ہے تو اللہ کے سرائر یعنی ولایت کا وہ کس طرح اہل ہو سکتا ہے؟

۱ اور اسرارِ الہی پر مطلع ہونا ولایت ہے۔ (۱۲ سیدی ابوالبرکات)

ولایت کی قسمیں

- (۱) ایک ولایت ایمان ہے وہ کبیرہ گناہوں کے ارتکاب سے زائل نہیں ہوتی۔
 (۲) دوسری ولایت احسان و اتمان ہے اور وہ کبیرہ کے ارتکاب سے باقی نہیں رہتی۔
 اور نبی سے معصیت کا امکان نہیں یعنی نہ وہ کبیرہ کا مرتکب ہو سکتا ہے اور نہ صغیرہ کا وہ
 صغائر و کبار سے معصوم ہوتا ہے جیسا کہ ہم نے بیان کیا۔

تیرھواں قول

اس بارے میں کہ معجزہ جب خاص کے لیے ہو
 تو وہ عام کے حق میں بھی ہوتا ہے یا نہیں؟

اس پر اجماع امت ہے کہ جب معجزہ خاص کے لیے ثابت ہو جائے تو وہ عوام کے لیے
 بھی حجت ہوتا ہے اس لیے کہ جب مطالبہ نقض معجزہ اور اس کی مثل لانے کا حاذق و ماہر اور
 حکماء اور راہنہین فی العلم (علم میں پختگی رکھنے والے) سے ہوتا ہے تو جب معجزہ کی مثل لانے
 سے اور اس کے توڑنے کی صلاحیت بڑے بڑے فصحاء و بلغاء اور ماہرین میں نہ ہو بلکہ سب
 کے سب عاجز ہو جائیں اور معجزہ کی مثل نہ لاسکیں اور نقض و فسخ اور خلل معجزہ میں نہ ہو باوصف
 حذاقت و رزانت و حکمت کے تو جو نقض اور معجزہ کی مثل پیش کرنے سے عاجز ہوں اور اہل نہ
 ہوں اور نظر و فکر کے بھی اہل نہ ہوں تو ان کے حق میں معجزہ بہ طریق اولیٰ ثابت ہے۔

اور اس لیے اگر ہم کہیں کہ یہ معجزہ جو خواص کے سامنے پیش کیا وہ تو عاجز ہو گئے اس کی
 مثل لانے سے مگر دوسرے کے لیے حجت نہیں اور نہ دوسرے کے لیے معجزہ ہے بلکہ ہر شخص
 کے لیے علیحدہ علیحدہ معجزہ ہونا چاہیے تو یہ ”مؤدی الی مالا نہایہ لہ“ ہوگا یعنی یہ محال ہے
 کہ معجزہ ہر ایک کے لیے علیحدہ ہو اس لیے کہ تمام لوگوں کا نبی کی خدمت میں حاضر ہونا محال
 ہے (ممکن نہیں) تو جب حالت حیات میں سب کا حاضر ہونا ناممکن ہے تو وفات کے بعد بہ
 طریق اولیٰ ناممکن ہے اور پھر جب اس نے پیغمبر کا معجزہ نہ دیکھا تو اس پر ایمان کا انا واجب

۱۔ فاسق معین مرتکب کبیرہ ولی نہیں ہو سکتا۔ (۱۲ سیدی ابوالبرکات)

نہ ہوگا اور یہ محال ہے۔

یہود و نصاریٰ خاص کے لیے معجزہ ہو تو سب کے لیے کافی نہیں سمجھتے

اور یہود و نصاریٰ نے اس کا انکار کیا کہ معجزہ خاص کے لیے ہو تو وہ سب کے لیے کافی ہے، عنقریب ہم اس کا ذکر کریں گے۔

اجماع اور اجتہاد کی حجیت پر بحث

اجتہاد اور اجماع حجت ہیں

اور جیسے معجزہ خاص و عام کے لیے حجت ہے، اسی طرح دین میں اجتہاد کرنے، علماء و فقہاء اور راہنہین فی العلم (علم میں پختگی رکھنے والے) جب کہ وہ اہل اجتہاد سے ہوں، کسی شئی (مسئلہ) میں اجتہاد کریں تو باقی غیر مجتہدین پر واجب ہے کہ ان کے اجتہاد میں ان کی اتباع کریں اگرچہ مجتہد بعض مسائل میں مبتدع اور مخطئی ہو مگر اس درجہ نہیں کہ اس کو فاسق یا کافر کہا جائے تو اس کا اتباع کیا جائے گا، اس لیے کہ اس کا اجماع و اجتہاد اس چیز میں کہ وہ متہم بالفسق و الکفر نہ ہو معتبر ہے کہ اس نے اسی کو صواب دیکھا اگرچہ فی نفسہ اس نے خطا کی ہو، لوگوں پر اس کا اتباع واجب ہے اور اگر مبتدع کی خطا و اجتہاد موجب کفر و فسق ہے تو وہ تو اہل اجتہاد سے ہی نہیں اور اس کا اجتہاد معتبر نہ ہوگا۔

اہل سنت اور حجیت اجماع

اہل سنت و جماعت کے نزدیک امت کا اجماع حجت ہے اور روافض اجماع امت کے منکر ہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا" (البقرہ: ۱۴۳) اور اسی طرح ہم نے تم کو بہترین امت بنایا کہ تم لوگوں پر گواہ ہو جاؤ اور یہ رسول تم پر گواہ ہوں، پھر نبی کی شہادت اور اس کی بات خلق (لوگوں) پر حجت ہے، اسی طرح امت کی بات حجت ہے جب کہ افراد امت اس بات پر بلاشبہ اور قطعاً کسی تہمت کے مجتمع ہوئے ہوں، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ

۱۔ یہود و نصاریٰ نے اس بات کا انکار کیا ہے کہ جب معجزہ خواص کے لیے ثابت ہو تو وہ سب کے لیے کافی ہے۔ (۱۲ سیدی ابوالبرکات)

نے شہادت علی الناس کے ساتھ ان کا وصف بیان فرمایا ہے، جیسے نبی علیہ السلام شاہد علی الاطلاق تمام مخلوق کے لیے ہیں، اسی طرح امت ایک دوسرے پر گواہ ہے۔

دوسری دلیل برجیت اجماع

دوسری دلیل یہ ہے کہ معجزات کے اثبات اور ان کے نقل میں اجماع امت حجت ہے تو تمام احکام کے اثبات میں بھی اجماع حجت ہونا چاہیے اور یہ ہم نے جو کہا کہ معجزوں کے اثبات اور ان کے نقل میں اجماع امت حجت ہے تو تمام احکام میں بھی حجت ہونا چاہیے اس لیے کہ جو شخص معجزہ اور استدراج و مخرقہ میں فرق نہیں کر سکتا بالکل جاہل ہے۔ حاذقین و ماہرین و راہنہین فی العلم کا اتباع اور تقلید و اقتداء واجب ہے تو ماہرین اور علماء راہنہین کی ایک جماعت کا اثبات نبوت پر مجتمع ہے تو اس اجماع سے اس کو شبہ نہیں رہتا تو اس پر ان کا اجماع حجت ہے تو اسی طرح عامی کے لیے مجتہدین راہنہین فی العلم کا اتباع واجب ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اجماع و اتفاق علماء راہنہین فی العلم حجت ہے اور غیر مجتہد عامی و جاہل پر ان کا اتباع واجب ہے اور جو اس کا انکار کرے وہ کافر ہے جیسا کہ حضور نے ارشاد فرمایا: "من فارق الجماعة قدر شبر فاقتلوه" جو اہل سنت و جماعت سے ایک باشت بھر بھی جدا ہو اس کو قتل کر دو نیز حضور نے فرمایا: "لا تجتمع امتی علی الضلالة" میری امت گمراہی پر جمع نہ ہوگی، پھر جب امت کی بات سب پر حجت ہے تو حضور پر نور ﷺ کا ارشاد اور نبی و رسول کا قول بہ طریق اولیٰ حجت ہے۔

چودھواں قول

اس امر کا بیان کہ ایک زمانہ میں دو مختلف شریعتیں مقرر ہو سکتی ہیں یا نہیں؟

مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ ایک زمانہ میں دو مختلف شریعتیں مقرر کرنا جائز نہیں اور یہود و نصاریٰ اس کے منکر ہیں۔

۱ یعنی ان کے نزدیک ایک وقت میں دو مختلف شریعتیں مقرر ہو سکتی ہیں۔ (۱۲ سیدی ابوالبرکات)

ایک وقت میں دو مختلف شریعتیں کیوں نہیں چل سکتیں؟

ہمارا دعویٰ ہے کہ ایک وقت میں دو مختلف شریعتیں لاگو نہیں ہو سکتیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر دو مختلف شریعتیں ایک زمانہ میں ہوں گی تو اس میں بہت سی خرابیاں ہیں، مثلاً (۱) احکام کا معطل ہونا (۲) اور مخلوق کا ایمان ضائع کرنا (۳) اور دین سے روگردانی کرنا ہوگا، اس لیے کہ شریعت اول جب امت کے لیے حجت ہے، دوسری شریعت سے اعراض کرنے کے ساتھ بایں طور کہ ہم یہ کہیں کہ ہم پہلی شریعت پر ایمان لائے اور ہم نے اس کا اتباع کیا، اب ہم شریعتِ ثانیہ کا اتباع نہیں کریں گے۔ دونوں پر بیک وقت عمل ناممکن ہوگا جب کہ ہر ایک دوسری سے مختلف ہے۔

اور پھر یوں ہوگا کبھی اس پر عمل کیا اور کبھی دوسری پر، جس میں آسانی دیکھی اس کو اختیار کر لیا اور دوسری کو چھوڑ دیا اور کبھی دوسری شریعت میں آسانی دیکھی تو اس کو اختیار کر لیا اور پہلی کو چھوڑ دیا تو جس کو چھوڑے گا اس میں کافر ہوگا۔ گویا جس کو اختیار کیا اور اس پر ایمان لایا تو مؤمن ہوا، دوسری کو چھوڑا تو کافر ہو گیا اور دونوں شریعتیں برحق ہیں تو ایک پر عمل کرنے سے دوسری شریعت کا منکر ہو کر کافر ہو جائے گا اور یہ محال ہے۔

تو لازم آیا کہ ایک شخص ایک وقت میں مؤمن بھی ہو اور کافر بھی، یہ محال ہے۔

ایک وقت میں دو امام ہو سکتے ہیں یا نہیں؟

اور دو اماموں کا ایک وقت میں نصب کرنا جائز ہے یا نہیں؟ بعض فقہاء فرماتے ہیں کہ ناجائز ہے، اس لیے کہ امت میں اختلاف واقع ہوگا، جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ بعض فقہاء کرام نے فرمایا کہ ایک وقت میں دو اماموں کا قائم کرنا جائز ہے لیکن کچھ شرائط کے ساتھ یہ جواز ہے، مثلاً

☆ جب کہ دونوں اماموں میں مسافت بعیدہ ہو کہ امت میں اختلاف ناممکن ہو۔

☆ اور ایسے ہی اگر امت خبر دینے اور خبر لینے سے بعد مسافت کی وجہ سے عاجز ہو۔

پہلے امام سے تو اقتداء ناممکن ہوگا، جمیع احوال میں تو وہ اقتداء کرے دوسرے امام کی، ہمارے اس قول کے صحیح ہونے پر دلیل یہ ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم نے امامت و خلافت میں حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مصالحت کی، اگر جائز نہ ہوتا تو آپ ان کے

ساتھ نہ صلح کرتے اور نہ دین کے معاملہ میں اظہارِ خطاء میں راضی ہوتے جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ صلح سے پہلے راضی نہ تھے تو ہماری بات درست ہوئی کہ دو اماموں کا بیک وقت ہونا جائز نہیں۔

امام کون مقرر کرے گا؟ نیز امام وقت کے فرائض منصبی کیا ہوں گے؟

فیصلہ کن بات: اور صحیح یہ ہے کہ امام صاحب شریعت کی جانب سے مقرر ہوتا ہے جس کا کام احکام کا قائم و ثابت کرنا ہے اور یہ اسی صورت میں جائز اور ممکن ہوگا جب کہ امام ایک ہی ہو اور اس لیے کہ اگر لوگ براہ راست امام سے خبر لینے یا خبر دینے سے عاجز و قاصر ہوں تو اس کے نائب سے تو عاجز نہیں، تو یہ کلام بھی درست نہیں اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ”اذا بویع الخلیفتان فاقتلوا الاخر منهما“ جب دو خلیفوں کی بیعت کی جائے تو دوسرے کو قتل کر دو تو ثابت ہو امام ایک ہی ہونا چاہیے۔

سوال: ایک وقت میں دو مختلف مذاہب کا ہونا کیسا ہے؟

جواب: احکام و شرائع میں فتویٰ کے ذریعہ دو مختلف مذاہب کا ہونا جیسا کہ فقہاء کرام مثلاً امام اعظم ابوحنیفہ، امام مالک، امام ابو یوسف، امام محمد شیبانی، امام زفر و شافعی رحمہم اللہ اور باقی فقہاء کا اختلاف ہے آیا یہ اختلاف جائز ہے یا نہیں؟ تو اس سلسلہ میں مختلف آراء ہیں۔

روافض و معتزلہ کی رائے

معتزلہ اور روافض کہتے ہیں کہ اس قسم کا اختلاف ناجائز ہے (ان کا کہنا ہے کہ مختلف مذاہب کے حاملین ائمہ و فقہاء کا اتباع جائز نہیں ہے)۔

اہل سنت و جماعت کا موقف

اہل سنت و جماعت کہتے ہیں کہ ہر مجتہد کا فتویٰ و اجتہاد قبول کیا جائے گا پھر اگر اس کے اجتہاد و فتویٰ میں یقین کے ساتھ خطاء ثابت ہو جائے تو اس کا اتباع واجب نہیں بلکہ امتناع ضروری ہے اور جب تک اس کی خطاء یقین سے ثابت نہ ہو تو متابعت جائز ہے مگر جس میں احتیاط و حق معلوم ہو اس کو لیا جائے اور ترجیح کا مطالبہ واجب ہے۔

۱۔ جس قول کو ترجیح ہو اس کو اختیار کیا جائے گا۔ (۱۲ سیدی ابوالبرکات)

اہل سنت کی دلیل

اہل سنت کہتے ہیں کہ ہم نے یہ بات اس لیے کہی ہے کہ حضور اقدس سے مروی ہے کہ ”اصحابی کالنجوم فباہم اقتدیتم اھتدیتم“ یعنی میرے اصحاب ستاروں کی مانند ہیں جس کی پیروی کرو گے ہدایت یافتہ ہو جاؤ گے اور یہ معلوم ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مسائل میں آپس میں مختلف ہوتے تھے۔

صحابہ نے براہ راست حضور سے دین سیکھا

اور ہم نے یہ اس لیے کیا کہ ہر ایک حضور کا صاحب ہے اور حضور سے بلا واسطہ دین کو سیکھا اور حضور ﷺ سے احکام سیکھے اور نبی کریم ﷺ کے بعد صحابہ کا آپ ﷺ کی اقتداء کرنا حضور سے سماع کے سبب یا ثقہ نے حضور سے سنا اور جو مسائل باب قیاس سے ہیں تو ہر صحابی مجتہد تھا اور سب اہل قیاس سے تھے تو ان کا قیاس دوسروں کی تقلید کی بہ نسبت اولیٰ ہے اسی وجہ سے صحابہ میں اختلاف واقع ہوا اور اسی طرح فقہ میں اختلاف ہوا ائمہ میں۔ پھر یہ واجب نہیں کہ صحابہ اور ائمہ مذہب میں سے کسی ایک کو اقتداء کے لیے متعین کریں کیونکہ اس میں دوسرے ائمہ سے اعراض و انکار لازم آتا ہے یہ ناجائز ہے اور اگر ہم کہیں کہ مذہب ایک ہی ہونا چاہیے تو اس میں بطلان وحی و رسالت لازم آتا ہے اس لیے کہ مذہب جب ایک ہوگا تو ضروری بات ہے کہ صاحب مذہب بھی ایک ہوگا اور تمام حوادث و مسائل میں وہی فتویٰ دے گا کیونکہ غیر کی طرف رجوع کرنا جائز نہ ہوگا اور یہ بھی واجب ہوگا کہ وہ خطا و نسیان اور سہو سے معصوم ہو اور یہ لوگوں پر معاملہ تنگ کرتا ہے اور اس میں کتمان حق لازم ہوگا اس لیے کہ غیر کی طرف رجوع کرنا جائز نہیں اور یہ جب خطا کرے یا سہو کرے تو پھر حق کو ظاہر نہ کرے گا تو پھر ان کا درجہ انبیاء سے بھی اعلیٰ ہوگا اس لیے کہ انبیاء علیہم السلام صغائر و کبار سے تو معصوم ہوتے ہیں لیکن وہ سہو و ذلت سے معصوم نہیں ہوتے تو یہ سہو و ذلت و خطا سے معصوم مانا جائے تو یہ محال ہے کہ غیر نبی نبی سے بڑھ جائے۔

تو ثابت ہوا کہ ہر شخص جو اہل اجتہاد ہے وہ اجتہاد کر کے حوادث و نوازل میں جو مسائل پیش آئیں ان کا جواب دے اور اس کے فتویٰ و جواب کا لوگوں کو اتباع کرنا جائز ہے جب تک یقین سے اس کی خطا ظاہر نہ ہو اور طلب صواب کے لیے علل و دلائل اصول فقہ مذکور ہیں۔

پندرہواں قول صاحب شریعت اور صاحب دعوت کا بیان

اہل سنت و جماعت فرماتے ہیں کہ صاحب شریعت وہ اولوالعزم رسول ہیں اور وہ چھ نفر ہیں: اول: آدم علیہ السلام دوئم: نوح علیہ السلام سوم: ابراہیم علیہ السلام چہارم: موسیٰ علیہ السلام پنجم: عیسیٰ علیہ السلام ششم: حضور پر نور محمد مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء ہیں۔

معزلہ و قدریہ کا عقیدہ اور اس کی تردید

معزلہ اور قدریہ کہتے ہیں کہ آدم علیہ السلام نہ صاحب شریعت ہیں اور نہ وہ رسول ہیں۔ تردید: اور یہ کفر ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے بواسطہ جبریل ان پر وحی کی اور اللہ تعالیٰ نے بلا واسطہ ان سے کلام کیا اور ان کو بلا واسطہ تمام اشیاء کے نام سکھائے پھر ان کو دنیا میں اترنے کا حکم دیا اور ان کو طواف کا حکم دیا اور ان کو احکام اور مناکہ و قربانی وغیرہا کا حکم دیا اور یہ سب احکام ان پر فرض تھے اسی طرح ان کی اولاد پر فرض تھے اور یہ سب احکام اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی ان پر فرض کیے۔

صاحب شریعت کسے کہتے ہیں؟

اور آدم علیہ السلام نے یہ احکام اپنی اولاد کو تبلیغ فرمائے اور یہ نبوت و رسالت اور صاحب شریعت کی تعریف ہے۔

جو آدم علیہ السلام کو صاحب شریعت نہ مانے کافر ہے

تو آدم علیہ السلام سب سے پہلے انسان ہیں اور شریعت میں کسی کے تابع نہ تھے۔ پس جب کہ ان کو خدا نے احکام کا حکم دیا تو یہی ان کی شریعت ہوئی اور آدم علیہ السلام صاحب شریعت ہوئے اور جو اس کا انکار کرے وہ کافر ہے۔ پھر صاحب شریعت وہ ہے کہ جس کو اللہ کی طرف سے وحی اور الہام ہو اور امر و نہی اور ناسخ و منسوخ کے احکامات ملیں اور اپنی طرف سے بھی شریعت کو نصب کرے اور اس میں اپنی رائے سے تصرف و کارروائی کرے اور اپنے

اجتہاد سے احکام بیان کرے اور بغیر وحی ظاہر کے بعض احکام منسوخ کرے اور یہ بھی خدا کی طرف سے وحی کی جاتی ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ”وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ“ (انجم: ۳-۴) اور آپ اپنی طرف سے کلام نہیں فرماتے مگر وہ (اللہ کی طرف سے) کی ہوئی وحی ہوتی ہے۔

صاحب شریعت اور صاحب دعوت رسولوں میں فرق؟

پھر تمام وہ رسول جن کو صحیفے اور کتابیں دی گئی ہیں مگر ان میں امر و نہی اور ناسخ و منسوخ صراحت کے ساتھ نہ تھے بلکہ وعظ و دعا تھیں جیسے ”زبور“ وغیرہ میں اور نہ وہ اپنی طرف سے امر و نہی میں تصرف کرتے ہیں اور نہ کسی حکم کو منسوخ کرتے ہیں مگر وحی ظاہر جدید سے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو اور یہ ان صاحب شریعت رسل کے تابع ہوتے ہیں جو ان سے پہلے ہو گزرے اور یہ اصحاب دعوت ہوتے ہیں اصحاب شریعت نہیں ہوتے۔

کیا آدم علیہ السلام صاحب کتاب و شریعت تھے؟

اور جو یہ کہے کہ آدم علیہ السلام صاحب شریعت نہ تھے کیونکہ ان پر کتاب نازل نہیں ہوئی یہ خیال بالکل غلط ہے اس لیے کہ اگرچہ ان کو کتاب نہیں دی گئی مگر ان کو وحی ظاہر دی گئی اور احکام و نصب شریعت اور ناسخ و منسوخ اور کتاب و وحی میں کچھ فرق نہیں کیونکہ دونوں چیزیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں بلکہ ہم کہتے ہیں کہ آدم علیہ السلام کے پاس دس صحیفے تھے جو سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی طرف سے آدم علیہ السلام پر نازل ہونے والے صحیفے تھے ان صحیفوں میں احکام تھے تو ثابت ہوا کہ آدم علیہ السلام رسول اور صاحب شریعت تھے۔

سولہواں قول

اس کا بیان کہ صاحب شریعت پر وحی نازل ہونے سے قبل کسی سابقہ شریعت پر عمل کرنا لازم ہے یا نہیں؟

احناف اور شوافع کا فتویٰ

اس مسئلہ میں لوگوں نے اختلاف کیا ہے۔ بعض اہل علم فرماتے ہیں: اس پر قبل نزول

وحی پہلی شریعت پر عمل لازم ہے۔ امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کے قول کا قیاس یہی ہے اور امام شافعی رضی اللہ عنہ کے قول کے مطابق لازم نہیں اور یہ مسئلہ اصول فقہ میں بیان کیا گیا ہے کہ پہلی شریعتوں کے احکام جب تک دلیل نسخ وارد نہ ہوئی ہو کیا ہمارے لیے لازم ہیں یا نہیں؟ امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم پر لازم ہیں اور امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ہم پر لازم نہیں۔

اگر کسی نے لڑکا ذبح کرنے کی نذر مانی تو بکری ذبح کرنا پڑے گی

اس معنیٰ کے لحاظ سے امام ابوحنیفہ نے فرمایا کہ جس نے نذر مانی کہ میں اپنا لڑکا ذبح کروں گا یہ نذر صحیح ہے اور ایسے ہی غلام کے بارے میں اور اس پر بکری کا ذبح کرنا لازم ہوگا اس لیے کہ لڑکا ذبح کرنا ابراہیم علیہ السلام کے حق میں جائز تھا اور اس نذر سے بکری ذبح کر کے سبکدوش ہوئے اور دلیل نسخ ظاہر نہیں تو ابراہیم علیہ السلام کے سوا اور کوئی نذر مانے تو صحیح ہونی چاہیے اس لیے کہ مشروع چیز کی نذر مانی ہے اور نذر میں بکری متعین ہوگی جیسے ابراہیم علیہ السلام کے لیے دنبہ فدیہ میں دیا گیا۔ امام شافعی کے نزدیک یہ نذر صحیح نہیں اس مسئلہ کا مقام کتب فقہ ہیں۔

وحی ملنے سے پہلے سابقہ شریعت پر عمل کیوں واجب ہوتا ہے؟

اور یہ جو ہم نے کہا کہ وحی سے قبل پہلی شریعت پر عمل لازم ہے اس لیے کہ وحی سے قبل اس کو اپنی شریعت کا علم ہوگا۔ اس کی دلیل یہ آیت ہے: "مَا كُنْتُمْ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ وَلَا الْإِيمَانُ" (الشوری: ۵۲) نہ آپ یہ جانتے تھے کہ کتاب کیا ہے اور نہ ہی یہ کہ ایمان کیا ہے یعنی دعویٰ بالایمان اور کیفیت فی الایمان۔

اور دوسری دلیل یہ ہے کہ جب شریعت منصوبہ مملوک علی الرشد موجود ہے تو اس کو بلا عذر چھوڑنا جائز نہیں، قبل وحی اس کے لیے کوئی عذر نہیں اور جو شریعت کو بلا عذر چھوڑے تو وہ فاسق ہے نیز ہماری اس بات کے درست اور صحیح ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہو سکتی ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام "انجیل" نازل ہونے سے پہلے "تورات" کی پیروی کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِ نُوحًا" (الشوری: ۱۳) اسی دین کا راستہ تمہارے لیے مقرر کیا جس کا حکم اس نے نوح (علیہ السلام) کو دیا تھا دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "مِلَّةً

أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ“ (الحج: ۷۸) تمہارے باپ ابراہیم (علیہ السلام) کا دین (پسند کیا)۔

حضور ﷺ پر ”انجیل“ کی پیروی واجب نہ تھی

پھر حضور نبی کریم ﷺ نے ”انجیل“ کی پیروی نہیں کی تو اس کی اپنی وجوہات ہیں وہ یہ کہ حضور ﷺ پر ”انجیل“ کی پیروی فی الجملہ (آخر کار) واجب نہ تھی لیکن اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی کہی جاسکتی ہے کہ حضور ﷺ نے ”انجیل“ کی پیروی اس لیے نہیں کی تھی کہ آپ کو ”انجیل“ کا سماع نہیں پہنچا کیونکہ حضور اقدس ﷺ زمانہ فِثْرَت میں مبعوث ہوئے اور احکام واجب ہونے کے لیے سماع شرط ہے۔

پھر یہ طے شدہ بات ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے اتر کر حضور انور ﷺ کی پیروی کریں گے اس لیے کہ ان کی شریعت منسوخ ہو چکی ہے حالانکہ وہ صاحب شریعت رسول تھے۔ آسمان سے اترنے کے بعد بھی آپ رسول ہی ہوں گے مگر صاحب شریعت نہ ہوں گے ان کو یہ جائز نہیں کہ اپنی طرف سے کوئی حکم قائم کریں مگر اللہ کی وحی سے تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام حضور کے خلیفہ ہوں گے۔

کیا آسمان سے اترنے کے بعد حضرت عیسیٰ لوگوں کے امام ہوں گے؟

ان کی امامت نماز میں اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں ان کی امامت جائز نہیں کہ لوگوں کو نماز پڑھائیں اس لیے کہ متبوع ہو جائیں گے اور یہ جائز نہیں بلکہ امام مہدی نماز پڑھائیں گے اور عیسیٰ علیہ السلام ان کے پیچھے پڑھیں گے۔

امام مہدی ہی عیسیٰ علیہ السلام ہیں

اور بعض نے کہا: مہدی ہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں اور صحیح تر یہ ہے کہ لوگوں کے ساتھ نماز پڑھیں گے اور لوگوں کی امامت کریں گے اس لیے کہ مہدی علیہ السلام سے عیسیٰ علیہ السلام افضل ہیں تو امامت کے لیے زیادہ مناسب اور اولیٰ ہیں اور نماز پڑھنے سے حقیقت میں متبوع نہیں ہو جاتے اس لیے کہ متابعت بالصلوٰۃ دین و شریعت میں متابعت کو واجب نہیں کرتی ہے۔

نماز پڑھانے سے امام متبوع نہیں ہو جاتا، حقیقی متبوع -----
حضور اقدس ہی ہیں

متبوع و مقتداء حقیقت میں حضور پر نور ﷺ ہی ہیں اور عیسیٰ علیہ السلام تابع ہوں گے یہ ایسے ہی ہے جیسے سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے لوگوں کو نماز پڑھائی، حضور کی عین حیات میں تو وہ حقیقت میں متبوع نہ تھے بلکہ سب رسول اللہ ﷺ کے تابع ہیں اور نماز میں متابعت جائز ہے، شریعت میں متابعت جائز نہیں۔

فقہاء و ائمہ کی متابعت حقیقت میں حضور کی متابعت ہے

جیسے ہمارے زمانہ میں فقہاء و ائمہ کی متابعت حقیقت میں حضور کی متابعت ہے تو ادائے شریعت میں حضرت عیسیٰ بھی بہ منزلہ فقہاء کے ہوں گے ورنہ وہ رسول و نبی ہیں۔ پھر اگر عیسیٰ علیہ السلام ایسا کام کریں کہ جو شریعت محمدیہ کی زور سے جائز و مشروع نہیں تو اگر یہ فعل وحی جدید مقدر سے ہے اور شریعت محمدیہ کے موافق ہے اور شریعت محمدیہ کے مخالف و ناخ نہ ہو تو جائز ہے، ورنہ ناجائز ہے۔

سترھواں قول

شریعت و کتب کے نسخ کا بیان

(شریعت اور کتابوں کے منسوخ ہونے کا بیان)

تمام امت اور مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے شرائع و احکام اور کتابوں میں نسخ جائز ہے۔

اعتراض: یہودیوں اور مجوسیوں نے کہا کہ شرائع و احکام اور کتابوں کا منسوخ ہونا جائز نہیں ہے، انہوں نے اپنے موقف پر دلیل دیتے ہوئے کہا کہ جب کسی شئی کا حکم کیا جاتا ہے تو یہ مقتضی ہے کہ اس میں مصلحت ہے اور جب کسی شے سے منع کیا جاتا ہے تو یہ مقتضی ہے کہ اس میں مفسدہ اور قباحت ہے تو ثابت ہوا کہ اچھی چیز کا حکم دیا جاتا

ہے اور بُری چیز سے روکا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے ”تورات“ میں امر و نہی فرمائے اور اس میں مصلحت تھی۔ اس کے بعد اس سے منع فرمائے تو اس میں قبح و مفسدہ ہو گا (انہوں نے کہا) کہ گویا اللہ تعالیٰ کو ابتداء میں اس کی قباحت و فساد کا علم نہ تھا اور ایسا تو ہو نہیں سکتا کیونکہ اللہ تعالیٰ حکیم ہے، اس کے فعل کو سفاہت (بے وقوفی) نہیں کہا جاسکتا۔

جواب: یہودیوں اور مجوسیوں کے اس اعتراض کے جواب میں ہم نے کہا کہ وقت وقت کی بات ہے، ایک خاص وقت کسی شئی کا حکم اور امر دینے میں مصلحت ہوتی ہے، پھر دوسرے وقت میں اسی شئی کے اندر وہ مصلحت اور فائدہ نہیں رہتا، جیسے غذائیں، دوائیں اور رگ کا ثنا، بطور علاج گرم لوہے سے داغ دینا وغیرہ ایسی چیزیں ہیں کہ بعض وقتوں میں یہ مفید و کارآمد ثابت ہوتی ہیں، پھر انہی چیزوں میں بعض اوقات وہ فائدہ اور مصلحت نہیں ہوتی، اس لیے وقت بدلنے کے ساتھ مصلحت بھی بدل جاتی ہے، ہمیشہ ایک سا حکم نہیں رہتا۔

اعتراض: اگر کہا جائے کہ نسخ رجوع و بدء ہوتا ہے اور یہ اس شخص سے جائز ہوتا ہے جو عواقب امور سے ناواقف ہو۔

جواب: کہا جائے گا کہ ہم تسلیم نہیں کرتے کہ بدء و رجوع ہوتا ہے بلکہ اس میں (نسخ) مدت کے ختم ہونے کا بیان ہوتا ہے اور حکم اول کے ختم ہونے کی دلیل ہوتی ہے اور دوسرے حکم کا استیناف ہوتا ہے۔ کیا آپ دیکھتے نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو نطفہ سے پیدا کیا، پھر علقہ سے، پھر مضغہ سے؟ یہاں تک کہ فرمایا: ”ثُمَّ أَنْشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ“ (المؤمنون: ۱۴) ”پھر ہم نے اسے دوسری صورت میں پروان چڑھایا“ اور یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بدء نہیں بلکہ یہ پہلے حکم کی تعمیل ہوتی ہے اور دوسرے حکم استیناف ہوتا ہے۔ اسی طرح سمجھیں کہ مثلاً اللہ تعالیٰ زندوں کو مارتا ہے اور موت سے دوچار کرنے کے بعد پھر دوبارہ زندہ کرتا ہے تو یہ بدء نہیں بلکہ استیناف ہے۔

سوال: سوال یہ ہے کہ آخر نسخ میں فائدہ کیا ہے؟

جواب: جواب یہ ہے کہ فائدہ امتحان و آزمائش اور رحمت ہے اور یہ سب فائدوں سے بڑا

فائدہ ہے تو یہ نسخ قبل علم و عمل ہو اور بعض نے کہا کہ ہمارے حق میں جائز نہیں ہے اس لیے کہ قبل وقوع علم ہمارے لیے مشروع نہ تھا اور نبی کریم ﷺ عالم تھے اور قابل بھی تھے تو حضور کے حق میں نسخ بعد العلم قبل العمل ہو اور یہ دلیل ہے کہ نسخ بعد العلم قبل العمل جائز ہے اور نسخ قبل العلم جائز نہیں۔

اٹھارہواں قول

قرآن مجید اور وحی کے نازل ہونے کا بیان

اہل سنت و جماعت کہتے ہیں کہ قرآن پاک اللہ تعالیٰ کی طرف سے محمد رسول اللہ ﷺ پر اتارا گیا، مصاحف میں لکھا گیا بغیر حلول کے اور نہ وہ اس میں رکھا گیا ہے اور ہمارے کانوں سے سنا گیا اور ہماری زبان سے ہمارے الفاظ میں پڑھا گیا، ہمارے دلوں میں محفوظ ہے۔

اشعریہ کہتے ہیں کہ قرآن کلام اللہ ہے، معنی فی الذات، قائم بالذات، ذات سے منفک و جدا نہیں۔ غیر منزل (اتارا نہیں گیا) مکتوب و سماع نہیں (لکھا گیا ہے نہ سنا گیا ہے) اور محفوظ نہیں ہے اور دراصل یہ مسئلہ فرع ہے پہلے یہ پہچان ہونی چاہیے کہ کلام کسے کہتے ہیں؟

سوال: کلام کسے کہتے ہیں؟

جواب: اشعریہ کہتے ہیں: کلام معنی فی الذات ہے اور معنی اس سے جدا نہیں ہوتا۔

اہل سنت و جماعت فرماتے ہیں کہ کلام وہ ہے جو تکلم سے سمجھا جائے اور قراءت وہ معنی مفہوم ہے اور ان کا یہ کہنا کہ کلام معنی فی الذات ہے، خطا ہے اس لیے کہ یہ معنی اس صورت حال سے خالی نہیں کہ یا تو غیر ذات ہے؟ یا وہی ذات ہے؟ تو اگر کہیں کہ غیر ذات ہے تو حدیث قرآن کے قائل ہوئے اور اگر کہیں کہ وہی ذات ہے تو صفات کا انکار کیا اور اگر تیسری صورت اختیار کرتے ہوئے کہا کہ "لا هو ولا غیرہ" تو ان کی یہ بات کہ معنی فی الذات کا نام کلام ہے، باطل ٹھہری اور اس لیے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ عَلَى قَلْبِكَ" (الشعراء: ۱۹۳) جسے روح

الامین (جبرائیل علیہ السلام) نے آپ کے قلب پر اتارا اور دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا" (طہ: ۱۱۳) بے شک ہم نے اسے عربی (زبان میں) قرآن اتارا۔

امام ابو یوسف اور امام ابو حنیفہ کے درمیان مسئلہ قرآن پر۔۔۔۔۔
چھ مہینے مناظرہ ہوتا رہا

امام ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں نے امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ سے مسئلہ قرآن پر چھ مہینے مناظرہ کیا، حتیٰ کہ میری ان کی رائے متفق ہو گئی، اس پر کہ قرآن کریم اللہ کا کلام ہے اس کی وحی ہے اور اس کا اتارا ہوا ہے، غیر مخلوق ہے۔ اگر ہم کہیں کہ قرآن غیر منزل ہے تو جو جبریل نے نازل کیا اور حضور ﷺ نے سنا وہ کلام اللہ نہ ہوا بلکہ جبریل کا کلام ہوگا اور جو حضور نے سنا وہ کلام اللہ نہ ہوا اور یہ صحیح نہیں ہے۔

اس لیے کہ اگر ہم کہیں کہ کلام غیر منزل ہے تو درج ذیل مفاسد اور خرابیاں لازم آئیں گی۔

(۱) جو قراءت و تلاوت سے سمجھا گیا وہ کلام نہ ہو۔

(ب) جو سنا گیا وہ کلام نہ ہو۔

(ج) پھر اس سے امر و نہی بھی صحیح نہ ہو اور کسی پر احکام میں سے کوئی حکم لازم نہ ہو کیونکہ جو جبریل لے کر آئے وہ کلام اللہ نہیں۔

جو حضور نے سنا وہ بھی کلام اللہ نہیں اور جو امت مصطفویہ نے حضور اقدس ﷺ سے سنا وہ بھی اللہ کا کلام نہیں تو ان پر حجت لازم نہیں کیونکہ حجت تو کلام اللہ ہے اور اللہ کا حضور کو خبر دینا ہے تو جب یہ کلام اللہ نہیں تو کسی پر حجت قائم نہیں اور کسی پر واجب نہیں کہ ایمان لائے اور یہ محال و ناممکن ہے تو ثابت ہوا کہ "کلام وہ مفہوم ہے"۔

پھر یہ معنی قراءت و کتابت اور سماع و حفظ سے سمجھے جاتے ہیں اگرچہ ہزار زبانوں میں پڑھا جائے اور ہزار مصاحف میں لکھا جائے لیکن وہ معنی مفہوم ایک ہی ہوگا اس لیے تمام لغات سے سمجھا گیا اور کتابت سے سمجھا گیا وہ معنی واحد یا مفہوم واحد ہے تو جو ہم نے کہا وہ صحیح ہے۔

پھر 'تنزیل' انفاک کو واجب نہیں کرتی کیونکہ قرآن ایسی چیز نہیں جو منقول ہو یہاں تک کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو بلکہ وہ کلام مفہوم اور معنی مفہوم ایسی چیز ہے کہ نہ اس کی تنزیل جائز اور نہ اس کی کتابت جائز جیسے ہم کہیں کہ جس نے کتاب پر یا لوح پر لکھا ہزار دینار تو دنیا پر ایک موضع سے دوسرے موضع پر منتقل نہیں ہوتے لیکن سمجھے گئے اور جانے گئے کتابت سے اور اسی معنی کے لحاظ سے ہم نے کہا کہ مصاحف میں مکتوب (لکھا ہوا) ہے اس میں حلوں کے ہوئے نہیں جیسے دینار کاغذ میں لکھے ہوئے ہیں کاغذ میں دینار رکھے ہوئے نہیں ہیں۔

انیسواں قول قرآن کیا ہے؟

اہل سنت و جماعت کہتے ہیں: قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا غیر مخلوق کلام ہے انہوں نے کہا کہ جو شخص قرآن کریم کو مخلوق کہے وہ کافر ہے۔
نجاریہ کرامیہ کہتے ہیں: قرآن پاک حادث ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ قرآن کریم محدث ہے۔

معتزلہ اور روافض کہتے ہیں: قرآن اللہ کی مخلوق ہے اور اللہ تعالیٰ متکلم نہیں ہے انہوں نے کہا: اللہ تعالیٰ قرآن غیر قرآن اور کسی کلام کے ساتھ متکلم نہیں ہے۔
(معتزلہ و روافض یہ بھی کہتے ہیں کہ) اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے اور نہ ہی جبریل علیہ السلام سے کلام فرمایا بلکہ موسیٰ علیہ السلام سے جبریل نے کلام کیا جیسا اللہ نے ارادہ فرمایا اور ایسی ہی ایک روایت امام شافعی رحمہ اللہ سے مروی ہے۔
بعض حضرات کہتے ہیں کہ جبریل علیہ السلام نے لوح محفوظ میں دیکھا اور وہاں سے قرآن لائے اور اللہ تعالیٰ کے لیے نہ کلام ہے اور نہ تکلم ہے۔

اس کی بجائے ہم یہ کہتے ہیں: قرآن کلام اللہ ہے بہ سبب اضافت جیسا کہ "ناقۃ اللہ" اور "بیٹ اللہ" میں اضافت ہے۔

جہمیہ کہتے ہیں: اس مسئلہ میں توقف کیا جائے۔

حنابلہ اور اصحابِ ظواہر کہتے ہیں کہ قرآن و قراءت اور کلمہ و حروف اور آواز غیر مخلوق ہیں اور یہ کفر ہے، لیکن جو حضرات کہتے ہیں کہ قرآن حادث ہے تو انہیں ہم یہ کہیں گے کہ یہ صحیح نہیں ہے اس لیے کہ اگر قرآن حادث ہے تو اللہ تعالیٰ کے احداث سے ہے یا بغیر اللہ کے احداث کے حادث ہے؟ اگر کہیں کہ اللہ تعالیٰ کے احداث سے ہے تو پھر محدث ہو حادث نہ ہو اور اگر اللہ تعالیٰ احداث کے بغیر حادث ہو تو یہ بات متقاضی ہے کہ صانع کا وجود نہ ہو اس لیے جب قرآن پاک محدث بغیر محدث ہے تو جائز ہے کہ تمام عالم اور عالم کی تمام اشیاء بغیر محدث کے محدث ہوں یہ ناممکن ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ قرآن پاک جب حادث ہو تو (سوال یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ کی ذات میں حدوث ہو یا غیر ذات میں؟ تو اگر اللہ کی ذات کے غیر میں حدوث ہو تو اللہ کا کلام نہ ہو اور اگر اللہ کی ذات میں حادث ہو تو اللہ تعالیٰ (مرید و مختار تھا) اس کے حدوث کے لیے یا نہیں؟ مرید و مختار تھا یا نہیں؟

تو اگر کہیں کہ اللہ تعالیٰ کے اختیار و ارادہ سے حادث ہو تو محدث ہو حادث نہ ہو اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا کسی شے کے حدوث کے لیے ارادہ ہی تو احداث ہے اور اگر اللہ تعالیٰ کے اختیار کے بغیر حادث ہو تو اس کی ذات حدوث قرآن کے لیے اپنی ذات میں مکڑہ و مجبور ہو گا اور مجبور اللہ نہیں ہو سکتا تو ثابت ہوا کہ یہ بات درست نہیں ہے۔

کیا قرآن محدث ہے؟ نہیں تو کیوں؟

لیکن جس نے کہا کہ قرآن محدث ہے تو یہ بھی صحیح نہیں اس لیے کہ محدثات کی نسبت اور اشیاء کا حدوث ذاتِ باری تعالیٰ میں جائز رکھا اور ذاتِ باری میں جائز نہیں کہ وہ محدث یا حدوث کا محل بنے۔

جو اللہ کو محل حوادث ٹھہرائے، کافر ہے

اس لیے کہ اگر ایک حدیث کے لیے محل بن سکتا ہے تو جائز اور ممکن ہے کہ تمام محدثات و حوادث کا محل بنے، جیسے تکوین و تغیر اور یہ وہ جوہر و عرض اور مخلوق کی تعریف ہے اور ان صفات سے اللہ تعالیٰ کو موصوف کرے تو وہ کافر ہو جائے گا۔

معز لہ کا مسلک

معز لہ کہتے ہیں کہ قرآن مخلوق ہے اس لیے کہ کلام ہے اور کلام کے لیے کلمہ و حروف ابتداء اور انتہاء ضروری ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ ان چیزوں سے منزہ ہے۔

جواب: ہم کہتے ہیں کہ کلمہ تقطیع اصوات (جدا جدا آوازوں کو کلمہ کہتے ہیں) اور حروف آوازوں سے اعضاء کی ہونے کی حرکات کا نام ہے اور کلام ان چیزوں کے بغیر بھی کلام ہو سکتا ہے اس لیے کہ کلام وہ معنی ہیں جو سمجھے جائیں اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا وہ فرمان ہے جو اس نے موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا: "إِنِّي أَنَا رَبُّكَ" (طہ: ۱۳) میں تمہارا رب ہوں۔ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "إِنِّي أَنَا اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ" (القصص: ۳۰) بے شک میں اللہ تمام جہانوں کو پالنے والا ہوں۔ نیز فرماتا ہے: "إِنِّي أَنَا اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدْنِي" (طہ: ۱۳) بے شک میں اللہ ہی ہوں میرے سوا کوئی معبود نہیں تو آپ میری عبادت کرتے رہیں۔ تو اگر کلام اصوات و حروف کا نام ہوتا تو یہ کلام اللہ تعالیٰ کا کلام نہ ہوتا اور اس کلام کا متکلم اللہ تعالیٰ کا غیر ہوتا (یعنی یہ کلام اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کا ہوتا) تو دعویٰ ربوبیت غیر اللہ کی طرف سے ہوتا اور موسیٰ علیہ السلام کا اس کی تصدیق کرنا کفر ہوتا اور جو اس کا اعتقاد کرتا وہ کافر ہوتا۔ اور ایسے ہی نبی علیہ السلام نے فرمایا: "اعوذ بكلمات الله التامات من شر ما خلق" تو اگر کلام اللہ نہیں تو پھر یہ مخلوق ہو اور جب قرار پایا تو اس کے ساتھ استعاذہ کفر ہوگا اور یہ ناممکن ہے اور اس لیے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "الرَّحْمَنُ ۝ عَلَّمَ الْقُرْآنَ ۝ خَلَقَ الْإِنْسَانَ" (الرحمن: ۱-۳) رحمن نے قرآن تعلیم فرمایا اپنے محبوب کو انسان کو پیدا کیا ۝ تو اللہ تعالیٰ نے تعلیم اور تخلیق کے درمیان فرق کر دیا تو ثابت ہوا کہ قرآن مخلوق نہیں۔

ابن عباس اور خلق قرآن کا مسئلہ

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا: "القرآن كلام الله غير مخلوق" (قرآن اللہ تعالیٰ کا غیر مخلوق کلام ہے) قرآن اللہ کا کلام ہے اور مخلوق نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا کہ آخر زمانہ میں کچھ لوگ پیدا ہوں گے جو قرآن کو مخلوق کہیں گے تو ان پر خدا اس کے

فرشتوں اور انسانوں کی لعنت۔

اعترض: اگر کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "إِنَّا جَعَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا" (الزخرف: ۳) بے شک ہم نے کیا اسے عربی قرآن اور "جَعَلَ" کے معنی تخلیق کے ہیں ہم کہتے ہیں: اگر "جَعَلَ" کو جمع وجوہ سے تخلیق کے معنی میں قرار دیا جائے تو یہ کفر تک پہنچانے والی بات ہوگی اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "وَجَعَلُوا لَهُ مِنْ عِبَادِهِ جُزْئًا" اور جو یہ اعتقاد کرے کہ "جعل" اس جگہ تخلیق کے معنی میں ہے تو کافر ہو جائے گا اور ان کا یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ و آدم و جبریل و محمد صلوات اللہ وسلامہ علیہم سے کلام نہیں کیا تو یہ کفر ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "كَلَّمَ اللَّهُ مُوسَى تَكْلِيمًا" (النساء: ۱۶۴) اور اللہ تعالیٰ نے موسیٰ (علیہ السلام) سے (بلا واسطہ بہ کثرت) کلام فرمایا اور تکلم بروزن تفعیل موجب تاکید و تحقیق ہے یہ نص قطعی ہے اس کا منکر کافر ہے اور اگر اللہ تعالیٰ متکلم نہیں تو دعویٰ ربوبیت اور امر و نہی غیر اللہ کی طرف سے ہوں گے اور یہ ناممکن ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا" (النساء: ۸۲) اور اگر وہ اللہ تعالیٰ کے غیر کی طرف سے ہوتا تو ضرور اس میں وہ بہت اختلاف پاتے۔ پھر اگر کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے بغیر صوت و حروف کے کلام کیا ہے تو یہ ممکن نہیں کہ جبریل علیہ السلام بغیر صوت و حروف کے سمجھیں یا سنیں۔

جواب: ہم نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے بغیر صوت و حروف کے کلام فرمایا اور جبریل کو اللہ تعالیٰ نے صوت و حروف کے ساتھ سنایا اور صوت و حروف مخلوق ہیں اور یہ ناممکن نہیں اس لیے کہ ہم اللہ کے کلام کو پڑھتے ہیں اور ہماری قراءت اور حروف مخلوق ہیں اور مقروہ (یعنی جو پڑھا گیا) وہ اللہ کا غیر مخلوق ہے۔

اور اللہ تعالیٰ نے درخت سے فرمایا: "أَنْ يَأْمُرْسِي" تو اللہ تعالیٰ نے درخت میں صوت (آواز) و حروف پیدا فرمائے اور موسیٰ علیہ السلام نے کلام کیا تو اللہ تعالیٰ نے اپنا کلام درخت سے صوت و حروف کے ساتھ سنا دیا تو جب درخت کے واسطہ سے کلام درست ہوا تو بواسطہ جبریل اور دوسرے وسائل سے بھی جائز ہوا اسی طرح

بلا واسطہ بھی جائز ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "وَكَلِمَةُ رَبِّهِ" (الاعراف: ۱۴۳) اور موسیٰ سے ان کے رب نے کلام فرمایا اور یہ اس بات میں نص ہے نیز اللہ کا ارشاد ہے کہ "وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللَّهُ إِلَّا وَحْيًا" (الشوریٰ: ۵۱) اور کسی بشر (یعنی انبیاء علیہم السلام) کے لائق نہیں کہ اللہ تعالیٰ ان سے کلام کرے مگر وحی کے ساتھ یا پردہ کے پیچھے سے یعنی انبیاء سے "أَوْ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ" (یا پردے کے پیچھے سے) یعنی آدم و جبریل و محمد صلوٰۃ اللہ علیہم اجمعین۔

اور اس پر دلیل یہ ہے: "فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلٰی قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ" (البقرہ: ۹۷) یعنی جبریل نے اسے اللہ تعالیٰ کے حکم سے آپ کے قلب انور پر اتارا یعنی اس کی تلاوت کو جبریل نے آپ کے قلب اقدس پر اللہ کے اذن و اجازت سے نازل کیا اور یہ سب نص ہیں۔

کلام، تکلم، تکلیم میں کیا فرق ہے؟

اہل سنت و جماعت کے نزدیک کلام، تکلم، تکلیم میں کچھ فرق نہیں۔ اشعر یہ کہتے ہیں کہ کلام قدیم ہے اور تکلم و تکلیم حادث و محدث ہیں اور جو جبریل نے سنا وہ تکلم و تکلیم ہے کلام نہیں، لیکن یہ بات درست نہیں اس لیے کہ تکلم کلام سے خالی نہیں کیونکہ جو معنی تکلم سے سمجھے وہ درحقیقت کلام ہے۔

فقہاء اہل سنت کا ارشاد

ہمارے فقہاء فرماتے ہیں کہ کلام تو بغیر تکلم و تکلم کے بھی ممکن ہے لیکن تکلم و تکلم بغیر کلام کے نہیں ہو سکتے اس کے معنی وہی ہیں جو ہم نے ذکر کر دیئے ہیں۔ جس نے کہا کہ حروف و کلمہ مخلوق نہیں تو یہ کلام انسان کو کفر تک پہنچا دیتا ہے اس لیے کہ حروف و کلمہ آواز اور اعضاء کے محتاج ہیں کیونکہ حروف کے مخارج وہ اعضاء ہیں جیسے ہونٹ، زبان، حلق، تالو، تو یہ صانع کی مخلوق کے ساتھ تشبیہ دیتا ہے (یعنی اللہ کو مخلوق کے مشابہ قرار دیتا ہے) اور یہ بلا خلاف کفر ہے۔

اللہ کیسے کلام فرماتا ہے؟

فیصلہ کن اور درست بات صحیح تر یہ ہے کہ ہم کہیں کہ قرآن اللہ کا کلام ہے، مخلوق نہیں ہے اور اس کے لیے نہ آواز ہے نہ حروف ہیں نہ کلمہ ہیں نہ آیت نہ سورت نہ تقطیع، نہ تفعیل، نہ

بدایت نہ نہایت یہ سب صفات قاری کی طرف لوٹتی ہیں۔ قاری کی قراءت حروف و آواز لفظ و آیت سورت و نظم و تقطیع حد اور نہایت و بدایت سے ہوتی ہے یہ سب کلام اللہ سے حکایت ہے اور کلام اللہ بغیر حکایت ہے۔

سوال: یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تخلیق عالم سے پہلے متکلم تھا یا نہیں؟

جواب: بعض نے کہا: متکلم تھا اور بعض نے کہا: نہ متکلم تھا نہ غیر متکلم۔ صحیح یہ ہے کہ جو ہم کہتے ہیں کہ زیادت و نقصان (کی و بیشی) خدا کی صفات میں جائز نہیں تو جب جائز ہے کہ فی الحال متکلم ہو تو ایسے جائز ہے کہ ازل میں متکلم ہو اس لیے کہ اس سے صفات باری میں کچھ فرق نہیں پڑتا کہ وہ ازل میں متکلم تھا یا نہیں تھا؟ اور قبل از تاثیر صفات کا اثبات کرنا جائز ہے۔

بیسواں قول

سات قراءتوں (قراءت سبعة) کا بیان

ساتوں قراءتوں سے نماز جائز ہے

امت کا اجماع ہے کہ اگر قرآن پاک کو ساتوں قراءتوں کے ساتھ نماز یا خارج میں نماز میں پڑھا جائے تو جائز ہے اس لیے کہ حضور انور ﷺ نے فرمایا کہ قرآن پاک سات قراءتوں میں نازل ہوا ہے سب قراءتیں شافی و کافی ہیں نیز ساتوں قراءتیں نقل متواتر کے ساتھ ہم تک پہنچی ہیں۔

قراءت سبعة میں سے کسی ایک کا انکار بھی کفر ہے

جو ان میں سے ایک قراءت کا انکار کرے کافر ہو جائے گا۔

سوال: اگر یہ سوال ہو کہ اللہ تعالیٰ نے سات قراءتوں سے تکلم فرمایا یا ایک قراءت سے کلام فرمایا؟

جواب: ہم کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کے ساتھ تکلم فرمایا بغیر قراءتوں کے اور اللہ تعالیٰ متکلم ہے نہ عربی نہ سریانی نہ لغتوں میں سے کسی لغت میں اس لیے کہ لغت حرف و

آواز کی محتاج ہوتی ہے اللہ تعالیٰ اس سے منزہ و پاک ہے اور اس کا کلام عربی فارسی، سریانی نہیں اور اس کا کلام واحد ہے لغات کا مقتضی اور موجب نہیں اور ایک کلام سے متکلم ہے اور کلام اس کی صفت ہے، لیکن جبریل علیہ السلام اللہ کے حکم سے اس کا کلام ہر پیغمبر کی زبان کے مطابق لے کر اترے تو قرآن سات قراءتوں میں نازل ہوا۔ اس پر دلیل یہ ہے (جو مروی ہے) کہ حضور کے سامنے ایک قراءت میں قرآن پڑھا گیا تو آپ نے فرمایا: اسی طرح نازل ہوا، پھر دوسرے آدمی نے دوسری قراءت سے پڑھا تو آپ ﷺ نے فرمایا: اسی طرح اترے۔

قراءت سب سے علاوہ کسی قراءت کا منکر کا فر نہیں ہوگا

اور سات قراءتوں کے نقل و عمل پر امت کا اجماع ہے۔ پس جو کچھ ہم نے کہا صحیح ثابت ہو گیا، جو روایتیں ان سات قراءتوں سے خارج ہیں، وہ بھی حضور سے مروی ہیں مگر تو اتر سے منقول نہیں تو وہ قراءتیں خبر واحد کا حکم رکھتی ہیں اور کلام اللہ خبر واحد سے ثابت نہیں ہوتا، جو ان کا انکار کرے کافر نہیں ہوگا۔

روایت معروف کا انکار کرنے والا فاسق ہے

اگر وہ روایت معروف ہے تو اس کا انکار کرنے سے فاسق ہو جائے گا اور اگر وہ قراءت شاذہ ہے تو اس کے انکار سے فاسق بھی ہوگا، ایسے ہی اگر قراءت معروف و مشہور ہے تو نماز میں پڑھنا جائز ہے اور قراءت شاذہ سے نماز پڑھی تو جائز نہیں، یہ قرآن کرام کے نزدیک ہے، لیکن فقہاء کرام کے نزدیک ہر لغت میں پڑھنا جائز ہے اور فارسی میں بھی بشرط اعجاز جائز ہے اور مسئلہ کا مقام اصول فقہ ہے۔

اکیسواں قول

قرآن کریم کے جمع کرنے کا بیان

جمع قرآن کا کام عہد صدیقی میں شروع ہو چکا تھا

اہل سنت و جماعت کہتے ہیں کہ جمع و ترتیب قرآن پاک میں وہ ہے کہ جس کو حضرت

عثمان غنی نے جمع کیا اور وہ قرآن کریم کے جمع کرنے میں امت کے امام و پیشوا ہیں۔
روافض کہتے ہیں: قرآن کریم کی جمع و ترتیب میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم امام
ہیں۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ خلیفہ اول حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قرآن کریم کی
جمع و ترتیب کا کام شروع کیا تھا مگر وہ جنگ و قتال میں دو سال مشغول رہنے کی وجہ سے تدوین
قرآن کے کام کو پایہ تکمیل تک نہ پہنچا سکے۔

عہد عثمانی میں قرآن کریم مدون شکل میں منظر عام پر آیا

پھر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کچھ جمع کیا لیکن وہ بھی عجم کے فتح کرنے میں
مشغول رہے پھر سیدنا عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تمام و کمال جمع کیا اور اس کو منظر عام پر
لائے اور آپ نے فرمایا: میں نے سوچا کہ تم قرآن پاک کے بارے میں اس قدر اختلاف کر
رہے ہو تو تمہارے بعد تو بہت زیادہ اختلاف ہوگا اس لیے میں نے یہ جمع کر دیا ہے چنانچہ
آپ نے اسے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور دیگر صحابہ کرام کے سامنے پیش کیا کسی نے
انکار نہ کیا نہ اعتراض اور متفق طور پر سب نے مان لیا صحابہ کرام کے بعد تمام مسلمانوں نے
اتفاق رائے کا اظہار کیا اور سب کا اجماع ہو گیا کہ یہی ہے جو حضور اقدس ﷺ پر نازل ہوا۔
اب جو اجماع کا انکار کرے وہ کافر ہے۔

مصحف علی پر صحابہ کا اجماع نہیں ہوا تھا

اور ایک روایت میں یہ بھی آتا ہے کہ حضور پر نور روح کائنات کے وصال کے بعد چند
روز حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم گھر میں بیٹھے رہے باہر تشریف نہیں لائے تو حضرت ابو بکر
رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دیکھا اور فرمایا کہ کیا وجہ ہے کہ آپ ہم سے جدا ہو کر گھر میں تنہا بیٹھ
گئے؟ فرمایا: میں بلا وجہ نہیں بیٹھا میں قرآن کریم کو اس ترتیب سے جمع کرتا رہا ہوں جس طرح
وہ نازل ہوا تھا ابو بکر نے فرمایا: اس کو منظر عام پر لاؤ ظاہر کرو۔ حضرت علی نے فرمایا کہ وہ
اظہار کے لائق نہیں میں نے اپنے لیے جمع کیا ہے تو ثابت ہوا کہ مصحف علی پر صحابہ کرام کا
اجماع و اتفاق نہیں ہوا اور مسلمان اس پر جمع نہ ہوئے تو ثابت ہوا کہ مولیٰ علی شیر خدا رضی اللہ
تعالیٰ عنہ قرآن کریم کی جمع و ترتیب میں امام نہیں حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ امام
ہیں۔ واللہ اعلم

ساتواں باب

معرفت اور ایمان کا بیان

اس میں گیارہ قول ہیں۔

پہلا قول

اللہ کے حقیقی عارفوں کا بیان

مہتدی ابوشکور سالمی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ معلوم ہونا چاہیے کہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کے عارفین وہ ہیں جو بغیر ادراک و احاطہ کے اس کی معرفت میں کامل ہیں اور اس معرفت سے ان کی مراد یہ ہے کہ ذات کو پہچانا اس لیے کہ معرفت کی دو قسمیں ہیں۔

معرفت کی دو قسمیں ہیں

(۱) معرفت ذات (۲) معرفت صفات

ہمارا اس پر اجماع ہے کہ ذات باری تعالیٰ کی معرفت اور پہچان میں تحیر اور نقصان جائز اور ممکن نہیں ہے۔

معرفت صفات کی تین قسمیں ہیں

ایک وہ صفات ہیں جو ربوبیت کے مخصوص اوصاف سے تعلق رکھتی ہیں کہ ان میں کسی حال میں تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا اور ان صفات کے بغیر ذات "الہ" ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتی تو ان صفات کی معرفت میں تحیر و نقصان جائز نہیں اور یہ وہ صفات ہیں جو نص سے ثابت ہوئی ہیں اور یقین میں خطا کا وہم و شبہ نہیں ہو سکتا اس لیے ان صفات میں تحیر و نقصان جائز نہیں کیونکہ نص قطعی و یقینی علم کا موجب ہوتی ہے اور وہ صفات جو نص سے یا خبر سے

ثابت ہیں لیکن نص میں خطا کا وہم نہیں اور نہ شبہ کو واجب کرتا ہے۔ عام فقہاء نے فرمایا کہ اس میں تحیر جائز نہیں اور اللہ کے کلام پر اور جو اس نے ارادہ فرمایا اور ایمان لانا واجب ہے اور یہ تحیر اور شک کو واجب نہیں کرتا یہی اصح ہے اور بعض نے کہا: اس میں تحیر و شک جائز ہے۔

صفات میں تحیر تو حید ہے اور ذات میں تحیر کفر ہے

بعض متقدمین سے مروی ہے کہ ذات میں تحیر کفر ہے اس سے ان کی مراد اثبات ذات ہے اس لیے کہ جو اثبات ذات میں تحیر و شک کرے وہ کافر ہے اور ان کا یہ کہنا کہ صفات میں تحیر و شک تو حید ہے یہ مطلقاً نہیں فرمایا بلکہ اسی تفصیل کے مطابق جو ہم نے ذکر کی۔

اشعریہ کہتے ہیں کہ معرفت کی حقیقت یہی ہے کہ معرفت میں حیرت و عجز ہو اس لیے کہ معرفت میں درک و احاطہ نہیں ہو سکتا۔

مبتدعین کا نظریہ

بعض مبتدعین نے کہا اور وہ مصور یہ ہیں کہ جب تک کوئی صورت دل میں متصور نہ ہو معرفت صحیح نہیں تعبد و عبادت جب صحیح ہو سکتی ہے کہ معبود کی صورت سامنے ہو اور یہ کفر ہے۔ محمد ابن حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ اس میں کوئی فرق نہیں کہ بظاہر صورت بنا کر عبادت کرے یا باطن میں فرض کر کے عبادت کرے۔

پھر صورت اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے علم سے معلوم ہے اور ہماری عقل سے معقول نہیں کیونکہ عقل وہم و خیال اور صورت کو واجب کرتی ہے یہاں تک کہ اس پر واقف ہو اور اللہ تعالیٰ وہم و صورت و خیال کا خالق ہے اس معنی کے لحاظ سے حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "تفکروا فی الصفات ولا تفکروا فی الذات" صفات میں تفکر کرو ذات میں تفکر نہ کرو اس لیے کہ ذات میں تفکر ماہیت و کیفیت کو واجب کرتا ہے اور جو خدا کو ماہیت اور کیفیت کے ساتھ مانے وہ کافر ہے۔

خدا کیا ہے؟ اور کیسا ہے؟

پھر اگر کہے کہ وہ کیا ہے اور کیسا ہے؟ تو ہم کہیں گے: سوال ہی محال ہے اور اس کا اعتقاد کفر ہے اس لیے کہ خدا وہ ہے جو ماہیت اور کیفیت سے پاک و منزہ ہے۔

معرفت کسے کہتے ہیں یا وہ کیا ہے؟

اگر سوال کیا جائے کہ معرفت کیا ہے؟ تو ہم کہیں گے کہ حادث و قدیم میں تمیز کرنا (اللہ (خالق) مخلوق کے درمیان فرق جاننا)۔

معرفت کا ایک اور مطلب

بعض کہتے ہیں کہ صانع کی معرفت اس وقت صحیح ہے کہ اپنے نفس و روح کو پہچانے اور جو شخص اپنی روح و نفس کو نہ پہچانے اس پر صانع کا پہچانا واجب نہیں اور یہ کفر ہے۔

معرفت کا تیسرا معنی

اور بعض نے کہا کہ جو چیز مدرک و محاط نہ ہو اس کا پہچانا صحیح نہیں اور یہ بھی کفر ہے (اس لیے کہ اللہ تعالیٰ مدرک و محاط نہیں اور پہچانا فرض ہے) اس لیے کہ درک و احاطہ فقط محدود و متغیر اور متکون جوہر میں متصور ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ ان امور سے منزہ و پاک ہے اس لیے ہم کہتے ہیں کہ یہ کہنا جائز نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی کیفیت معلوم نہیں یا کہا جائے کہ اس کی ماہیت معلوم نہیں کیونکہ یہ کہنا بھی ماہیت و کیفیت کے جواز پر دلالت کرتا ہے اور یہ کفر ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات بے کم و کیف ہے

اسی طرح یہ بھی نہیں کہنا چاہیے کہ اس کی سمع کی کیفیت اور بصر کی کیفیت معلوم نہیں کہ اس میں بھی وہی خرابی ہے جو ہم نے بیان کی۔ صحیح یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے کیفیت ماہیت اور کمیت نہیں اور اسی طرح اس کی صفات کو سمجھنا چاہیے کہ ان کے لیے کیفیت نہیں۔

اعضاء کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف بطور نفی بھی درست نہیں

ہمارے بعض مشائخ فرماتے ہیں کہ فارسی میں یہ کہنا جائز نہیں کہ "خدا را دست نیست" (خدا کے ہاتھ نہیں) یا "چشم نیست" یا "پانے نیست" یا "زبان نیست" اور اس کی مانند (اس کی آنکھ پاؤں زبان وغیرہ نہیں) اس لیے کہ الفاظ موہم خطاء ہیں کیونکہ عرف و عادت میں جو اندھا ہوتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ اس کی آنکھ نہیں اور ایسے اشلن (جس کا ہاتھ شل ہو گیا ہو) کو کہا جاتا ہے کہ اس کا ہاتھ نہیں اور پانچ کو کہتے ہیں کہ اس کا

پاؤں نہیں۔

صحیح یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ بغیر آلہ کے سمیع ہے اور بغیر آلہ کے بصیر ہے اور تمام صفات کو اسی طرح سمجھنا چاہیے کہ وہ ماہیت و کمیت اور کیف سے پاک و منزہ ہے تو اول صفات کو ثابت کرنے پھر تشبیہ کی نفی کرے۔

اللہ تعالیٰ کو ساقی اور مہمان نواز نہیں کہہ سکتے

ایسے ہی یہ کہنا جائز نہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمارا ساقی ہے اور مہمان نواز ہے کیونکہ یہ مشابہت و مشاکلت کا وہم پیدا کرتا ہے کیونکہ تمام مخلوق اللہ کی مہمان ہے اور اللہ ان کا رازق ہے اور اس میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا کہ اپنے بندوں کو دنیا میں رزق دے اور انہیں کھلائے پلائے یا جنت میں رزق دے اور کھلائے پلائے یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "وَهُوَ يُطْعِمُهُمْ وَلَا يُطْعَمُ" (الانعام: ۱۳) اور وہ کھانا کھلاتا ہے اور اسے کھلایا نہیں جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کی طرف سے خبر دی اور فرمایا: "هُوَ يُطْعِمُنِي وَيَسْقِينِي" (الشعراء: ۷۹) کہ میرا رب مجھ کو کھلاتا اور پلاتا ہے اور فرمایا: "وَسَقِيهِمْ رَبُّهُمْ" (الدھر: ۲۱) اور ان کے رب نے ان کو پلایا دنیا اور جنت میں کھانے پلانے میں فرق یہ ہے کہ دنیا میں آدمیوں کے واسطے سے اور یہ نظر آتا ہے اور جنت میں واسطے سے ہوگا مگر وہ نظر نہیں آتا ہے اور بسا اوقات بلا واسطہ کھلانا پلانا ہوتا ہے کیونکہ دونوں حال میں اسقاء و اطعام (کھانا پلانا) من جانب اللہ ہی ہوتا ہے۔

دوسرا قول

استدلال اور تقلید کا بیان

معتزلہ کہتے ہیں کہ ہدایت و فضل اللہ کی جانب سے ہے وہ آیات و نشانات ہیں جو اس کی صفات و وحدانیت پر دلالت کرتے ہیں اور یہی اس کا فضل و ہدایت ہے (اس کے سوا اور کوئی اس کا فضل و ہدایت نہیں) کہ رہنمائی مہربانی اور انشراح صدر ہو۔

اہل سنت و جماعت

(اہل سنت و جماعت کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے لیے ہدایت اور لطف اور عارفین کے لیے انشراح صدر ہے تعریف کے ساتھ) بعض متصوفین کہتے ہیں: معرفت صانع کے لیے استدلال کی کوئی راہ نہیں اس لیے کہ اشیاء صانع سے پہچانی جاتی ہیں اور یہ ناممکن ہے کہ اشیاء سے صانع پہچانا جائے اور انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ عارفوں کے دلوں کو اور ان کے اسرار کو جذب کرتا ہے اور ان کو اپنی معرفت کی طرف بغیر استدلال کے ہدایت کرتا ہے۔

رب کی پہچان کیسے ہوتی ہے؟ اس سوال کے جواب میں مشاہیر علماء کرام اور مشائخ کے ارشادات ہیں۔

حضرت شبلی رحمہ اللہ تعالیٰ سے پوچھا گیا کہ آپ نے اپنے رب کو کس چیز سے پہچانا؟ تو انہوں نے فرمایا کہ ”عرفت اللہ باللہ“ میں نے اللہ کو اللہ سے پہچانا اگر اللہ نہ ہوتا تو میں اس کو نہ پہچانتا۔

کیا معرفت الہی استدلال سے حاصل ہوتی ہے؟

اس کا جواب ”ہاں“ میں ہے اور معرفت الہی استدلال سے حاصل ہوتی ہے اس پر دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: ”انا ہدیناہ السبیل اما شاکرا واما کفورا“ (الذکر: ۳) یقیناً ہم نے اسے راستہ دکھا دیا (اب) وہ شکر گزار ہو یا ناشکر۔ نیز اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ”وہدیناہ النجدین (الی السبیلین)“ (البلد: ۱۰) اور ہم نے اسے (نیکی اور بدی کے) دونوں واضح راستے دکھا دیئے۔

حضرت سیدنا امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا کہ آپ نے اپنے رب کو کس طرح پہچانا؟ فرمایا کہ ماں کے پیٹ سے خوب صورت بچہ کے پیدا ہونے سے اس لیے کہ نہ یہ ستارہ سے ہے نہ طبع سے بلکہ صانع جل شانہ کی تقدیر سے ہے۔

حضرت علی شیر خدارضی اللہ تعالیٰ عنہ سے سوال کیا گیا کہ آپ نے اپنے رب کو کیسے پہچانا؟ فرمایا: ”بفسخ العزائم ونقض الہمم“ کہ ہمارے پختہ ارادوں اور ہمتوں کی شکست و ریخت سے (یعنی ”تدبیر کند بندہ تقدیر زند خندہ“ سے)۔

حضرت حاتم الاصبم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے دریافت کیا: تم نے اپنے رب کو کس طرح

پہچانا؟ فرمایا: ہر شے میں اس کا جلوہ دیکھ کر۔

ان اقوال سے ثابت ہوا کہ آیاتِ دالہ سے استدلال حصولِ معرفت کے لیے سبب ہے اس کی رہنمائی اور فضل و کرم سے اور یہی صحیح تر ہے۔

تقلیدِ استدلال کی ضد ہے چنانچہ اب عنوان کی اس دوسری جز (تقلید) سے بحث ہوتی

ہے۔

تقلید کسے کہتے ہیں؟

تقلید کی تعریف یہ ہے کہ بلا دلیل غیر کے قول کو مان لینا۔

بعض حضرات کہتے ہیں: بلا دلیل کسی کے قول و فعل کی متابعت کرنا تقلید کہلاتا ہے۔

سوال: کیا معرفت و ایمان میں تقلید کرنے والا مؤمن ہے یا نہیں؟

جواب: معتزلہ اور اشعریہ کہتے ہیں کہ مقلد (معرفت و ایمان میں) مؤمن نہیں ہے۔

فرقہ کرامیہ کی ایک شاخ محققہ نے کہا کہ مقلد مؤمن ہے۔

اہل سنت و جماعت فرماتے ہیں کہ مقلد اگر تصدیق کرتا ہے تو مؤمن ہے۔

مہدی ابوشکور سالمی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے بلخ میں قاضی امام شیخ الاسلام

امام الائمہ ابوسعید خلیل ابن احمد ابن اسمعیل سجری کا قلمی فتویٰ دیکھا جو انہوں نے کسی کے اس

سوال کے جواب میں لکھا تھا کہ مقلد فی الایمان مؤمن ہے یا نہیں؟ فرمایا: نرا مقلد مؤمن نہیں

اس لیے کہ معرفتِ صانع میں اس کو تقلید کی کیا ضرورت ہے؟ جب کہ آیات و علامات اور

آثارِ صانع کے وجود پر شاہد عدل ہیں جیسے زمین و آسمان، سورج، چاند رات، دن اور تمام اشیاء

میں اس کی تاثیر ظاہر ہے یہ صانع کے اثبات اور اس کی وحدانیت پر دلیل ہے۔

ایمان میں تقلید جائز نہیں

معتزلہ کہتے ہیں کہ ایمان میں تقلید جائز نہیں اور مقلد مؤمن نہیں۔

معتزلہ تقلید کس کو کہتے ہیں؟ معتزلہ کے ہاں تقلید کا معنی یہ ہے کہ ہر مسئلہ کہ جس پر

ایمان لانا واجب ہے احکام و شرائع اور معرفتِ صانع اور معرفتِ رسول اس کے لیے واجب و

ضروری ہے کہ دلیل و حجت سے مانے بغیر شبہ کے بیان کرے تاکہ تقلید سے نکل جائے ان

کے مذہب میں ان کے اصول ہیں اور پانچ مسائل ہیں ان کا نام اصولِ خمس ہے جو ان مسائل

کو نہ جانے ان کے نزدیک وہ مسلمان نہیں۔

(۱) مسئلہ توحید (۲) مسئلہ عدل (۳) مسئلہ بین (۴) مسئلہ وعد (۵) مسئلہ وعید

مسئلہ توحید: مسئلہ توحید یہ ہے کہ انہوں نے کہا: قرآن مخلوق ہے اور اللہ تعالیٰ کے لیے صفات نہیں اور صفات غیر اللہ ہے اور غیر اللہ قدیم نہیں تو صفات مخلوق ہوں گی۔

مسئلہ عدل: اور مسئلہ عدل میں انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نہ شر کو پیدا کرتا ہے نہ شر کا ارادہ کرتا ہے اور نہ شر کو چاہتا ہے۔ اس لیے کہ اگر وہ شر کو پسند کرے اور اس کا ارادہ کرے اور چاہے اور پھر فاعل شر (برائی کرنے والے کو) عذاب دے تو یہ عدل نہیں۔

مسئلہ بین: مسئلہ بین یہ ہے کہ مؤمن جب کبیرہ گناہ کا ارتکاب کرتا ہے تو ایمان سے خارج ہو جاتا ہے اور کفر میں داخل نہیں ہوتا تو وہ کفر و اسلام کے بین یعنی درمیان ہوگا۔

مسئلہ وعد و وعید: اور مسئلہ وعد و وعید یہ ہے کہ ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ پر واجب ہے کہ ثواب و عقاب تو جب ثواب کا یا عقاب کا وعدہ کیا تو جائز نہیں کہ وہ ثواب و عقاب کو روکے اور اگر ثواب سے روکا یا عقاب سے باز رہا تو یہ ان کے نزدیک عدل نہیں ہے۔ یہ اصول خمس (پانچ اصول) یعنی معتزلہ کا پانچ نکاتی پروگرام ہے۔ تو جو ان پانچوں اصولوں کو نہ مانے اور معتقد نہ ہو ان کے نزدیک وہ مؤمن نہیں تو مقلد ہو جائے گا اور اس معنی کے لحاظ سے اہل سنت و جماعت نے کہا کہ مقلد مؤمن ہے اس لیے کہ ہر شخص کے لیے ناممکن ہے کہ وہ تقلید سے خارج ہو جب کہ یہی تقلید ہے۔

اشعر یہ کہتے ہیں کہ بندہ جب اللہ تعالیٰ کو کج معنی صفاتہ دلیل و حجت کے ساتھ جانے اور بیان کرنے پر قادر ہو تو حد تقلید سے نکل جاتا ہے۔

کرامیہ کہتے ہیں: جس نے ”لا الہ الا اللہ“ (یعنی کلمہ طیبہ) پڑھا اور اللہ کو نہیں پہچانا اور صنایع و مصنوع میں فرق نہ جانا اور اس کا معتقد بھی نہ ہو تو بھی مؤمن ہے اور یہ ہی تقلید محض ہے۔ اسی وجہ سے ہمارے فقہائے اہل سنت و جماعت فرماتے ہیں کہ اکیلا قول ہی (یعنی محض کہنا) ایمان نہیں اور مقلد جب تصدیق کرتا ہے تو مؤمن ہے اور اگر تصدیق نہیں کرتا تو مؤمن نہیں۔

اہل سنت و جماعت کی دلیل کہ مقلد محض مؤمن نہیں یہ ہے کہ صحت ایمان کے لیے

تصدیق شرط ہے اور تصدیق بغیر معرفت کے نہیں ہوتی اور معرفت بغیر استدلال کے نہیں ہوتی اور یہی معنی ہیں اس جواب کے کہ جس کی طرف شیخ امام خلیل ابن احمد بخاری نے اشارہ کیا تو جو شخص جانتا ہے کہ میرے لیے صانع اور تمام عالم کے لیے صانع ہے تو وہ حد تقلید سے نکل گیا اور صورت مسئلہ یہ ہوگی کہ جب تجھ سے کوئی سوال کر لے کہ تجھ کو کس نے پیدا کیا؟ اور تو جواب میں کہے: اللہ نے یا کہے آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے نے تو وہ مقلد محض نہیں اور اس کا ایمان صحیح ہے اور اگر کہے کہ میں نہیں جانتا اور باوجود اس کے کہ کلمہ پڑھتا ہے تو اہل سنت و جماعت کے نزدیک مؤمن نہیں اور کرامیہ نے کہا کہ وہ مؤمن ہے اور ایک مسئلہ امام محمد ابن حسن رضی اللہ عنہ نے ”جامع کبیر“ میں فرمایا جو ہمارے قول کی صحت پر دلالت کرتا ہے اور وہ مسئلہ یہ ہے کہ عورت جب صفت ایمان و اسلام کو نہ جانے تو میاں بیوی میں تفریق کر دی جائے گی۔

اس کا تفصیلی بیان یہ ہے کہ جب اس کے سامنے ایمان و اسلام اور دین کی صفت بیان کی جائے تو اگر کہے: میں ایمان لائی اور تصدیق کرتی ہوں تو حد تقلید سے نہیں نکلی اور نکاح اس کا جائز ہے اور اگر کہتی ہے کہ میں نہیں جانتی پہچانتی تو اس کا نکاح جائز نہیں۔ بعض فقہاء کہتے ہیں کہ اس کے سامنے ایمان کی صفت بیان کی جائے پھر کبھی درست بیان کرے اور کبھی خطا تو اگر وہ خطا و صواب کو جانتی ہے تو اس کا نکاح جائز ہے اور اگر خطا و صواب کو نہیں پہچانتی تو نکاح جائز نہیں۔

بعض فقہاء فرماتے ہیں: تقلید صحیح جو کہ اہل سنت کے نزدیک ایمان ہے وہ یہ ہے کہ جس کا لوگ کلمہ شہادت اور اذان کے ساتھ تلفظ کرتے ہیں اور اس کی تفسیر نہیں جانتے اور اللہ تعالیٰ کو خیر کے ساتھ پہچانتے ہیں اور تقلید کے ساتھ من حیث الصنع والتاثر (تاثر و صنع کی حیثیت سے) اور اسلام کا صحیح اعتقاد کرتے ہیں اور جانتے ہیں کہ اسلام خیر الادیان ہے لیکن زبان سے اس کا وصف نہیں کر سکتے تو وہ اہل سنت و جماعت کے نزدیک مؤمن ہیں۔

روایت

ایک روایت ہے کہ حضرت حماد ابن ابی حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے اس مسئلہ کو اپنے والد سے دریافت کیا تو امام ابوحنیفہ نے فرمایا کہ وہ اس کے فائدہ کو جانتا ہے اور نام سے جاہل

ہے عالم ہے اس کے نفع کا اور جاہل ہے اس کے نام سے یہ ایسے ہے جیسے دو پیالے ہیں ایک میں شہد ہو اور دوسرے میں زہر اور ایک شخص ہے کہ غسل و سم (شہد اور زہر) کے ناموں سے واقف نہیں لیکن یہ جانتا ہے کہ شہد زہر سے اچھا اور بہتر ہے تو نام سے جاہل ہونا اس کو نقصان نہیں دیتا اور اگر کسی شخص کے سامنے ایمان اور شرائط بیان کیے جائیں تو وہ سن کر اعتراف کرے تو مؤمن ہوگا اور اگر ایمان و اسلام و دین اور اس کے شرائط سننے کے بعد کہے کہ میں نہیں جانتا تو مؤمن نہ ہوگا۔

تیسرا قول رکن ایمان کا بیان

معلوم ہونا چاہیے کہ لوگوں نے ایمان کے رکن اس کی شرائط وصف اور اس کے حکم میں کلام کیا ہے۔

جمہور ابن صفوان کہتا ہے کہ ایمان کا رکن معرفت بالقلب ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں۔
حشویہ اور محققہ کہتے ہیں کہ ایمان کا رکن صرف اقرار ہے بغیر اعتقاد کے۔
بعض کرامیہ کہتے ہیں کہ ایمان کا رکن زبان سے اقرار دل سے اعتقاد کرنا (یعنی ماننا) اور عمل بالارکان یعنی اعضاء سے عمل کرنا ہے۔ امام شافعی علیہ الرحمۃ کا بھی یہی مسلک ہے۔

معتزلہ کہتے ہیں کہ ایمان کا رکن زبان کے ساتھ اقرار کرنا دل سے اعتقاد رکھنا اور اعضاء سے عمل کرنا اور کبار سے بچنا ہے۔

حروریہ اور خارجیوں کا کہنا ہے کہ ایمان کا رکن اقرار لسانی، تصدیق قلبی، عمل بالارکان اور صفائے کبار سے اجتناب کرنا ہے اور صحیح تر یہی ہے جو ہم کہتے ہیں کہ ایمان کا رکن اقرار باللسان اور تصدیق بالقلب ہے یہ قول امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کا ہے۔

مؤمن کے تین درجے ہیں

سیدنا امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ ایمان کے تین درجے ہیں:

(۱) ایک وہ جو اللہ کے نزدیک مؤمن ہے اور لوگوں کے نزدیک کافر ہے، یہ وہ ہے جو دل سے اللہ تعالیٰ کو پہچانتا ہے جیسا کہ اس کو پہچاننے کا حق ہے اور توحید کا معتقد ہے، دین کا اعتقاد کرتا ہے اور کفر سے بیزار ہے۔ لیکن اس سے اقرار ظاہر نہیں ہوا یا وہ جانتا نہیں کہ قرار کیسے کرتے ہیں (یعنی اقرار کی کیفیت سے ناواقف و انجام ہے) اور تقیہ کفر کو ظاہر کرتا ہے تو یہ اللہ کے ہاں مؤمن ہے اور عند الناس کافر ہے۔

(۲) دوسرا مرتبہ یہ ہے کہ اللہ کے نزدیک کافر ہے اور لوگوں کے نزدیک مؤمن اور یہ وہ ہے جو لوگوں کے سامنے اقرار کرتا ہے، لیکن دل سے تصدیق نہیں کرتا تو بظاہر اس کو مسلمان کہا جائے گا اور اللہ کے نزدیک کافر ہوگا۔

(۳) تیسرا درجہ یہ ہے کہ زبان سے اقرار کرے اور دل سے تصدیق کرے تو یہ اور فرشتوں کے نزدیک اور انسانوں کے نزدیک مؤمن ہے۔ لیکن جس نے کہا کہ ایمان صرف معرفت بالقلب ہے بغیر اقرار کے اور کہا کہ جب اپنے رب کو جانتا ہے تو اس کو معصیت مضر نہیں، اگرچہ رب کو گالی دے جیسے دل کی معرفت کے بغیر اقرار فائدہ نہیں دیتا تو ایسے ہی معرفت کے ساتھ انکار نقصان نہیں دیتا۔

ہم نے جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ نے معرفت کے ساتھ اقرار کو شرط قرار دیا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "مِمَّا عَرَفُوا مِنَ الْحَقِّ" (المائدہ: ۸۳) اس لیے کہ انہوں نے حق کو پہچان لیا۔ نیز فرمایا: "فَأَتَابَهُمُ اللَّهُ بِمَا قَالُوا" (المائدہ: ۸۵) تو اللہ تعالیٰ نے ان کے اس کہنے کے بدلے عطا کیے اور نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ حضور نے فرمایا کہ میں مامور ہوں کہ کافروں سے جہاد کروں یہاں تک کہ کہیں "لا الہ الا اللہ"۔ نیز فرمایا: جنت کی کنجی "لا الہ الا اللہ" ہے اور حضور اقدس ﷺ کا یہ بھی ارشاد ہے کہ جس نے خالصاً مخلصاً "لا الہ الا اللہ" کہا جنت میں داخل ہوگا، اعتقاد کے ساتھ ساتھ اقرار کو بھی شرط قرار دیا، اس سے ثابت ہوا کہ نری معرفت کا نام ایمان نہیں ہے اور معنی اس میں یہ ہے کہ ابلیس اللہ تعالیٰ کو خوب جانتا تھا لیکن جب اس کی زبان سے کفر صادر ہوا تو کافر ہو گیا۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ أَبْنَاءَهُمْ" (البقرہ: ۱۳۶) جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی وہ اس (نبی) کو ایسا پہچانتے ہیں جیسے وہ اپنے

بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔ پھر معرفت مع انکار یا بغیر انکار اس کو دنیا و آخرت میں نفع نہیں دے گی تو ثابت ہوا کہ خالی معرفت ایمان نہیں اور اللہ نے فرمایا: ”يَكْتُمُونَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ“ (البقرہ: ۱۴۶) کہ وہ حق کو چھپاتے ہیں حالانکہ وہ جانتے ہیں تو وہی صحیح ہے جو ہم نے کہا ہے۔ اب رہے وہ لوگ کہ جو کہتے ہیں: خالی اقرار ہی ایمان ہے تو یہ بھی مفسی الی الکفر ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے منافقین کے ایمان باطل ہونے کی شہادت دی جہاں فرمایا کہ ”وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنَافِقِيْنَ لَكَٰذِبُوْنَ“ (النفاقون: ۱) اور اللہ تعالیٰ گواہی دیتا ہے کہ منافقین ضرور جھوٹے ہیں اور جو محض اقرار کو ایمان کہتا ہے اس نے منافقین کے ایمان کی صحت کا حکم کیا اور یہ عقیدہ کفر ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اقرار کے ساتھ اعتقاد کو شرط قرار دیا ہے ان دلائل مذکور سے یہی ثابت ہوتا ہے۔

اعتراض: اگر کوئی کہے کہ منافقین کا ایمان تو ایمان ہے ہی نہیں لیکن غیر منافقین محض اقرار سے مؤمن ہو جائیں گے اس لیے کہ وہ کافر نہیں لیکن مخطی و متبدع ہو گا اس لیے کہ اس نے نص و خبر کی مخالفت کی اور اگر وہ کہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ احکام دنیا میں اس کا ایمان صحیح ہے کہ اس کو قتل نہیں کیا جائے گا اور اس پر مسلمانوں کے احکام جاری ہوں گے اور احکام آخرت میں اس کا ایمان صحیح نہیں تو یہ صحیح ہے اور ہم بھی یہی کہتے ہیں۔

اور لیکن جس نے یہ کہا کہ ایمان نام ہے اقرار باللسان تصدیق بالبحان عمل بالارکان کا انہوں نے اس آیت سے احتجاج کیا: ”وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ حُنَفَاءً وَيُقِيمُوا الصَّلَاةَ وَيُؤْتُوا الزَّكَاةَ وَذَلِكَ دِينُ الْقِيَمَةِ“ (البقرہ: ۵) اور انہیں یہی حکم دیا گیا کہ وہ اللہ کی عبادت کریں صرف اسی کے لیے اپنے دین کو خالص کر کے بالکل اسی کی طرف متوجہ ہو کر اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں اور یہ نہایت سیدھا دین ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ذکر کیا ہے اخلاص کا نماز کا زکوٰۃ کا۔ پھر فرمایا: ”ذَلِكَ دِينُ الْقِيَمَةِ“ تو دین نام رکھا شرائع کے پائے جانے کے بعد۔ تو ثابت ہوا عمل بالارکان بھی جزو ایمان ہے۔ اور حضرت امام جعفر ابن محمد صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ عن ابیہ عن جده کہ نبی کریم سے دریافت کیا حضور نے فرمایا: اقرار باللسان تصدیق بالبحان اور عمل

بالارکان اور اس مسئلہ میں نص ہے۔

آیت کا صحیح مفہوم

اور آپ کا جواب یہ ہے کہ ”لعبدوا اللہ“ کا معنی ہے: ”یوحدوا اللہ“ یعنی اللہ تعالیٰ کو ایک جانیں۔

اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ قرآن پاک میں جہاں عبادت کا نام آیا ہے اس سے مراد توحید ہے اور اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا نام مسلمان رکھا، ابھی نماز کا حکم بھی نہیں آیا تھا۔ پھر فرمایا کہ ”حَنَفَاءَ وَيُقِيمُوا الصَّلَاةَ وَيُؤْتُوا الزَّكَاةَ“ خبر دی اس بات کی کہ فعل مَوْحِدِينَ کا ہے، ہم بھی یہی کہتے ہیں اور ضمیر ”ذَلِكُ“ ”دِينُ الْقِيَمَةِ“ (البینہ: ۵) ایک طرف کے ہو کر اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں، میں ”لعبدوا اللہ“ کی طرف لوٹتی ہے۔ اس پر دلیل یہ ہے کہ اگر مراد شرائع و احکام ہوتے تو ”ذَلِكُ“ کی جگہ ”بَلَدُ دِينِ الْقِيَمَةِ“ ہوتا اور اس پر دلیل یہ ہے کہ قصہ یوسف میں ہے: ”إِنَّ الْحُكْمَ إِلَّا لِلَّهِ أَمَرَ أَنْ لَا تَعْبُدُوا إِلَّا آيَاهُ ذَلِكَ الدِّينُ الْقِيَمُ“ (یوسف: ۳۰) حاکمیت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے اس نے فرمایا کہ اس کے علاوہ کسی کی بندگی نہ کرو یہی سیدھا دین ہے۔ معنی اس میں یہ ہیں کہ ہم کہیں کہ عمل اگر ایمان میں سے ہے تو واجب ہوتا کہ انسان خراسان میں ہوتا اور ایمان مکہ میں، مدینہ و عراق میں اس لیے کہ حج کرے مکہ میں اور نماز پڑھے مدینہ و عراق میں اور رباطات (جہاد کے گھوڑے) و مساجد قناطیر (پلیں) مختلف شہروں میں اور محال ہے کہ ایمان ایک جگہ ہو اور مؤمن دوسری جگہ اور اس حدیث کا جواب جو جعفر صادق سے روایت ہے، ہم نے کہا: العمل بالارکان سے مراد شرائع ایمان ہے اور اس سے مراد شرائط ایمان ہیں اور اگر عمل شرائط ایمان سے ہوتا تو بغیر عمل کے ایمان صحیح نہ ہوتا اور اس پر ہمارا اجماع ہے کہ بغیر عمل کے ایمان صحیح ہے تو اس سے ثابت ہوا کہ شرائع سے ہے شرائط سے نہیں اور تحقیق اس کی اللہ تعالیٰ کا قول ہے کہ ”قُلْ لِعِبَادِيَ الَّذِينَ آمَنُوا يُقِيمُوا الصَّلَاةَ“ (ابراہیم: ۳۱) میرے مؤمن بندوں سے فرمادیں کہ وہ نماز قائم رکھیں۔ نماز سے پہلے مؤمن نام رکھا۔ صحیح ہوا جو ہم نے کہا کہ عمل ایمان نہیں اور لیکن جس نے کہا کہ ایمان اقرار باللسان اور تصدیق بالبحان اور عمل بالجوارح اور تجانب عن الکبائر ہے اور کہا کہ جو کبیرہ کا

مرتب ہوا ایمان سے خارج ہو گیا اس سے حجت پکڑتے ہیں: ”وَإِنْ أَطَعْتُمُوهُمْ إِنَّكُمْ لَمُشْرِكُونَ“ (الانعام: ۱۲۱) اور اگر تم نے ان کی پیروی کی تو تم مشرک ہو۔

اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ”الزَّانِي لَا يَنْكِحُ إِلَّا زَانِيَةً أَوْ مُشْرِكَةً“ (النور: ۳) اور زانی صرف زانیہ عورت یا مشرکہ سے نکاح کرے اور نبی کریم سے مروی ہے کہ فرمایا: زانی جس وقت زنا کرتا ہے تو وہ مؤمن نہیں ہوتا اور چور جس وقت چوری کرتا ہے وہ مؤمن نہیں ہوتا اور شرابی جس وقت شراب پیتا ہے وہ مؤمن نہیں ہوتا نیز حضور اقدس ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے قصد نماز کو چھوڑا وہ کافر ہے۔

ایک سجدہ نہ کرنے سے شیطان کا کافر ہونا تو جو پوری نماز ترک کر دیتے ہیں؟

نیز حضور نے فرمایا: عبد اور کفر کے درمیان نہیں مگر ترکِ صلوٰۃ اور نیز اس لیے بھی کہ ایک سجدہ کے ترک سے ابلیس کافر ہو گیا تو جس شخص نے تمام نمازوں کو ترک کر دیا تو وہ بہ طریقِ اولیٰ کافر ہو گیا۔

جواب یہ ہے کہ ”إِنْ أَطَعْتُمُوهُمْ إِنَّكُمْ لَمُشْرِكُونَ“ کہ یہاں اطاعت سے مراد اطاعت فی الشریک ہے کیونکہ وہ کہتے تھے کہ ہم میتہ (مردار) کھاتے ہیں یہ اللہ کا ذبیحہ ہے تو یہ زیادہ حلال اور زیادہ طیب و ستھرا ہوگا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ اگر تم نے شرکوں کی اطاعت کی تو تم بھی اس عقیدہ سے مشرک ہو جاؤ گے اور جواب اس آیت کا کہ ”الزَّانِي لَا يَنْكِحُ إِلَّا زَانِيَةً أَوْ مُشْرِكَةً“ ہم نے کہا: سعید بن مسیب نے فرمایا کہ یہ حکم ابتداء اسلام میں تھا پھر ”فَانكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ“ (النساء: ۳) اپنی پسند کی عورتوں سے نکاح کرؤ سے منسوخ ہو گیا۔

اور لفظ ثانی یعنی ”او مشرکہ“ لفظا خبر ہے اور مراد اس سے نہیں ہے اور ”لا یزنی الزانی حین یزنی و هو مؤمن“ کا جواب یہ ہے کہ ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ زانی زنا کرنے کے وقت امن من عذاب النار نہیں رہتا یعنی وہ مؤمن (یعنی امن والا نہیں ہے عذاب سے)۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ یہ منسوخ ہے بدلیل اس کے جو حضور سے مروی ہے کہ ابو درداء رضی اللہ عنہ سے کہا کہ جاؤ اور ان لوگوں کو کہہ دو کہ ”من قال لا اله الا الله دخل الجنة“ کہ جس نے ”لا اله الا الله“ کہا جنت میں داخل ہوگا۔ حضرت ابو درداء نے

کہا: ”وان زنی وان سرق“ اگرچہ وہ زنا اور چوری کرے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ”وان زنی وان سرق“۔ تین مرتبہ حضور ﷺ نے اسی طرح فرمایا اور حضور ﷺ کا یہ فرمانا کہ جس نے قصداً نماز کو ترک کیا وہ کافر ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ کفرانِ نعمت کیا نہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کیا اور یہ ایسے ہی ہے جیسے قصہ سلیمان علیہ السلام میں ہے کہ انہوں نے فرمایا: ”لَيَسْلُونِيْ ءَ اَشْكُرُ اَمْ اَكْفُرُ“ (النمل: ۴۰) کہ وہ ضرور مجھے آزمائے گا کہ میں شکر گزار ہوں یا ناشکر۔ اور انبیاء کرام سے کفر باللہ متصور نہیں تو ثابت ہوا کہ یہاں بھی کفرانِ نعمت مراد ہے نہ کہ کفر باللہ۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ جس نے ترکِ صلوة کو حلال جانا وہ کافر ہے۔ اور یہ کہنا کہ ابلیس ایک سجدہ نہ کرنے سے کافر ہو گیا، ہم کہتے ہیں کہ سجدہ ترک کرنے سے کافر نہیں ہوا بلکہ اس کا کفر تو اس سے ثابت ہے کہ اس نے تکبر کیا، سجدہ کرنے سے انکار کیا اور خود پسندی کی اور یہ کہ اللہ تعالیٰ کی طرف جہل کی نسبت کی جب ہی تو کہا: ”خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَخَلَقْتَهُ مِنْ طِيْنٍ“ (الاعراف: ۱۲) یعنی اس نے کہا: حکمت کے خلاف ہے تو مجھے سجدہ کرنے کا حکم دے۔

اور حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ انہوں نے اس آیت ”خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَخَلَقْتَهُ مِنْ طِيْنٍ“ (الاعراف: ۱۲) کہ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور آدم کو مٹی سے کی تفسیر میں فرمایا کہ اس آیت میں دعویٰ ربوبیت ہے۔

کبیرہ گناہوں سے ایمان سلب نہیں ہوتا

اس کی دلیل کہ کبار سے ایمان سلب نہیں ہوتا اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ”فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِنُ بِاللّٰهِ فَقَدْ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى“ (البقرہ: ۲۵۶) پس جو

مشکوٰۃ شریف عربی ص ۱۴ میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جو بندہ کلمہ طیبہ ”لا الہ الا اللہ“ پڑھے پھر وہ اس کلمہ پر فوت ہو جائے وہ جنت میں داخل ہوگا۔ میں نے عرض کی کہ اگرچہ وہ زنا اور چوری کرے؟ فرمایا: اگرچہ وہ زنا اور چوری کرے۔ میں نے دوبارہ عرض کی کہ اگرچہ وہ زنا اور چوری کرے؟ تو فرمایا: اگرچہ وہ زنا اور چوری کرے۔ میں نے تیسری بار پھر عرض کیا کہ اگرچہ وہ زنا اور چوری کرے؟ تو فرمایا: اگرچہ وہ زنا اور چوری کرے ابوذر کی ناک کو خاک آلود کر کے (یعنی ان کی ناپسندیدگی کے باوجود) وہ جنت میں جائے گا۔ (۱۲ شرف قادری)

بتوں سے بری الذمہ ہو کر اللہ تعالیٰ پر ایمان لایا تو یقیناً اس نے بڑی مضبوط گرہ پکڑ لی جو کھل نہیں سکتی ”فَمَنْ يَكْفُرُ بِالطَّاغُوتِ“ یعنی بتوں سے بیزاری کی ”وَيُؤْمِنُ بِاللَّهِ فَقَدْ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ لَا انفِصَامَ لَهَا“ ابن عباس عباس نے فرمایا: ”لا انقطاع لها سوى الجنة“ تو اگر کبیرہ کے ساتھ کافر ہو جاتا تو ”عروہ وثقی“ کے ساتھ تمسک نہ ہوتا۔

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”تُوبُوا إِلَى اللَّهِ جَمِيعًا أَيُّهَا الْمُؤْمِنُونَ“ (النور: ۳۱) مسلمانو! تمام کے تمام اللہ کی بارگاہ میں توبہ کرو۔ اللہ تعالیٰ نے توبہ کا حکم دیا اور توبہ تمہارے نزدیک کبیرہ گناہوں سے ہوتی ہے پھر ان کبیرہ کے مرتکب کو مؤمن فرمایا اور نیز ارشاد خداوندی ہے: ”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا تَوْبُوا إِلَى اللَّهِ تَوْبَةً نَّصُوحًا“ (التحریم: ۸) اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں صاف دل سے خالص توبہ کرو۔ ان کو مؤمن فرمایا اور توبہ کا حکم دیا تو ثابت ہوا کہ کبیرہ گناہوں کے ارتکاب سے ایمان سلب نہیں ہوتا لہذا اس پوری گفتگو کا خلاصہ اور لب لباب یہ نکلا کہ ہمارا مدعا ثابت ہوا کہ اجتناب عن الكبائر (کبار سے بچنا) شرط ایمان نہیں۔

ایمان کی دو قسمیں

(۱) مجمل (۲) مفتر (مفصل)

امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایسے ہی مروی ہے کہ ایمان کی دو قسمیں ہیں: مجمل اور مفتر۔

ایمان مجمل: ایمان مجمل کی صورت یہ ہے کہ کہے: ”امنت باللہ وملئکتہ وبعمیع ما قال اللہ علی ما اراد اللہ وامت برسول اللہ وبما قال رسول اللہ علی ما اراد رسول اللہ وبعلم وبعقد“ یعنی میں اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر ایمان اور تمام ان چیزوں پر جو اللہ نے فرمائیں اور جو ارادہ فرمایا۔ اور میں ایمان لایا اللہ کے رسول ﷺ پر اور تمام ان باتوں پر جو حضور ﷺ نے ارشاد فرمائیں اور جو حضور ﷺ نے ارادہ فرمایا اور جن چیزوں پر حضور ﷺ کا اعتقاد ہے اور جو حضور ﷺ مانتے ہیں۔

ایمان مفتر: ایمان مفتر کی صورت یہ ہے کہ ایمان کی تمام شرائط کو ذکر کرے اور جانے اور

اعتقاد کرے اور ان سب پر ایمان لائے۔

سوال: ایمان مفسر بعداً مجمل بنفسہ ایمان ہوگا یا نہیں؟

جواب: اس میں اختلاف ہے کہ ایمان مجمل کے بعد ایمان مفسر بنفسہ ایمان ہوگا یا نہیں؟ تو بعض کہتے ہیں کہ یہ مجمل کی تکرار ہے اور بعض کہتے ہیں کہ یہ (ایمان مفسر بعداً از مجمل) بنفسہ ایمان ہے۔

زیادہ صحیح وہ ہے جو ہم کہتے ہیں کہ اگر وہ اس حال میں ہے کہ جب اس کے سامنے ایمان کے اوصاف اور شرائط بیان کیے جائیں تو اگر وہ کہے کہ میں یہ نہیں جانتا تھا کہ ان باتوں پر ایمان لانا ضروری ہے تو دیکھیں گے اگر وہ حربی دار الحرب میں ہے یا ذمی ہے اجمالاً ایمان لایا اور تفسیر کو نہیں جانتا تھا تو جب اس نے جان لیا اور کہتا ہے کہ میں نہیں جانتا تھا اب میں ایمان لاتا ہوں تو اس کا پہلا ایمان معتبر ہوگا اور اگر تفسیر ایمان سنا کر ایمان نہ لائے تو اس کو مرتد کہا جائے گا اور اگر وہ مسلمان ہے اور دارالاسلام میں پیدا ہوا اور پھر کہتا ہے کہ میں نہیں جانتا تھا کہ ان باتوں پر ایمان لانا واجب ہے تو اس کا پہلا ایمان مجمل ایمان نہیں از سر نو ایمان لائے اور وہ احکام جو ایمان مفسر سے پہلے تھے نکاح وغیرہ وہ جائز نہ ہوں گے اور نہ وہ منعقد ہوں گے اور سب احکام اس کے باطل ہوں گے۔

اور بعض محققین نے فرمایا: اس کے جملہ احکام زمانہ ایمان مجمل کے صحیح ہیں عبادت ہو یا معاملہ البتہ نکاح صحیح نہ ہوگا کیونکہ نکاح ایمان مجمل بوصف الایمان صحیح نہیں

ہوتا۔

ایمان مجمل کن چیزوں سے مکمل ہو جاتا ہے؟

امام ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نزدیک ایمان مجمل ایک شہادت یعنی "لا الہ الا اللہ" کہنے سے تمام ہو جاتا ہے۔ پھر اس پر اوصاف ایمان کی تقریر اور اس پر ثبات رہنا واجب ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ایمان مجمل دو شہادتوں سے ہوتا ہے اور وہ یہ ہیں: "لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ" پھر اس پر ثبات و تقریر واجب ہے اور تمام

اوصاف ایمان اور شرائط ایمان اور ہر اس چیز پر کہ جس پر ایمان لانا واجب ہے، امر و نہی، ناسخ و منسوخ اور احکام کہ کرنے کے ہیں اور یا کرنے کے نہیں، یعنی صحت ایمان کے لیے جن چیزوں کا جاننا ضروری ہے، سب کو جاننے اس لیے کہ صحت ایمان کے لیے یہ شرط ہے اور ایمان کا وصف ہے اور دلیل یہ ہے جو حضور نے ارشاد فرمایا: ”ان تؤمن باللہ و ملئکتہ و کتبہ و رسلہ و البعث بعد الموت و القدر خیرہ و شرہ من اللہ تعالیٰ“ یہ کہ تو اللہ تعالیٰ اس کے فرشتوں، اس کی کتب، اس کے رسولوں، موت کے بعد اٹھنے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اچھی اور بُری تقدیر پر ایمان لائے اور عنقریب ہم ذکر کریں گے۔

ایمان کا حکم کیا ہے؟ ایمان کا حکم عدالت ہے۔

ایمان کا موجب کیا ہے؟

ایمان کا موجب (مقتضی) جب کہ تصدیق سے مقرون ہو اللہ تعالیٰ کے خبر دینے سے جنت ہے اور اگر زبان سے اقرار کرے اور دل سے اعتقاد نہ کرے تو اس کو مسلمان کہا جائے گا۔ مسلمانوں والے احکام اس پر جاری و نافذ ہوں گے، جب تک خلاف اسلام اس سے کوئی بات ظاہر نہ ہو اور جو تم کو سلام کرے اس کو یہ مت کہو کہ تو مؤمن نہیں یعنی اس کو جو پہلے کافر تھا یہ نہ کہو: تو مسلمان نہیں۔ ”وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ أَلْقَى إِلَيْكُمُ السَّلَامَ لَسْتَ مُؤْمِنًا“ (النساء: ۹۳) اور وہ شخص جو تمہیں سلام کہے تو تم اسے یہ نہ کہو تو مؤمن نہیں، یعنی جب وہ کہے: ”السلام علیکم انی مؤمن“ کہ میں مسلمان ہوں تو اس کا قول قبول کیا جائے گا، دنیوی احکام میں۔ پھر اگر اس کے دل میں اعتقاد نہیں تو وہ جنت میں داخل نہ ہوگا، جنتی نہیں اور اس کا حکم منافقین کا سا ہوگا۔

چوتھا قول

ایمان کی شرائط اور اس کے شرائط کا بیان

اہل سنت و جماعت نے کہا: شرائط ایمان سے وہ امور مراد ہیں جن پر ایمان لانا

یعنی صاحب ایمان عادل قرار دیا جائے گا۔

ضروری اور ان کے بغیر ایمان صحیح نہیں اور ان کے انکار و رد سے آدمی کافر ہو جاتا ہے اور یہ وہ امور ہیں جو نص یا خبر متواتر یا اجماع امت سے ثابت ہوں اس لیے کہ جو چیزیں ان دلائل ثلثہ سے ثابت ہوں گی ان کا قبول کرنا اور ان پر اعتقاد واجب و ضروری ہو جاتا ہے اور جو امر خبر واحد سے ثابت ہو اور جس پر ائمہ متفق نہ ہوں اور امت مرحومہ نے قبول پر اتفاق نہ کیا ہو تو ایمان کی صحت کے لیے شرط نہیں اور جو امر خبر واحد سے ثابت ہو اور امت کے فقہاء نے بالاتفاق اس کو بلا تاویل قبول کیا ہو تو وہ ہی شرائط ایمان سے ہوگا جیسے عذاب قبر، پل صراط، میزان، شفاعت، معراج الی السماء اور اس کی مانند کہ خبر واحد سے ثابت ہیں لیکن صحابہ کرام اور فقہاء نے اس کی صحت و قبول پر اتفاق کیا ہو تو یہ بھی بہ منزلہ اجماع کے ہے اور اس پر ایمان واجب ہے پھر جو ان امور کا انکار کرے وہ کافر ہے یا نہیں؟

بعض نے کہا: کافر ہے اور بعض نے کہا: کافر نہیں اس لیے کہ وہ تاویل کرتے ہیں اگرچہ تاویل میں خطا کی تو مبتدع ہیں ان کی تفسیق کی جائے گی۔

لیکن شرائع وہ ایمان نہیں بغیر شرائع کے ایمان صحیح ہے اور وہ اہل سنت کے نزدیک عمل بالارکان ہے اور معتزلہ کے نزدیک اور روافض و خوارج کے نزدیک شرائع ہی ایمان ہے اور یہی قول امام شافعی کا بھی ہے اور ہم پہلے اس کا بیان کر چکے ہیں۔

شرائط اور شرائع میں فرق

شرائط اور شرائع میں ہمارے نزدیک فرق یہ ہے کہ شرائط کا نام ملت ہے اور شرائع کا نام خدمت ہے اور ملت بغیر خدمت کے صحیح ہے اور خدمت بغیر ملت صحیح نہیں۔

شرائط اور شرائع کے درمیان دوسرا فرق

شرائط اور شرائع میں دوسرا فرق یہ ہے کہ ملت میں دوام شرط ہے اور خدمت میں دوام شرط نہیں۔

پھر اگر ان امور میں سے کسی امر کو چھوڑا اور منہیات میں سے کسی شئی کا مرتکب ہوا تو دیکھا جائے گا کہ اگر حلال سمجھ کر اس نے ارتکاب کیا ہے تو تکفیر کی جائے گی اور اگر بغیر حلال سمجھے عصیاناً مرتکب ہوا ہے تو اس کی تکفیر نہیں کی جائے گی یہ اہل سنت و جماعت کے عقائد ہیں اور دلیل یہ آیت ہے: **حَقَّ سَبْحَانَهُ وَتَعَالَى فِرْمَانُهُ: "لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُولُوا وَجُوهَكُمْ**

قَبْلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ
وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ وَآتَى الْمَالَ عَلَى حُبِّهِ“ (البقرہ ۱۷۷) اصل نیکی یہ نہیں کہ تم مشرق اور
مغرب کی طرف منہ پھیر لو لیکن اصل نیکی یہ ہے کہ وہ اللہ، یوم آخرت فرشتوں، کتاب اور
پیغمبروں پر ایمان لائے اور اللہ کی محبت میں اپنا مال دے۔ اللہ تعالیٰ نے ایمان و عمل کا فرق
بیان فرمادیا اور نیز فرمایا: ”وَمَنْ يَكْفُرْ بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَرُسُلِهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَقَدْ ضَلَّ
ضَلَالًا بَعِيدًا“ (النساء: ۱۳۶) اور جو انکار کرے اللہ تعالیٰ، فرشتوں اور کتابوں اور آخرت کے
دن کا، تحقیق وہ گمراہ ہو اور دور کی گمراہی میں۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے خبر دی ہے جو ان شرائط کے
ساتھ کفر رہے گا کافر ہو جائے گا۔ پھر اعمال بعض وہ ہیں جن کے کرنے سے ایمان کا حکم کیا
جائے گا اور وہ یہ ہیں کہ کافر جب جماعت سے نماز پڑھے اور جمعہ میں حاضر ہو اور عیدین میں
حاضر ہو اور مسلمانوں کے ساتھ نماز ادا کرے اور اذان دے اقامت کہنے حج کرنے
مسلمانوں کے ساتھ تو ان اعمال سے اس کے مسلمان ہونے کا حکم کیا جائے گا اور اگر کفر کی
طرف لوٹا تو ارتداد کا حکم کیا جائے گا اور اگر تنہا پڑھے تو مسلمان نہ سمجھا جائے گا۔

اور ایسے ہی اگر مسلمان بت کو سجدہ کرے یا کسی فعل میں افعال کفار سے کافروں کی
متابعت کرے وہ افعال جو کافروں کا دین ہے تو کافر ہو جائے گا اور ایسے ہی اگر ظاہر کرے
اپنی طرف سے علامت کفار کی جیسے مجوسیوں کی ٹوپی پہنے یا زنا، جینیو وغیرہ باندھے جو کفار کی
علامت ہو تو کافر ہو جائے گا۔ پھر یہ اعتقاد کے ساتھ پہنے یا بغیر اعتقاد کے یا سخریہ اور مذاق
کے طور پر کافر ہو جائے گا اور تقیہ یا مکر یا علامت کفار کو اختیار کیا تو کافر نہ ہوگا اور اگر کفار کا ایسا
لباس پہنتا ہے جو کفار کی علامت نہیں یا ان کی عادت و خصلت کو اختیار کیا یا ان کی کسی ایسی چیز
میں پیروی کی جو ان کا دین نہیں ہے بلکہ وہ اختراع اور لہو کے طور پر ہو تو کفر کا حکم نہیں دیا
جائے گا۔

یہ جو کچھ کہا اس معنی کی بناء پر ہے جو فعل و اعتقاد کسی شئی کا ہو اس کی صحت کے لیے
اعتقاد شرط ہے اور جو عمل اعتقاد پر دلالت کرے وہ بھی اعتقاد کے حکم میں ہے اور اعتقاد کا وہ
عمل کرے گا جیسے بت کو سجدہ کرنا بت پرستی کے حکم میں ہے اور جو عمل متحمل شبہ ہے وہ اعتقاد پر
دلالت نہیں کرے گا۔

امام محمد ابن حسن رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انہوں نے ”کتاب الممتحنی“ میں ایک مسئلہ ذکر فرمایا کہ جو شخص ”لا الہ الا اللہ“ پڑھتا ہے اور کفر سے بیزاری کا اظہار نہیں کرتا تو وہ منافق ہوگا اس لیے کہ کفر سے بیزاری کا اظہار کرنا ایمان کے صحیح ہونے کی شرط ہے یہ حوالہ ”فَمَنْ يَكْفُرُ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِنُ بِاللَّهِ فَقَدْ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَى لَا انْفِصَامَ لَهَا“ (البقرہ: ۲۵۶) ”پس جو بتوں سے بری الذمہ ہو اور اللہ تعالیٰ پر ایمان لایا تو یقیناً اس نے بڑی مضبوط گرہ پکڑ لی جو کھل نہیں سکتی“۔ واللہ تعالیٰ اعلم

پانچواں قول

اس کا بیان کہ ایمان گھٹتا بڑھتا ہے یا نہیں؟

امام ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کے اصحاب فرماتے ہیں کہ ایمان کم و بیش نہیں ہوتا۔

امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ایمان طاعت و عبادت سے بڑھتا اور معصیت و نافرمانی سے گھٹتا ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ایمان میں زیادتی ہو سکتی ہے اور نقصان (کمی) نہیں ہو سکتا اور یہ قول صحیح نہیں اس لیے کہ جب زیادتی ہو سکتی ہے تو نقصان بھی ہو سکتا ہے اور یہ بھی درست نہیں اور انہوں نے اس آیت سے حجت پکڑی: ”لِيَزِدُوا اِيْمَانًا مَّعَ اِيْمَانِهِمْ“ (الفتح: ۴) تاکہ ان کا ایمان پر ایمان بڑھے۔

اور ابو ہریرہ انس اور ابو سعید خدری اور ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہم نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ جب جنتی جنت میں اور دوزخی دوزخ میں داخل ہو جائیں گے تو اللہ تعالیٰ فرشتوں کو حکم دے گا کہ جس کے دل میں ذرہ برابر ایمان ہے اور ایک روایت میں رائی کے دانہ کے برابر اور ایک روایت میں جو برابر ایمان ہے اس کو جہنم سے نکال لاؤ (نکالا جائے)۔ اگر ایمان میں زیادتی و کمی جائز نہ ہوتی تو صغرو زیادہ کے ساتھ ایمان کو موصوف نہ کیا جاتا تو اس حدیث سے ثابت ہوا کہ ایمان میں کمی و بیشی ہوتی

ہے۔

آیت کا جواب یہ ہے کہ مراد تکرار ایمان ہے یہ ایسے ہے جیسے فرمایا: "فَإِذَا قَرَأْتَهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ" (القیامہ: ۱۸) تو جب ہم پڑھ چکیں تو آپ اس پڑھے ہوئے کی اتباع کریں۔ قراءت کا نام قرآن رکھا حالانکہ قراءت اور ہے اور قرآن اور ہے اس لیے کہ قراءت مخلوق ہے اور قرآن غیر مخلوق ہے تو ایسے ہی یہاں ہے۔

اور ابن عباس سے مروی ہے کہ یہ آیت اصحاب کرام کے بارے میں نازل ہوئی اور اس لیے کہ قرآن کریم تیس سال تک حضور ﷺ پر نازل ہوتا رہا جب کبھی قرآن کریم کی آیت نازل ہوتی اس پر ایمان لانا واجب تھا۔ اس کے بعد شرائط ایمان نہ کم ہوں نہ زیادہ۔ اعتراض: اب اگر کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "مَا كَانَ اللَّهُ لِيُضِيعَ إِيمَانَكُمْ" (البقرہ: ۱۳۳) ای صلوٰتکم اور اللہ تعالیٰ کی یہ شان نہیں کہ تمہارے ایمان یعنی نمازیں ضائع کر دے۔ صلاۃ کا نام ایمان رکھا۔

جواب: ہم کہتے ہیں کہ اس سے مراد اعتقاد ہے کیونکہ آیت ان لوگوں کے متعلق نازل ہوئی جو سفر میں تھے اور انہیں تحویل (تبدیلی قبلہ) قبلہ کی خبر نہ تھی اور وہ بیت المقدس کی طرف نماز پڑھتے رہے جب ان کو تحویل قبلہ کی خبر ہوئی تو انہوں نے کہا: خدا نے ہمارا ایمان ضائع کر دیا کہ ہم سب بیت المقدس کی طرف نماز پڑھتے رہے اور ہم نے نسخ کے بعد اعتقاد کیا کہ قبلہ بیت المقدس ہے تو یہ آیت نازل ہوئی کہ اللہ تعالیٰ کی یہ شان نہیں کہ تمہارا ایمان ضائع کر دے۔

اور راس المفسرین حضرت محمد ابن فضل سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ میں نے محمد ابن احمد قرطبی سے سنا انہوں نے کہا: میں نے ابو اسمیل سے اس آیت یعنی "مَا كَانَ اللَّهُ لِيُضِيعَ إِيمَانَكُمْ" کی تفسیر میں سنا "ایمانکم" یعنی "تصدیقکم بالنبی علیہ السلام علی القبلتین حیث صدقوہ وصلوا الی بیت المقدس وماتوا علی ذلک" کہ اللہ تعالیٰ کی شان نہیں کہ تمہاری تصدیق بالنبی کو ضائع کرے جو دونوں قبلوں کی تصدیق کی اور نماز پڑھی اور اسی

مطلب یہ ہے کہ نماز عمل ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے ایمان فرمایا ہے۔

حالت میں مر گئے۔

اور حدیث کا جواب یہ ہے کہ ایمان سے مراد صدق و یقین اور اخلاص میں ہے جیسا کہ ہم نے بیان کیا اور اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا ہے مماثلت کا ایمان میں فرمایا: ”فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنْتُمْ“ (البقرہ: ۱۳۷) یعنی یہود اقرار کر لیں جیسے تم نے اقرار کیا اور اگر ایمان میں زیادتی و نقصان (کمی و بیشی) ہوتا یعنی ایمان گھٹتا بڑھتا تو یہود کا اقرار صحابہ کرام کے اقرار کے مثل نہ ہوتا اور اگر ہم نقصان کو جائز رکھیں تو یہ اس امر کو مستلزم ہے کہ جتنا ایمان کم ہے اس کی جگہ کفر ہے اس لیے کہ زوال ایمان مستلزم کفر ہے، جتنا ایمان کم اتنا اس کی جگہ کفر ہوگا تو اس سے لازم آئے گا کہ ایک وقت میں ایک شخص کچھ مؤمن ہو اور کچھ کافر ہو یہ ناممکن اور محال ہے اس لیے کہ گناہ توحید و معرفت میں مؤثر نہیں تو ایسے ہی ایمان میں بھی گناہ مؤثر نہیں۔ پھر بالاتفاق گناہوں کی کثرت ایمان کو زائل نہیں کرتی کہ کل ایمان زائل ہو جائے تو گناہوں کی قلت بعض ایمان کو واجب نہیں کرے گی۔

پھر اگر نیکی اور طاعت سے ایمان زیادہ ہو جاتا تو غنی کا ایمان ضعیف و نادار کے ایمان سے اقویٰ و اکمل ہوتا، یہ جائز و ناممکن نہیں اس لیے کہ ایمان اقرار و تصدیق و عمل کا نام ہے، ان کے نزدیک اور یہ افعال عباد ہیں اور فعل عبد عرض ہے، دوزمانوں تک باقی نہیں رہتا تو ناممکن ہے بعض کو بعض کے ساتھ منضم کرنا یہاں تک کہ زیادت و نقصان متصور ہو۔ یہ کمی زیادتی کہاں ہوتی ہے؟

پھر یہ زیادتی یا تو عین ایمان میں ہوگی یا وصف ایمان میں یا حکم ایمان میں یا موجب ایمان میں؟ تو اگر زیادتی موجب ایمان میں ہو اور وہ ثواب ہے تو اس کے ہم بھی قائل ہیں اور اگر کہا جائے کہ زیادت و نقصان حکم ایمان میں ہے اور وہ شخص کا مسلمان عادل بہ حکم ایمان ہونا ہے اور یہ متصور نہیں اس لیے کہ شخص واحد بعض اس کا مؤمن ہو اور بعض کافر اور اگر کہا جائے کہ زیادتی کمی وصف ایمان میں ہے اور وہ شرائط ایمان ہیں تو یہ بالاتفاق جائز نہیں ہے اس لیے کہ جو ایک شرط یا وصف کا انکار کرے وہ مسلمان نہیں اور اس کا ایمان صحیح نہیں کیونکہ کوئی شخص تمام شرائط ایمان کو مانے اور ایک کو نہ مانے وہ کافر ہے اس کا ایمان صحیح نہیں، تو

ثابت ہوا کہ ایمان میں کمی بیشی نہیں ہو سکتی اور اگر کہے کہ کمی بیشی عین ایمان میں ہوتی ہے تو عین ایمان تو اعتقاد ہے درحقیقت اور اقرار و عمل دلیل ہے اعتقاد پر اس دلیل سے کہ اگر کوئی کام کرے یا قبول کرے جو اعتقاد پر لالت کرتا ہو جیسے جمعہ میں حاضر ہونا، اذان دینا، اقامت کہنا تو اس کے اسلام کا حکم کیا جائے گا، اگرچہ اس سے اقرار نہ پایا گیا ہو اور اگر کوئی فعل یا قول ایسا پایا گیا کہ جو کفر پر دلالت کرتا ہو تو علامت کفر کے اظہار اور الفاظ کفر کے کہنے سے اس کو کافر کہا جائے گا جب کہ مکڑہ نہ ہو، جہالت یا مذاق میں کلمات کفر کہے اور علامت پائی جائے تو اس کے کفر کا حکم دیا جائے گا، تو ثابت ہوا کہ ایمان دراصل اعتقاد ہے لیکن ایمان کا حکم بغیر اقرار کے صحیح نہ ہوگا جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے۔

اور اعتقاد میں زیادت و نقصان کا تصور نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ اصل اعتقاد میں اگر زیادتی مانی جائے تو مسلمان اور اگر اعتقاد میں کمی ہوگئی تو کافر ہو جائے گا تو وہی صحیح ہوا جو ہم نے کہا۔

اسی طرح حدیث مبارک میں مذکور ہے کہ ایک انصاری جن کو ابو حارثہ کہتے تھے وہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ نے فرمایا: ”کیف اصبحت یا ابا حارثہ“ ابو حارثہ! کیسے صبح کی؟ ابو حارثہ نے عرض کی: حضور! میں نے صبح اس عالم میں کی کہ سچا مومن ہوں، تو حضور ﷺ نے فرمایا: ”من اراد ان ينظر الى عبد نور الله قلبه بالایمان فلينظر الى هذا“ جو شخص ایسے بندے کو دیکھنا چاہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے دل کو نور ایمان سے روشن کر دیا ہو وہ ابو حارثہ کو دیکھ لے، نیز حضور نے فرمایا: تم نے ٹھیک کہا، اسی پر ثابت ہو ”اصبت فالزم“ تو ثابت ہوا کہ بہ طور حقیقت ایسا کہنا روا اور مشروع ہے۔

سوال: اگر یہ پوچھا جائے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کے علم کے بارے میں تم کیا کہتے ہو؟ اللہ تعالیٰ کاموں کے انجام سے واقف ہے اور جس کو اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ یہ کافر مرے گا تو ناممکن ہے کہ وہ مسلمان مرے اور اللہ تعالیٰ کا علم بدلتا نہیں اور شاید یہ شخص کہے کہ میں سچا مسلمان ہوں اور اللہ تعالیٰ کے علم میں یہ ہے کہ کافر مرے گا۔

جواب: اس کا جواب یہ ہے کہ ہم کہتے ہیں کہ بے شک اللہ تعالیٰ عواقب امور (انجام کار) کو

۱۔ اور یہ باطل ہے۔ (۱۲ شرف قادری حفظہ اللہ تعالیٰ)

جانتا ہے، اسی طرح مبادی امور (آغاز کار) کو بھی جانتا ہے اور جو فی الحال مؤمن ہے تو اللہ تعالیٰ کے علم میں بھی وہ مؤمن ہے اور اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ یہ بھی جانتا ہے کہ یہ کافر مرے گا، اس لیے کہ فی الحال جب تک اس سے کفر نہیں پایا جاتا، کافر نہیں ہے، جیسے اللہ تعالیٰ جانتا ہے اہل جنت جنت میں داخل ہوں گے اور جہنمی جہنم میں داخل ہوں گے لیکن باوجود اس کے دونوں اپنے مقبرہ اوقات تک مؤخر کیے گئے ہیں، اسی طرح یہاں معاملہ ہے۔

حضرت سفیان ثوری رضی اللہ تعالیٰ سے مروی ہے کہ آپ فرمایا کرتے تھے کہ میں سچا مؤمن ہوں، فی الحال اپنے نزدیک اور یہ نہیں جانتا کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں میرا کیا حال ہے؟ اور ان شاء اللہ العزیز میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی سچا مؤمن ہوں۔

اور بعض نے کہا کہ اس مسئلہ میں کوئی اختلاف نہیں اس لیے کہ امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ نے خوف کی بناء پر کہا کہ میں ان شاء اللہ تعالیٰ مؤمن ہوں۔

اور امام ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ حسن ظن کی بناء پر کہا کہ ”انا مؤمن حقاً“ میں سچا مؤمن ہوں ”واکون مؤمناً ان شاء اللہ تعالیٰ“ اور ان شاء اللہ مؤمن ہی رہوں گا۔

حضرت ابوالقاسم قشیری رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”انا مؤمن حقاً“ میں سچا مؤمن ہوں ”واکون مؤمناً ان شاء اللہ تعالیٰ“ اور ان شاء اللہ تعالیٰ مؤمن ہی رہوں گا۔

ترجمی بات

حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا صحیح مذہب یہ ہے: میں انسانوں اور فرشتوں کے نزدیک اور لوح محفوظ میں سچا مؤمن ہوں اور اللہ تعالیٰ کے علم میں مجھے معلوم نہیں، ان شاء اللہ مؤمن ہی ہوں گا۔

اس کی تحقیق بیان ہو چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام اشیاء کو اسی طرح جانتا ہے جیسی کہ وہ فی الحال ہیں جیسا کہ حضرت ابوبکر جس وقت مسلمان نہ تھے اللہ جانتا تھا کہ وہ مسلمان نہیں اور جب اسلام لائے تو جانتا تھا کہ مسلمان ہیں اور لوح محفوظ میں لکھا ہوا اللہ تعالیٰ کے علم کے مطابق و موافق ہے۔ پس ہم نے جو کہا تھا صحیح ثابت ہوا۔

چھٹا قول

ایمان میں شک و شبہ کے بارے میں

اہل سنت و جماعت کے فقہاء کا اجماع ہے کہ جو اپنے ایمان میں شک کرے کہ وہ کافر ہے اور جس نے کسی دوسرے کے ایمان میں شک کیا یا اسے کہا: ”او کافر“ تو دیکھا جائے گا کہ اس میں کفر کا شبہ ہے تو کفر کی گالی دینے والا اور اس کے ایمان میں شک کرنے والا کافر نہ ہو گا اور اگر گالی دینے والے نے کفر کے شبہ کے بغیر کافر کہا تو وہ خود کافر ہو جائے گا۔

تفصیل: جس شخص کے ایمان کے بارے میں شک ہے اگر وہ شخص گاؤں کا و ذریا (عریف) یا عشر لینے والا (عشار) یا جاسوس (عوانا) ہے تو اس کو کفر کی گالی دینے والا اور اس کے ایمان میں شک کرنے والا کافر نہ ہوگا۔

اگر وہ شخص کھلم کھلا فاسق ہے اپنے فسق پر اصرار کرتا ہے اور علومِ دینیہ سے جاہل ہے ایسے شخص کو کافر کہا تو کہنے والا کافر ہوگا اور اگر اس کے ایمان میں شک کیا تو کافر نہ ہوگا۔

اور اگر اس نے کبیرہ گناہوں کا ارتکاب کیا لیکن ان پر اصرار نہ کیا اور نہ ہی علی الاعلان گناہ کیے ہیں اور علومِ دینیہ کا جاننے والا ہے تو اس کے ایمان میں شک کرنا جائز نہیں ہے اور جو اس کے ایمان میں شک کرے گا وہ بدعتی ہے یہ تمام باتیں اس قاعدے کی طرف لوٹتی ہیں کہ گناہوں سے ایمان کی نفی لازم نہیں آتی لیکن توبہ کو بھول جانا دین کی تحقیر اور گناہوں پر سزا کا قائل نہ ہونا یہ امور ایمان کی نفی کا باعث ہیں اسی طرح جو شخص گناہوں کو برانہ جانے یا اطاعت و عبادت کو اچھا نہ جانے یا اطاعت پر ثواب ملنے کا عقیدہ نہ رکھے یا اطاعت کو واجب نہ جانے تو وہ کافر ہو جائے گا اور جس میں ان (مذکورہ) باتوں کا توہم ہو اس کے ایمان میں شک کرنا جائز ہے اور جو یہ باتیں زبان سے کہے۔ تو ایسے شخص کو کافر کہا جائے گا۔

ایمان میں شک کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کو پہچانے لا اللہ الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھے اور اس کی تصدیق کرے پھر اس میں بائیں صورت شک

۱۔ مثلاً کہے کہ نماز روزہ حج زکوٰۃ فرض نہیں ہیں۔

کرے کہ یہ ایمان اور یہ قول آیا اس کا ایمان ہے یا نہیں؟ اور کیا یہ کفر کو زائل کرتا ہے یا نہیں؟ پس یہی ایمان میں شک ہے اور شک کے ساتھ ایمان ثابت نہیں ہو سکتا۔

حضرت حماد بن ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ وہ امام اعظم کی وفات کے بعد مدینہ منورہ میں حاضر ہوئے اور امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ میرے والد قدس سرہ قرآن پاک کو اللہ تعالیٰ کا کلام اور غیر مخلوق فرمایا کرتے تھے اور حضرات شیخین یعنی حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو سب سے افضل فرماتے تھے اور نبی اکرم ﷺ کے دونوں نسبتی فرزندوں حضرت عثمان غنی اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے محبت رکھتے تھے خیر و شر کو اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے جانتے تھے کسی مسلمان کو بعینہ جنتی یا جہنمی نہیں فرماتے تھے اور ایمان میں شک کے قائل نہیں تھے یہ سن کر حضرت امام مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ ایمان میں شک کیا ہے؟ حضرت حماد رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا کہ ہماری طرف کچھ ایسے لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان رکھتے ہیں اور پھر یہ کہتے ہیں کہ ہم نہیں جانتے کہ ہمارا کلمہ پڑھنا ایمان ہے یا نہیں؟ اور کلمہ پڑھنے کے بعد ہم کفر سے نکلے ہیں یا نہیں؟ پس امام مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تعجب سے تبسم فرمایا۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ جس نے اپنے ایمان میں شک کیا تو اس نے نص قرآنی کا انکار کیا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ایمان کا حکم دیا اور قرآن پاک میں ایمان کی صفت کو اپنے ان فرامین میں بیان فرمایا: ”فَاعْلَمُ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَاسْتَغْفِرُ لِذَنْبِكَ“ (محمد: ۱۹) آپ یقین رکھیے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور آپ (امت کی تعلیم کے لیے) خلاف اولیٰ کاموں کی بخشش چاہیں۔ اور ”شَهِدَ اللَّهُ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ“ (آل عمران: ۱۸) اللہ نے گواہی دی کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔

پھر اس قول اس ایمان کی وجہ سے ان کا نام مؤمن رکھا جو اس کے صحیح ہونے میں شک کرے گا وہ کافر ہو جائے گا، لیکن ایمان میں استثناء کرنا آیا یہ شک ہے یا نہیں؟ استثناء کا طریقہ یہ ہے کہ یوں کہے کہ میں مؤمن ہوں ان شاء اللہ تعالیٰ۔

۱۔ سوائے عشرہ مبشرہ کے ان کا جنتی ہونا نبی اکرم ﷺ کے ارشاد سے ثابت ہے۔

حضرت امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ عنہ کا بھی یہی مذہب ہے۔ اگر کسی شخص نے کہا کہ میں اللہ تعالیٰ پر ایمان لایا، ان شاء اللہ تعالیٰ (اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا) تو اس کا ایمان صحیح نہ ہوگا اور وہ کافر ہو جائے گا۔

حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یوں کہنا چاہیے کہ میں سچا مومن ہوں، یہی قول صحیح ترین ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کی تعریف فرماتے ہوئے فرمایا کہ ”هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا“ (الانفال: ۴) (اور حقیقت میں) وہی سچے مومن ہیں۔

سوال: اگر کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلے انہیں ایمان کی صفت کے ساتھ موصوف کیا ہے اور پھر انہیں سچے مومنین فرمایا ہے اور وہ فرمایا یہ ہے کہ ”إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ وَإِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ آيَاتُهُ زَادَتْهُمْ إِيمَانًا“ (الانفال: ۲) مومن وہی ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل خوف زدہ ہو جائیں اور جب ان پر آیتیں پڑھی جائیں تو ان کے ایمان کو زیادہ کر دیں۔

جواب: ہم کہتے ہیں کہ یہ مومن کی صفت ہے نہ کہ ایمان کی۔ ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ مومن مختلف قسم کے ہیں، بعض مومن دوسروں کی بہ نسبت اصلح ہوتے ہیں لیکن ایمان میں مختلف نہیں ہیں، پس ایمان میں فاسق اور نیک تمام برابر ہیں جیسے کفر میں (تمام کفار برابر ہیں) احادیث میں روایت کیا گیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے سامنے ایک صحابی حاضر ہوتے ہیں، جنہیں ابو حارثہ کہا جاتا تھا تو آپ نے فرمایا کہ اے ابو حارثہ! صبح کیسے کی؟ ابو حارثہ نے عرض کیا کہ حضور! میں نے سچے مومن کی حالت میں صبح کی تو حضور نے فرمایا: ہر حق کی ایک حقیقت ہوتی ہے (الحديث) پھر حضور علیہ السلام نے فرمایا: کون ایسے شخص کو دیکھنا چاہتا ہے جس کے دل کو اللہ تعالیٰ نے ایمان کے نور سے منور کر دیا ہے، پھر حضور ﷺ نے فرمایا: تم نے ٹھیک کہا ہے، اس کو لازم پکڑو اس سے معلوم ہوا کہ اس طرح کہنا حقیقت کے اعتبار سے درست ہے۔

سوال: آپ اللہ تعالیٰ کے علم اور اس کے حکم کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ اللہ تعالیٰ تمام امور کے انجام کو جانتا ہے، جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ وہ کافر مرے گا تو ناممکن ہے کہ وہ مسلمان مرے اللہ تعالیٰ کا علم بدلتا نہیں اور ہو سکتا ہے کہ وہ کہے کہ

میں سچا مسلمان ہوں اور علم الہی میں یہ ہے کہ وہ کافر مرے گا۔

جواب: بے شک اللہ تعالیٰ تمام امور کے انجاموں کو جانتا ہے اسی طرح امور کی ابتداؤں کو بھی جانتا ہے لہذا جو فی الحال مومن ہے وہ اللہ تعالیٰ کے علم میں بھی مومن ہے اور باوجود اس کے کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ وہ کافر مرے گا تو وہ فی الحال کافر نہ ہوگا جب تک اس میں کفر نہیں پایا گیا جیسے اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ عالم فنا ہوگا تو جہان فی الحال فانی نہ ہوگا ایسے ہی اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ جنتی جنت میں داخل ہوں گے اور جہنمی جہنم میں جائیں گے اس کے باوجود وہ دونوں فریق اپنے اپنے وقت تک موخر کیے گئے ہیں اسی طرح یہاں بھی ہے۔

حضرت سفیان ثوری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ آپ فرمایا کرتے تھے کہ میں فی الحال اپنے نزدیک سچا مسلمان ہوں لیکن یہ نہیں جانتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں میرا کیا حال ہے؟ اور (ان شاء اللہ تعالیٰ) اللہ تعالیٰ نے چاہا تو اس کے ہاں بھی میں سچا مومن ہوں۔
حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں فی الحال اپنے نزدیک سچا مسلمان ہوں اور اللہ تعالیٰ کے ہاں بھی مومن ہوں ان شاء اللہ تعالیٰ۔

بعض علماء کہتے ہیں کہ اس مسئلے میں کوئی اختلاف نہیں ہے کیونکہ امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ نے خوف کی بناء پر کہا کہ میں مومن ہوں ان شاء اللہ تعالیٰ اور امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اللہ تعالیٰ کے بارے میں حسن ظن کی بناء پر فرمایا کہ میں سچا مومن ہوں امام ابوالقاسم قشیری رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں سچا مومن ہوں اور ان شاء اللہ تعالیٰ میں مومن ہی رہوں گا۔

امام اعظم ابوحنیفہ کا صحیح مذہب یہ ہے کہ لوگوں اور فرشتوں کے نزدیک میں مومن ہوں لیکن لوح محفوظ اور اللہ تعالیٰ کے علم میں مجھے معلوم نہیں ہے اور ان شاء اللہ تعالیٰ مومن ہی ہوں گا ہم اس کی تحقیق بیان کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تمام اشیاء کو جانتا ہے جیسی فی الحال ہیں مثلاً حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ جس وقت مسلمان نہ تھے اللہ تعالیٰ جانتا تھا کہ وہ مسلمان نہیں ہیں اور جب اسلام لائے تو اللہ تعالیٰ جانتا تھا کہ وہ مسلمان ہیں اور لوح محفوظ میں لکھا ہوا اللہ تعالیٰ کے علم کے مطابق و موافق ہے تو ہمارا دعویٰ صحیح ثابت ہوا۔

ساتواں قول ایمانِ میثاق کا بیان

چند نظریات

- (۱) معتزلہ اور روافض نے کہا کہ جسموں سے عہد و پیمان لینا جائز نہیں اور نہ صحیح ثابت ہے، یہ ایسی بات ہے جسے عقلی طور پر قبول کرنا ضروری نہیں ہے۔
- (۲) بعض کہتے ہیں: میثاقِ روحوں سے تھا۔
- (۳) بعض کہتے ہیں: یہ میثاق بہ طریق حکمتِ عقلی ہے اس لیے کہ شرک اور کفر ان (ناشکری) جائز نہیں اور شکر و ایمان واجب ہے۔

(۴) اہل سنت و جماعت کا مسلک اس بارے میں یہ ہے کہ میثاقِ جسموں سے لینا صحیح اور ثابت ہے اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا ارشاد: ”وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِي آدَمَ مِنْ ظُهُورِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَأَشْهَدَهُمْ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوا بَلَىٰ“ (الاعراف: ۱۷۲) اور جب آپ کے رب نے اولادِ آدم کی پشت سے ان کی نسل نکالی اور انہیں اپنے آپ پر گواہ بنایا، کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ وہ بولے: کیوں نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ اس نے بنی آدم سے عہد و پیمان لیا اور یہ خبر ماضی کی ہے اور میثاقِ اجساد پر تھا اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”من بنی آدم“ اور جسم کے بغیر صرف روح کو بنی آدم نہیں کہا جاتا۔

اور اس لیے بھی کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”من ظہورہم ذریتہم“ اور ذریتِ روح و جسم کے ساتھ اور یہ عہد و پیمان عیاں اور صریح تھا، محض عقلی اور حکمی نہ تھا اس لیے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ”الست بربکم“ کیا میں تمہارا رب نہیں؟ ان کو خطاب کے لفظ سے خبر دی اور خطاب بغیر مشافہ کے درست نہیں۔

اور اس لیے بھی کہ حضور اقدس ﷺ سے مروی ہے آپ ﷺ نے فرمایا: بے شک اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کی پشت پر ہاتھ پھیرا اور پشتِ آدم علیہ

السلام سے قیامت تک ہر مولود (پیدا ہونے والے) کو نکالا اور ان سے عہد و پیمان لیا کہ تم میری عبادت کرنا اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا، تو ثابت ہو گیا کہ میثاق صحیح ہے۔

بعض فقہاء کا مسلک

بعض فقہاء فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جبرئیل کو حکم دیا، انہوں نے اپنے دونوں بازو آدم علیہ السلام کی پشت پر رکھے تو اللہ تعالیٰ نے آدم کی اولاد کو نکالا اور ان کی ذریت کو ان کی پشتوں سے جو بھی قیامت تک پیدا ہونے والا تھا، روح و جسد کے ساتھ عاقل و بالغ، پھر ان سے خطاب فرمایا: "الست بربکم" (کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں) سب نے متفق اور یک زبان ہو کر عرض کی: "بلی" کیوں نہیں اور یہ ان کا ایمان تھا۔

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ یہ میثاق آدم علیہ السلام میں روح ڈالنے سے پہلے لیا گیا تھا اور بعض اس کے قائل ہیں کہ میثاق اس وقت لیا گیا جب آدم علیہ السلام جنت کے دروازہ پر تھے۔ بعض یہ کہتے ہیں کہ میثاق اس وقت لیا گیا جب آدم علیہ السلام چوتھے آسمان میں تھے۔ بعض کہتے ہیں: میثاق لیا گیا جب آدم علیہ السلام دنیا میں اتارے گئے اور ادائے رسالت کے بعد۔ بہر حال میثاق پر ایمان لانا واجب ہے، اس کی کیفیت نامعلوم ہے۔

کیا میثاق کے بعد ان پر موت آگئی تھی؟

اس پر اجماع ہے کہ نہ ان پر موت طاری ہوئی اور نہ ہی ابھی ان کی پیدائش ہوئی تھی اور ان کی پشتوں سے اجزاء کو نکالا تھا جو چیونٹی یا ذرے کی مثل تھے، بعض کو بعض کی پشتوں اور صلبوں سے نکال کر پھر میثاق لینے کے بعد پھر دوبارہ لوٹا دیا گیا تھا، جیسے پہلے تھے اسی طرح دوبارہ پشتوں میں رکھ دیا۔

کیا میثاق کا حکم اب بھی باقی ہے؟

رہا یہ امر کہ حکم میثاق اب بھی باقی ہے یا نہیں؟ تو بعض نے کہا کہ باقی ہے اور سب لوگ ایمان میثاق کے ساتھ ماسوائے ان لوگوں کے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کیا اور ایسے ہی مشرکین کے بچے (ان) بعض کے نزدیک مؤمن ہیں، مگر یہ صحیح نہیں ہے۔

بعض نے کہا کہ ان پر ایمان میثاق واجب نہ تھا اور یہ خطاب، خطاب تکلیف نہ تھا بلکہ استخبار و تفہیم کے لیے خطاب تھا اور استفہام کے معنی میں تھا۔

استفہام کے دو معنی

اور استفہام کبھی بمعنی نفی ہوتا ہے اور کبھی بمعنی اثبات ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو سمجھا دیا اور انہوں نے پہچان لیا اور ان کے دلوں میں ایمان ڈال دیا یہاں تک کہ انہوں نے ”بلی“ کہا۔

علاوہ ازیں وہ وقت و وقت تکلیف نہ تھا اور اس لیے کہ ابتلاء و آزمائش اور تکلیف احکام و معاملات میں ثابت ہوتی ہے اور ان کو وہاں حاجت نہیں تھیکو نکہ سب اولین و آخرین (انگلوں پچھلوں) کو ایک ساعت میں جمع فرمایا اور ان کے درمیان نہ نکاح تھا نہ سفاح (زنا) نہ دعویٰ و شہادت نہ ولادت نہ حیض و نفاس نہ موت نہ وراثت نہ عدت نہ روزہ نہ نماز نہ حج نہ زکوٰۃ تو وہ تمام احکام سے بے نیاز تھے اور نہ ہی ان کو کھانے پینے کی حاجت تھی اور مصالح و ابتلاء و آزمائش عبادات میں ہوتی ہے تاکہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی شکرگزاری ہو اور اللہ تعالیٰ کی نعمتیں اس وقت ان کے حق میں مکمل نہیں ہوئی تھیں۔ ثابت ہوا کہ خطاب تکلیف نہ تھا اس معنی کے لحاظ سے ہم نے کہا: اس ایمان پر جزاء واجب نہیں یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس ایمان کا حکم باقی نہیں اس لیے کہ اگر ایمان کا حکم باقی ہوتا تو جزاء بھی واجب ہوتی اور جب جزاء واجب نہیں تو ثابت ہوا کہ وہ ایمان باقی نہیں لیکن یہ صحیح نہیں اس لیے کہ ہر خطاب پر ایمان واجب ہے۔ پس ثابت ہو گیا کہ وہ خطاب کے اہل تھے تو ان پر واجب تھا کہ ایمان لائیں اور زیادہ صحیح وہ بات ہے جو ہم کہتے ہیں کہ ایمان روح ڈالنے کے بعد اور آسمان پر چڑھنے سے پہلے واجب ہے اور خطاب تکلیف و الزام تھا اس معنی کے لحاظ سے کہ وہ ہمارا الہ (معبود) ہے اور ہم اس کے بندے ہیں بغیر کسی شک و شبہ کے۔ اس لیے کہ ایمان اللہ تعالیٰ کا حق ہونے کے باعث واجب ہے معانی سے خالی پھر اس ایمان پر جزاء اس لیے واجب نہیں کہ یہ تو اللہ تعالیٰ کا ان پر حق ہے۔

اسی معنی کے لحاظ سے اہل سنت و جماعت کہتے ہیں کہ ایمان والے اللہ تعالیٰ کے فضل سے جنت میں داخل ہوں گے۔ ایمان والوں کو جنت میں داخل کرنا اللہ تعالیٰ پر واجب نہیں اور نہ یہ جزاء ایمان ہے اور اس لیے کہ جزاء کا ثبوت و وجوب اور اس کا پتا تو اللہ تعالیٰ کے خبر دینے سے معلوم ہوا ہے اور اللہ تعالیٰ نے ایمان میثاق کی جزاء و ثواب کی خبر نہیں دی تو ہم بھی

نہیں کہتے کہ اس ایمان کی جزا ملے گی اور وہ باقی نہیں اس لیے کہ وہ ایک مدت تک کے لیے مشروع اور مقصود تھا، وہ مدت ختم ہو گئی۔

اگر کہا جائے کہ یہ بات نہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ”کل مولود یولد علی الفطرة فابواه یهودانہ الخ“ کہ ہر مولود فطرتِ اسلامی پر پیدا ہوتا ہے۔ پس اس کے ماں باپ یہودی یا مجوسی یا نصرانی بنا لیتے ہیں۔

ہم کہتے ہیں کہ اگر مشرکوں کے بچے بلوغ سے قبل مؤمن ہوں تو لائق یہ ہوگا کہ جب وہ بالغ ہو جائیں تو کافر قرار دیئے جائیں اور ان سے جزیہ قبول نہ کیا جائے بلکہ ان کو قتل کر دیا جائے۔ اس لیے کہ ان پر اسلام کا حکم ثابت ہے اور اب کفر کریں گے تو اولادِ مسلمین کی طرح مرتد قرار پائیں گے اور مرتد سے سوائے اسلام اور سیف (لڑائی) کے کچھ قبول نہیں کیا جاتا اور جب یہ شرط نہیں تو یہ اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ اصل میں وہ کافر تھے اور اگر اسلام کا حکم ثابت ہوتا تو کفر کا حکم نہ کیا جاتا بلکہ ماں باپ کی تبعیت میں یا اسلامی مملکت کی تبعیت میں انہیں مسلمان قرار دیا جاتا، نیز ”اسلام بلند ہوتا ہے مغلوب نہیں ہوتا“ تو ہم نے اجماعی فیصلہ دیا کہ وہ تبعاً کافر ہیں، ان کا اسلام ثابت نہیں۔

اور اس لیے کہ یہ بچہ اپنے کافر والدین کی میراث کا وارث ہوتا ہے اور ولایتِ عصبت اس پر ثابت ہوتی ہے۔ ثابت ہوا کہ جو ہم نے کہا وہی حق ہے۔

اور حضور ﷺ کا فرمان ہے کہ ”کل مولود یولد علی الفطرة“ بعض نے کہا: ”علی“ بمعنی ”ل“ ہے ”للفطرة“ اور ہم یہی کہتے ہیں اور اصح یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا فرمایا اپنے راستے پر اور اس کے لیے جائز و روا نہیں ہے کہ اس کے راستے کے سوا کوئی اور راستہ اختیار کرے اور دین کا نام فطرت رکھا کیونکہ شرعاً اس کا حکم ثابت اور ظاہر نہیں ہے اس لیے کہ تخلیق تکلیف کو واجب نہیں کرتی۔ صحیح یہ ہے کہ ”یولد علی الفطرة“ ای علی الدین“ (بچہ) فطرت پر پیدا ہوتا ہے یعنی دین پر اس لیے کہ واجب نہیں کہ کوئی مولود بغیر کسی دین کے پیدا ہو۔ پھر دینِ اسلام اصل ہے تو ہر بچہ دینِ اسلام پر پیدا ہوتا ہے، پیدائش کے وقت مگر ان کے تابع و زیرِ حکم ہونے کی وجہ سے والدین کا کفر بچے میں سرایت کرتا رہتا ہے، لیکن حقیقت میں اس کا کوئی دین نہیں، جب تک بالغ نہ ہو اور جب بالغ ہو اور زبان سے تعبیر

کر لیا تو ہو جائے گا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ”اما شاکراً واما کفوراً“ کہ چاہے شکر گزار ہو یا ناشکر۔ اصول صغار میں حضور ﷺ کے اس ارشاد کے متعلق فرمایا: ”کل مولود یولد علی الفطرة الا یمن ام غیرہ“ کہ ہر بچہ فطرتِ ایمان پر پیدا کیا گیا، میثاق کا دن ہو یا اس کے علاوہ۔ روزِ میثاق کا ایمان مراد ہے یا کوئی دوسری چیز مراد ہے؟ فرمایا: حدیث میں مذکورہ فطرت سے مراد اتباعِ والدین ہے اور یہ دنیا میں احکام کے اعتبار سے نہ یہ کہ یومِ میثاق کا ایمان مراد ہے۔

بعض کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے ذریتِ آدم علیہ السلام کو نکالا اور بعض کو دائیں جانب کھڑا کیا اور بعض کو بائیں جانب اور فرمایا: ”الست بربکم“ تو جو آدم علیہ السلام کے دائیں جانب کھڑے تھے انہوں نے مثبت طور پر سمجھا اور کہا: ”بلی“ اور جو آدم علیہ السلام کے بائیں جانب تھے انہوں نے نفی کے طور پر سنا اور سمجھا اور کہا: ”بلی“ تو دائیں جانب والے (اصحابِ یمن) اپنے جواب کی وجہ سے مؤمن ہیں اور اصحابِ شمال (بائیں جانب والے) اپنے جواب کے سبب کافر ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”هؤلاء فی الجنة ولا ابالی و هؤلاء فی النار ولا ابالی“ یہ لوگ جنتی ہیں اور میں اس کی پرواہ نہیں کرتا اور یہ دوزخ میں اور میں اس کی پرواہ نہیں کرتا اور صحیح وہ ہے جو ہم نے ذکر کیا۔

آٹھواں قول

ایمان اور اسلام میں کیا فرق ہے؟

بعض فقہاء کا نظریہ

بعض فقہاء نے کہا: اسلام اور ہے اور ایمان اور ہے۔ رافضیوں کا بھی یہی مسلک و نظریہ ہے اور اس بناء پر انہوں نے اپنا نام مؤمن رکھا۔ رافضی لوگ اپنے علاوہ دوسری امت کو مسلم اور جو ان کے مذہب کے موافق ہو اس کو مؤمن کہتے ہیں۔

رافضیوں کا نظریہ

ان حضرات کا کہنا ہے کہ جو شرائع اور احکام کو ادا کرتا ہے لیکن تاویل و تنزیل کے علوم کو

نہیں جانتا وہ مسلم ہے اور جو علوم حقائق اور تاویل و تنزیل کو جانتا ہے وہ مؤمن ہے۔

معززہ کا نظریہ

معززہ کہتے ہیں کہ باطن کے لحاظ سے مؤمن اور ظاہر کے لحاظ سے مسلم ہے اور مرتکب کبیرہ ایمان سے خارج ہو جاتا ہے، اسلام سے خارج نہیں ہوتا۔ اس کو مسلمان کہیں گے، مؤمن نہیں کہیں گے۔ دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "قَالَتِ الْأَعْرَابُ آمَنَّا قُلْ لَمْ تُؤْمِنُوا وَلَكِنْ قُولُوا أَسْلَمْنَا" (الحجرات: ۱۳)۔

ایسے ہی حضور ﷺ سے جب کسی نے سوال کیا تو آپ نے اسلام اور ایمان کے درمیان فرق بیان فرمایا۔ حضور ﷺ سے پوچھا گیا کہ "ما الایمان؟" ایمان کیا ہے؟ جواب ارشاد فرمایا: "ان تؤمن باللہ و ملکته و کتبه و رسله" یہ کہ تو ایمان لائے اللہ پر فرشتوں پر کتابوں اور رسولوں پر۔ اور جب سوال کیا گیا: "ما الاسلام؟" اسلام کیا ہے؟ فرمایا: "اقام الصلوٰۃ و ایتاء الزکوٰۃ" نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ دینا۔

اور عام فقہاء و اہل سنت کہتے ہیں: ایمان و اسلام معرفت و توحید میں کوئی فرق نہیں ہے اس لیے کہ ہر مؤمن مسلمان عارف مؤحد ہوتا ہے اور ہر مسلمان مؤمن عارف مؤحد ہوتا ہے اور ہر عارف مؤحد مؤمن مسلم ہوتا ہے اور ہر مؤحد عارف مؤمن مسلم ہوتا ہے۔

اور اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کا قول ذکر فرمایا: "و بذلک امرت و انا اول المسلمین" (الانعام: ۱۶۳) اور مجھے اس کا حکم دیا گیا ہے اور میں سب سے پہلا مسلمان ہوں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قول ذکر فرمایا: "تبت الیک و انا اول المؤمنین" (الاعراف: ۱۴۳) کہ میں تیری طرف رجوع کرتا ہوں اور میں سب سے پہلا مؤمن ہوں۔

سب انبیاء کرام کا دین ایک ہے

سب انبیاء کرام کا دین ایک ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے "مسلم" فرمایا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے "مؤمن" فرمایا تو ثابت ہوا کہ ایمان و اسلام میں کوئی فرق نہیں۔

خلاصہ کلام

مطلب یہ ہے کہ ان چار چیزوں (اسلام، ایمان، معرفت، توحید) میں سے کسی ایک کا

بھی انکار موجب کفر ہے اہل سنت کے نزدیک اس لیے کہ جو مسلمان موحّد نہ ہو گا وہ کافر ہے اور جو عارف نہ ہو گا وہ بھی کافر ہے اور جو مؤمن و مسلمان نہ ہو گا کافر ہوگا۔

درحقیقت مسلمان اور مؤمن کا ایک مطلب ہے اسلام اور ایمان۔۔۔

میں صرف لفظی فرق ہے

ان الفاظ میں لغوی اور لفظی اعتبار سے فرق ہے اور از روئے حقیقت کچھ فرق نہیں۔

بظاہر دو آیتوں میں تعارض کا جواب

لیکن رہا اس قول کا جواب کہ ”قَالَتِ الْأَعْرَابُ آمَنَّا قُلْ لَمْ تُؤْمِنُوا وَلَكِنْ قُولُوا أَسْلَمْنَا“ (الحجرات: ۱۳) بدوؤں نے کہا کہ ہم ایمان لائے آپ فرمائیں کہ تم ایمان تو لائے نہیں لیکن یہ کہو کہ ہم مطیع ہوئے۔ اس سے مراد سلامتی ہے اسلام نہیں۔

دلیل: اس پر دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام امت کو مؤمن بھی فرمایا اور ان کو مسلمان کے نام سے بھی موسوم فرمایا تو ثابت ہوا وہی بات ٹھیک ہے جو ہم نے بیان کی ہے کہ ایمان و اسلام اور معرفت و توحید میں فرق لغوی اور لفظی طور پر ہے اور حقیقت میں سب ایک ہے۔

اور حضور ﷺ کے ارشاد مبارک کے معنی یہ ہیں کہ نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ ادا کرنا مسلمان کے فعل اور علامت ہیں اور یہی ہم کہتے ہیں۔

نواں قول

ایمان کا بیان (ایمان مخلوق ہے یا غیر مخلوق؟)

ایمان کے مخلوق یا غیر مخلوق ہونے کے بارے میں فقہاء کا اختلاف ہے۔ بعض فقہاء فرماتے ہیں کہ ایمان غیر مخلوق ہے۔

عام فقہاء کا مسلک ہے کہ ایمان مخلوق ہے۔

ایمان کو غیر مخلوق کہنے والوں کی دلیل

جو حضرات ایمان کو غیر مخلوق مانتے ہیں وہ اس آیت سے استدلال کرتے ہیں: ”شہد

اللَّهُ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ“ (آل عمران: ۱۸) اللہ تعالیٰ نے گواہی دی کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور دوسری آیت ”كَلِمَةُ اللَّهِ هِيَ الْعُلْيَا“ (التوبہ: ۴۰) اللہ تعالیٰ کا کلمہ ہی بلند ہے (یعنی اللہ ہی کا بول بالا ہے)۔ اس سے مراد ایمان ہے۔

تیسری آیت: ”إِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ“ (الفاطر: ۱۰) اسی کی طرف پاکیزہ کلام چڑھتا ہے۔ اس سے بھی ایمان مراد ہے۔

چوتھی آیت: ”وَمَنْ يَكْفُرْ بِالْإِيمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهُ“ (المائدہ: ۵) اور جو ایمان کے ساتھ کفر کرے تو اس کا عمل ضائع ہو گیا۔ ان آیات سے ثابت ہوا کہ ایمان غیر مخلوق ہے۔

جواب: اس کا جواب یہ ہے کہ ہم کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں صفت ایمان بیان فرمائی ہے اور رہی یہ آیات تو یہ بعینہ ایمان نہیں۔

دلیل: اس کی دلیل یہ ہے کہ اگر کوئی کافر تمام قرآن پاک اول سے آخر تک پڑھے ان آیات سمیت اور ان کی تصدیق نہ کرے تو اس کے اسلام کا حکم نہیں کیا جائے گا۔ ثابت ہوا کہ یہ ایمان نہیں بلکہ یہ اللہ کا کلام ہے اور غیر مخلوق ہے یعنی کلام اللہ غیر مخلوق ہے۔

ایمان کے مخلوق ہونے پر دلیل

ایمان مخلوق ہے اس پر دلیل یہ ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ایمان و کفر مخلوق ہیں اور یہ دونوں متضاد ہیں۔

اور حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ایمان کو پیدا فرمایا اور اس کو جواں مردی و حیا کے پردہ میں ڈھانپ دیا اور کفر کو پیدا کیا اور اسے بخل و جفاء سے ڈھانپ دیا۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضور اقدس نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے عرش کے نیچے ایمان سے زیادہ محبوب کوئی چیز پیدا نہیں فرمائی۔ ان دلائل سے ثابت ہوا کہ ایمان مخلوق ہے اور اس لیے کہ ایمان بندہ کی صفت ہے کیونکہ بندہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لایا اور بندے کا خدا پر ایمان لانا اس کی صفت ہے اور صفت بندہ بالاتفاق مخلوق ہے۔

اور اس لیے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ”وَقَالَ رَجُلٌ مُؤْمِنٌ مِّنْ آلِ فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ

إِيْمَانُهُ“ (المؤمن: ۲۸) اور فرعون والوں میں سے ایک مسلمان مرد کہ اپنے ایمان کو چھپاتا تھا نے کہا اور اگر ایمان مخلوق نہ ہوتا تو اس کا چھپانا اس کے فعل سے ناممکن تھا اور اصح یہ ہے جو ہم کہتے ہیں کہ بندہ کا ایمان اللہ تعالیٰ کی طرف طلب اور قبول و اقرار اور تصدیق و ثبات اور جو ہو اللہ کی طرف امر و ہدایت توفیق اور ثبات اور لیکن بندہ بلا خلاف مجموعہ صفاتہ مخلوق (اور بندہ کی ساری صفتیں نو پیدا ہیں) اور اللہ تعالیٰ قدیم ہے اور اسی طرح اس کی ساری صفتیں قدیم ہیں اور اس پر حدوث طاری نہیں ہوتا۔

ایمان کی دو قسمیں ہیں

(۱) ایک ایمان مکتوب من اللہ تعالیٰ وہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے: ”كُتِبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيْمَانُ“ (المجادلہ: ۲۲) کہ ان کے دلوں میں ایمان لکھا۔

(۲) اور دوسرے ایمان محکوم وہ بندے کا فعل ہے تو مکتوب اللہ غیر مخلوق ہے اور محکوم علیہ مخلوق ہے۔

مہدی ابوشکور سالمی فرماتے ہیں: مجھ سے کسی نے پوچھا کہ ایمان مخلوق ہے یا غیر مخلوق؟ میں نے کہا: ایمان کیا ہے؟ اس نے کہا: ”لا الہ الا اللہ“ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ میں نے کہا: یہ غیر مخلوق ہے اور ایک اور شخص نے مجھ سے پوچھا: ایمان مخلوق ہے یا غیر مخلوق؟ میں نے کہا: ایمان کیا ہے؟ اس نے کہا: اقرار باللسان اور تصدیق بالقلب۔ میں نے کہا: یہ مخلوق ہے۔

دسواں قول

ایمان کے محل اور اس کی بقاء کا بیان

ایمان کہاں ہوتا ہے؟ اس بات پر اجماع ہے کہ ایمان کا محل اور مقام قلب و زبان ہے۔ قلب محل اعتقاد ہے اور زبان محل اقرار ہے اور یہ دونوں (اعتقاد و اقرار) ایمان کے رکن ہیں یہ اہل سنت و جماعت کا مسلک ہے۔

اقرار و تصدیق عرض ہیں اس لیے کہ یہ دونوں بندے کی صفت ہیں اور عرض دو زمانوں

تک باقی نہیں رہتی، لیکن ایمان کا حکم ہمیشہ باقی رہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ باقی رکھتا ہے۔ پھر یہ کہ عرض اگر چہ فنا ہو جائے کوئی شخص ایمان کے حکم سے خارج نہیں ہوتا۔ اس کی نظیر یہ ہے کہ مثلاً نکاح ایجاب و قبول کا نام ہے اور ایجاب و قبول دو عرض ہیں، وہ دو زمانہ تک باقی نہیں رہتے ایجاب و قبول جب پائے جائیں گے تو نیست و نابود ہو کر رہ جائیں گے، مگر اس کا حکم باقی رہتا ہے (حکم یعنی نفع اٹھانا حلال رہتا ہے) جب تک ایسی چیز نہ پائی جائے جو نکاح کو ختم کرنے والی ہو یا اس کے منقض ہو جیسے طلاق وغیرہ تو ایسے ہی اقرار و تصدیق اگر چہ فنا ہو جائیں مگر حکم ایمان باقی رہتا ہے بلکہ حکم ایمان اتوی و موؤ کہ ہے۔

تو لفظ اقرار کی فناء اور تصدیق کی فناء جو بندہ کے دل کا عمل ہے اور عمل حکم ایمان کی فناء کا موجب و باعث نہیں ہو سکتا، جب تک ایمان کی ضد و نقیض عارض نہ ہو اور وہ (ضد) کفر ہے۔

تو ہم کہتے ہیں کہ مؤمن جب ایک بار ایمان لایا تو اس کے مؤمن ہونے کا حکم دیا جائے گا، اگرچہ اس کے بعد ہزار مرتبہ اقرار کرے کہ پہلا اقرار ہی ایمان ہے اور بعد کے اقرار اسی پہلے اقرار کی تکرار ہیں اور اگر ایک مرتبہ اقرار کرنے کے بعد پھر کبھی اقرار نہ کیا تو اگرچہ برسوں زندہ رہا تو اس کے کفر کا حکم نہیں دیا جائے گا، جب تک ایمان کی ضد ظاہر نہ ہو اور اگر اسی اقرار کے بعد مر جائے تو اس کو مؤمن قرار دیا جائے گا اور اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی، جب تک ایمان کے خلاف کوئی بات نہ پائی جائے۔ پس اگر کہا جائے کہ مؤمن جب مر جائے تو اس کا ایمان جسم کے ساتھ تھا یا روح کے ساتھ؟

ہم کہتے ہیں کہ اس کا ایمان اللہ تعالیٰ کے حکم میں ہے نہ جسم میں اور نہ روح کے ساتھ، ہاں! جسم و روح مؤمن ہیں بہ حکم ایمان، اللہ کے حکم میں جیسے حالت حیات میں کہ ایمان نہ روح کے ساتھ تھا اور نہ جسم کے ساتھ اور نہ دونوں کے ساتھ، لیکن ایمان روح و جسم سے (قائم) ہوتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ ایمان نہ بندہ میں اور نہ بندہ ایمان میں لیکن بندہ حکم ایمان میں ہے اللہ تعالیٰ کے حکم سے اور ایمان و عبد دونوں اللہ تعالیٰ کے حکم میں ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم

گیارہواں قول

نزع کے وقت ایمان کا زوال جائز ہے یا نہیں؟

اس پر ہمارا اجماع ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام سے ایمان کا زوال قطعاً جائز نہیں اور پہلے بھی اس کا ذکر ہو چکا ہے۔

رہا صحابہ کرام کا ایمان کہ وقتِ نزع ان کا زوال جائز ہے یا نہیں؟

تو جاننا چاہیے کہ صحابہ کرام کے دو فریق ہیں۔ ایک فریق وہ ہے جن کے مامون ہونے کی حضور اقدس ﷺ نے پہلے ہی بشارت دے دی وہ نقباء و عشرہ مبشرہ ہیں، یوں ہی حضرات حسنین کریمین کہ ان کے حق میں حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”ہما سیدا شباب اهل الجنة“ وہ دونوں (حسین کریمین علیہما السلام) اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اور ان کی مانند جس جس کو جنت کی بشارت و شہادت دی گئی ہے کہ یہ جنتی ہیں تو ان حضرات کے ایمان کے زائل ہونے کا امکان نہیں کہ حضور ﷺ کا فرمان حق ہے اور جیسا فرمایا: ایسا ہی ہوگا۔

رہے وہ صحابہ کرام جن کے حق میں حضور اقدس ﷺ نے جنت کی بشارت نہیں دی، ان کے متعلق حکم یہ ہے کہ ہم ان کا ذکر بھلائی کے ساتھ کریں گے لیکن ہمیں ان کے قطعی جنتی ہونے کا حکم کرنے کا حق نہیں پہنچتا اور نہ قطعی ناری ہونے کا حکم کریں لیکن غیر صحابہ کے لیے جس قدر ہم امید کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو جنت میں داخل کرے گا، اس سے کئی درجات زیادہ ان کے جنتی ہونے کی امید رکھتے ہیں۔ اب رہے دیگر مؤمنین اور کافرین تو ان میں سے کسی کو متعین کر کے قطعی جنتی یا دوزخی نہیں کہہ سکتے۔ ہاں! یوں کہیں گے کہ جو ایمان کے ساتھ مراوہ جنتی ہے اور جو کفر پر مراوہ جہنمی ہے۔ ہاں! فی الجملہ یہ کہتا جائز ہے کہ مؤمنین سب جنت میں کفار سب جہنم میں ہوں گے۔

اور اہل سنت و جماعت کے نزدیک بد اعمالی کے سبب بوقتِ معاینہ ایمان کے سلب ہو جانے سے مامون و محفوظ ہونا جائز نہیں، ہر عاصی کو سلب ایمان سے محفوظ کیونکر مانا جائے؟

مرجیہ اور مسئلہ ایمان

مرجیہ کہتے ہیں کہ جب ایک مرتبہ ایمان حاصل ہو گیا تو پھر معاصی اس کو نقصان نہیں دیں گے۔

دلیل: اور دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ ایمان اللہ تعالیٰ کی عطا ہے اور اس کی عطا میں تبدیل و خلع جائز نہیں اس لیے کہ یہ تو ایک نعمت دے کر واپس لینا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق نہیں کہ کسی کو نعمت عطا فرما کر واپس لے۔

اہل سنت کی طرف سے جواب

اہل سنت و جماعت مرجیہ کی اس دلیل کا جواب یہ دیتے ہیں کہ یہ عطیہ میں رجوع نہیں، نہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے عطا فرما کر (نعمت ایمان) واپس لے لیا بلکہ بندہ نے اس کی قدر نہیں کی اور اس کی نعمت کو ٹھکرا دیا اور اس کا حق ادا نہ کیا۔

جیسا کہ قرآن پاک میں ارشاد ہوا: "فَلَا يَأْمَنُ مَكْرَ اللَّهِ إِلَّا الْقَوْمُ الْخَاسِرُونَ" (الاعراف: ۹۹) اللہ تعالیٰ کی خفیہ تدبیر سے سوائے گھائے والوں کے کوئی بے خوف نہیں ہوتے اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "سَنَسْتَدْرِجُهُم مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُونَ" (الاعراف: ۱۸۴) ہم عنقریب انہیں آہستہ آہستہ (عذاب کی طرف) لے جائیں گے جہاں سے نکلنا وہ جانتے نہ ہوں۔

حضرت سیدنا امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: اکثر ایمان معاینہ عذاب کے وقت سلب ہوتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ نزع (جان کنی) سے قبل ایسے امور کا مرتکب ہوا کہ حرام قطعی کو حلال جانا یا حلال کو حرام جانا یا از روئے جہالت کلمہ کفر کہایا کفر یہ فعل کا مرتکب ہوا یا بے علمی میں ایسی بات کی جس میں اسلام کا رد ہوتا ہے اور توبہ نہ کی اور

۱۔ ورنہ اس کی شان تو یہ ہے جو اعلیٰ حضرت قدس سرہ نے ایک شعر میں فرمایا۔

تو نے اسلام دیا تو نے جماعت میں لیا تو کریم رب کہیں پھرتا ہے عطیہ تیرا

تو اس نے اپنا انعام واپس نہیں لیا بلکہ بندہ نے اس کی جیسے چاہے تھی قدر نہیں کی اور اپنی

بد اعمالیوں اور بُری کرتوتوں کے باعث اس کے عطیہ (ایمان) کو رد کر دیا۔

۲۔ جیسے بت کو سجدہ کیا، یا قشقہ لگایا اور جینو پہنا وغیرہ شعار کفر استعمال کیے۔ ۱۲ سیدی ابوالبرکات

جب عذاب الہی کا معائنہ کیا تو اس وقت توبہ قبول نہیں اور اس وقت یہ توبہ نفع نہ دے گی۔
خاتمہ بالا ایمان کے لیے بہترین وظیفہ

اس لیے ہر مؤمن بندہ پر لازم ہے کہ وہ روزانہ یہ دعا پڑھ لیا کرے:

”اللهم انى اعوذ بك من ان اشرك بك شيئا وانا اعلم به
واستغفرك بما لا اعلم به تبت عنه وتبرأت من الكفر والشرك والمعاصي
كلها واقول لا اله الا الله محمد رسول الله صلى الله تعالى عليه و آله
وصحبه وبارك وسلم“ الہی! میں پناہ مانگتا ہوں کہ میں تیرے ساتھ کسی ایسی چیز کو
شریک کروں جسے میں جانتا ہوں اور معافی مانگتا ہوں جسے میں نہیں جانتا، میں کفر و شرک اور
سب گناہوں سے توبہ کرتا ہوں اور کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی مستحق عبادت نہیں اور محمد
ﷺ اللہ تعالیٰ کے سچے رسول ہیں، اللہ تعالیٰ حضور ﷺ ان کی آل اور اصحاب پر اپنی خاص
رحمتیں نازل فرمائے۔ (آمین)



آٹھواں باب

ایمان کی شرائط کا بیان

شرائط ایمان کے بیان میں انیس قول ہیں۔

مہدی ابوشکور سالمی نے فرمایا: جاننا چاہیے کہ ایمان کی شرطیں وہ ہیں جو حضور اقدس ﷺ نے بیان فرمائی ہیں:

(۱) اللہ تعالیٰ پر ایمان

(۲) اللہ تعالیٰ کے فرشتوں پر ایمان

(۳) اس کی کتابوں پر ایمان

(۴) اس کے رسولوں پر ایمان

(۵) آخرت پر ایمان

(۶) خیر و شر کی تقدیر من اللہ پر ایمان (یہ ایمان لانا کہ اچھا بھلا اللہ کی تقدیر سے ہے)

(۷) موت کے بعد اٹھنے پر ایمان

اصل ایمان اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا ہے اور اس کا وصف اور حکم ہم بیان کر چکے ہیں پھر

فرشتوں پر ایمان لانا ہے۔

تو اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ہم کہتے ہیں: جاننا چاہیے کہ تمام فرشتے اللہ

تعالیٰ کے بندے اور مخلوق ہیں اور کفر سے معصوم پاک صاف اور فرماں بردار و اطاعت کیش

ہیں۔

ابلیس جن تھا یا فرشتہ

سوال: اگر کہا جائے کہ ابلیس نے کفر کیا حالانکہ وہ فرشتوں میں سے تھا؟ (پھر معصوم کیونکر

ہوئے؟)

جواب: ہم کہتے ہیں کہ اس میں فرشتوں کے اوصاف در آئے تھے اور عبادت کے ذریعے وہ

فرشتوں کے مرتبہ پر فائز تھا لیکن درحقیقت وہ فرشتہ نہ تھا۔

ابلیس فرشتہ نہیں تھا

دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”إِلَّا ابْلِيسَ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ أَمْرِ رَبِّهِ“ (الکہف: ۵۰) سوائے ابلیس کے کہ وہ جنوں سے تھا تو اپنے رب کے حکم سے نکل گیا، یعنی ابلیس جنوں سے تھا اس نے اپنے رب کے حکم کی نافرمانی کی۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ وہ شہوت سے پیدا ہوا اور اس پر شہوت سوار ہو گئی۔ تو ثابت ہوا کہ اصل خلقت میں فرشتوں میں سے نہ تھا برائے نام فرشتہ ہونے سے فرشتوں میں شمار ہوا۔

ہاروت و ماروت فرشتے تھے یا آدمی؟

سوال: اگر یہ کہا جائے کہ ہاروت و ماروت کے بارے میں تم کیا کہتے ہو؟

جواب: ہم نے کہا: ان کے متعلق لوگوں کا اختلاف ہے۔

بعض نے کہا: یہ دو بادشاہ تھے (ملکین لام کی زیر کے ساتھ پڑھیں تو) اور صحیح یہ ہے کہ وہ دونوں فرشتے تھے (یعنی ملکین کے لام پر زبر پڑھو تو) اور اس پر ہمارا اجماع ہے کہ ان سے کفر کا صدور نہیں ہوا اور ان کے حال کی کیفیت نص میں مذکور نہیں اور نہ ان کے دین کا حال معلوم اور جب نص میں ان کا حال اور دین مذکور نہیں تو ان کے متعلق کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ پھر یہ کہ ان کا عمل کبیرہ گناہ بھی نہیں اس لیے کہ ان پر عقوبت واجب نہیں کیونکہ عقوبت آخرت میں واجب ہوتی ہے اور انہیں آخرت میں عذاب نہیں ہوگا اور دنیا میں عذاب کبھی بطور جزاء ہوتا ہے اور کبھی بطور معاتبہ ہوتا ہے اور علی وجہ المعاتبہ جائز ہے جیسے انبیاء کرام سے اگر لغزش و سہو واقع ہو تو ان کو سختی اور مشقت پہنچتی ہے۔

انبیاء کرام پر عتاب جائز ہے؟

اور ان پر عتاب جائز ہے جیسے موسیٰ علیہ السلام پر عتاب ہوا کہ بے ہوش کر دیئے گئے جیسا کہ قرآن پاک میں ہے: ”خَرَّ مُوسَىٰ صَعْقًا“ (الاعراف: ۱۴۳) موسیٰ (علیہ السلام) بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ پھر موسیٰ علیہ السلام نے کہا: ”إِنِّي تَبْتُ إِلَيْكَ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُؤْمِنِينَ“ (الاعراف: ۱۴۳) میں تیری طرف رجوع کرتا ہوں اور میں سب سے پہلا مسلمان ہوں۔

فرشتوں پر عتاب ہو سکتا ہے

اور ایسے ہی اگر فرشتوں سے کوئی لغزش ہو تو ان پر عتاب ہو سکتا ہے۔

اگر کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں (ہاروت و ماروت) کے بارے میں خبر دی: ”إِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ فَيَتَعَلَّمُونَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُونَ بِهِ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهِ وَمَا هُمْ بِضَارِّينَ بِهِ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ وَيَتَعَلَّمُونَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ“ (البقرہ: ۱۰۲) ”ہم تو صرف آزمائش ہیں تو تم کفر مت کرو پس وہ ان دونوں سے وہ سیکھتے جس کے ذریعہ وہ مرد اور اس کی بیوی کے درمیان جدائی ڈالیں اور وہ کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتے مگر اللہ تعالیٰ کے حکم سے اور وہ سیکھتے ہیں جو ان کو نقصان دے اور نفع نہ دے۔“ ظاہر سی بات ہے کہ ضرر رسانی (نقصان پہنچانا) حرام ہے اور کفر کا ذریعہ و سبب بننا بھی حرام ہے۔

جواب: ان آیات کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ یہ دونوں فرشتے (ہاروت و ماروت) لوگوں کو ڈراتے ہیں و عظ کرتے ہیں کہ ”إِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ“ اور پھر یہ کہ لوگ ان سے جادو کو سمجھنے کی حد علم سحر سیکھتے ہیں۔

اور یہ تو معلوم ہی ہے کہ کچھ جادو سیکھنا حلال و جائز ہے، لیکن اس پر عمل کرنا حرام ہے اور یہ دونوں (ہاروت و ماروت) لوگوں کو اس پر عمل کرنے سے روکتے اور ڈراتے ہیں اور لوگوں کو بتاتے ہیں کہ جادو کو حلال جاننا باعثِ فتنہ اور نقصان ہے اور سبب کفر ہے اور مخلوق کا ان سے سیکھنا تو یہ کفرِ تعلم سے حاصل ہوا نہ کہ تعلیم سے لہذا اعتراض لازم نہیں آتا۔

بعض فرشتے رسول ہیں

فرشتوں میں سے بعض اللہ تعالیٰ کے پیغمبر ہوتے ہیں جیسے کہ جبرائیل، میکائیل، اسرافیل، عزرائیل علیہم السلام مخلوق کی طرف سے اللہ تعالیٰ کے فرستادہ پیغمبر ہیں اور تمام ملائکہ نبوت و رسالت کے درجے پر ہوتے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ”تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا“ (الانعام: ۱۶) ہمارے رسل (فرشتے) اس کی روح قبض کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ”بِأَيْدِي سَفَرَةٍ“

انبیاء کرام صغائر و کبار سے معصوم ہوتے ہیں ایسے ہی ملائکہ معصوم ہیں۔ لغزش، ذہول اور بھول

سے معصیت (گناہ) نہیں۔ ۱۲ سیدی ابوالبرکات

کِرَامِ بَرَزَةٍ ۝“ (العنکبوت: ۱۵-۱۶) ایسوں کے ہاتھ لکھے ہوئے ۝ معزز اور نیکو کار ۝ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”لَا يَعْصُونَ اللَّهَ مَا أَمَرَهُمْ“ (التحریم: ۶) وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے۔

دوسری بات یہ ہے کہ تمام فرشتے اللہ کے رسول ہیں اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا“ اور رسولان کرام اللہ تعالیٰ کے امین اور سفیر ہوتے ہیں اور وہ نبوت کے مرتبے پر فائز ہیں۔ اس لیے کہ جبرئیل علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے احکام پہنچاتے ہیں اور جسے جبرئیل کی زبان سے اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچے وہ نبی اور رسول ہوتا ہے۔

اس پر دلیل یہ ہے کہ ان سے بغض رکھنا اور انہیں گالی دینا سب و شتم کرنا جائز نہیں ہے اور جس شخص نے کسی فرشتے کو گالی دی یا اس سے بغض رکھا تو وہ کافر ہو گیا جیسا کہ نبیوں سے بغض رکھنے والا یا انہیں سب و شتم کرنے والا کافر ہو جاتا ہے۔

اور جو کسی نبی یا فرشتے کا حقارت کے ساتھ گھٹیا انداز میں ذکر کرتا ہے وہ کافر ہے۔ اس پر دلیل اللہ تعالیٰ کا قول ہے: ”مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِلَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَرُسُلِهِ وَجِبْرِيلَ وَمِيكَالَ فَإِنَّ اللَّهَ عَدُوٌّ لِلْكَافِرِينَ“ (البقرہ: ۹۸) جو اللہ تعالیٰ اس کے فرشتوں اس کے رسولوں جبرائیل اور میکائیل کا دشمن ہو تو بے شک اللہ تعالیٰ کافروں کا دشمن ہے اور نبی مکرم ﷺ سے مروی ہے آپ نے ارشاد فرمایا کہ جس نے نبی کو گالی دی ہو اسے قتل کر دیا جائے اور جو نبی کے صحابہ کو گالی بکتا ہو اس پر حد جاری کی جائے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ”اللَّهُ يَضْطَفِي مِنَ الْمَلَائِكَةِ رُسُلًا وَمِنَ النَّاسِ“ (الحج: ۷۵) اللہ تعالیٰ فرشتوں اور لوگوں میں سے رسول جن لیتا ہے۔ اس کی تحقیق یہ ہے کہ فرشتوں پر ایمان لانا ایسے ہی واجب ہے جس طرح نبیوں پر اور اللہ تعالیٰ کی کتابوں پر تو ضروری ہوا کہ فرشتے بھی انبیاء کرام علیہم السلام کے مرتبہ میں ہوں۔

دوسرا قول

اللہ تعالیٰ کی کتابوں پر ایمان لانے کا بیان

یہ بات ذہن نشین رہے کہ اللہ تعالیٰ کی سب کتابیں اس کا کلام ہیں اور یہ کلام جو اللہ

تعالیٰ کی طرف سے وحی کی صورت میں نازل ہوتا رہا، مخلوق نہیں ہے اور اس کا سب کلام واحد ہے۔

اللہ تعالیٰ کی کسی کتاب یا اس کے کسی فرمان کا انکار کرنے والا کافر ہے
جو شخص اللہ تعالیٰ کی کسی کتاب کا انکار کرتا ہے یا کسی ایک کلمے کا انکار کرتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام نہیں ہے، وہ کافر ہے۔

کیا اللہ تعالیٰ کی سب کتابیں ایک درجے کی ہیں؟

اللہ تعالیٰ کی کتابوں میں کلام ہونے کے پہلو سے کوئی فرق نہیں اور سب الہیہ میں سے کسی کتاب کو دوسری کتاب پر کلام الہی ہونے کے حوالے سے کوئی فضیلت اور برتری حاصل نہیں، سب اس کا کلام ہے۔

ہاں! کتابت و تلاوت اور تنزیل کے لحاظ سے روا اور جائز ہے کہ ایک کو دوسری پر فضیلت ہو، جیسے ہم کہتے ہیں کہ قرآن مجید اول سے آخر تک اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور بعض کو بعض پر فضیلت دینا ہے جائز نہیں۔ ہاں! کتابت و تلاوت اور قراءت میں فضیلت دینا جائز ہے، جیسے احادیث مبارکہ میں آتا ہے کہ سورت اخلاص کے پڑھنے والے کو اتنا ثواب ملتا ہے جب کہ اس کے مقابل سورت تبت کے پڑھنے والے کو اس کی نسبت اتنا ثواب نہیں ملتا۔ دراصل یہ فضیلت پڑھنے والے کے اس اعتقاد کی طرف لوٹتی ہے، جو اس نے اختیار کیا کہ اس میں مرے رب کی صفات ہیں اور اس کا خالص ذکر ہے تو اس کا پڑھنا بہ نسبت سورت تبت وغیرہ کے افضل ہے، اسی طرح اس مقام کو سمجھنا چاہیے۔

چار کتابیں سب سے افضل ہیں

چار کتابیں افضل الکتب ہیں: تورات، انجیل، زبور، قرآن مجید اور ان چاروں میں سے قرآن پاک افضل ہے۔

۱۔ کہ سب کتابیں اللہ تعالیٰ کا کلام ہیں اور اللہ تعالیٰ کا کلام ہونے کے اعتبار سے ایک کو دوسرے پر فضیلت نہیں۔ ۱۲ سیدی ابوالبرکات

قرآن مجید نے سب کتابوں کو منسوخ کر دیا

اس پر ہم سب کا اجماع ہے کہ گزشتہ کتابوں کو پڑھنا اور لکھنا قرآن کریم کی قراءت و کتابت اور نزول کے ساتھ منسوخ ہو گیا ہے۔

کیا سابقہ کتب الہیہ کے احکام قرآن سے منسوخ ہو چکے ہیں؟

اب رہا یہ مسئلہ کہ قرآن پاک کے احکام کے ساتھ کتب ماضیہ کے احکام منسوخ ہو گئے ہیں یا نہیں؟

امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہر وہ حکم جو سابقہ کتب میں تھا اس کا نسخہ قرآن پاک احادیث رسول (ﷺ) اجماع امت یا قیاس جلی جو نسخہ پر دال اور اس کا مقتضی ہو ان سے منسوخ ہو گا اور جس حکم کے منسوخ ہونے کا قرآن حدیث اجماع یا قیاس جلی تقاضا نہ کرنا ہو وہ بہ دستور سابق مشروع اور جائز ہوں گے تو ایسے احکام بحال اور باقی رہیں گے۔

تمام احکام سابقہ منسوخ نہیں

پس قرآن مجید تمام احکام سابقہ کا نسخہ نہیں ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "فَرَع لَكُمْ مِنَ الدِّينِ مَا وُضِيَ بِهِ نُوحًا" (الشوریٰ: ۱۳) تمہارے لیے وہ دین شروع کیا جس کی وصیت اس نے نوح (علیہ السلام) کو کی اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "مِلَّةَ اٰبِيكُمْ اِبْرٰهِيْمَ" (الحج: ۷۸) تمہارے باپ ابراہیم (علیہ السلام) کا دین۔

امام شافعی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ قرآن کریم احکام سابقہ کا نسخہ ہے خواہ نسخہ پایا جائے یا نہ پایا جائے اور اس مسئلہ کا اصل مقام اصول فقہ ہے۔

تیسرا قول

رسولوں پر ایمان

تمام فقہاء اہل سنت و جماعت کا اجماع ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں اور بنی آدم سے ہیں تمام انبیاء کرام معصوم ہی پیدا کیے گئے ہیں انہیں اللہ تعالیٰ کی

طرف سے تائید و قوت حاصل ہوتی ہے اور عقل و عبادت میں کامل ہوتے ہیں۔ انبیاء کرام کے اعمال کو ناقص کہنا جائز نہیں اگرچہ ان کا عمل کم ہو مگر کامل وافر اور تام ہوتا ہے۔ سب انبیاء کرام کا ایک دین، ایک ملت، ایک اسلام ہے اور تمام ملت حنیفہ پر ہوتے ہیں۔

تمام انبیاء کرام پر خواہ ان کے نام و تعداد معلوم ہو یا نہ ہو، ایمان لانا واجب ہے جو ان میں سے کسی کا انکار کرے وہ کافر ہے۔

سوال: اگر کسی سے پوچھا جائے کہ تو فلاں نبی پر ایمان لایا ہے حالانکہ یہ شخص اس نبی کا نام نہیں جانتا تو اس کا کیا جواب دینا چاہیے؟

جواب: اگر کوئی کہے کہ بتا کہ تو فلاں پیغمبر پر ایمان لایا ہے اور وہ اس کا نام نہیں جانتا تو مطلقاً نفی و اثبات (ہاں یا نہ) میں جواب نہ دے کہ ممکن ہے کہ وہ نبی ہو اور ہو سکتا ہے کہ وہ نبی نہ ہو۔

صحیح جواب: یوں کہے کہ اگر وہ نبی ہے تو میں اس پر اور اللہ تعالیٰ کے تمام انبیاء و مرسلین پر ایمان لایا اور اگر وہ نبی نہیں ہے تو پھر میں غیر نبی کو نبی نہیں مانتا۔

انبیاء کرام کی صحیح تعداد کیا ہے؟

انبیاء کرام کی صحیح تعداد کے متعلق کوئی نص قطعی وارد نہیں ہوئی، البتہ نبی کریم ﷺ سے ایک روایت میں ایک لاکھ چوبیس ہزار اور ایک روایت میں دو لاکھ چوبیس ہزار اور جب تعداد کے بیان میں مختلف روایتیں بہ طریق آحاد مروی ہیں تو قطع و یقین کے ساتھ عدد کی تعیین نہیں کر سکتے تو بغیر گنتی و شمار اور کسی حتمی تعداد کی حد اور تعیین کے تمام انبیاء و مرسلین صلوات اللہ علیہم اجمعین پر ایمان لائے۔

کیا کوئی عورت نبی ہوئی ہے؟ عورتوں میں سے کوئی نبیہ ہوئی ہے یا نہیں؟ بعض فقہاء فرماتے ہیں کہ کوئی عورت نبی نہیں اور بعض فقہاء کہتے ہیں کہ چار عورتوں کو نبوت ملی، جیسا کہ ایک روایت میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ چار نبیات ہیں: حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ، مریم، سارہ، حوا۔ بعض فقہاء نے اس روایت کو غیر صحیح قرار دیا ہے۔

پھر ہم یہ کہتے ہیں: اگر یہ روایت ثابت ہو تو ہم کہیں گے کہ ہمارا تمام انبیاء و مرسلین خواہ مذکر ہوں یا مؤنث ایمان ہے اور اگر ثابت نہیں ہے تو نہیں، لیکن عورت ہونا رسالت کے

منافی ہے کیونکہ یہ تو پردے کی مقتضی ہے۔

چوتھا قول

حضور پر نور سید المرسلین ﷺ پر ایمان لانے کا بیان

جاننا چاہیے کہ ہر عاقل پر واجب ہے کہ وہ حضور پر نور ﷺ پر اس طرح ایمان لائے کہ حضور ﷺ اللہ تعالیٰ کے رسول تھے اور اب بھی اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں اور جیسا کہ پہلے بھی ذکر ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی نبی کو منصب نبوت سے معزول نہیں فرماتا (نبوت کا سلب ہو جانا یا اس سے معزول کر دینا جائز نہیں) اور یہ ایمان لائے کہ حضور خاتم النبیین ہیں اور آپ کے بعد کسی نبی کا آنا جائز نہیں سوائے عیسیٰ علیہ السلام کے کہ وہ حضور کے بعد آسمان سے نزول فرمائیں گے اور ان کی ملت اور شریعت حضور سے پہلے تھی اور ان کی وفات نزول کے بعد ہوگی اور حضور کے بعد کوئی پیدا نہیں ہوگا۔

روافض کا عقیدہ کفر ہے

روافض کہتے ہیں کہ کوئی زمانہ نبی سے خالی نہیں ہو سکتا ہر زمانہ کا نبی ہوتا ہے یہ کفر صریح ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ" (الاحزاب ۴۰) اور نبیوں کی نبوت ختم کرنے والا اور جو ہمارے زمانہ میں نبوت کا دعویٰ کرے وہ قطعی طور پر کافر ہے کہ اس نے نص قطعی میں شک کیا اور یہ اعتقاد رکھنا واجب ہے کہ حضور ﷺ کی نبوت میں کوئی شریک نہیں۔

اس کے برخلاف روافض یہ کہتے ہیں کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم نبوت میں حضور ﷺ کے شریک تھے یہ عقیدہ ان کا کفر ہے اور یہ اعتقاد کرنا واجب ہے کہ حضور اقدس ﷺ تمام مخلوق سے زیادہ علم رکھتے ہیں اور حضور تمام مخلوق سے افضل ہیں۔ عقیدہ کفر: اس کے خلاف رافضیوں نے کہا کہ حضرت علی حضور سے بھی افضل اور زیادہ علم والے تھے یہ عقیدہ بھی ان کا کفر ہے۔

۱۔ جب کہ انبیاء کرام اور رسولوں کا کام کھلم کھلا اپنوں اور بیگانوں سے ملنا ہے۔ ۱۲ شرف قادری

عقیدہ کفر ۲: بعض رافضیوں نے کہا کہ نبوت درحقیقت حضرت علی کے لیے تھی اور جبریل امین نے غلطی سے حضور کو وحی کر دی یہ عقیدہ بھی کفر ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: "مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰهِ" (الفتح: ۲۹) محمد اللہ کے رسول ہیں۔

اور اس لیے کہ رافضیوں نے اللہ تعالیٰ کو جہل کے ساتھ موصوف کیا اس لیے کہ ملائکہ سے غلطی ناممکن ہے تو اللہ تعالیٰ سے غلطی کیسے ہو سکتی ہے؟

حشو یہ کا عقیدہ

بعض حشو یہ کہتے ہیں کہ حضرت عزرائیل علیہ السلام نے فلاں کی روح قبض کرنے میں غلطی کی مدینہ سے یا روم سے اور یہ عقیدہ کفر ہے اس لیے کہ زندگی اور موت کا خالق تو اللہ تعالیٰ ہے۔ اگر بالفرض عزرائیل روح قبض کرنے میں غلطی کرے تو اللہ عزوجل کے ابطال حیات اور ایجادِ ممات میں کیسے غلطی ہو سکتی ہے؟ اور جب عزرائیل سے غلطی ہو سکتی ہے تو پھر جبریل سے بھی غلطی ہو سکتی ہے اور جب جبریل غلطی کر سکتے ہیں تو ہو سکتا ہے کہ وحی رسالت حضرت علی کو تھی اور وہ غلطی سے "معاذ اللہ" حضور کو دے گئے تو ہو سکتا ہے کہ وحی "معاذ اللہ" فرعون کو تھی اور موسیٰ علیہ السلام کو دے دی گئی لہذا جو وحی میں حضرت جبریل کی غلطی کا قائل ہو یا حضرت عزرائیل کے روح قبض کرنے میں غلطی کا قائل ہو وہ یقیناً کافر ہے اور اس میں کسی کا اختلاف نہیں۔

حضرت علی حضور سے زیادہ علم رکھتے تھے؟

جو کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور ﷺ سے زیادہ علم رکھتے تھے جیسے حضرت خضر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے زیادہ جانتے تھے اور حضرت علی کو کونین کا علم تھا جیسا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت علی کو کونین کا علم تھا۔ ہم اس کا یہ جواب دیتے ہیں کہ حضرت علی کو حضور اقدس ﷺ کی تعلیم سے کونین کا علم حاصل تھا۔

دلیل یہ ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم فرماتے ہیں کہ مجھ کو نبی کریم ﷺ نے یمن کا قاضی بنا کر بھیجا چاہا تو میں نے عرض کی: حضور! میں قاضی کے فرائض انجام دینے کے قابل نہیں تو حضور ﷺ نے تبسم فرمایا اور ارشاد ہوا کہ اپنا منہ کھول۔ میں نے اپنا منہ کھولا تو

حضور اقدس ﷺ نے اپنا لعاب دہن میرے مُنہ میں ڈال دیا، اس کی برکت سے کبھی کسی فیصلے میں اشتباہ نہیں ہوا، تو ثابت ہوا کہ حضرت علی جو کچھ جانتے تھے وہ حضور اقدس ﷺ کی تعلیم اور لعاب دہن کی برکت تھی۔

اور ان کا یہ کہنا کہ حضرت علی بہ منزلہ حضرت خضر علیہ السلام کے تھے، موسیٰ علیہ السلام کے لیے تو ہم کہیں گے کہ موسیٰ علیہ السلام حضرت خضر سے افضل اور زیادہ جاننے والے تھے کیونکہ وہ صاحب شریعت اور صاحب کتاب تھے۔

حضرت خضر کون تھے؟ ولی یا نبی؟

حضرت خضر کے متعلق اختلاف ہے، بعض نے کہا: نبی تھے اور بعض نے کہا: ولی تھے اور بعض نے کہا: رسول تھے۔

مگر اس میں سب کا اتفاق ہے کہ خضر نہ تو صاحب شریعت تھے اور نہ صاحب کتاب۔ پھر سرکارِ دو عالم محمد رسول اللہ ﷺ صاحب کتاب اور صاحب شریعت اور تمام انبیاء و مرسلین سے افضل، اعلیٰ، برتر و بالا ہیں صلوات اللہ وسلامہ علیہم اجمعین اور لیکن حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور پر نور کے دستِ حق پرست پر ایمان لائے تو حضور اقدس سے کس طرح افضل و اعلم ہو سکتے ہیں؟

حضرت علی کو حضور سے افضل ماننے والا کافر ہے

اور جو یہ عقیدہ رکھے کہ حضرت علی حضور اقدس سے افضل و اعلم تھے تو وہ قطعاً کافر ہو جائے گا۔

حضرت علی کو شریکِ نبوت ماننے والوں کی دلیل

جن لوگوں نے حضرت علی کو نبوت میں شریک مانا، انہوں نے اس سے حجت قائم کی کہ حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ ”اما تر ضی ان تکون منی بمنزلہ ہارون من موسیٰ“ کیا تو اس بات پر راضی نہیں کہ تو مجھ سے ایسے ہو جیسے ہارون علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام سے تھے اور ہارون علیہ السلام نبی تھے لہذا ضروری ہوا کہ مولیٰ علی کرم اللہ وجہہ الکریم بھی نبی ہوں۔

اس کا جواب ہم یہ دیتے ہیں کہ پوری حدیث یہ ہے: ”الا انه لا نبی بعدی“ یعنی

میرے بعد کوئی نہیں اور ”اما ترضی ان تكون منی بمنزلة هارون من موسى“ اس سے مراد قرابت و رشتہ داری اور خلافت ہے نہ کہ نبوت۔

پانچواں قول معراج کا بیان

معز لہ اور جہمیہ نے کہا کہ معراج بیت المقدس تک تھی اور اس کے آگے بیداری میں نہ تھی۔ ان میں سے بعض نے کہا: معراج روح کو تھی جسم کو نہ تھی۔

اور اہل سنت و جماعت کہتے ہیں: معراج حق ہے۔ حضور ﷺ کے در اقدس سے بیت المقدس تک، بیت المقدس سے ساتویں آسمان تک، ساتویں آسمان سے الی ماشاء اللہ جہاں تک اللہ نے چاہا۔

اور بعض فقہاء نے کہا کہ جنت تک۔ بعض نے کہا: عرش تک۔ بعض نے کہا: عرش کے اوپر تک۔ بعض نے کہا: طرف عالم تک، حضور ﷺ کا ایک قدم مبارک عالم کی طرف اور دوسرا قدم عدم میں۔

اور بعض نے کہا کہ حضور سید المرسلین ﷺ اس عالم سے ماورائے عالم تشریف لے گئے عدم میں اور یہ محال نہیں، اس لیے کہ کینونت عالم اور حدوث عالم عدم میں عدم سے اور جب وجود عالم عدم سے اور حدوث عالم عدم سے جائز ہوا تو نقل موجودات کا عالم موجودات سے

۱۔ حضرت ہارون علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حقیقی بھائی تھے اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضور ﷺ کے چچا زاد بھائی ہیں اور حضرت ہارون علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام سے عمر میں بڑے تھے اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور ﷺ سے عمر میں چھوٹے ہیں اور حضرت ہارون علیہ السلام کا انتقال حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں ہوا اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور علیہ السلام کے بعد حیات رہے، حضرت ہارون علیہ السلام کی خلافت زندہ رہنے تک تھی اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت بھی نبی اکرم ﷺ کی حیات تک تھی، اختلاف وفات کے بعد کی خلافت میں ہے نہ کہ حضور کی زندگی والی خلافت میں۔ ۱۲ سیدی ابوالبرکات رحمہ اللہ تعالیٰ

عدم تک جائز ہے اور بعض نے کہا: ناجائز ہے اس لیے کہ مخلوق کا وجود بغیر مکان کے جائز نہیں۔

مخلوق کا وجود بغیر مکان کے ممکن ہے؟

ہم نے کہا: کینونت شخصہ (اس کی تخصیص و ذات کا ہونا) اس کی ذات کے لیے مکان ہو

گا۔

پھر جب وجود عالم جائز ہے کہ مکان ہو اپنی ذات کے لیے اور دوسرے مکان میں رکھنے کی ضرورت نہیں تو جائز ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کے لیے یا دوسری مخلوق کے لیے کہ اس کی ذات کے لیے مکان ہو اور موضوع نہ ہو مکان آخر میں۔

مکان کی دو قسمیں ہیں

(۱) مکان حقیقی (۲) مکان مجازی

مکان مجازی کسے کہتے ہیں؟ مکان مجازی وہ ہے کہ اس مکان کے بغیر شئی کا وجود ممکن ہو اور وہ مقام موضع جلوس ہو یعنی مکان مجازی کسی شئی کی نشست گاہ اور قرار گاہ کو کہا جاتا ہے اور یہ ایسے ہی ہے جیسے ہم کہتے ہیں کہ عالم کے لیے وہ مکان مجازی کے بغیر موجود ہے اس لیے کہ عالم کے نیچے منتہی الی العدم ہے اور اس کے نیچے اور کوئی چیز نہیں جس پر وہ قرار پکڑے تو ہمارا کہنا درست ہے کہ اس کا وجود اور شکل و تشخص ہی اس کا مکان ہے۔

مکان حقیقی کسے کہتے ہیں؟

مکان حقیقی وہ ہے کہ جس کے بغیر شئی کا وجود نہ ہو اور اس مکان میں اور کوئی غیر نہ ہو اور اسے شئی کا شکل و دائرہ کہتے ہیں اس لیے کہ مخلوق کو وجود بغیر شکل و دائرہ کے ممکن نہیں اور اس شکل و دائرہ میں دوسرے کا وجود ناممکن ہے تو جو کچھ ہم نے کہا وہ صحیح ہوا۔

کیا عدم کی جانب انتقال ممکن ہے؟ بعض نے کہا کہ عدم کی طرف کسی کا منتقل ہونا ممکن نہیں ہے اس لیے کہ نبی کریم ﷺ سانس لینے کے محتاج تھے اور عدم میں سانس لینا ناممکن ہے۔

ہم کہتے ہیں: تنفس بقائے حیات کے لیے علت نہیں اس لیے کہ مچھلی اور اس کی مثل جاندار پانی میں زندہ موجود ہیں اور وہ سانس کے بغیر زندہ باقی ہیں اور زیادہ درست بات یہ

ہے کہ ہم کہتے ہیں کہ معراج حق ہے اور بیداری میں ہوئی جہاں تک اللہ تعالیٰ نے چاہا۔

معراج النبی ﷺ اور معجزہ کا مسلک

معجزہ کی دلیل وہ روایت ہے جو ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا کہ ”ما فقد جسد محمد (ﷺ) لیلۃ المعراج“ نبی کریم ﷺ کا جسم اقدس معراج کی رات مفقود نہیں ہوا اور حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے معراج کے متعلق دریافت کیا تو آپ نے فرمایا کہ وہ سچا خواب تھا اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ”وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْيَا الَّتِي أَرَيْنَاكَ إِلَّا فِتْنَةً لِلنَّاسِ“ (الاسراء: ۶۰) اور ہم نے آپ کے خواب کو جو ہم نے دکھایا لوگوں کے لیے آزمائش اور فتنہ بنایا۔

اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ معراج نیند میں تھی اور یہ کہ معراج بیت المقدس تک نص سے ثابت ہے اور بیت المقدس سے آگے خبر واحد سے ثابت ہے اور خبر واحد سے جو چیز ثابت ہو اس سے عقیدہ نہیں بنتا تو جو ہم نے کہا: وہ صحیح ہے۔

ام المؤمنین کی روایت کا جواب

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا فرمانا کہ معراج کی رات حضور ﷺ کا جسم اقدس گم نہیں ہوا اس کا مطلب اور مفہوم یہ ہے کہ ”ما فقد جسدہ عن الروح بل کان روحہ معہ“ یعنی حضور ﷺ کا جسم روح سے جدا نہیں ہوا بلکہ روح مع الجسد (روح و جسم دونوں) معراج ہوئی اور معراج فقط روحانی نہیں بلکہ روح و جسد دونوں کو ہوئی۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت کا مفہوم

حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث کا مطلب یہ ہے کہ معراج بیداری میں ہوئی، خواب میں نہیں ہوئی اور حضور ﷺ نے سر کی آنکھوں سے عجائبات قدرت کو دیکھا۔ دوسری بات یہ کہ رؤیا مصدر ہے کہا جاتا ہے: ”رای رؤیا“ تو مراد رؤیا بالعمین ہے یعنی طاہری آنکھوں سے دیکھا۔

علاوہ ازیں اگر معراج خواب ہوتا تو کوئی انکار نہ کرتا، خواب تو ہنود منکر، کافر، گبر و ترسا مجوس اور عاصی و مطیع سب ہی دیکھتے ہیں تو اس میں نبی کریم ﷺ کی کوئی تخصیص اور فضیلت نہیں ہوئی، تو ثابت ہوا کہ یہ معراج جسمانی تھا اور بیداری میں ہوا اسی طرح ”وَمَا جَعَلْنَا

الرُّؤْيَا النَّبِيَّ أَرَيْنَاكَ“ سے مراد رویت یعنی ہے بیداری میں جیسا کہ ہم نے کہا اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد ”فِتْنَةٌ لِلنَّاسِ“ سے مراد ابو جہل اور اس کے قابعین ہیں اس لیے کہ اس نے سب سے پہلے انکار کیا تھا۔ جب حضور ﷺ نے فرمایا: ”إِنَّ شَجَرَةَ الزَّقُّومِ فِي النَّارِ“ کہ تھور کا درخت جہنم میں ہے یہ سن کر ابو جہل نے کہا تھا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ درخت اور جہنم میں (آگ میں درخت) کیونکر باقی رہ سکتا ہے؟ اور بہت سے ضعیف الایمان لوگ واقعہ معراج سن کر مرتد ہو گئے۔

سب سے پہلے معراج کی تصدیق سیدنا ابو بکر صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ نے کی اور بے شمار صحیح احادیث مبارکہ سے حضور اقدس کی معراج جسمانی ثابت ہے اور جماعت صحابہ سے مروی ہے ان میں سے ابو سعید خدری، انس ابن مالک، مالک ابن صعصعہ، عبد اللہ ابن عباس اور ام ہانی رضوان اللہ علیہم اجمعین مگر یہ احادیث بہ طریق آحاد ثابت ہیں لہذا ان سے اعتقاد واجب نہیں تو ہم کہیں گے احادیث کے تین مرتبے ہیں:

(۱) ایک مرتبہ یہ ہے کہ فقہاء نے بالاتفاق ان کو قبول کیا تو وہ حدیث حد شہرت میں کثرت روایت کی وجہ سے متواتر کے قریب ہے کہ بہ کثرت صحابہ نے مختلف مجالس میں واقعہ معراج بیان کیا اور معروف متقدمین صحابہ میں سے کسی نے انکار نہیں کیا تو یہ بہ منزلہ اجماع کے ہو گیا اور علم و عمل واجب ہو گیا اور جو منکر ہے وہ فاسق ہے مبتدع زجر و تعزیر کا مستحق ہے اور بعض نے کہا کہ کافر ہو جائے گا۔

(۲) دوسری قسم آحاد کی وہ ہے کہ اس کا منکر فاسق ہوگا اور اس کو مبتدع نہ کہا جائے گا۔

(۳) تیسری قسم آحاد کی وہ ہے کہ اس کا منکر فاسق بھی نہیں۔ پھر کلام معراج میں ہے اور یہ حد شہرت کو پہنچا ہوا ہے جو ”معراج الی ماشاء اللہ“ کا انکار کرے گا وہ فاسق و مبتدع قرار دیا جائے گا اگرچہ کافر نہ ہوگا اور اس پر سب کا اجماع ہے کہ جو مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک کا انکار کرے وہ قطعاً کافر ہے پھر یہاں تین چیزیں ہیں:

(۱) اسراء (۲) معراج (۳) اعراج۔

(۱) لیکن اسراء مکہ سے بیت المقدس تک کا انکار تو معتزلہ بھی نہیں کرتے اور جو انکار کرے وہ قطعاً کافر ہے اس لیے کہ بیت المقدس تک تشریف لے جانا نص قطعی

”سُبْحَانَ الَّذِي أَسْرَى بِعَبْدِهِ لَيْلًا مِنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ إِلَى الْمَسْجِدِ الْأَقْصَى الَّذِي بَارَكْنَا حَوْلَهُ“ (الاسراء: ۱) ”پاک ہے وہ ذات جس نے اپنے (خاص) بندے کو رات کے مختصر حصے میں سیر کرائی مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک جس کے ارد گرد ہم نے برکت رکھی ہے“ سے ثابت ہے۔

(۲) اور معراج زمین سے ساتویں آسمان تک۔

(۳) اور اعراج ساتویں آسمان سے عرش معلیٰ تک۔

اور حضرت ام ہانی رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ نے رات میرے ہاں گزاری صبح کے وقت حضور اقدس ﷺ نے فرمایا: اے ام ہانی! آپ سے ایک حیرت انگیز اور تعجب خیز بات نہ بیان کروں؟ فرماتی ہیں: میں نے عرض کیا: کیوں نہیں فرمائیے، حضور نے فرمایا: میری آنکھیں سوتی تھیں اور دل بیدار تھا کہ جبریل علیہ السلام تشریف لائے اور مجھ کو جگایا، آخر تک حدیث بیان کی۔

اور دوسری دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”فَلَا أُقْسِمُ بِالشَّفَقِ وَاللَّيْلِ وَمَا وَسَقَ وَالْقَمَرِ إِذَا اتَّسَقَ لِتَرْكُوبٍ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ“ (الانشقاق: ۱۶) تو مجھے قسم ہے شام کے اجالے کی اور رات کی اور جو چیزیں اس میں جمع ہوتی ہیں اور چاند کی جب وہ پورا ہو تم ضرور ضرور منزل بہ منزل چڑھو گے۔ اس آیت سے اللہ تعالیٰ نے چند چیزوں کی قسم یاد فرمائی اور فرمایا کہ نبی کریم آسمانوں پر تشریف لے جائیں گے اور طبق آسمان ہے۔

اس پر دلیل یہ ہے: ”لَقَدْ رَأَى مِنْ آيَاتِ رَبِّهِ الْكُبْرَى“ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: ”هو الرفرف“ وہ رفررف۔ نیز فرمایا: ”ذو مرة فاستوى“ (النجم: ۶) یعنی قوت والے تو اس نے قصد فرمایا۔ اس سے مراد حضور ﷺ ہیں اور ”فاستوى“ سے مراد رفررف ہے۔

پھر فرمایا: ”فَأَوْحَىٰ إِلَىٰ عَبْدِهِ مَا أَوْحَىٰ“ (النجم: ۱۰) پس اپنے بندے کو وحی فرمائی جو وحی فرمائی، یعنی ساتوں آسمانوں سے گزر کر عرش بریں پر پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے کلام فرمایا جو بھی

۱۔ ام ہانی ابوطالب کی بیٹی، حضرت علی کی بہن اور حضور علیہ السلام کی رضاعی بہن بھی ہیں۔

فرمایا تو اس میں اعراج کا ثبوت ہے۔

پھر حضور نبی کریم ﷺ نے اپنے رب کو دل سے دیکھا آنکھ سے نہیں دیکھا۔
دلیل یہ ہے کہ حضور سے دریافت کیا کہ آپ نے رب کو سر کی آنکھوں سے دیکھا؟

فرمایا:

سبحان الله! سبحان الله! رايته سبحان الله! سبحان الله! میں نے رب
بفوادي وما رايته بعيني. کو دل کی آنکھوں سے دیکھا، آنکھوں سے
نہیں دیکھا۔

اور حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے کہا گیا کہ کعب احبار نے
فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے رؤیت (دیدار) اور کلام کو دو نبیوں میں تقسیم کر دیا۔ رؤیت حضور ﷺ
کو اور کلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ سن کر ام المؤمنین نے فرمایا: تین چیزوں کے بارے
میں جو کوئی تم سے کہے تو یہ اللہ تعالیٰ پر بڑا جھوٹ ہے:

(۱) جو یہ کہے کہ حضور ﷺ نے شب معراج میں رب کو سر کی آنکھوں سے دیکھا، پھر دلیل
میں یہ آیت تلاوت کی: "مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَأَى" (النجم: ۱۱) دل نے جھوٹ نہ کہا
جو آپ نے دیکھا۔ رؤیت کو قلب کی طرف مضاف کیا۔

(۲) اور یہ کہے کہ نبی کریم ﷺ "يَعْلَمُ الْقِيَامَةَ" قیامت کا علم رکھتے تھے، پھر یہ آیت
پڑھی: "إِنَّ اللَّهَ عِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ" (لقمان: ۳۴) یعنی قیامت کا علم بے شک اللہ
کے پاس ہے (جس کو چاہے عطا فرمائے)۔

(۳) اور جو یہ کہے کہ حضور ﷺ نے "كُتِبَ بَعْضُ مَا أَوْحَى إِلَيْهِ" بعض وحی کا حصہ چھپایا
ہے، دلیل میں یہ آیت پڑھی: "يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ"
(المائدہ: ۶۷) اے نبی محترم! جو آپ پر اتارا گیا تمہارے رب کی طرف سے اس کو تمام
و کمال پہنچا دیجئے۔ دلائل معراج صحیح ہو گئے۔

نوٹ: یعنی جو حضور نے دیکھا دل نے اس کو نہیں جھٹلایا، آنکھوں نے دیکھا دل نے
تصدیق کی۔

۱ دیگر محققین کا کہنا ہے کہ سر کی آنکھوں سے دیکھا۔ ۱۲ سیدی ابوالبرکات

قیامت کا علم بے شک خدا کے پاس ہے لیکن جب فرمادیا کہ ”عَلَّمَك مَا لَمْ تَكُن تَعْلَمُ“ (النساء: ۱۳۳) آپ کو سکھادیا جو کچھ بھی آپ نہیں جانتے تھے۔ تو اس عموم میں قیامت بھی داخل ہے۔

دوسرے ”فَلَا يُظْهِرُ عَلَىٰ غَيْبِهِ أَحَدًا إِلَّا مَنِ ارْتَضَىٰ“ (الجن: ۲۶) تو وہ اپنے غیب پر کسی سے اظہار نہیں کرتا سوائے اپنے پسندیدہ (رسولوں) کے۔ یا ”مَا كَانَ اللَّهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَجْتَبِيٰ مِنْ رُسُلِهِ مَنْ يَشَاءُ“ (آل عمران: ۱۷۹) اللہ تعالیٰ کی شایانِ شان نہیں کہ وہ تمہیں غیب پر مطلع کرے لیکن اپنے رسولوں میں سے جسے چاہتا ہے چن لیتا ہے۔

چھٹا قول آخرت پر ایمان

قرامطہ زنادقہ ابا حنیہ منجمہ تناخیه فلاسفہ نے قیامت اور حشر کا انکار کیا ہے اور بعض رافضیوں سے شیعہ رجحان نے بھی انکار کیا۔

قیامت کا عجیب مطلب

اور ان سب نے کہا کہ قیامت کے معنی یہ ہیں کہ روح جسم میں داخل کر کے ان عملوں کا بدلہ دیا جائے گا جو زمانہ سابقہ اور گذشتہ ایام میں کیے ہوں گے اور یہ ان سب کا عقیدہ کفر ہے اور اس بات کا فساد کسی عقل مند پر پوشیدہ نہیں اس لیے کہ انہوں نے نص قطعی کا انکار کیا ہے اور بہ طریق مناظرہ ان کافروں سے اثبات وحی و نبوت کے دلائل ہیں۔

اور قرآن و حدیث کے خلاف کلام اللہ کی تاویل کرنا کفر ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں قیامت کے اوصاف ذکر فرمائے ہیں اور مثلاً وہ یہ ہیں کہ فرمایا: ”فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ خَمْسِينَ أَلْفَ سَنَةٍ“ (العارج: ۴) ایسے دن میں جس کی مقدار پچاس ہزار ہے۔ ”وَعَلَّمَك مَا لَمْ تَكُن تَعْلَمُ“ یعنی جو بھی آپ نہیں جانتے تھے وہ آپ کو سکھادیا تو اس عموم میں قیامت کا علم بھی داخل ہے۔

سال ہے۔

دوسری آیت میں ارشاد فرمایا: "إِنَّ اللَّهَ يُنْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُورِ" (الحج: ۷) بے شک اللہ انہیں اٹھائے گا جو قبروں میں ہیں۔ اسی طرح ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ وَفِيهَا نُعِيدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرَى" (طہ: ۵۵) اس سے ہم نے تم کو پیدا کیا اور اس میں ہم تم کو لوٹائیں گے اور دوبارہ اس سے تم کو نکالیں گے اور اس طرح کی بہت آیتیں ہیں جن سے قیامت کا ثبوت سورج کی طرح روشن ہے۔

ساتواں قول

میزان اور صراط و کتاب کا بیان

معز لہ اور جہمیہ 'میزان' صراط اور حساب و کتاب کے منکر ہیں اور کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نیکیوں اور بُرائیوں کی مقدار کو جانتا ہے اور اسے ان (میزان و صراط اور حساب و کتاب) کی حاجت نہیں اور حقیقت میں یہ چیز صحیح اور ثابت نہیں بلکہ ان سے کچھ اور ہی مراد ہے اور ان کا یہ اعتقاد کفر ہے اس لیے کہ یہ چیزیں نص سے ثابت ہیں۔

قرآن کریم میں ہے:

فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَئِكَ هُمُ

الْمُفْلِحُونَ. (الاعراف: ۸) ہیں۔

۱ "فَلَا يَظْهَرُ عَلَىٰ غَيْبِهِ أَحَدًا إِلَّا مَنِ ارْتَضَىٰ مِنْ رَسُولٍ" (الحج: ۲۶-۲۷) یعنی اللہ تعالیٰ

اپنے چنے ہوئے رسول کے علاوہ کسی کو بھی اپنے غیب خاص کی اطلاع نہیں دیتا۔

۲ "وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَجْتَسِي مِنْ رُسُلِهِ مَنْ يَشَاءُ" (آل

عمران: ۱۷۹) غیب پر مطلع فرمانا اللہ تعالیٰ کی شان نہیں ہے ہاں! اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں میں سے

جسے چاہے اس کے لیے چن لے۔ ۱۲ سیدی ابوالبرکات

تفصیل کے لیے دیکھئے: "الدولة المملیة" از امام احمد رضا بریلوی اور "من عقائد اہل سنت" از

عبدالکلیم شرف قادری اور "جاء الحق" از مولانا مفتی احمد یار خاں نعیمی رحمہ اللہ تعالیٰ۔

وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَئِكَ
الَّذِينَ خَسِرُوا أَنْفُسَهُمْ. (الاعراف: ۹)
اور جس کی تول ہلکی ہوئی تو وہ وہی ہیں
جنہوں نے اپنے آپ کو نقصان میں ڈالا۔
یہ میزان کے حق ہونے میں نص ہے۔

سیدنا ابن عباس نے فرمایا: ترازو کی ایک زبان ہے اور دو پلڑے ہیں، ایک پلڑا مشرق
میں اور دوسرا مغرب میں۔ پھر اگر یہ کہا جائے کہ اعمال تو اعراض ہیں باقی رہنے والے نہیں وہ
کس طرح تولے جائیں گے؟ اس کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ بندہ اپنے عمل سمیت تول
جائے گا۔

نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ حضور اقدس کسی غزوہ میں تھے۔ ابن عباس ایک
درخت پر چڑھے ان کی پنڈلیاں پتلی تھیں۔ صحابہ کرام مسکرانے لگے، حضور اقدس ﷺ نے
فرمایا: ان کی پتلی پنڈلیوں کو دیکھ کر تعجب کرتے ہو؟ یہ پنڈلیاں میزان میں آسمان و زمین سے
بھی زیادہ وزنی ہیں۔

اور عبد اللہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: بندہ کے اعمال صحیفوں میں لکھے جاتے
ہیں، ایک صحیفہ میں نیکیاں اور دوسرے میں بُرائیاں۔ ایک پلڑے میں حسنات کا صحیفہ اور
دوسرے پلڑے میں برائیوں کا صحیفہ رکھا جائے گا۔

اور محمد ابن علی ترمذی نے فرمایا: اعمال بغیر انسان کے تولے جائیں گے، ایک پلڑے
میں نیکیاں رکھی جائیں گی وہ نور کی مانند نظر آئیں گی اور دوسرے میں بُرائیاں رکھی جائیں
گے وہ تاریکی و ظلمت کی طرح معلوم ہوں گی۔

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا
يَرَهُ ۖ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا
يَرَهُ. (الزلزال: ۷-۸)
جس نے ذرہ برابر نیکی کی اس کو
دیکھے گا اور جس نے ذرہ برابر بدی کی
اس کو دیکھے گا۔

اور ایسے حساب بھی نص سے ثابت ہے۔

”فَسَوْفَ يُحَاسِبُ حَسَابًا يَسِيرًا“ (الانشقاق: ۸) جلدی حساب لیا جائے گا

آسانی سے۔

دوسری نص ”إِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ“ (آل عمران: ۱۹۹) اللہ تعالیٰ جلدی حساب لے لے گا، یہ نص حساب کے بارے میں ہے۔

اور مروی ہے کہ ایک اعرابی نے حضور ﷺ سے عرض کی: قیامت کے دن حساب کون لے گا؟ حضور اقدس نے فرمایا: اللہ تعالیٰ۔ اعرابی نے عرض کیا: جب تو میں کامیاب ہوں۔ قسم ہے رب کعبہ کی! اپنے حق میں گرفت نہیں فرمائے گا اور اپنا حق چھوڑ دے گا (اور بندے کے حق کو نہیں چھوڑے گا)۔

ایسے ہی کتاب نص سے ثابت ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”كِتَابٌ مَّرْقُومٌ يَشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُونَ“ (المطففين: ۲۰-۲۱) وہ لکھی ہوئی کتاب ہے جس کی مقربین زیارت کرتے ہیں۔ دوسری جگہ ارشاد فرمایا: ”لَا يُغَادِرُ صَغِيرَةً وَلَا كَبِيرَةً إِلَّا أَحْصَاهَا“ (الأنفال: ۴۹) اس نے نہیں چھوڑا کوئی چھوٹا (گناہ) اور نہ بڑا مگر اس کا احاطہ کر لیا اور فرمایا: ”إِنَّ رُسُلَنَا يَكْتُبُونَ مَا تَمْكُرُونَ“ (یونس: ۲۱) بے شک ہمارے رسول لکھتے ہیں جو تم مکر کرتے ہو۔ اور بھی اسی طرح آیتیں ہیں یہ نص ہے جو انکار کرے کافر ہے۔

اگر کہا جائے کہ حساب و کتاب اور میزان و صراط میں کیا حکمت اور فائدہ ہے؟ جب کہ اللہ تعالیٰ سب کو جانتا ہے تو وہ حساب و کتاب اور میزان و سوال کا محتاج نہیں۔

جواب: ہم کہتے ہیں کہ یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ بنی آدم پر ثابت کر دیا جائے اور ان پر حجت قائم کر دی جائے تاکہ بندہ اپنے اچھے اور بُرے عملوں کی مقدار کو جان لے اور اسے یقین ہو جائے کہ جو کچھ مجھے پہنچا ہے وہ عدل ہے اور بندہ اسی کا اہل ہے وہ جس کے قابل تھے وہ اسے مل گیا۔

اب اگر دریافت کیا جائے کہ ان میں سے سب سے پہلے کیا ہوگا؟

تو اس کے متعلق کوئی نص نہیں ہے، لیکن تاہم یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ سب کچھ صراط پر ہوگا اور یہ جائز نہیں کہ صراط سے پہلے ہو اس لیے کہ میزان و حساب کے بعد مشقت جائز نہیں جس نے نجات پائی اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ”فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ“ (الاعراف: ۸) پس جس کی تول بھاری ہوئی تو وہ لوگ کامیاب ہیں۔

اور صراط کے بعد (حساب و میزان) جائز نہیں اس لیے کہ جب صراط سے گزر گیا تو

کامیاب ہو گیا اور جہنم سے بچ گیا، پھر افعالِ قلوب فکر اور نیت وغیرہ کا حساب ہو گا یا نہیں؟ بعض نے کہا: سب کا حساب ہو گا۔ بعض نے کہا: ان کا حساب نہیں ہو گا اور زیادہ درست بات یہ ہے کہ جب کبھی دل میں خطرہ گزرا (دل میں کسی بُرے کام کا خیال آیا) اگر اس کا عزم نہیں کیا اور نہ نیت کی تو اس کا حساب نہ ہو گا اگرچہ خطرہ (کھٹکا) کفر ہی کیوں نہ ہو۔ اس لیے یہ خطرات ایسے ہیں جن سے بچنا ناممکن ہے ہاں! اگر دل میں خطرہ پیدا ہو اور اس کا اعتقاد کیا اور اس پر جمار ہا تو ضرور سوال ہو گا اور حساب لیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”قُلْ إِنْ تَخْضِعُوا مَا فِي صُدُورِكُمْ أَوْ تُبْذِرُوهُ يَعْلَمَهُ اللَّهُ“ (آل عمران: ۲۹) آپ فرمادیتے اگر تم چھپاؤ جو تمہارے سینوں میں ہے یا اس کو ظاہر کرو تو اللہ تعالیٰ اس کو جانتا ہے۔ اور فرمایا: ”إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْنُورًا“ (الاسراء: ۳۶) بے شک کان، آنکھ اور دل سب کے بارے میں سوال ہو گا۔

نوٹ: انسان کے ذہن میں جو بات خیالات، ترغیبات اور عزائم پیدا ہوتے ہیں ان کی پانچ قسمیں ہیں:

- (۱) ہاجس: اچانک کسی چیز کا خیال آئے (۲) خاطر: کسی چیز کا بار بار خیال آئے
- (۳) حدیثِ نفس: جس چیز کا خیال آئے، ذہن اس کے حصول کے لیے پروگرام تیار کرنا شروع کر دے۔
- (۴) ہم: غالب جہت اس چیز کو حاصل کرنے کی ہو اور مغلوب سا خیال ہو کہ اس کو حاصل نہ کیا جائے۔

- (۵) عزم: مغلوب سا خیال بھی زائل ہو جائے اور اس چیز کے حصول کا پختہ ارادہ ہو، اگر کسی شخص کے ذہن میں گناہ کا خیال آئے، ہاجس، خاطر، حدیثِ نفس اور ہم کے مرتبہ میں اس سے مواخذہ نہیں ہوتا، البتہ گناہ کا عزم کرے تو وہ مستحق مواخذہ ہے، خواہ اس کے بعد گناہ کا فعل نہ کرے، کیونکہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے عزم سے روکا ہے، فرمایا: ”وَلَا تَعْزِمُوا عُقْدَةَ النِّكَاحِ“ (البقرہ: ۲۳۵) اور عورت کی عدت میں اس سے نکاح کرنے کا ارادہ نہ کرو۔ نماز میں جو خیالات ہاجس اور خاطر کی قسم سے ذہن میں آئیں ان سے نماز میں کوئی کمی نہیں ہوتی، کیونکہ وہ اس کے بس اور اختیار سے باہر ہے، البتہ حدیثِ نفس سے احتراز کرنا چاہیے اور یہ انسان کے بس میں ہے۔ (ماخوذ از: شرح مسلم شریف (علامہ غلام رسول سعیدی) ص ۲۳۲)

آٹھواں قول

کراماً کاتبین اور حفاظت کرنے والے فرشتوں کا بیان

معز لہ کا مسلک

معز لہ کہتے ہیں کہ ہم پر کوئی حفاظت کرنے والے اور ہمارے عملوں کو لکھنے کے لیے فرشتے مقرر نہیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو اور ان کے اعمال کو جانتا ہے جس کو چاہے بخشے جس کو چاہے عذاب دے۔

اہل سنت کا مذہب

اہل سنت فرماتے ہیں کہ حفظہ (حفاظت کرنے والے فرشتے) ہر کافر اور مؤمن پر مقرر ہیں جو بندے کے شب و روز کے اعمال کا حساب و کتاب رکھتے ہیں۔ دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَإِنَّ عَلَيْكُمْ لَحَافِظِينَ كَرَامًا
كَاتِبِينَ يَعْلَمُونَ مَا تَفْعَلُونَ. (الانفطار: ۱۱)

اور بے شک تم پر حفاظت کرنے والے ضرور مقرر ہیں جو کچھ تم کرتے ہو اسے لکھنے والے ہیں اور اس کو وہ جانتے ہیں۔

دوسری آیت:

مُعَقَّبَاتٌ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ
يَحْفَظُونَهُ مِنْ أَمْرِ اللَّهِ. (الرعد: ۱۱)

یکے بعد دیگرے آنے والے فرشتے ہیں آگے پیچھے اللہ کے حکم سے حفاظت کرتے ہیں۔

امام ابراہیم نخعی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ ان میں کسی رسول کو بھیجتا ہے تو اس رسول کی حفاظت کے لیے اللہ فرشتوں کو بھیجتا ہے جو رسول کی مکمل حفاظت کرتے ہیں۔

ام المؤمنین سیدہ عائشہ صدیقہ عقیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں: جب قیامت کی سب سے پہلی نشانی اور علامت ظاہر ہوگی تو قلم ڈال دیئے جائیں گے اور فرشتے لائے

جائیں گے اور تمام اعضاء گواہی دیں گے کہ بندوں نے فلاں فلاں اعمال کیے ہیں اور یہ اعمال صحیح ہیں اور یہ امر نص سے ثابت ہے جو انکار کرنے والے کافر ہے۔

نواں قول

دوزخ میں داخل ہونے اور دوزخ سے نکلنے کا بیان

معتزلہ کہتے ہیں: مؤمنین دوزخ میں داخل نہیں ہوں گے دوزخ میں کافر اور فاسق داخل ہوں گے اور جو دوزخ میں داخل ہو گیا وہ ہمیشہ اسی میں رہے گا نکالا نہیں جائے گا۔ اہل سنت و جماعت کہتے ہیں کہ دوزخ میں داخل ہونا تمام امتوں کے لیے ہے اور دوزخ سے خروج مؤمنوں کے لیے خاص ہے یہ حق ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ”وَإِنْ مِنْكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا كَانَ عَلَى رَبِّكَ حَتْمًا مَقْضِيًّا ۝ ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِينَ اتَّقَوْا (یعنی من الشُرک) وَنَذَرُ الظَّالِمِينَ فِيهَا جِثِيًّا“ (مریم: ۷۱-۷۲) تم میں سے کوئی ایسا نہیں جس کا گزر اس (دوزخ) پر نہ ہو تمہارے رب کے ذمہ پر یہ ضرور ٹھہری ہوئی بات ہے پھر ہم ڈرنے والوں کو نجات دیں گے (یعنی شرک سے) اور ظالموں کو اس میں گھٹنوں کے بل گرے ہوئے چھوڑ دیں گے (یعنی کافروں کو)۔

علماء نے فرمایا: ورود اس جگہ داخل ہونے کے معنی میں استعمال ہوا ہے اس پر دلیل حضور ﷺ کا وہ ارشاد ہے کہ سب سے آخر میں جہنم سے وہ نکلے گا جس کے دل میں ذرہ برابر ایمان ہوگا۔ ایک دوسری روایت میں آتا ہے کہ سب سے آخر میں جہنم سے اس شخص کو نکالا جائے گا جس کے دل میں رائی کے دانہ کے برابر ایمان ہوگا اور یہ نص ہے۔

دخول جہنم سے مراد؟

پھر ہم کہتے ہیں کہ انبیاء اور مرسلین کے سوا سب امتوں کے لیے خواہ وہ مؤمن ہوں یا کافر دخول جہنم ثابت ہے اس لیے کہ دخول سے مراد صراط سے گزرنا ہے اور یہ گزرنا جزاء و سزا، سوال و میزان اور حساب و کتاب کے لیے تمام امتوں سے ہوگا سوائے نبیوں اور رسولوں کے اس لیے کہ یہ چیزیں نیکی اور بدی کے اظہار کے لیے ہوں گی تاکہ نیکیوں کو اچھا بدلہ

دیا جائے اور بُروں کو سزا دی جائے اور انبیاء و مرسلین تو پیدا ہی پاک و معصوم ہوتے ہیں وہ ہر چھوٹے بڑے گناہ سے معصوم ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ تمام بندوں پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے حجت ہیں اور حجت پر حجت قائم کرنے کی ضرورت نہیں۔

علاوہ ازیں یہ امور اظہارِ تقصیر اور گناہ کے لیے ہیں اور انبیاء کرام مغفور اور فائز المرام ہوتے ہیں وہاں گناہ اور تقصیر کو تاہی کا امکان ہی نہیں بلکہ ان سے گناہ و تقصیر کا وہم بھی نہیں کیا جاسکتا اس لیے ان سے حساب بھی نہ ہوگا۔

قرآن پاک میں ہے: "فَأَمَّنْ أَوْ أَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ" (س ۳۹) پس تو احسان کر یا روک لے تجھ پر کچھ حساب نہیں۔ اور حساب حاصل و محصول کا ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے ان سے حساب اٹھالیا ہے اس لیے وہ مدعی نبوت ہیں اور شریعت کو بیان کرنے والے ہیں اور اگر انبیاء و مرسلین علیہم السلام ان امور سے محفوظ نہ ہوں یعنی ان سے بھی سوال و جواب اور حساب و کتاب ہو اور سزا دیئے جائیں تو مخلوق کو نجات کی دعوت کس طرح دیں گے؟ جب وہ خود نجات یافتہ نہیں تو دوسروں کو نجات کا مشرکہ کس طرح دے سکتے ہیں؟ جو خود خوف زدہ ہوں وہ دوسروں کو کیسے نجات دلا سکتا ہے؟ اور جب دوسروں کو نجات دلا سکتا ہے تو خود بہ طریقِ اولیٰ نجات یافتہ ہوگا۔

پس ثابت ہوا کہ انبیاء کرام نجات یافتہ ہیں اور ہلاکت کے خوف سے محفوظ ہیں اور ان سے سوال ہوگا اور نہ انہیں عذاب ہوگا۔ لہذا جو ہم نے کہا وہ صحیح ثابت ہوا۔ بعض کہتے ہیں: یہ (حساب و کتاب، سوال و جواب) انبیاء کرام سے بطور عرض اور ان کے فضل و کمال کے اظہار کے لیے ہوگا۔

اہل سنت و جماعت کے نزدیک اہل ایمان ہمیشہ جہنم میں نہ رہیں گے۔ معتزلہ کے نزدیک مرتکب کبیرہ اگر بغیر توبہ کیے مر جائے تو وہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا اور انہوں نے یہ کیوں کہا؟ دراصل اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے زعم میں مرتکب کبیرہ ایمان دار نہیں رہتا اور جب توبہ کیے بغیر مر گیا تو وہ بے ایمان ہونے کی وجہ سے جنت و ثواب کا مستحق نہیں۔

۱۔ اس لیے ان سے نہ سوال ہوگا نہ حساب و کتاب وہ بالکل مامون ہوں گے۔ ۱۲ سیدی ابوالبرکات
۲۔ بلکہ وہ تو دوسروں کو شفاعت کر کے نجات دلائیں گے۔ ۱۲ سیدی ابوالبرکات

معتزلہ اس آیت سے دلیل دیتے ہیں کہ ”مَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا فَجَزَاءُ هُ
جَهَنَّمَ خَالِدًا فِيهَا“ (النساء: ۹۳) جو کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کرے تو اس کی جزاء جہنم
ہے اس میں ہمیشہ رہے گا۔

ہم (اہل سنت) کہتے ہیں: مرتکب کبیرہ اسلام سے خارج نہیں تو جب وہ ایمان دار
ہے تو کافروں کے ساتھ ہمیشہ جہنم میں نہیں رہے گا۔ حکمت کا تقاضا بھی یہی ہے دوسری بات
یہ ہے کہ مشرکوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے تائبید (ہمیشہ) کا لفظ فرمایا ہے: ”وَالْمُشْرِكِينَ فِي
نَارِ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا“ (البیۃ: ۶) اور مشرکین جہنم کی آگ میں ہوں گے جس میں
وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ اور اسی طرح جنتیوں کے لیے ”ابدًا“ (ہمیشہ) کا لفظ فرمایا ”تَجْرِي
مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا“ (البیۃ: ۸) جس کے نیچے سے نہریں جاری ہیں
جن میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔

خلود اور تائبید میں فرق؟

اور قاتل کے لیے خلود کا ذکر ہے تائبید کا ذکر نہیں اور خلود سے مراد مکث طویل (مدت
دراز تک ٹھہرنا) مراد ہے اس بات کو ہم بھی مانتے ہیں کہ جہنم میں طویل مدت تک رہے گا پھر
نکال لیا جائے گا۔

ایک کی دوسری توجیہ

اور بعض نے کہا کہ یہ آیت اس شخص کے بارے میں نازل ہوئی ہے کہ جس نے
مسلمانوں کو قتل کیا اور پھر مرتد ہو گیا تو ہم بھی کہتے ہیں کہ بوجہ ارتداد ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔
لیکن مسلمان مرتکب کبیرہ ہمیشہ جہنم میں نہیں رہے گا اس لیے کہ ایمان کے ساتھ خلود
بمعنی تائبید ناجائز ہے۔

دسواں قول

شفاعت اور فد یہ کا بیان

شفاعت کے مسئلہ میں معتزلہ کے دو گروہ ہیں: ایک گروہ تو بالکل سرے سے ہی

شفاعت کا منکر ہے۔ دوسرا تین قسم کے لوگوں کے لیے شفاعت ثابت مانتا ہے:

(۱) ایک وہ لوگ جو کبیرہ گناہوں سے پرہیز کرتے تھے اور صغیرہ گناہوں کے مرتکب ہوئے تو وہ صغیرہ گناہوں سے بخشش کے لیے نبی یا فرشتے کی شفاعت کے محتاج ہوں گے۔

(۲) دوسرا وہ جو مرتکب کبیرہ ہے پھر توبہ کر لی تو وہ قبول توبہ کے لیے شفاعت انبیاء کرام کا محتاج ہوگا۔

(۳) تیسرا وہ کہ چھوٹے بڑے گناہوں سے بچتا رہا ہے لیکن وہ درجات کی بلندی کے لیے انبیاء کرام اور فرشتوں کی شفاعت کا محتاج ہے۔

شفاعت کون کر سکتا ہے؟

معتزلہ کے نزدیک شفاعت صرف انبیاء کرام اور فرشتے کر سکتے ہیں۔

معتزلہ کے نزدیک اور اہل سنت کی جوابی کارروائی

مسئلہ شفاعت میں معتزلہ نے اپنے عقائد و نظریات بیان کرتے ہوئے جو چند سوال اٹھائے ہیں ان کا جواب دیتے ہوئے اہل سنت فرماتے ہیں کہ جواب یہ ہے کہ جو شخص کبیرہ گناہوں سے بچتا رہا اور صغیرہ کا مرتکب ہوا تو ان کے نزدیک وہ شفاعت کا محتاج ہی نہیں اس لیے کہ ان کا مذہب یہ ہے کہ جو کبیرہ گناہوں سے بچتا رہا اور صغیرہ کا ارتکاب کرتا رہا تو خدا پر واجب ہے کہ اس کو بخش دے۔

اس پر دلیل کے طور پر یہ آیت پیش کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "إِنْ تَجْتَنِبُوا كَبَائِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نَكْفُرْ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ" (النساء: ۳۱) اگر تم کبیرہ گناہوں سے بچو جن سے تم کو منع کیا گیا ہے تو ہم تمہاری برائیوں کو مٹا دیں گے۔

تو جب ان (معتزلہ) کے نزدیک جیسا کہ ان کا زعم ہے کہ اللہ تعالیٰ پر ایسے بندے کی مغفرت کرنا واجب ہے تو وہ شفاعت کا محتاج ہی نہیں ہے اور ان کا یہ کہنا کہ جو شخص صغائر کا مرتکب اور کبائر سے اجتناب کرتا رہا تو اللہ تعالیٰ پر واجب ہے کہ اس کو بخش دے یہ صحیح نہیں اس لیے کہ جب وہ صغیرہ گناہ کرتا رہا اور اس کو ہلکا جانا تو کبیرہ ہو گیا اور ہم کہتے ہیں کہ بندوں کی طرف سے اللہ عزوجل پر کوئی شئی واجب نہیں اور اس کو اپنی جگہ بیان کریں گے۔

رؤ

اور ان کا یہ کہنا کہ جو شخص کبائر کا مرتکب ہو کر تائب ہو گیا تو اس کے لیے بھی شفاعت ہے، یہ بھی صحیح نہیں کہ ان کا مذہب یہ ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ پر ایمان لایا اور اچھے کام کیے تو وہ محتاج شفاعت نہیں، پھر اثبات شفاعت اس فرق کے ساتھ ان کے مذہب میں کفر ہے، اس لیے کہ ان کے مذہب میں جب بخشنا واجب ہے تو پھر مغفرت کے لیے شفاعت کرنا اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ نے اس کو نہیں بخشتا تو جو چیز اللہ پر واجب تھی وہ نہیں کی۔ واجب کو ترک کر دیا تو ظلم و ستم ہوا اور جو اللہ تعالیٰ کو ظلم و جور کے ساتھ موصوف کرے وہ کافر ہو جائے گا۔

اہل سنت و جماعت اور مسئلہ شفاعت

اہل سنت و جماعت کے نزدیک شفاعت کا ثابت کرنا بالکل صحیح ہے، اس لیے کہ وہ کہتے ہیں کہ مرتکب صغیرہ و کبیرہ جب بغیر توبہ کیے مر جائے تو اللہ تعالیٰ کی مشیت پر موقوف ہے۔ اگر بخشتے تو اس کا فعل ہے اور اگر نہ بخشتے اور عذاب دے تو عدل ہے اور ایسے ہی اگر توبہ کر کے مرے تو اس کی مشیت پر موقوف ہے، اگر چاہے اپنے فضل سے توبہ قبول کر لے اور اگر چاہے تو تقاضائے عدل کے مطابق بندہ کی کوتاہیوں کی وجہ سے عذاب دے اور نہ بخشتے۔

شفاعت کن کے لیے ہوگی؟

شفاعت ہر مؤمن کے لیے ثابت ہے خواہ مرتکب کبیرہ ہو خواہ مرتکب صغیرہ ہو، جب کہ وہ ایمان پر مرے، مستحق شفاعت ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا:

شفاعتی لاهل الكبائر من امتی
یعنی میری شفاعت میری امت کے
ومن انکرہا لم ینلہا یوم القیامۃ
مرتکب کبائر کے لیے ہے اور جو انکار کرے
اترونها للمصلین اترونها للصائمین
وہ قیامت کے دن شفاعت سے محروم ہوگا۔
لا و لکنہا للمتلوثین و الخطائین
کیا تم سمجھتے ہو کہ شفاعت نمازیوں کے لیے
ہے؟ کیا تم سمجھتے ہو روزہ داروں کے لیے
ہے؟ نہیں! شفاعت گناہوں میں ڈوبے

ہوؤں اور خطا کاروں کے لیے ہے۔

اشکال: اگر یہ دریافت کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "وَلَا يَشْفَعُونَ إِلَّا لِمَنْ ارْتَضَىٰ" یعنی الا لمن ارتضى عمله وهذا غير مرضى العمل " (۱۱۱ انبیاء: ۲۸) وہ شفاعت نہیں کرتے مگر جس کو وہ پسند کرے یعنی مگر اس کی جس کے عمل کو وہ پسند کرے اور یہ غیر پسندیدہ عمل ہے۔ شفاعت صرف ان لوگوں کی کی جائے گی جن کے اعمال اچھے ہوں اور مرتکب کبیرہ و صغیرہ کے عمل اچھے نہیں ہیں پھر ان کے لیے شفاعت کیسے ثابت ہوئی؟

اس اشکال کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ اس سے مراد "لمن ارتضى دينه" یعنی جس کا دین اچھا ہو اس کی شفاعت کی جائے گی۔ دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "ورضى له قولا" (طہ: ۱۱۹) اور جس کے قول کو وہ پسند کرے۔ اور جو کبیرہ کا مرتکب ہے اس کا دین تو اچھا ہے اور اسی طرح اس کا عمل (دین دار ہونا) بھی پسندیدہ ہی ہے اس لیے کہ وہ نماز پڑھتا ہے، روزہ رکھتا ہے لہذا عمل بھی اچھا ہوا۔

اشکال: پھر اگر کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "مَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ حَمِيمٍ وَلَا شَفِيعٍ يُطَاعُ" (الغافر: ۱۸) ظالموں کے لیے کوئی دوست اور شفیع نہیں جس کی پیروی کی جاتی ہو۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ ظالموں کے لیے کوئی دوست اور شفیع جس کی بات مانی جائے نہ ہوگا تو مرتکب کبیرہ ظالم ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِنَفْسِهِ" (الغافر: ۲۲) پس ان میں سے کوئی اپنے آپ پر ظلم کرنے والا ہے۔

ہم جواباً یہ کہتے ہیں کہ پہلی آیت میں ظالم سے مراد کافر ہے اور اس پر دلیل وہ آیت کریمہ ہے جو پہلے گزری کہ "وَأَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْأُزْفَةِ" (الغافر: ۱۹) اور ان کو ڈراؤ قیامت کے دن سے۔ نیز اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ" (الانعام: ۱۳) بے شک شرک بہت بڑا ظلم ہے۔ اگر کہا جائے حدیث میں ہے حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: "لا ينال شفاعتي اهل الكبائر من امتي" میری شفاعت میری امت کے کبیرہ گناہوں کا ارتکاب کرنے والوں کو نہیں حاصل ہوگی۔

حدیث کا صحیح مفہوم

اس حدیث کی دو توجیہات بیان کی جاتی ہیں:

(۱) یہ حدیث ثابت نہیں ہے صحیح حدیث یہ ہے: "شفاعتي لا اهل الكبائر من

امتھی "میری شفاعت میری امت کے کبیرہ گناہ والوں کے لیے ہے۔"

(۲) اور اگر بالفرض صحیح ہو تو اس کے معنی یہ ہوں گے جو کبیرہ گناہوں کو حلال جان کر ان کا مرتکب ہو اوہ میری شفاعت سے بہرہ ور نہ ہوگا۔

پھر یہ مسئلہ راجع ہے ایک حرف کی طرف، وہ یہ ہے کہ مرتکب کبیرہ معزولہ کے نزدیک مؤمن نہیں تو وہ اہل شفاعت سے نہ ہو اور اہل سنت کے نزدیک مرتکب کبیرہ مؤمن ہے لہذا وہ اہل شفاعت سے ہے اور اس کا ہم ذکر کر آئے ہیں۔

معزولہ کی طرف سے اہل سنت پر اعتراض

اگر (معزولہ) کہیں کہ حدیث میں آتا ہے کہ "مدمن الخمر لا یدخل الجنة" شراب کا رسیا جنت میں داخل نہ ہوگا۔ اس کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ اس سے مراد عذاب سے پہلے اول ریلہ میں جنت میں نہ جائے گا۔

اشکال: اگر کہا جائے کہ حدیث میں ہے: "من غشنا فلیس منا" جو ہمیں دھوکا دے وہ ہم میں سے نہیں۔

جواب: اہل سنت معزولہ کے اس اشکال کے جواب میں فرماتے ہیں کہ اس کے معنی بھی یہی ہیں کہ جو دجل و فریب دھوکا دہی کو حلال سمجھے (وہ ہمارے طریقہ پر نہیں)۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ "لیس من سنا" کہ وہ ہمارے طریقے پر نہیں۔

شفاعت کے ثبوت پر دلیل

اس کی دلیل وہ حدیث ہے جس کو صحابہ کرام کی جماعت نے روایت کیا ہے، بعض کی حدیث بعض کی حدیث میں داخل ہو گئی ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا: "اذا کان یوم القیامة الخ" جب قیامت ہوگی، بعض لوگ بعض کے پاس آئیں گے۔ پہلے آدم علیہ السلام کے پاس آئیں گے اور عرض کریں گے: آپ ہماری شفاعت کیجئے، آدم علیہ السلام فرمائیں گے: "لست لھا" میں شفاعت کے لیے نہیں، نوح علیہ السلام کے پاس حاضر ہوں۔ حضرت نوح علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کریں گے: آپ ہماری شفاعت فرمائیے۔ آپ بھی یہی فرمائیں گے: میں شفاعت کے لیے نہیں، ابراہیم علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوں۔ ابراہیم علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کریں گے: اے ابراہیم!

آپ ہماری سفارش کیجئے، آپ فرمائیں گے: یہ کام میرے بس کا نہیں، موسیٰ علیہ السلام کا دامن پکڑو۔ پھر موسیٰ علیہ السلام کے پاس حاضر ہو کر کہیں گے: اے موسیٰ! آپ ہماری شفاعت کریں، موسیٰ علیہ السلام فرمائیں گے: میرا یہ منصب نہیں، عیسیٰ علیہ السلام کے پاس جاؤ۔ جب عیسیٰ علیہ السلام سے عرض کریں گے کہ آپ ہماری شفاعت کیجئے، عیسیٰ علیہ السلام فرمائیں گے: میرا یہ کام نہیں، حضور سید المرسلین شفیع المذنبین محمد رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ عرش جاہ میں حاضر ہو کر شفاعت کی درخواست کرو۔ پھر یہ سب بارگاہ رسالت مآب میں حاضر ہو کر عرض کریں گے: حضور! ہماری شفاعت فرمائیے۔ حضور رحمۃ للعالمین ﷺ اپنی زبان حق ترجمان سے ارشاد فرمائیں گے: ہاں! ہم شفاعت کے مالک ہیں۔ حضور فرماتے ہیں کہ میں وہاں سے کھڑے ہو کر مقام محمود میں زیر عرش اللہ عزوجل کو سجدہ کروں گا اور اللہ عزوجل کی حمد و ثناء کروں گا اور اس وقت میری زبان پر وہ کلمات جاری ہوں گے جو کسی حمد کرنے والے کی زبان پر جاری نہیں ہوئے، اللہ عزوجل ارشاد فرمائے گا: اے محمد (ﷺ)! اپنا سر مبارک اٹھائیے اور شفاعت کیجئے، آپ کی شفاعت قبول کی جائے گی، اور سوال کیجئے جو مانگو گے دیا جائے گا، تو میں اپنا سر اٹھاؤں گا اور عرض کروں گا: اے رب کریم! تو نے مجھ سے وعدہ فرمایا تھا کہ میں اپنی امت کے اہل کبار کی شفاعت کروں، اللہ تعالیٰ فرمائے گا: جائیے! اور جہنم سے ہر اس شخص کو نکال لیجئے جس کے دل میں رائی کے دانہ برابر بھی ایمان ہو، پھر میں دوبارہ سجدہ کروں گا، پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا: اپنا سر اٹھائیے، شفاعت کیجئے، شفاعت قبول کی جائے گی، مانگئے! جو مانگو گے عطا کیا جائے گا، تو میں اپنا سر اٹھاؤں گا اور اللہ تعالیٰ فرمائے گا: جائیے! اور جہنم سے ہر اس شخص کو نکال لیجئے جس کے دل میں رائی کے دانہ برابر ایمان ہو۔

پھر میں تیسری مرتبہ سجدہ کروں گا، پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا: اپنا سر اقدس اٹھائیے اور شفاعت کیجئے، شفاعت قبول کی جائے گی، مانگئے! دیئے جاؤ گے۔ پھر میں سر اٹھاؤں گا اور عرض کروں گا: اے میرے رب! ہر اس شخص کے حق میں میری شفاعت قبول فرما، جس نے ساری عمر میں ایک مرتبہ ”لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ“ پڑھا ہو تو اللہ عزوجل فرمائے گا: مجھے اپنی عزت و جلال کی قسم! میرا حکم ہے جائیے اور جہنم سے ہر اس شخص کو نکال لیجئے کہ جس نے عمر بھر میں ایک مرتبہ کلمہ ”لا الہ الا اللہ“ پڑھا ہو (حدیث آخر تک)۔

اور اس کا ثبوت اس آیت سے ملتا ہے: ”وَلَسَوْفَ يَعْطِيك رَبك فترضى“ (الضحیٰ: ۵) اے محبوب (ﷺ)! ہم تمہیں اتنا دیں کہ تم راضی ہو جاؤ گے۔ یہ نص قطعی ہے، کسی کو انکار کی گنجائش نہیں اور جو انکار کرے گا، کافر ہو جائے گا، پھر کافر مسلمانوں کی طرف سے فدیہ ہو کر جہنم میں جائیں گے۔ دلیل یہ ہے: ”وَلَيَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَاثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ“ (العنکبوت: ۱۳) اور وہ ضرور اپنے بوجھ اٹھائیں گے اور اپنے بوجھ کے ساتھ ایک دوسرا بوجھ۔ اور معتزلہ نے اس کا بھی انکار کیا، اس دلیل سے کہ ”لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ اُخْرٰی“ کوئی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔

ہم نے کہا: کیوں نہیں؟ ان پر مسلمانوں کے گناہ لادے جائیں گے، اس وجہ سے کہ کافر مسلمان سے بغض رکھتا ہے، گالیاں دیتا ہے، غیبت کرتا ہے اور جنگ کرتا ہے، اس لیے وہ مستحق ہے کہ صدقہ کا بکر ا بنا یا جائے۔

گیارہواں قول

اس کا بیان کہ کیا موت کے بعد بعینہ یہی اجسام اٹھائے جائیں گے؟

معتزلہ نے کہا کہ اجساد فنا و معدوم ہو جاتے ہیں، پھر اللہ تعالیٰ قیامت کو دوسرا جسم پیدا فرما کر اس میں روح ڈالے گا اور اسے عذاب و ثواب دے گا اور یہ عقیدہ کفریہ ہے۔ اہل سنت و جماعت کہتے ہیں: بعینہ یعنی جسم اٹھایا جائے گا، دلیل یہ ہے: ”كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ“ (المدثر: ۳۸) ہر جان اپنے اعمال میں گروی ہے، نیز فرمایا: ”جَزَاءُ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ“۔ اور اس لیے کہ عمل اس جسم سے ہوتا ہے، اگر اللہ تعالیٰ دوسرا جسم پیدا کر کے اس میں روح ڈال کر عذاب دے تو یہ عدل کے خلاف ہے، اللہ تعالیٰ جل و علا فرماتا ہے: ”لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ اُخْرٰی“ (الانعام: ۱۶۳) کوئی بوجھ اٹھانے والی (جان) دوسری کا بوجھ نہیں اٹھائے گی۔

تو یہی واجب ہے کہ اسی جسم کو اٹھا کر اس کے اچھے برے کاموں کا بدلہ دیا جائے۔

اجساد کے بعینہ زندہ کرنے پر اشکال

دریافت طلب امر یہ ہے کہ اگر اسی جسم کو بعینہ اٹھایا جائے گا اور اسی جسم کو سزا دی جائے گی تو یہ شخص مرنے کے بعد گل سڑ گیا، مٹی ہو گیا، معدوم ہو گیا تو بعینہ اس کا اٹھانا متصور نہیں ہو سکتا بلکہ عدم سے دوبارہ وجود میں لایا جائے گا تو از سر نو تخلیق ہوگی تو ثابت ہوا کہ دوسرا جسم پیدا کیا جائے گا بعینہ ہو بہو یہی جسم تو نہ ہوا۔

رفع اشکال کی تقریر

اس اشکال کو اٹھانے کے لیے ہم نے کہا کہ جائز ہے کہ اللہ تعالیٰ اسی جسم کو بعینہ عدم سے وجود میں لائے اور اللہ تعالیٰ اسی جسم کو بعینہ اٹھائے اس طرح کہ اس مٹی کو گوشت اور ہڈی بنا دے، جیسی پہلی تھی۔ یہ شخص بالکل وہی شخص ہو اور یہ جو ہر بعینہ وہی جو ہر ہوگا لیکن اس صفت کو بدل کر دوسری صفت عطا فرمائے گا اور صفت کی تبدیلی سے دوسرے شخص کا پیدا کرنا لازم نہیں آتا بلکہ وہی شخص ہے پہلی صفت سے بدلا ہوا۔ یہودیوں نے کہا کہ روح مع الجسد بعینہ اٹھائی جائے گی، لیکن وہ نہ کھائے گی نہ پئے گی اور نہ کسی چیز سے انتفاع حاصل کرے گی یہ مسئلہ اپنی جگہ بیان کیا جائے گا۔ بتوفیق اللہ تعالیٰ

بارھواں قول

سوال منکر و نکیر اور عذاب قبر کا بیان

جہینہ معتزلہ اور نجاریہ ان تینوں فرقوں نے عذاب قبر اور منکر و نکیر کے سوال کا انکار کیا ہے۔ انہوں نے کہا: اس کی چند صورتیں ہیں: (۱) جسم کو عذاب ہوگا بغیر روح کے (۲) یا یہ کہ روح جسم میں ڈالی جائے گی اور عذاب ہوگا (۳) یا صرف روح کو عذاب ہوگا جسم کو نہ ہوگا۔ یہ تینوں باتیں جائز نہیں اس لیے کہ جسم کو بغیر روح کے تکلیف نہیں ہوتی اور اگر جسم میں روح داخل کی جائے تو دوبارہ موت کا محتاج ہوگا اور یہ جائز نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ" انسان ایک ہی مرتبہ مرتا ہے۔

دوسری صورت "روح بغیر جسم کے" یعنی روح کو بغیر جسم کے عذاب نہیں دیا جاتا۔

اہل سنت و جماعت فرماتے ہیں کہ عذابِ قبر حق ہے اور منکر و نکیر کا سوال بھی حق ہے اور ثابت ہے۔

اس کی دلیل حضور اقدس ﷺ کی وہ حدیث ہے جس میں آپ نے عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا: اے عائشہ! جب قبر دبائے گی اور منکر نکیر سوال کریں گے تو اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: میں قبر کے عذاب اور منکر و نکیر کے سوال سے ڈرتی ہوں۔ حضور شفیع یوم النشور نے ارشاد فرمایا: اے حمیرہ! (ام المؤمنین کا لقب ہے) مؤمن کے حق میں قبر کا دبانا ایسا ہے جیسے ماں اپنے بچے کا ہاتھ پاؤں دباتی ہے اور سوال منکر و نکیر مؤمن کے لیے ایسے ہے جیسے آشوبِ چشم یعنی دکھتی ہوئی آنکھوں میں سرمہ لگایا تو اس کو تکلیف ہو۔ حضور اقدس سے مروی ہے آپ نے فرمایا: اے عمر! اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا جب تمہارے پاس قبر میں منکر و نکیر آئیں گے؟ عرض کی: یا رسول اللہ ﷺ! میں حال پر ہوں اور عقل میرے ساتھ ہوگی؟ فرمایا: ہاں، تو حضرت عمر نے کہا: اب مجھے پرواہ نہیں اور اس کے علاوہ یہ امر معقول و مشروع ہے کہ سونے والے کی روح اس کے جسم سے نکل جاتی ہے قرآن کریم میں ارشاد ہے: ”اللَّهُ يَتَوَفَّى الْأَنْفُسَ حِينَ مَوْتِهَا“ (الزمر: ۴۲) اللہ تعالیٰ روح کو قبض کرتا ہے مرنے کے وقت اور سونے کے وقت پھر خواب میں رنج و الم اور راحت و آرام پاتا ہے، جانتا ہے، کلام کرتا ہے، روتا ہے، ہنستا ہے، سنتا ہے، اس لیے کہ اس کی روح کا جسم کے ساتھ تعلق رہتا ہے اور جب روح شخص کے ساتھ متصل ہے تو اس اتصال و تعلق کی وجہ سے درد محسوس ہوگا، خواہ ہڈی ہو، گوشت ہو یا مٹی ہو، وہ رنج و الم کا احساس کرتی ہے۔

(۱) اس پر دلیل یہ ہے کہ حضور سے پوچھا گیا: یا رسول اللہ! قبروں میں گوشت کو کیسے تکلیف ہوگی، حالانکہ اس میں روح نہیں ہوگی؟ فرمایا: جیسے تیرا دانت درد کرتا ہے اور اس میں روح نہیں اور دانت درد اس لیے کرتا ہے کہ دانت گوشت کے ساتھ متصل ہوتا ہے اور گوشت متصل ہے دانت کے ساتھ تو درد و تکلیف محسوس کرتا ہے۔

(۲) اور نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ قبرستان میں تشریف لے گئے، دونی قبروں کے پاس سے آپ کا گزر ہوا، فرمایا: ان دونوں میں ہلکا عذاب ہے۔ تو آپ

نے کھجور کی ایک ہری بھری ٹہنی لے کر اس کے دو ٹکڑے کئے اور دونوں قبروں پر اس شاخ کے ٹکڑوں کو گاڑ دیا اور فرمایا کہ جب تک یہ خشک نہیں ہوگی، قبروں والوں کا عذاب ہلکا ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "سَنُعَذِّبُهُمْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّونَ" (التوبہ: ۱۰۱) ہم انہیں عذاب دیں گے دو مرتبہ پھر وہ بڑے عذاب کو دیکھیں گے یعنی جہنم کو دیکھیں گے اور دو مرتبہ کے عذاب سے مراد عذاب دنیا اور عذاب قبر ہے۔

عذاب قبر پر دلائل منقول از حماد ابن ابی حنیفہ رضی اللہ عنہما

اور حماد ابن ابی حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ انہوں نے اپنے والد (امام اعظم رضی اللہ عنہ) سے اس بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا: عذاب قبر حق عذاب قبر حق۔ حماد پھر پوچھتے ہیں: والد گرامی! اس پر کوئی دلیل؟ ارشاد ہوتا ہے: اس پر دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے کہ "وَإِنَّ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا عَذَابًا دُونَ ذَلِكَ" (الطور: ۴۷) اور بے شک ظالموں کے لیے اس کے علاوہ بھی عذاب ہے یعنی جہنم کے علاوہ "یعنی دون جہنم" اور اس سے مراد عذاب قبر ہے۔

عذاب قبر کے تین حصے ہیں

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: عذاب قبر کے تین اجزاء ہیں:

- (۱) ۱/۳ (ایک تہائی) غیبت کرنے والے کو غیبت سے۔
- (۲) ۱/۳ (ایک تہائی) چغل خور کو چغلی کھانے سے۔
- (۳) ۱/۳ (ایک تہائی) پیشاب کی وجہ سے ہوگا۔

مؤمنوں اور کافروں کے عذاب قبر میں فرق

مؤمنوں کے لیے قبر کا عذاب جائزات سے ہے اور کافروں کے لیے عذاب قبر واجبات سے ہے یعنی لازمی طور پر ہوگا۔ کافروں کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "النَّارُ يُعْرَضُونَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَعَشِيًّا" (الغافر: ۴۶) یعنی فرعون اور اس کی قوم پر صبح و شام آگ پیش کی جاتی ہے۔

یہ آیت عذاب قبر کے ثبوت پر واضح دلیل ہے، بہر حال عذاب قبر حق ہے کسی جگہ ہو کسی حال میں ہو جو اس کا انکار کرے وہ کافر ہے۔ واللہ اعلم

تیرھواں قول جنت اور دوزخ کی تخلیق کا بیان

جنت و دوزخ ابھی پیدا نہیں ہوئے؟

معتزلہ اور جہمیہ کہتے ہیں کہ جنت اور دوزخ ابھی تک پیدا نہیں ہوئے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن پیدا کرے گا اس لیے کہ حکمت کا تقاضا نہیں ہے کہ ثواب و عتاب کو ان کے مستحقین سے پہلے ہی پیدا کر دیا جائے۔ علاوہ ازیں یہ وجہ بھی ہے کہ اگر یہ دونوں مخلوق ہیں تو زمین و آسمان کے ساتھ ان کا فنا ہونا بھی ضروری ہوگا۔

مسئلہ تخلیق جنت و دوزخ اور اہل سنت

اہل سنت و جماعت فرماتے ہیں: جنت اور دوزخ دونوں مخلوق (پیدا شدہ) ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ إِلَّا مَنْ شَاءَ اللَّهُ.
بے ہوش ہو جائیں گے مگر جس کو اللہ چاہے
آسمان و زمین میں جو کچھ ہے سب
(الزمر: ۶۸) گا۔

اور استثناء سے مراد اہل جنت اور اہل نار ہیں۔ ثواب و عتاب کو ان کے اہل سے پہلے پیدا کرنے میں یہ حکمت بھی ملحوظ ہے کہ اس طرح بندہ اللہ کی اطاعت پر زیادہ حریص ہوگا اور معصیت و نافرمانی سے زیادہ اجتناب و گریز کرے گا۔
اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَجَنَّةٌ عَرْضُهَا السَّمَوَاتُ وَالْأَرْضُ أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِينَ.
کہ جنت کا عرض آسمان و زمین کے برابر ہے جو پرہیزگاروں کے لیے تیار کی گئی
(آل عمران: ۳۳) ہے۔

اور دوزخ کے بارے میں فرمایا: "أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ" (البقرہ: ۲۳) کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔ اگر وہ دونوں مخلوق نہ ہوں تو اللہ کی خبروں میں جھوٹ لازم آئے گا۔

جنت پیدا ہو چکی ہے کی تیسری دلیل اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: "خَلَقَ الْجَنَّةَ فَوْقَ السَّمَوَاتِ" اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کے اوپر جنت کو پیدا فرمایا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهَىٰ عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَأْوَىٰ" (النجم: ۱۳-۱۵) سدرۃ المنتہیٰ کے پاس جنت الماویٰ ہے تو آسمان وزمین کے فنا ہونے سے جنت کا فنا ہونا لازم نہیں آتا۔ اشکال: اگر کہا جائے کہ "جَنَّةٌ" سے مراد "جَنَّةٌ" ہے "ہا" کے ساتھ ہے اور یہ جبریل سے کنایہ ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ لفظ "جَنَّةٌ" ہے "جَنِّ يَجْنُّ" کے باب سے اس کے معنی "مُسْتَرَّةٌ" یعنی پردہ آڑ مراد ہے۔

جواب: جو اب اس سلسلے میں گزارش یہ ہے کہ یہ لفظ ساتوں قراءتوں میں موجود نہیں کسی قراءت میں اس کی تلاوت نہیں ہوتی لہذا اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے بلکہ لطف کی بات تو یہ ہے کہ اس کے خلاف دلیل میں ابن عباس کی حدیث موجود ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں: جس نے جَنَّةٌ "ہا" کے ساتھ پڑھا اللہ تعالیٰ اسے مجنون (دیوانہ) کر دے گا لہذا یہ جائز نہیں۔ پس جو کچھ ہم نے کہا وہ صحیح ثابت ہوا۔

جہنم کہاں ہے؟

جہنم پیدا ہو چکی ہے اور وہ زمین کے نیچے ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ "إِنَّ كِتَابَ الْفُجَّارِ لَفِي سِجِّينٍ" (المطففين: ۷) بے شک گنہگاروں کی کتاب (نامہ اعمال) سجین میں ہوگی۔ اور یہ نص ہے اس باب میں جو انکارے کرے وہ کافر ہو جائے گا۔

چودھواں قول

جنت و دوزخ باقی رہیں گے یا نہیں؟

معتزلہ اور جمیہ کہتے ہیں: عذاب چکھانے اور ثواب پہنچانے کے بعد جنت و دوزخ فنا ہو جائیں گے ہمیشہ باقی نہیں رہیں گے۔

جنت اور دوزخ کے فنا ہونے پر دلیل

اس پر دلیل اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ وہی (اللہ تعالیٰ) اول اور وہی آخر ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ

مخلوقات سے اول ہے اور ایسے ہی آخر ہے کہ اس کے بعد کوئی مخلوق نہیں آئے گی تو ضروری ہوا کہ اللہ تعالیٰ بغیر مخلوق باقی رہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ”فَأَمَّا الَّذِينَ سَعَدُوا ففِي الْجَنَّةِ خَالِدِينَ فِيهَا مَا دَامَتِ السَّمَوَاتُ وَالْأَرْضُ إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ“ (ہود: ۱۰۸) پس خوش نصیب جنت میں ہیں اس میں ہمیشہ رہیں گے جب تک آسمان و زمین رہیں مگر جتنا تمہارے رب نے چاہا۔ اور جہنمیوں کے بارے میں فرمایا: ”مَا دَامَتِ السَّمَوَاتُ وَالْأَرْضُ إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ“۔

اس استثناء کا فائدہ یہی ہے کہ جنت و دوزخ دونوں ہمیشہ باقی نہیں رہیں گے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جہنم پر ایک دن آئے گا کہ ہو اس کے دروازے بجائے گی کہ اس میں کوئی نہ ہوگا۔

جنت و دوزخ ہمیشہ باقی رہیں گے

اہل سنت و جماعت کے دلائل: اہل سنت و جماعت فرماتے ہیں کہ ”جنت و دوزخ ہمیشہ باقی رہیں گے ان کو فنا نہیں“ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ”إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَى مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنْ لَهُمُ الْجَنَّةُ“ (التوبہ: ۱۱۱) بے شک اللہ تعالیٰ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور مال خرید لیے ہیں (اس کے بدلے) کہ ان کے لیے جنت ہے۔ جو چیز خریدی گئی ہے وہ دائمی طور پر باقی رہتی ہے یعنی خریدار نے جو (سودا) خریدا ہے وہ اس کے پاس رہے گا تو ثابت ہوا کہ اس کا بدل بھی علی سبیل الدوام (یعنی ہمیشہ کے لیے) ہوگا۔

۱۔ نبی اکرم ﷺ سے مروی ہے کہ آپ ایک رات مسجد میں تشریف لے جانے کے ارادے سے نکلے تاکہ معلوم کر سکیں کہ آپ کے غلاموں میں سے کون ہے جو اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول ہے۔ جب آپ مسجد شریف کے دروازے کے قریب پہنچے تو آپ ﷺ کو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی آواز سنائی دی وہ قرآن پاک کی تلاوت میں مصروف تھے۔ جب وہ اس آیت کریمہ پر پہنچے: ”إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَى مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنْ لَهُمُ الْجَنَّةُ“ تو وہ بڑے شدید انداز میں رونے لگے اور اس بات سے بے خبر تھے کہ حضور نبی اکرم ﷺ مسجد کے دروازے پر تشریف فرما ہیں۔ جب صبح ہوئی اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور اکرم ﷺ کی اقتداء میں نماز صبح ادا فرمائی (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اس پر دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: "أُولَئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ" (الاعراف: ۴۲) وہی لوگ جنتی ہیں اس میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور جہنم کے بارے میں فرمایا: "أُولَئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ" - "إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ" کی تشریح فراء سے مروی ہے انہوں نے کہا کہ اس کے معنی ہیں: "وقد شاء ربك"۔

عرب اسی قسم کا محاورہ بولتے ہیں کہ مثلاً وہ کہتے ہیں: "فعلت كذا وكذا إلا ما شئت" میں ایسا ایسا کیا یعنی "قد شئت" کے معنی میں ہے۔

اور دوسری دلیل یہ ہے کہ حضرت ضحاک نے حضرت ابوسعید خدری اور حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہم) سے روایت ہے کہ نبی کریم نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ "وَأَمَّا الَّذِينَ

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) تو نبی اکرم ﷺ صحابہ کرام کی طرف متوجہ ہوئے اور حضرت ابو بکر صدیق (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) سے فرمایا: تم "إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَى" (الآیۃ) والی آیت پڑھ کر کیوں رو رہے تھے؟ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کی: یا رسول اللہ ﷺ! میں کیسے نہ روتا؟ اللہ تعالیٰ نے بندے کی جان خرید لی ہے اب اگر بندہ عیب دار نکلا تو مشتری اس خریداری کو رد کر دے گا لہذا مجھے خوف ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے میرے عیب کے سبب کہیں رد نہ فرمادے پس میں جہنم والوں میں سے ہو جاؤں حضرت جبرائیل علیہ السلام نے بارگاہ رسالت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ اے محبوب ﷺ! آپ اللہ تعالیٰ کی طرف سے صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو فرما دیجئے کہ جب خریدار بندے کے عیب سے واقف ہو اور اس کے باوجود اسے خرید لیں تو اس کو ادا کرنے کا حق نہیں رہتا اور میں اپنے بندے کے عیب اس کے پیدا کرنے سے پہلے ہی جانتا تھا لہذا میں اس کو رد نہیں کروں گا اسی طرح اگر عیب خریداری کے بعد پیدا ہوا تو نے عیب کی وجہ سے خریدار کو رد کرنے کا حق نہیں ہوگا۔

اسی طرح اگر کسی نے دس اونٹ خریدے اور ان میں سے نو عیب دار ہیں اور ایک صحیح سلامت ہے تو اب اگر اس نے عیب دار اونٹوں کو لوٹانے کا ارادہ کیا تا کہ بدلے میں صحیح اونٹ لے سکے تو شریعت اسے اس کام سے منع کرتی ہے اور تمام کو قبول کرنے کا حکم دیتی ہے یا پھر تمام کو لوٹانے کا حکم دیتی ہے نہ کہ صرف عیب داروں کو اور میں نے تمام مؤمنوں کو خرید لیا ہے پس ہماری اس خریداری میں انبیاء کرام اولیاء و فرمانبردار سب شامل ہیں اور ان میں کوئی عیب نہیں ہے کیوں کہ میں نے تمام کو ایک خریداری سے خریدا ہے۔

شَقُوا فِي النَّارِ لَهُمْ فِيهَا زَفِيرٌ وَشَهِيقٌ خَالِدِينَ فِيهَا مَا دَامَتِ السَّمَوَاتُ
وَالْأَرْضُ إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ“ (سود: ۱۰۶) اور وہ لوگ جو بد بخت ہیں وہ دوزخ میں ہیں وہ
اس میں گدھے کی طرح رینگیں گے جب تک آسمان و زمین رہیں مگر جتنا تمہارا رب چاہے۔
یعنی وہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے مگر ”إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ“ اور اس سے مراد اہل کبار ہیں کہ وہ
ہمیشہ نہیں رہیں گے یعنی آخر جنت کی طرف نکالے جائیں گے۔ ”وَأَمَّا الَّذِينَ سَعَدُوا فِي
الْجَنَّةِ خَالِدِينَ فِيهَا مَا دَامَتِ السَّمَوَاتُ وَالْأَرْضُ إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ“ (سود: ۱۰۸)
اور وہ لوگ جو خوش نصیب ہوئے وہ جنت میں ہیں اس میں وہ ہمیشہ رہیں گے جب تک
آسمان و زمین رہیں مگر جتنا تمہارا رب چاہے یعنی اہل کبار کہ وہ پہلے مرحلہ میں جنت میں
نہیں جائیں گے سزا بھگت کر بعد میں جنت میں داخل ہوں گے۔

دوسری توجیہ یہ ہے کہ ”ماشاء ربك“ کے معنی ہیں: ”ماشاء من المدة“ جتنی
مدت وہ چاہے اور یہ کہ اس سے مراد دنیا کی مدت، قبر کی مدت اور قیامت کے دن کی مدت
مراد ہے۔

یعنی جنتی جنت میں اور دوزخی دوزخ میں نہیں ہوں گے جب تک وہ دنیا میں ہیں۔
”هو الاول هو الاخر“ کا مفہوم اس قول کے متعلق ہم کہتے ہیں کہ آیت میں
”آخر“ ہے مگر یہ نہیں ہے کہ اس کا غیر نہیں، یعنی اس کے سوا کچھ نہیں۔ پھر ایک شئی کا ذکر
دوسری چیز کی نفی کرنا۔

علاوہ ازیں ہم کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ ایک ہے، اثبات وجود کے ساتھ اول ہے اور آخر
ہے بالبقاء یعنی وہی باقی رہے گا۔ جنت و دوزخ اور اس کے اہل یہ اللہ تعالیٰ کے باقی رکھنے
سے آخر ہیں لہذا دونوں (اللہ اور بندوں) کے درمیان فرق ہو گیا۔

ایک حدیث شریف کی تشریح

حضور ﷺ کی اس حدیث شریف ”سیاتی علی جہنم یوم تصفق الريح
ابوابها لیس فیہا احد“ ”ای لیس فیہا احد من المؤمنین“ کا مفہوم یہ ہے کہ جہنم
میں کوئی مؤمن باقی نہیں رہے گا اور ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ کوئی مؤمن جہنم میں نہیں رہے گا
جہنم مؤمنوں کے رہنے کی جگہ نہیں، اہل کبار سزا بھگت کر آخر جنت میں جائیں گے اور وہ

ہمیشہ جہنم میں نہیں رہیں گے۔

جنت و دوزخ کے بارے میں بعض لوگوں کے جداگانہ نظریہ کی تردید

بعض لوگوں کا نظریہ یہ ہے کہ جنت فنا نہیں ہوگی اور جہنم فنا ہو جائے گا اور جہنمی بھی فنا ہو جائیں گے اس لیے کہ عقل و حکمت کا یہ تقاضا نہیں کہ انہیں ایک محدود وقت تک کفر میں مبتلا رہنے کی وجہ سے ہمیشہ کے لیے عذاب میں رکھا جائے۔

لیکن یہ درست نہیں ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا“ اس میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور فرمایا کہ ”كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُودُهُمْ بَدَّلْنَاهُمْ جُلُودًا غَيْرَهَا لِيَذُوقُوا الْعَذَابَ“ (النساء: ۵۶) جب کبھی ان کی کھالیں پک جائیں گی ہم ان کی کھالیں بدل دیں گے ان کے علاوہ تاکہ وہ عذاب چکھیں۔ اور ”کلما“ کا لفظ اس معنی کا تقاضا کرتا ہے کہ یہ تکرار دائمی طور پر ہو (یعنی ”کلما“ کا لفظ چاہتا ہے کہ یہ ان کی کھالوں کا بار بار بدلنا ابدی ہو اور ہمیشہ کے لیے ہو)۔

دوسری بات یہ ہے کہ کافر کا کفر ابدی ہے کہ اگر وہ ہمیشہ زندہ رہتا تو کفر پر قائم رہتا کہ اس کا ہمیشہ کے لیے اعتقاد ہی کفر تھا اس لیے عقوبت و سزا بھی ہمیشہ ہوگی۔ اسی لیے اہل جنت ہمیشہ جنت میں ہوں گے کہ اگر وہ ہمیشہ زندہ رہتے تو ان کا اعتقاد ایمان پر ہوتا تو وہ اپنے اعتقاد کے مطابق ہمیشہ جنت میں رہیں گے۔

جہنمیوں کے بارے میں بعض مرجیہ کا نظریہ

بعض مرجیہ کہتے ہیں کہ جہنم فنا نہیں ہوگی۔ اللہ تعالیٰ سب جہنمیوں کو جہنم میں داخل فرمائے گا، لیکن عذاب نہیں دے گا اور وہ جہنم میں بغیر عذاب کے رہیں گے۔ انہوں نے کہا کہ کیا آپ دیکھتے نہیں کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کافروں کو نعمتیں دیتا ہے عذاب نہیں دیتا؟ یونہی آخرت میں ہوگا اور اہل سنت و جماعت کے نزدیک ان کو شدید عذاب ہوگا۔ قرآن پاک میں فرمایا: ”فَذَاقَتْ وَبَالَ أَمْرِهَا وَكَانَ عَاقِبَةُ أَمْرِهَا خُسْرًا أَعِدَّ اللَّهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا“ (الطلاق: ۹-۱۰) تو انہوں نے اپنے عمل کا وبال چکھا اور ان کے کام کا انجام گھانا ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے سخت عذاب تیار کر رکھا ہے۔ اور فرمایا: ”لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ“ (آل عمران: ۴) علاوہ ازیں اور بھی آیتیں ہیں جو اس مسئلہ میں بطور دلیل پیش کی جاسکتی ہیں۔

معتزلہ اور جہمیہ کا نظریہ (عقیدہ)

معتزلہ اور جہمیہ کہتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ پہلی بار صور پھونکنے کا حکم دے گا تو (پہلے نغخ سے) تمام اشیاء معدوم ہو جائیں گی سوائے چند ان چیزوں کے جو یہ ہیں: عرش، کرسی، لوح و قلم اور ارواح وغیرہ۔

ان حضرات کے نزدیک جنت و دوزخ ابھی پیدا ہی نہیں ہوئے ان کو قیامت کے روز اللہ تعالیٰ پیدا فرمائے گا اور یہ مذہب صحیح نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ" (الزمر: ۶۸) تو آسمان اور زمین میں رہنے والے بے ہوش ہو جائیں گے۔ پھر بعض چیزیں باقی رہیں گی جنہیں اللہ تعالیٰ باقی رکھنا چاہے گا، مثل جنت، دوزخ اور جو کچھ ان میں ہے اور عرش و کرسی، لوح و قلم اور روح، یہ سب باقی اللہ تعالیٰ کے اذن سے باقی رہیں گے۔

عرش سے کیا مراد ہے؟

معتزلہ کہتے ہیں کہ عرش سے مراد ملک ہے اور کرسی سے مراد قلم ہے اور یہ صحیح نہیں اس لیے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمَانِيَةَ" (الحا: ۱۷) اور اس دن تمہارے رب کا عرش آٹھ فرشتے اپنے اوپر اٹھائیں گے۔ اور ظاہری بات ہے کہ ملک کو اٹھایا نہیں جاتا ہے تو ان کا کلام درست نہیں اور پھر یہ کہنا جائز نہیں کہ اللہ تعالیٰ تھا اور کوئی شے نہ تھی اس لیے کہ اللہ تعالیٰ بھی شے ہے۔

اور صحیح یہ ہے کہ یوں کہے کہ اللہ تعالیٰ تھا اور اس کے ساتھ کوئی شے نہ تھی اور یہ کہنا بھی جائز نہیں کہ اللہ تعالیٰ ہوگا اور کوئی شے نہ ہوگی اس لیے کہ اللہ تعالیٰ باقی ہے اور وہ شے ہے پھر (اسی طرح) جنت و دوزخ، عرش و کرسی، لوح و قلم اور روہیں باقی رہیں گے اللہ تعالیٰ کے باقی رکھنے سے اور یہ سب بلا اختلاف شے ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم

پندرہواں قول

جنت کی نعمتوں سے نفع اٹھانے کا بیان

اہل سنت و جماعت فرماتے ہیں کہ جائز ہے کہ اللہ تعالیٰ مومنوں کو جنت کی بے حساب

اور بے شمار نعمتیں عطا فرمائے اور ایک مؤمن کو پوری دنیا کے برابر عطا ہو بلکہ سات گنا زیادہ عطا ہو اور معتزلہ نے اس کا انکار کیا اور کہا کہ ایک مؤمن کیسے دیکھے گا اور نفع اٹھائے گا اور کہاں بیٹھے گا؟ جب کہ اس کو دنیا کے برابر باغات اور نعمتیں اور خادم وغیرہ ملیں گے اور جب اس کو اس قدر چیزوں کی حاجت نہ ہوگی تو ان میں تصرف کیسے کرے گا اور نفع کیسے اٹھائے گا؟ تو اس میں نعمتوں کا ضائع کرنا ہے اور نعمتوں کا ضیاع نادانی اور بیوقوفی ہے اور اللہ تعالیٰ سبحانہ ہر عیب سے پاک و منزہ ہے۔

معتزلہ کے مذہب کی تردید

ہم کہتے ہیں: جنت کی نعمتوں کو بے کار اور ضائع ہونے کے وصف سے موصوف نہیں کیا جاسکتا اس لیے کہ جنت کی نعمتیں نہ گلیں سڑیں گی اور نہ فنا ہوں گی اور اس لیے کہ وہ نعمتیں اس وقت بھی اپنی حالت میں موجود ہیں اس پر دلائل پوری تفصیل کے ساتھ بیان ہو چکے ہیں اور وہ ضائع ہونے والی نہیں ہیں۔

پھر یہ ضروری ہوا کہ جنت کی نعمتیں اور املاک دنیا کی نعمتوں اور یہاں کی املاک سے زیادہ ہوں اور پھر جب دنیا کی نعمتوں میں جائز ہے کہ مشرق سے مغرب تک ہو جیسے حضرت سلیمان علیہ السلام اور ذوالقرنین اور بخت نصر اور نمرود کہ باوجود اس وسعت اور فراوانی کے ان کو حاجت نہ تھی اور سب چیزوں سے انتفاع حاصل کرتے تھے اور ایسے ہی جائز ہے کہ جنت میں شمار سے بھی زیادہ نعمتیں ہوں اور اللہ تعالیٰ کے مقدر کر دینے سے ان نعمتوں سے نفع اٹھانا بھی ممکن ہے اور اس لیے کہ سلیمان علیہ السلام اگر اپنا ملک دوسرے کو دے دیں تو کیا وہ جزاء کے مستحق نہیں ہیں؟ اور جب جزاء میں شک نہیں تو جائز ہے کہ اس کی جزاء دس گنا ہو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرَ امْثَالِهَا" (الانعام: ۱۶۰) جو نیکی کرے تو اس کے لیے اس جیسی دس ہیں۔ تو پھر جزائے دنیا سے دس گنا ہوگی جب ایک کے لیے جائز ہے تو دوسرے تیسرے کے لیے بھی جائز ہوگی اور یہ کسی کے لیے جائز نہیں کہ وہ کہے کہ بادشاہ کے لیے مفت کسی دوسرے کو ملک و حکومت دے دینا جائز نہیں لہذا جزا بھی واجب نہیں اس لیے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "فَاَمِنْ أَوْ اَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ" (سن: ۳۹) پس تو چاہے تو احسان کر یا روک لے۔ جب جنت اس پر واجب ہے تو جزا بھی واجب ہے۔

اگر کہا جائے کہ تمام دنیا حضرت سلیمان علیہ السلام کی ملک نہ تھی اور ہاں بادشاہی تھی اور بذل ملک جزا کو واجب نہیں کرتا۔ میں کہتا ہوں: جیسے تمام دنیا سلیمان علیہ السلام کی ملک تھی تو جائز ہے کہ ان کے سوا کسی اور کی بھی ملک ہو جیسے ہمارے نبی مکرم ﷺ کے لیے مالِ غنیمت حلال تھا تو اگر تمام دنیا یا بعض دنیا غنیمت کے سبب اپنے نفس اور ذات کے لیے ملکیت ہو سکتی ہے تو کیا پھر یہ بات جائز نہیں؟ تو جو ہم نے کہا وہ صحیح ہے اور ثابت ہے۔

ایک اور دلیل

اور نبی کریم ﷺ سے مروی ہے آپ نے فرمایا کہ ”لقاب قوسین احد کم فی الجنة خیر مما طلعت علیہ الشمس و مما غربت“ قاب قوسین کے برابر جنت میں جگہ دنیا سے بہتر ہے تو ثابت ہوا کہ جنت اور اس کی نعمتیں دنیا سے زیادہ ہوں یہاں تک کہ وہ دنیا سے بہتر ہو تو ہمارا کہنا صحیح ثابت ہوا۔

جنت اور اس کی نعمتوں سے نفع اٹھانے کی اباحت پر دلیل

جنت میں کھانا پینا اور نفع حاصل کرنا مباح ہے۔ دلیل یہ ہے کہ قرآن پاک میں فرمایا: ”اُكْلُهَا دَائِمٌ“ (الرعد: ۳۵) اس کے پھل ہمیشہ رہنے والے ہیں۔ اور فرمایا: ”وَسَقِيهِمْ رَبَّهُمْ شَرَابًا طَهُورًا“ (الدھر: ۲۱) اور انہیں ان کے رب نے پاکیزہ شراب پلائی اور فرمایا: ”وَفِيهَا مَا تَشْتَهِيهِ الْأَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْأَعْيُنُ“ (الزخرف: ۷۲) اور اس میں وہ چیزیں ہیں جنہیں دل پسند کریں اور آنکھیں لذت حاصل کریں۔ اور یہود و نصاریٰ اس کے منکر تھے انہوں نے کہا کہ کھانا پینا وغیرہ حاجت کے لیے ہوتا ہے اور اہل جنت جنت کی نعمتوں کے محتاج نہیں۔

ہم کہتے ہیں کہ دنیا میں تو کھانا پینا وغیرہ کبھی حاجت کے لیے ہوتا ہے اور کبھی لذت حاصل کرنے اور خواہش و شوق کے پورا کرنے کے لیے ہوتا ہے لیکن جنت میں کھانا پینا اور نفع اٹھانا حاجت سے نہیں ہوگا بلکہ جنت میں یہ سب کچھ تلذذ اور خواہش سے ہوگا۔

کیا جن بھی جنت میں جائیں گے؟

یہ اجماعی مسئلہ ہے کہ مسلمان جن جنت میں داخل ہوں گے۔ اب رہا یہ مسئلہ کہ ان کو ثواب بھی ملے گا یا نہیں؟ تو امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: مؤمن جن جنت

میں جائیں گے ان کو ثواب نہیں ملے گا اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے جنوں کے قول کی خبر دیتے ہوئے فرمایا کہ ”يَا قَوْمَنَا اجِيبُوا دَاعِيَ اللَّهِ وَاٰمِنُوْا بِهِ يَغْفِرْ لَكُمْ مِنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُجْرِكُمْ مِنْ عَذَابِ اَلِيْمٍ“ (الاحقاف: ۲۱) اے ہماری قوم! اللہ تعالیٰ کی طرف بلائے والے کو لبیک کہو اور اس پر ایمان لاؤ وہ تمہارے گناہوں کو بخش دے گا اور تمہیں دردناک عذاب سے نجات دے گا۔ مغفرت و نجات کا ذکر فرمایا ثواب کا ذکر نہیں فرمایا۔

اور قاضی ابو یوسف و امام محمد اور امام شافعی رحمہم اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جنات کو بھی ثواب ہوگا جس طرح عقوبت ہوگی۔ صحیح ترین بات یہ ہے کہ ان کے لیے کھانا پینا نہیں ہوگا لیکن تمشع حاصل کریں گے دیکھ کر سن کر جیسے دنیا میں تھا۔ لیکن استمتاع تو بعض فقہاء نے فرمایا کہ ان کے لیے جنت میں اہل جنت کے ساتھ استمتاع نہیں ہے۔

بعض فقہاء فرماتے ہیں کہ جنات کے لیے استمتاع بھی ہے جیسے دنیا میں تھا حسب طبیعت اور حسب عادت اور متقدمین سے اس بارے میں کوئی قول مروی نہیں اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ”لَمْ يَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَانٌّ“ (الرحمن: ۷۳) ان سے پہلے کسی انسان اور جن نے انہیں ہاتھ نہیں لگایا۔ اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ جنات جنتی اہل طمٹ میں سے ہیں اور یہ خبر نہیں دی کہ ان کو طمٹ بھی ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ اگر ان میں اشتہاء ہے تو طمٹ بھی ہوگا اور یہ محال نہیں جیسے انسان کے حق میں ہے اور اگر ان میں اشتہاء نہیں تو طمٹ بھی نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”وَفِيْهَا مَا تَشْتَهِيْهِ الْاَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْاَعْيُنُ“ (الزخرف: ۷۲) اور اس میں وہ چیزیں ہیں جنہیں دل پسند کریں اور آنکھیں لذت حاصل کریں۔ اور جب ان میں طمٹ کے ساتھ تلذذ دنیا میں تھا تو جائز ہے کہ آخرت میں بھی ہو جیسے انسان کے حق میں ہے۔

اصح یہ ہے کہ ان کے لیے جنت والوں سے طمٹ ہے اور اہل جنت کے ساتھ نہ ہوں گے۔ پھر ہم کہتے ہیں: ان کو اشتہاء نہ ہوگی مگر جائز چیزوں کی اور ممنوع و مخطور چیزوں کی خواہش نہ ہوگی برخلاف دنیا کے۔ اس لیے کہ دنیا میں کبھی خواہش حرام کی ہوتی ہے اور کبھی حلال کی اشتہاء ہوتی ہے لیکن جنت میں نہ خطرہ گزرے گا اور نہ خواہش ہوگی مگر ان چیزوں کی خواہش ہوگی جو جائز ہیں اور ممنوعات کی خواہش نہ ہوگی جیسے زنا، لواطت وغیرہ۔

اگر کہا جائے کہ شیطان جنت میں جا سکتا ہے یا نہیں؟

ہم کہیں گے کہ کافر جنت میں نہیں جائیں گے خواہ انس ہوں یا جن یا شیاطین ہاں! جو مسلمان ہو گیا وہ جنت میں جائے گا۔

کیا شیطانوں میں سے کوئی مسلمان ہوا ہے یا نہیں؟

بعض نے کہا کہ شیاطین میں سے ایک شیطان اسلام لایا یہ وہ شیاطن تھا جو حضور ﷺ کے ساتھ پیدا ہوا جیسا کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ”ان شیطانی قد اسلم“ بے شک میرا ہم زاد اسلام لے آیا۔

اگر یہ صحیح ہو کہ وہ اسلام لایا تو وہ بھی جنت میں ہوگا اور بعض نے کہا کہ شیطان میں سے کوئی مسلمان نہیں ہوا اور حضور کی حدیث کا مطلب یہ ہے کہ میں اس کے وسوسہ سے سلامت رہتا ہوں اس لیے کہ شیطان کسی نبی پر قادر نہیں، خصوصاً حضور پر نور سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ پر۔

پھر فرشتوں کو جنت سے روکا نہیں جائے گا۔ اللہ کے حکم سے جنت میں جا سکتے ہیں، لیکن فرشتے جنت میں وہاں کی نعمتوں سے استراحت حاصل نہ کر سکیں گے اس لیے کہ بغیر اشتہاء و تملذ کے استراحت ناممکن ہے اور تملذ و اشتہاء طبیعت و شہوت سے ہوتی ہے اور ملائکہ ان چیزوں سے پاک ہیں ان کو طبیعت و شہوت سے پاک و منزہ پیدا کیا گیا ہے تو ان میں تملذ و اشتہاء نہ ہوگی اور اسی وجہ سے ہم نے کہا کہ وہ طاعت و عبادت کرنے سے ثواب کے مستحق نہیں، یعنی جنت اور اس کی نعمتوں سے وہ راحت حاصل نہیں کرتے، مگر ہاں! ان کو جنت سے روکا نہیں جائے گا جیسے اب بھی وہ جنت میں جاتے ہیں۔

پھر فرشتوں کی طاعت و عبادت کا بہترین بدلہ انہیں عطا کر دیا اور وہ نعیمِ اصلیہ ہیں ان کی پیدائش میں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو مقدس اور معصوم پیدا فرمایا کہ وہ نہ بھولیں نہ لہو و بیہودگی میں مبتلا ہوں نہ عبث و فضول کام کریں نہ کھائیں نہ پیئیں نہ نکاح کریں نہ ان میں خواہش ہے نہ شہوت اس لیے وہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول رہتے ہیں اس نعمتِ عظمیٰ کا شکر ادا کرتے رہتے ہیں اس کے سوا ان پر کوئی شئی واجب نہیں ہے جیسے انسانوں میں مگر اللہ تعالیٰ نے بندوں سے وعدہ کیا ہے ثواب کا ان کے افعال کی مزیت کی وجہ سے اس معنی کے

لحاظ سے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے خمیر میں بلا خواہشات اور شہوت کو جمع کر دیا اور گوندھ دیا ہے جیسا کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: بلا و شہوت آدم علیہ السلام کے خمیر میں گوندھی گئی ہے۔ پھر شیطان ان کو وسوسہ ڈالتا ہے اور معاصی کی طرف بلاتا ہے اور ترغیب دیتا ہے اور ان سب چیزوں کے باوجود انسان اللہ تعالیٰ کی طاعت و بندگی میں لگے رہتے ہیں اور خواہشات نفسانی اور شہوات و وساوس شیطان کے ساتھ مقابلہ و محاربہ کرتے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ثواب کا وعدہ دیا ہے، پھر استحقاقِ ثواب ترکِ عادت کا سبب ہے کہ خلافِ عادت و جبلتِ خدا کی عبادت میں مشغول ہیں اور ثواب ترکِ عادت کے سبب سے ہے کہ بندے عادت و جبلت کے خلاف خدا کی عبادت کرتے ہیں اور فرشتے اپنی عادت کے خلاف عمل نہیں کرتے بلکہ وہ پیدا ہی عبادت کے لیے کیے گئے ہیں اس لیے کہ کھانا، پینا، نفع گیری ان کی عادت نہیں کہ عادت کو وہ ترک کر کے خدا کی عبادت کرتے ہوں بلکہ وہ تو پیدا ہی عبادت کے لیے کیے گئے ہیں اس لیے وہ ثواب کے مستحق نہیں بخلاف جن و انس کے کہ وہ اپنی عادت و خصلت کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہیں تو مستحقِ ثواب ہوئے۔

بعض معتزلہ نے کہا کہ انسان پر شیطان کا کوئی عمل دخل نہیں اور نہ یہ ممکن ہے کہ شیطان وسوسہ پیدا کرے بلکہ انسان کی ہوئی و خواہش نفسانی ہی وسوسہ ہے اور اس طرح جنات میں معتزلہ کا خلاف ہے۔

اہل سنت و جماعت کے نزدیک، نفع، نقصان، خبر دینا، ایجاد کرنا، وسوسہ ڈالنا جن و شیطان سے جائز و ممکن ہے۔ دلیل وہی ہے جو حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ "ان الشیطن یجری من ابن آدم مجری الدم فی العروق" کہ شیطان انسان کے دل میں اس طرح سرایت کرتا ہے جیسے رگوں میں خون رواں دواں ہوتا ہے یعنی شیطان انسان میں وسوسہ پیدا کرتا رہتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: "إِنَّ الشَّيْطَانَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوهُ عَدُوًّا" (الفاطر: ۶) شیطان تمہارا دشمن ہے اس کو اپنا دشمن سمجھو۔

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "الْخَنَّاسِ الَّذِي يُوَسْوِسُ فِي صُدُورِ النَّاسِ" (الناس: ۳-۵) شیطان جو لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتا رہتا ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ نے شیطان کی خبر دی کہ وہ جہنم میں کہے گا: "وَمَا كَانَ لِي عَلَيْكُمْ مِنْ سُلْطَانٍ إِلَّا أَنْ دَعَوْتُكُمْ

فَاسْتَجَبْتُ لِي فَلَاتَلُوْا مُؤْنِيْ وَلَوْ مُؤَا اَنْفُسَكُمْ“ (ابراہیم: ۲۲) (شیطان آدمیوں سے کہے گا) کہ میری تم پر کوئی حکومت نہیں، میں تم کو بلاتا تھا اور تم میری آواز پر ”لیک“ (حاضر جناب) کہتے تھے تو مجھے ملامت نہ کرو بلکہ اپنے آپ کو ملامت کرو۔ ثابت ہو گیا کہ شیطان وسوسہ ڈالتا ہے۔

سولہواں قول

جنت میں اللہ تعالیٰ کا دیدار ہو گا یا نہیں؟

اہل سنت و جماعت نے فرمایا کہ جنت میں دیدارِ الہی جائز ہے۔

معتزلہ، جہمیہ اور یہود کہتے ہیں کہ رویتِ الہی جائز نہیں۔

ہماری (اہل سنت و جماعت کی) دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے قصہ

میں فرمایا: ”رَبِّ اَرِنِيْ اَنْظُرُ اِلَيْكَ قَالَ لَنْ تَرَانِيْ وَلٰكِنْ اَنْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ فَاِنْ اسْتَقَرَّ مَكَانَهُ فَسَوْفَ تَرَانِيْ“ (الاعراف: ۱۴۳) اے میرے رب! مجھے دکھا کہ میں تیری طرف دیکھوں، فرمایا: تو مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکتا لیکن پہاڑ کی طرف دیکھ، اگر وہ اپنی جگہ ٹھہرا رہے تو عنقریب تو مجھے دیکھ سکتا ہے۔

اس آیت سے استدلال یوں ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے رویت کی درخواست کی اور اگر وہ رویت کو ناممکن جانتے ہوتے تو ہرگز اس کی طلب اور درخواست نہ کرتے، اس لیے کہ وہ دوسروں کی بہ نسبت زیادہ جانتے تھے کہ (دیدارِ الہی) جائز ہے یا ناجائز اور یہ کہنا بالکل بے معنی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو اس کا علم نہ تھا۔ اگر علم ہوتا تو ہرگز رویت کی طلب نہ کرتے تو اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے علم کی نفی ہے کہ وہ اپنے خالق کی معرفت نہیں رکھتے، اپنے صانع کو نہیں جانتے تھے۔

اور جب معتزلہ وغیرہ جانتے ہیں کہ رویت باری تعالیٰ ممکن نہیں تو موسیٰ علیہ السلام کو تو ضرور علم ہونا چاہیے تھا کہ یہ طلب نہیں کرنی چاہیے۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ وہ جانتے تھے کہ یہ امر طلب کے لائق نہیں، پھر انہوں نے باوجود

علم کے طلب کیا تو یہ طلب طلب مجال ہے اور موسیٰ علیہ السلام سے مجال کا طلب کرنا مجال ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ خدا تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے سوال کو رد کر دیا اور فرمایا: ”لن ترانی“ تو جواباً ہم کہتے ہیں کہ یہ فرمایا کہ دنیا میں تم نہیں دیکھ سکتے اور یہ نہیں فرمایا کہ آخرت میں بھی تم نہیں دیکھ سکتے، گویا کہ دنیا میں رویت کی نفی فرمائی نہ کہ آخرت میں۔

”لن“ کے معانی

اگر کہا جائے کہ لفظ ”لن“ تابید کے لیے ہے (یعنی ہمیشگی پر دلالت کرتا ہے) تو ہمیشہ کے لیے دنیا میں بھی اور آخرت میں رویت ممکن نہیں تو ہم کہیں گے: لفظ ”لن“ دو معنوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ کبھی ہمیشگی کے لیے اور کبھی اس سے دوام و ہمیشگی کے معنی مراد نہیں ہوتے بلکہ مدت دنیا مراد ہوتی ہے۔

”لن“ کے ہمیشہ کے معنی پر دلالت نہ کرنے پر دلیل

دیکھیں! جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”وَلَنْ يَّتَمَنُوهُ اَبَدًا“ (البقرہ: ۹۵) وہ اس کی ہرگز کبھی بھی تمنا نہیں کریں گے۔ اس جگہ لفظ ”لن“ بیان فرمایا، مگر مراد یہاں دوام و ہمیشگی نہیں بلکہ مدت دنیا مراد ہے۔

دلیل یہ ہے کہ فرمایا: ”وَنَادُوا يَا مَالِكُ لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ“ (الزخرف: ۷۷) اور وہ پکاریں گے: اے مالک! تمہارا رب ہمارا فیصلہ کر دے۔ اور کفار کے متعلق خبر دی: ”يَالَيْتُهَا كَانَتِ الْقَاضِيَةَ“ (الحاقة: ۲۷) ہائے کاش! موت ہی آ جاتی۔ تو کلمہ ”لن“ ذکر کیا اور مراد اس سے مدت دنیا ہے ایسے ہی اس مقام میں لفظ ”لن“ سے مدت دنیا مراد ہے، آخرت مراد نہیں۔

رویت باری پر دلائل

رویت باری تعالیٰ جائز ہے دلائل یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”وَجُودَ يَوْمَئِذٍ نَاضِرَةٌ اِلَى رَبِّهَا نَاطِرَةٌ“ (القيامة: ۲۲) اس دن بعض چہرے تروتازہ ہوں گے اور اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے، یعنی قیامت کے دن مؤمنین اللہ تعالیٰ کو بلا کیف اور بلا حجاب دیکھیں گے۔

اعتراض: اگر کہا جائے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اپنے رب کے ثواب کی طرف دیکھیں گے؟
 جواب: ہم کہتے ہیں کہ یہ تاویل صحیح نہیں اس لیے کہ جب مؤمن جنت میں پہنچے گا تو اس نے
 ثواب پالیا اور جنت میں سکونت پذیر ہو گیا تو اب اس کی طرف کیا دیکھنا ہے؟ جنت
 میں پہنچ گیا اور وہاں کی نعمتیں حاصل ہو گئیں، جنت میں سکونت پذیر ہو گئے اور سب
 کچھ ان کو مل گیا، ثواب کیا کریں گے؟ دوسری دلیل یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام سے
 فرمایا: ”وَلَكِنْ انظُرْ إِلَى الْجَبَلِ فَإِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهُ فَسَوْفَ تَرَانِي“
 (الاعراف: ۱۴۳) لیکن پہاڑ کی طرف دیکھ اگر وہ اپنی جگہ ٹھہرا رہے تو عنقریب تو مجھے
 دیکھ سکے گا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے سوال کو شرط کے ساتھ معلق کیا اور وہ استقرارِ جبل
 ہے اور جب یہ شرط جائز ہے تو جس چیز کو معلق کیا وہ بھی جائز ہے۔

اعتراض: اگر کہا جائے کہ موسیٰ علیہ السلام کا نظر کرنا اگر جائز ہوتا تو ان پر توبہ واجب نہ
 ہوتی۔

جواب: ہم کہتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کا توبہ کرنا اس وجہ سے تھا کہ انہوں نے بلا اجازت
 سوال کیا تھا۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ آپ نے بتقاضائے طبیعت توبہ کی (یعنی توبہ طبعیہ) کہ جب
 ہول و وحشت کو دیکھا تو تجدید توبہ کی اور انسانی تقاضا یہی ہے کہ جزع، فزع اور ہول
 و وحشت کے وقت توحید و توبہ کی تجدید کرتے ہیں، کیا آپ نے دیکھا نہیں کہ فرمایا:
 ”وَأَنَا أَوَّلُ الْمُؤْمِنِينَ“ (الاعراف: ۱۴۳) اور میں سب سے پہلا مؤمن ہوں۔
 حالانکہ معلوم ہے کہ آپ اول المؤمنین ہیں؟ تو ثابت ہوا کہ آپ نے توبہ اور تجدید
 توحید طبعی طور پر کی تھی۔

سوال: اگر کہا جائے کہ سوال روایت جائز ہوتا تو موسیٰ علیہ السلام کی قوم مستحق عتاب نہ ہوتی،
 حالانکہ وہ مستحق عقوبت ہوئی، تو ثابت ہوا کہ روایت کا سوال کرنا جائز نہیں۔

مستحق عقوبت ہونے کی دلیل

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”فَاخَذْتَهُمُ الصَّاعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ“ (النساء: ۱۵۳) پس انہیں کڑک

نے پکڑ لیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے روایت کا سوال استہزاء اور تمسخر

کے طور پر کیا تھا اور موسیٰ علیہ السلام نے حقیقت کے طور پر سوال کیا تھا وہ مستحق عقوبت نہ ہوئے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ تکذیب کی وجہ سے مستحق عقوبت ہوئے اس لیے کہ انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کو جھٹلایا۔

روایت کے ثبوت پر دلیل

یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ سے کسی نے اس آیت کی تفسیر دریافت کی: "لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا الْحُسْنَىٰ وَزِيَادَةٌ" (یونس: ۲۶) اور نیکی کرنے والے کے لیے نیکی ہے اور (اس سے) زائد۔ تو حضور اقدس ﷺ نے فرمایا: "حسنی" سے مراد جنت اور "زیادۃ" سے اللہ تعالیٰ کی ذات کریمہ کو دیکھنا مراد ہے یعنی دیدار الہی ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم سے مروی ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا: "وَلَذَيْنَا مَزِيدٌ" (ق: ۳۵) اور ہمارے پاس (اس سے بھی) زائد ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ "یتجلی لهم الرب" رب تعالیٰ جل شانہ مؤمنوں کے لیے تجلی فرمائے گا۔

نیز مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "انکم سترون ربکم يوم القيامة كما ترون القمر ليلة البدر" بے شک تم عنقریب اپنے رب کو دیکھو گے جیسے چودھویں رات کے چاند کو دیکھتے ہو۔ "لا تضامون" بغیر دکہاد ہونی (یعنی بغیر کسی مزاحمت وغیرہ کے) اور لا تضارون کا لفظ بھی آیا ہے کہ اس کے دیکھنے میں تمہیں ایک دوسرے کو تکلیف و زحمت نہ ہوگی یعنی بے تکلف خدا کا دیدار ہوگا۔

تو جب حضور نے فرمایا: "سترون ربکم" (یعنی سوف ترون ربکم) تو ثابت ہوا کہ حضور اقدس ﷺ کو خوب علم تھا کہ رب کریم کا دیدار حق ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ یہ حدیث صحیح نہیں اس لیے کہ اس میں تشبیہ ہے؟

جواب یہ ہے کہ تشبیہ روایت کی روایت کے ساتھ دی ہے مرئی (نظر آنے والی) کو مرئی کے ساتھ نہیں دی یعنی "تروون کما تروون القمر" یہ کہ جیسے چاند کا دیکھنا جائز ہے رب کا

تو ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا دیدار حق ہے اور تم اس کے دیدار سے بے کیف بے حجاب اور تکلیف

کے بغیر مشرف کیے جاؤ گے۔ ۱۲ سیدی ابوالبرکات رحمہ اللہ تعالیٰ

دیکھنا بھی جائز ہے نیز جیسے چاند کے دیکھنے میں کوئی تکلیف نہیں ہوتی، یونہی بلا تکلیف اپنے رب کو بے کیف دیکھو گے اور ”لا تضامون“ کے قول کا معنی ہے: دیکھنے میں مزاحمت نہیں کرو گے اور رب کے دیدار سے تمہیں کوئی تکلیف نہ ہوگی جیسے سورج کی طرف دیکھنے میں تکلیف ہوتی ہے۔

سوال: اگر یہ کہا جائے کہ دیکھنے والا جب مکان میں ہوگا تو مرئی بھی مکان میں ہوگا۔

جواب: ہم کہتے ہیں کہ ایسا نہیں ہوگا، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ تمام اشیاء کو ان کے مکان میں دیکھتا ہے اور خود مکان میں نہیں، اسی طرح وہ نظر آئے گا اور مکان میں نہ ہوگا۔

سوال: اگر کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مدح فرمائی ”لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ“ (الانعام: ۱۰۳) اور آنکھیں اس کا احاطہ نہیں کر سکتیں اور سب آنکھیں اس کے احاطہ میں ہیں۔ یہ کہ کوئی جس بھر اس کا ادراک (احاطہ) نہیں کر سکتی اور وہ سب ابصار کا ادراک (احاطہ) کرتا ہے۔

سوال: دریافت طلب امر یہ ہے کہ جب اللہ عزوجل کا دیدار ہوگا اور مشاہدہ ہوگا تو لازمی امر ہے کہ وہ ”منظور الیہ“ ہو اور ناظر (دیکھنے والا) جب کسی چیز کو دیکھتا ہے تو وہ چیز یا چہرہ کے مقابل سامنے ہوگی یا داہنی یا بائیں جانب ہوگی۔ بہر حال کسی نہ کسی جہت (سمت) میں ہوگی تو ضروری بات ہے کہ منظور الیہ (جس کی طرف نظر کی جائے) جہت میں ہو اور جب جہت میں ہوگا تو کیفیت اور مکان وغیرہ کی حد میں محدود ہوتا کہ دیکھنے والے کو معلوم ہو کہ میں کس کو دیکھ رہا ہوں اور کیسے دیکھ رہا ہوں تو اللہ تعالیٰ مدرك ہوا (احاطہ میں آنے والا) اور یہ جائز نہیں، جیسا کہ آیت میں گزرا کہ ”لا تدركه الابصار“۔

جواب: ہم کہتے ہیں: (بے شک) باری تعالیٰ جل شانہ کو دیکھا جائے گا، اس کا مشاہدہ ہوگا، دیدار ہوگا۔ پھر کیفیت اور جہت و مکان ضروری نہیں اس چیز کے لیے جو دیکھی جائے اور یا مشاہدہ کیا جائے اس لیے کہ رویت مٹی ہے کہ وہ چیز یا ذات موجود ہو اور جب موجود ہوگی تو جائز ہے کہ مرئی ہو، نظر آئے۔

دیدار کے لیے چیز کا موجود ہونا ضروری ہے

لیکن شئی مرئی و مشاہد اسی حیثیت سے ہوگی جس صفت سے وہ موصوف ہے اور ہر شئی اسی صفت کے ساتھ نظر آئے گی جس صفت کے بغیر وہ شئی موجود نہ ہو اور اس کو ثابت کرنا اس کی صفت کے بغیر محال ہو۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ صانع جل شانہ شے ہے موجود ہے محدث ہے مبدع (ایجاد کرنے والا پیدا کرنے والا) ہے اور عالم اور ہر وہ شے جو جنس عالم سے ہے وہ شئی ہے محدث ہے مبدع ہے اور محدث کی صفات سے یہ ہیں کہ جوہر اور جوہر کے لیے جنس و نوع کا ہونا ضروری ہے۔

جوہر کے لیے جنس و نوع ضروری ہے

اور جس کے لیے جنس و نوع ہوگی اس کے لیے قطع و فصل کا ہونا ضروری ہے اور جس کے لیے قطع و فصل ہو اس کے لیے حد و نہایت ہوگی اور جس کے لیے حد و نہایت ہوگی تو ضروری ہے کہ اس کے لیے طول و عرض اور عمق ہو اور جس میں طول عرض عمق ہو ضروری ہے کہ اس کے لیے کم (مقدار) اور لون (رنگ) ہو اور ان تمام صفات کے معنی کیفیت ہے اور جب یہ معانی کسی چیز میں پائے جائیں گے تو اس کے لیے جہت ضروری ہے اور جب وہ جہت (سمت) میں نظر آئے گا اور جہت میں مشاہدہ کیا جائے گا اور اس کا ادراک جمیع صفات مذکورہ کے ساتھ ہوگا اور ہر محدث میں یہ صفات ضروری ہیں ان صفات سے خالی نہیں ہو سکتا اور جب بہ طریق ضرورت یہ بات جان لی کہ کوئی محدث (مخلوق) ان صفات مذکورہ بالا کے بغیر نہیں پایا جاسکتا ہر محدث ان صفات کے ساتھ جانا جاتا ہے اس لیے رویت خلاف نہ ہوگی۔

پھر صانع جل مجدہ نہ جسم ہے نہ جوہر اور جب وہ جسم و جوہر نہیں تو اس کے لیے جنس و نوع بھی نہیں اور جنس و نوع نہیں تو قطع و فصل بھی نہ ہو اور جب قطع و فصل نہیں تو اس کے لیے حد و نہایت بھی نہیں اور جب حد و نہایت نہیں تو اس کے لیے طول و عرض و عمق بھی نہیں ہوگا اور جب طول و عرض و عمق نہ ہوگا تو اس کے لیے لون و کیف نہ ہوگا اور جب لون و کیف نہ ہوگا تو رویت کے ساتھ مدرك نہ ہوگا اس لیے کہ ادراک ماہیت و کیقیت اور مقدار کا ہوتا ہے اور اللہ

تعالیٰ ان صفات سے منزہ و پاک ہے اس لیے فرمایا: "لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ" (الانعام: ۱۰۳) آنکھیں اس کا احاطہ نہیں کر سکتیں اور سب آنکھیں اس کے احاطہ میں ہیں۔

مگر وہ شے ہے موجود قائم بذاتہ ہے قدیم بصفاتہ ہے اور روایت جائز و صحیح ہے اور روایت ہوگی شے موجود قائم بذاتہ موصوف بصفاتہ۔

پھر جب ہم نے جانا اور پہچانا اس کی صفات سے تو وہ نظر آئے گا اسی صفت کے ساتھ جس صفت سے ہم نے پہچانا ہے اور جس صفت سے جانا ہے۔

جنات کو اللہ کا دیدار ہوگا؟

جنات کو دیدار الہی ہوگا یا نہیں؟ اس باب میں کوئی نص نہیں پائی گئی، لیکن ہم یہ کہتے ہیں کہ اگر یہ دیدار الہی کی سعادت و کرامت انسانوں کو ایمان کی وجہ سے حاصل ہوگی تو پھر کوئی وجہ نہیں ہے کہ ایمان کی برکت سے مؤمن جنات کو دیدار نہ ہو، مؤمن جنات کو بھی دیدار ہوگا اور اگر یہ شرف روایت انبیاء و مرسلین صلوات اللہ علیہم اجمعین کے بدولت ہے تو پھر ان کو روایت نہیں ہوگی اس لیے کہ جنوں میں سے کوئی نبی اور رسول نہیں ہوا۔

فرشتوں کو دیدار ہوگا؟

فرشتوں کو دیدار الہی ہوگا کیونکہ وہ اہل نبوت و رسالت سے ہیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "اللَّهُ يَصْطَفِي مِنَ الْمَلَائِكَةِ رُسُلًا" (الحج: ۷۵) اللہ تعالیٰ ملائکہ اور انسانوں میں رسولوں کو چنتا ہے۔

اور فرمایا: "تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا" (الانعام: ۶۱) ہمارے فرشتے اس کی روح قبض کرتے ہیں۔ اور فرمایا: "سَفَرَةَ كَرَامٍ بَرْرَةٍ" (العنکبوت: ۱۶) لکھے ہوئے وہ معزز ہیں اور نیکو کار۔ پھر حضرت جبریل و میکائیل و عزرائیل، اسرافیل علیہم السلام سب اللہ کی طرف سے مقرر ہیں، انبیاء و مرسلین صلوات اللہ علیہم اجمعین کی طرف اور انہوں نے وحی سے روایت کی خبر دی۔

۱۔ تو ثابت ہو گیا کہ اس کا دیدار بے کیف ہوگا یعنی مکان، زمان اور جہات سے پاک ہوگا۔

مؤمنوں کی قسمیں

پھر مؤمنوں میں بعض تو عاصی و گنہگار اور کبار کے مرتکب ہیں اور بعض وہ ہیں جو کافر ہو کر پھر اسلام لے آئے اور بعض وہ جو مبتدع ہیں اور ان میں ایمان نہیں ہوگا مگر ذرہ برابر پھر جب یہ لوگ جنت میں جائیں گے تو وہ اللہ عزوجل کا دیدار کریں گے بے کیف اور بلا کیفیت۔

اور وہ جو وحی لے کر تشریف لائے وہ رسول ہیں (یعنی جبریل علیہ السلام) آپ نے سب مؤمنوں کو دیدارِ الہی کی خبر دی اور دیدار کی بشارت دی تو ملائکہ بہ طریقِ اولیٰ مستحق ہیں کہ دیدار کریں اور دیدار سے محروم نہ کیے جائیں اس لیے کہ اگر یہ دیدار سے محروم ہوتے ہیں تو پھر عاصی و معاقب کو رسول پر فضیلت دینا لازم آتا ہے اور یہ قطعاً جائز نہیں تو پھر رؤیت یعنی دیدارِ الہی ثابت ہے۔ جبرئیل و میکائیل و اسرافیل و عزرائیل اور ایسے ہی تمام ملائکہ کے لیے صلوات اللہ علیہم اجمعین اس لیے کہ سب اللہ تعالیٰ کے رسل و انبیاء ہیں۔

فرشتوں کے لیے دیدارِ الہی کے ثبوت یا عدم ثبوت میں۔۔۔۔۔

بعض فقہاء کا مذہب

بعض فقہاء نے کہا: توقف (خاموشی اختیار) کرنا چاہیے کیونکہ فرشتوں کے حق میں کوئی نص موجود نہیں اور منع و انکار بھی جائز نہیں تو توقف کرنا چاہیے۔

کیا حور و غلمان دیدارِ الہی سے مشرف ہوں گے؟

حور و غلمان چونکہ اہل جنت سے ہیں لہذا اللہ تعالیٰ کو دیکھیں گے۔ بعض کہتے ہیں: ہر جنتی اللہ تعالیٰ کو دیکھے گا اور بعض نے کہا کہ ہر وہ شخص جو جانتا ہے کہ مؤمنوں کو دیدار ہوگا اور وہ اللہ تعالیٰ کے دیدار کی تمنا و آرزو کرتا ہے اور دیدارِ الہی کا مشتاق ہے اس کو بھی رؤیت ہوگی منع و انکار جائز نہیں اس لیے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "وَجُودَ يَوْمَئِذٍ نَاصِرَةٌ اِلَىٰ رَبِّهَا نَاطِرَةٌ" (القیامہ: ۲۲) اس دن بعض چہرے تر و تازہ ہوں گے اور اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے۔ مطلقاً ارشاد فرمایا تو جن و انس اور ملائکہ وغیرہ سب (دیدار کرنے میں) برابر ہیں جب کہ ایمان ثابت ہو۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ جو مؤمن نہیں ان کے لیے ارشاد ہوا: "وَجُودَ يَوْمَئِذٍ نَاصِرَةٌ اِلَىٰ رَبِّهَا نَاطِرَةٌ" (القیامہ: ۲۵) اس دن بعض چہرے بگڑے ہوئے

ہوں گے اور یہ خیال کریں گے کہ ان کے ساتھ وہ کیا جائے گا جو کمر توڑ دے۔ اس میں جن و انس و شیاطین برابر ہیں جب کہ مؤمن نہ ہوں اور اگر وہ اس بات کو نہ جانیں اور نہ ان کو روایت کی خبر ہے تو ان کے لیے روایت نہیں اور اصح یہ ہے کہ حور و غلمان کو دیدار ہوگا اس لیے کہ ان سے تکلیف اٹھالی گئی ہے یعنی وہ مکلف بالشرائع نہیں اور طاعت و اطاعتِ شرعیہ ان پر واجب نہیں تو ثوابِ آخرت سے ان کو نہیں نوازا جائے گا اور اس کرامت سے ان کا اکرام نہ کیا جائے گا۔

سترھواں قول خیر و شر اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقدر ہیں

اہل سنت و جماعت فرماتے ہیں کہ خیر و شر نیک و بد بیٹھا کڑوا سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقدر ہے۔

معزلہ اور قدر یہ کہتے ہیں: خیر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور شر بندوں کی طرف سے ہوتا ہے۔

ہمارا اہل سنت کا اجماع ہے کہ خیر و شر سب اللہ کی تقدیر سے اور اس کے علم سے ہے۔

بعض کا مذہب

بعض کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو پیدا کیا اور ابلیس نے شر کو پیدا کیا۔

بعض نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کو پیدا کیا اور بندوں نے شر کو پیدا کیا۔

شیطان کو کس نے پیدا کیا؟

بعض (قدریہ) کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے (شر کی طرح) ابلیس کو بھی پیدا نہیں کیا، اس لیے کہ اگر خدا نے ابلیس کو پیدا کیا تو بات پھر وہیں جا پہنچی کہ شر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو پیدا کیا اور ابلیس نے شر کو پیدا کیا۔ (نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ) گویا اللہ نے شر کو پیدا کیا، کیونکہ ابلیس کفر اور شر پیدا کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو پیدا کیا تو گویا خدا نے کفر و شر پیدا کیا اور اس کا ارادہ فرمایا اور یہ ہرگز جائز نہیں کہ خدا کفر اور شر کو پیدا کرے

اور اس کا ارادہ کرے۔

قدریہ فرقہ کا دوسرا نام شیطانیت ہے۔ یہ (عقائد رکھنے والی) قوم قدریہ فرقہ سے ہے اس کا نام شیطانیت ہے اور یہی (مذکورہ بالا) مذہب آتش پرستوں کا ہے اور یہ بالکل کفر ہے اسی معنی کے لحاظ سے حضور نے ارشاد فرمایا: "القدریۃ مجوس ہذہ الامۃ" کہ قدریہ اس امت کے مجوسی ہیں اور اگر ابلیس مخلوق نہ ہو تو پھر قدیم اور خالق ہوگا اور اس عقیدہ سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرکت ثابت ہوگی اور یہ صریح کفر ہے۔

پھر "قدر" کے معنی ایجاد و احداث (پیدا کرنے) کے ہیں اور حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی سب کا خالق ہے۔

اہل سنت کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "وَمَا تَشَاءُ وَاِنْ اَنْ يَّشَاءَ اللّٰهُ" (الاحزاب: ۳۰) اور تم نہیں چاہتے مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے وہی ہوتا ہے تمہارے چاہے سے کچھ نہیں ہوتا سب کچھ اس کی مشیت سے ہوتا ہے اس میں خیر و شر کی تفصیل اور فرق نہیں۔ یہ نہیں فرمایا کہ خیر ہماری مشیت سے اور شر ہماری مشیت سے نہیں بلکہ مطلقاً فرمایا۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ" (النساء: ۷۸) اے محبوب! تم فرما دو ہر خیر و شر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔

تیسری دلیل یہ ہے کہ فرمایا: "كُلُّ صَغِيرٍ وَكَبِيرٍ مُّسْتَطَرٌّ" (اقمر: ۵۳) یعنی "مکتب" ہر چھوٹی بڑی چیز لکھی ہوئی ہے اور اللہ جل شانہ فرماتا ہے: "وَلَقَدْ اخْتَرْنَا هُمْ عَلٰی عِلْمِ عَلٰی الْعٰلَمِيْنَ" (الدخان: ۳۲) اور تحقیق ہم نے انہیں زمانہ والوں سے دانستہ چن لیا یعنی اللہ تعالیٰ نے اہل اختیار کو جان لیا تو ان کو اختیار دیا اور فرمایا: "وَاصَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰی عِلْمِ" (الباقیہ: ۲۳) اور اللہ تعالیٰ نے اسے دانستہ گمراہ کیا یعنی اللہ تعالیٰ جانتا تھا کہ یہ اہل ضلالت ہیں تو ان کو گمراہ کیا اور نیز نبی کریم رؤف و رحیم ﷺ سے مروی ہے حضور نے فرمایا: "بعثت داعیا و مبلغا و اللہ یهدی من یشاء و یضل من یشاء" یعنی اللہ تعالیٰ نے مجھے داعی اور مبلغ بنا کر بھیجا ہے اللہ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے گمراہی میں چھوڑ دیتا ہے۔

اور اللہ تعالیٰ نے شیطان کو دوسو سے ڈالنے والا اور دنیا کو مزین کر کے دکھانے والا ”ولیس فی یدہ من الضلالة شنی“ اور وہ گمراہی پیدا کرنے والا نہیں اس کے ہاتھ میں کچھ نہیں۔ سوائے دوسو سے ڈالنے اور بنا سجا کر دکھانے کے اس کے پاس کچھ نہیں۔

ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نبی کریم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: قیامت کے دن ابلیس سے کہا جائے گا، آدم علیہ السلام کو سجدہ کر لے اور جنت میں داخل ہو جا اور تیرے عمل جو تو نے کفر سے پہلے کئے تھے اس کا درجہ ملے گا تو شیطان سجدہ کرنے سے باز رہے گا اور اہل قیامت میں سے جو عاصی و گنہگار ہیں، ابلیس سے کہیں گے: سجدہ کر لے، جہنم سے نجات مل جائے گی۔ ابلیس کہے گا: اے اہل قیامت! رک جاؤ اور مجھے کچھ نہ کہو۔ اللہ تعالیٰ اگر چاہتا کہ میں آدم کو سجدہ کروں تو میری مجال نہ تھی کہ میں سجدہ نہ کرتا لیکن خدا نے نہ چاہا تو میں نے بھی سجدہ نہ کیا۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کو پیدا کیا، یہ جانتے ہوئے کہ ان سے شر واقع ہوگا اور اگر وہ ارادہ نہ کرتا اور شر مقدر نہ کرتا تو از روئے حکمت ناجائز ہے کہ بندہ شر پیدا کرے اور اس لیے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ”وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُونَ“ (الصافات: ۹۶) اللہ تعالیٰ نے تم کو اور تمہارے اعمال کو پیدا فرمایا یعنی خیر و شر کا خالق اللہ ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جانتا تھا کہ ابو جہل سے کفر سرزد ہوگا تو اگر ہم یہ کہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ابو جہل کے کفر کا ارادہ بھی کیا تو ابو جہل کا کفر کو چاہنا علم الہی کے موافق ہوگا۔

اللہ کا ارادہ اس کے علم کے خلاف نہیں ہو سکتا

اور اگر ہم کہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ابو جہل کے کفر کا ارادہ نہیں کیا تو اللہ تعالیٰ کا ارادہ اس کے علم کے خلاف ہوگا اور یہ جائز نہیں اور اگر ہم کہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کے کفر کو جانتا تھا اور اس کے کفر کا ارادہ نہیں کیا بلکہ ارادہ اس کے ایمان کا کیا، تو یہ ایسی ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ نے ابو جہل سے ایسی چیز کا ارادہ کیا جسے وہ جانتا ہے کہ یہ چیز نہ ہوگی تو یہ بات علم و ارادہ کے بطلان کی طرف پہنچاتی ہے، بخلاف امر کے کہ یہ جائز ہے کہ کسی شئی کا امر کرے اور اس کے خلاف ارادہ فرمائے، جیسے ابراہیم علیہ السلام کو فرزند کے ذبح کا حکم کیا اور ارادہ کیا کہ ذبح نہ کریں ایسے ہی اس جگہ ہے۔

پھر اللہ کا کافر کے کفر کو جاننا اس کو کفر پر مجبور نہیں کرتا ایسے ہی اس کی مشیت و ارادہ اس کو مجبور نہیں کرتے کہ وہ کفر ہی کرے، لیکن امر الہی علم الہی کے خلاف ہو سکتا ہے یہ جائز ہے۔ اس لیے کہ امر حجت و بیان کے لیے ہے اور اس کا ارادہ اس کے علم کے خلاف ہو یہ جائز نہیں، یہ سفاہت (بے وقوفی) ہوگا اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ" (القدر: ۴۹) ہم نے ہر چیز ایک اندازے سے پیدا کی۔ اور فرمایا: "فَقَدَرَهُ تَفْدِيرًا" (الفرقان: ۲) پس اسے (شے کو) درست اندازہ پر رکھا اور فرمایا: "وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ مَفْعُولًا" (النساء: ۴۷) اور اللہ تعالیٰ کا حکم ہو کر رہتا ہے۔

جس کا تقدیر پر ایمان نہیں اس کی کوئی عبادت قبول نہیں

روایت ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا کہ اگر تیرے پاس اُحد پہاڑ کے برابر سونا ہو اور تو خدا کی راہ میں خرچ کرے تو جب تک قدر پر ایمان نہ لائے گا اللہ تعالیٰ قبول نہیں فرمائے گا اور جب تک یہ جانے کہ جو کچھ تجھ کو تکلیف یا راحت پہنچی ہے وہ تجھ سے مل نہیں سکتی اور جو تکلیف و راحت تجھ کو نہیں پہنچی وہ پہنچنے والی نہ تھی، یعنی خیر اور شر اللہ کی طرف سے مقدر ہے اس کے خلاف عقیدہ پر مہر تو جہنم میں جائے گا۔ اور اسی حدیث میں یہ بھی مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اگر اللہ تعالیٰ آسمان و زمین کی تمام مخلوق کو عذاب دے تو وہ ظالم نہیں اور اگر وہ سب پر رحم فرمائے تو ان کے لیے اس کی رحمت ان کے اعمال سے بہتر ہے۔

اگر کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ شر کی قضا فرمائے اور پھر ان کو عذاب دے تو یہ جور ہے، ہم کہیں گے کہ ہرگز ظلم و جور نہیں اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی قضا نے اس کو مجبور نہیں کیا کہ وہ شر کرے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قضا، بالشر کو اپنے بندہ سے مخفی رکھا اور اس کو خیر کا حکم دیا، اس پر حجت ظاہر کر دی اور پھر بندہ نے خیر کو ترک کیا باوجودیکہ اس کو خیر کا حکم تھا اور اس پر حجت ظاہر کر دی گئی تھی اور شر کا ارتکاب کیا بغیر حجت کے اور اللہ تعالیٰ کی قضا، کو جانے بغیر، اس لیے کہ بندہ ارتکاب شر سے پہلے نہیں جانتا تھا کہ قضا، الہی کیا ہے؟ شر ہے یا خیر؟ جب اس نے شر کا ارتکاب کر لیا تو جانا کہ قضا، الہی یہی تھی، لیکن اس کی مباشرت (کرنا) اور شر کا

ارتکاب بغیر حجت کے تھا لہذا مستحق عقوبت و سزا ہوا۔

اب اگر یہ کہا جائے کہ جب قضاء الہی شرکی تھی تو بندہ کے لیے ناممکن ہے کہ اس سے راہ فرار اختیار کرے تو یہ جبر کی طرف پہنچانے والا ہے۔ ہم کہتے ہیں: قضاء الہی (قدرت کا فیصلہ) نے بندے کی قدرت و اختیار کو سلب نہیں کر دیا جیسے اللہ تعالیٰ جانتا ہے بندے کے شر کو تو یہ جبر نہیں اسی طرح اللہ کی قضا بندہ کو مجبور نہیں کرتی۔ بندے سے مواخذہ و پکڑ اس کے اختیار اور قدرت کی بناء پر ہے اور اللہ تعالیٰ کی قضاء و قدر اور علم اس کے قدرت و اختیار کو سلب نہیں کرتا اس لیے کہ قضاء الہی کے خلاف ہونا جبر کو واجب نہیں کرتا۔

اگر کہا جائے کہ کیا ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے یہ روایت نہیں ہے کہ آپ نے حج کے موقع پر فرمایا: ”لیک والرغبة الیک والخیر فی یدیک والشر لیس الیک“ کہ ہم حاضر ہیں اور ہماری رغبتیں تیری جانب ہیں اور خیر تیرے دست قدرت میں ہے اور شر تیری طرف سے نہیں؟

جواب: ہم کہیں گے کہ ہم شر کو تیری طرف نسبت نہیں کرتے اور نیز یہ حسن ادب سے نہیں کہ شر اور قبح کو خدا کی طرف نسبت کریں۔

دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ تمام مخلوقات کا اکیلا خالق ہے مگر یہ کہنا خلاف ادب ہے کہ ”یا خالق البعوضة والحیة والعقرب“ اے مچھر کے اور سانپ کے بچھو کے پیدا کرنے والے! یوں کہا جائے: ”یا خالق السموات والارض“ اے آسمان و زمین کے پیدا کرنے والے!

اگر یہ دریافت کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”وَمَا آتَا بِظِلْمٍ لِّلْعَبِيدِ“ (آل عمران: ۱۸۲) ہم بندوں پر ظلم نہیں کرتے۔ ”وَمَا اللّٰهُ یُرِیْدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ“ اللہ تعالیٰ بندوں کے لیے ظلم کا ارادہ نہیں فرماتا۔

جواب: اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ بندوں پر ظلم کرنے کا ارادہ نہیں فرماتا آیت میں یہ تو نہیں کہ اللہ تعالیٰ ارادہ نہیں کرتا کہ بندہ بندہ پر ظلم نہ کرے۔

اگر دریافت کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ”مَا أَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنْ اللّٰهِ وَمَا أَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَفْسِكَ“ (النساء: ۷۹) جو تجھ کو بھلائی پہنچے وہ اللہ کی

طرف سے ہے اور جو تجھ کو بُرائی پہنچے تو وہ تیرے نفس کی طرف سے ہے۔
 جواب: ہم کہتے ہیں کہ جو بندہ کو پہنچائی جائے وہ اس کے نفس کی طرف سے ہے اور اس کے
 لیے ”أَصِيبَ“ کا لفظ بولتے ہیں اور جو غیر کی طرف سے پہنچائی جائے تو اس کے
 لیے ”أَصَابَ“ کہتے ہیں اور یہاں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”أَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ
 فَمَنْ نَفْسِكَ“ تو ثابت ہوا کہ غیر کی طرف سے ہے پھر کلام اس مسئلہ میں اور
 مسئلہ ارادہ و استطاعت میں برابر ہے۔

اٹھارہواں قول

عبادات و احکام کا بیان

مرجیہ کا مسلک

مرجیہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے خلق کو پیدا کیا اور ان کو کسی چیز کا حکم دیا نہ کسی چیز سے منع
 فرمایا۔ اگر اچھا کام کرے گا تو اللہ تعالیٰ ثواب عطا فرمائے گا اگر اس نے بُرا کام کیا تو اس پر
 کوئی عذاب نہیں اور قرآن کریم میں جس قدر امر و نہی ہیں وہ نذیب و استحباب پر محمول ہیں اور
 یہ ان کا (عقیدہ) کفر صریح ہے۔

فرقہ اباحیہ کا مذہب

فرقہ اباحیہ والے یہ کہتے ہیں کہ جب بندہ محبت کی انتہاء کو پہنچتا ہے پھر کبیرہ گناہ کا
 ارتکاب کرتا ہے زنا و چوری کرتا ہے تو خدا اس کو جہنم میں نہیں ڈالے گا یہ عقیدہ ان کا کفر
 ہے۔

بعض لوگوں کا مذہب

اور بعض نے کہا کہ بندہ جب غایت محبت کو پہنچتا ہے تو اس سے امر و نہی ساقط ہو جاتے
 ہیں اور محبت کی غایت یہ ہے کہ کفر پر ایمان کو اختیار کرے اور پھر منافق نہ ہو تو وہ محبت اللہ ہے
 غایت محبت کو پہنچا ہوا۔

بعض دوسرے حضرات کا مذہب

بعض نے کہا کہ بندہ جب انتہائی محبت کو پہنچتا ہے تو اس سے ظاہری عبادت ساقط ہو جاتی ہے اور اس کی عبادت صرف اور صرف تفکر ہوتی ہے جیسا کہ حضور ﷺ نے فرمایا: "تفکر ساعة خیر من عبادة سنة" ایک ساعت تفکر کرنا برس دن کی عبادت سے بہتر ہے اور یہ عقیدہ ان کا کافر ہے۔

اور بعض نے کہا کہ جب بندہ غایت محبت کو پہنچتا ہے تو اس کے لیے دوسروں کی لونڈیاں اور عورتیں جائز ہو جاتی ہیں۔

اور بعض نے کہا کہ مال دنیا سب مباح ہے، اولادِ آدم علیہ السلام کے لیے اور یہ کسی کو حق نہیں کہ اپنے لیے مالک ہو، اس لیے کہ آدم و حوا علیہما السلام کا جب انتقال ہوا تو ان کا مال میراث ہے ان کی اولاد کے لیے۔ یہ عقیدہ کفر ہے۔

امرو نہی کسی حال میں ساقط نہیں ہوتے

یہ عقیدہ کفر ہے اس لیے کہ امر و نہی انبیاء کرام کے حق میں ثابت ہیں اور کسی حال میں ان سے امر و نہی ساقط نہیں ہوتے اور حالانکہ وہ محبت میں کامل و اکمل ہیں (تو غیر انبیاء سے کیونکر ساقط ہو سکتے ہیں جب کہ وہ اس درجہ محبت میں بھی نہیں ہوتے)؟

نیز یہ بھی دلیل ہے: اللہ تعالیٰ جل شانہ فرماتا ہے: "وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتَّىٰ يَأْتِيَكَ الْيَقِينُ" (الحجر: ۹۹) اپنے رب کی عبادت کرو مرتے دم تک۔

نیز فرمایا: "قُلْ أَمْرٌ رَبِّي بِالْقِسْطِ وَأَقِيمُوا وُجُوهَكُمْ عِندَ كُلِّ مَسْجِدٍ" (الاعراف: ۲۹) آپ فرمادیتے ہیں کہ میرے رب نے انصاف کا حکم دیا ہے اور (یہ کہ) اپنے منہ سیدھے رکھو ہر نماز کے وقت۔

فرمایا: "إِنَّ اللَّهَ لَا يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ" (الاعراف: ۲۸) بے شک اللہ تعالیٰ بے حیائی کا حکم نہیں فرماتا۔ اللہ تعالیٰ فحاشی کا حکم نہیں دیتا (یعنی چوری، زنا، بد فعلی، قتل و غارت اور غصب و لوٹ کھسوٹ وغیرہ) اس قسم کی اور بھی آیات ہیں اور جس نے امر کو ترک کیا اور نہی کا مرتکب ہوا تو اس سے عذاب ساقط نہ ہوگا۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "يَغْفِرُ لِمَن يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَن يَشَاءُ" (آل عمران: ۱۲۹) جس کو

چاہے بخش دے اور جس کو چاہے عذاب دے اور ان باتوں کا اعتقاد کفر ہے (جو اس سے پہلے ذکر ہوئیں)۔

اموال مشترکہ نہیں ہیں

اگر اموال لوگوں کی ملک ہوتے تو کسی کو منع کرنا حلال و جائز نہ ہوتا حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ" (البقرہ: ۱۸۸) اور اپنے اموال آپس میں باطل طریقے سے نہ کھاؤ۔

اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوا أَيْدِيَهُمَا جِزَاءً بِمَا كَسَبَا" (المائدہ: ۳۸) چور مرد و عورت کا ہاتھ کاٹو یہ بدلہ ہے ان کے کیے کا اور ایسے ہی رجم و جلد (یعنی مرتکب زنا کو سنگسار کرنا اور کوڑے لگانا)۔

نیز حضور ﷺ نے فرمایا: میں غیور ہوں اور میرے باپ حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی غیور تھے اور ہم سے زیادہ غیور اللہ تعالیٰ ہے۔

جنت نے کیا کہا؟

حضور اقدس ﷺ فرماتے ہیں: جب اللہ تعالیٰ نے جنت کو پیدا کیا تو اس سے فرمایا: کلام کر۔ اس نے کہا: کامیاب ہو اوہ جو مجھ میں داخل ہوا۔ پھر فرمایا: "تَكَلَّمِي" بول۔ اس نے کہا: "قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ" مسلمان کامیاب ہوئے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "حَرَمْتُكَ عَلَيَّ كُلَّ بَخِيلٍ وَ مَدْمَنٍ وَ عَاقٍ وَ دِيوَتٍ" کہ میں نے تجھ کو حرام کیا بخیل پر ہمیشہ شراب پینے والے پر ماں باپ کے نافرمان پر دیوٹ پر جو بے غیرت و بے حیا ہو۔

انیسواں قول

اس بارے میں کہ اللہ عز و جل پر بندوں کی

جانب سے کوئی شئی واجب نہیں

اہل سنت و جماعت کہتے ہیں: ایجاب محض اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور کسی کی طرف

سے نہیں۔

معتزلہ نے کہا کہ ایجاب بہ طریق عقل و حکمت (یعنی جو چیز عقل و حکمت سے واجب ہوئی ہے) ایسے ہی ہے جیسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اور یہ کفر ہے۔

متکلمین اور اصولیوں کی اصطلاح

اہل اصول اور متکلمین جو لفظ 'جواز' و 'جوب' اور محال استعمال کرتے ہیں اسی طرح 'وجوب من الحکمة' کا لفظ جو ان کے نزدیک استعمال ہوتا ہے یہ بہ طریق مجاز ہے۔ اور اہل سنت کے نزدیک غرض اس سے اللہ تعالیٰ جل شانہ سے قبح کی نفی کرنا ہے۔

وجوب کی از روئے حکمت کیا تعریف ہے؟

از روئے حکمت وجوب کی تعریف یہ ہے کہ اگر اس کو ترک کر دے تو مستقبح (برا) ہے۔ جواز از روئے حکمت کسے کہتے ہیں؟

از روئے حکمت جواز کی تعریف یہ ہے کہ اگر کرے تو "سفہ" بیوقوفی نہیں۔

محال کسے کہتے ہیں؟

محال کی تعریف یہ ہے کہ اس کا ثابت کرنا نہ حکمت ہے اور نہ وہ جائز ہے۔ پھر معتزلہ کے نزدیک بندوں کے حقوق اور ان کے مصالح اللہ تعالیٰ پر واجب ہیں اور خدا پر وہ چیز واجب ہے جو بندوں کے لیے اصلح ہو بہ طریق حکمت جیسے رزق اور صغیرہ گناہوں پر گنہگاروں پر رحمت اور گناہ کبیرہ پر توبہ قبول کرنا اور اس کی مثل اور یہ سب معتزلہ کے نزدیک اللہ تعالیٰ پر واجب ہیں اور اسی طرح خدا پر واجب ہے کہ بندوں کو مستوی القامتہ سلیم الجوارح یعنی اس کے اعضاء درست ہوں، تو انا و مضبوط ہو، دیکھے سننے والا ہو، غرضیکہ اس میں کوئی نقص نہ ہو اور اگر اس کے خلاف کرے تو عدل نہ ہوگا، یہ عقیدہ کفر ہے۔ اس لیے کہ وجوب سے مراد تکلیف و الزام ہے اور لا محالہ الزام جبر کو مستلزم ہے تو ملزوم علیہ مجبور ہوگا اور جو اللہ تعالیٰ کو اس صفت سے موصوف کرے وہ کافر ہے کیونکہ بندوں میں بعض بیمار ہیں اور بعض نابینا ہیں اور بعض گونگے اور بعض بہرے اور بعض بالکل معذور و دائم المرض وغیرہ اور ظاہر ہے ان عوارض میں بندوں کی مصلحت نہیں۔

پھر (دریافت طلب امر یہ بھی ہے کہ) یہ عوارض یا تو اللہ تعالیٰ کی قضاء (فیصلہ) اور قدر (تقدیر) سے ہوں گے یا نہیں؟

اگر بقضاء اللہ (یعنی اللہ کے فیصلہ سے ایسا ہونا ٹھہرا) مانیں تو معاذ اللہ خدا ظالم ٹھہرا، اپنی قضاء و قدر میں اور اگر بقضاء اللہ نہیں تو دوسرے خالق کی احتیاج ہوگی تاکہ وہ یہ احوال و عوارض پیدا کرے اور جو اللہ کے سوا دوسرے کو خالق و محدث اور موجود تجویز کرے وہ کافر ہے تو ان چیزوں سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ عزوجل پر بندوں کی طرف سے کسی وجہ سے کوئی شئی واجب نہیں، مگر ہم یہ کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کی حوائج و ضروریات زندگی اپنے ذمہ کرم پر لے لی ہیں جیسے رزق وغیرہ۔

اور ایسے ہی نیکوکاروں کے لیے رحمت و بخشش کا وعدہ فرمایا ہے اور بدکاروں کو عذاب اور عقوبت سے ڈرایا ہے اور اس کے وعدہ و وعید میں خلف جائز نہیں اس لیے کہ اللہ تعالیٰ وعدہ خلافی نہیں کرتا۔ "إِنَّ اللَّهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيعَادَ" (آل عمران: ۹) اور عدم خلف کی وجہ سے اس سے قبح منفی ہے، لیکن وفاء وعدہ خدا پر واجب نہیں لیکن ہم یقیناً جانتے ہیں کہ وہ وعدہ خلافی نہیں کرے گا، نہ وعدہ خلافی اس کی صفت ہے اور نہ اس کے ساتھ اسے متصف کرنا جائز۔ پھر جب بندہ کو بھوک، پیاس، رنج و محن، درد و الم بقضائے الہی اور بارادۃ اللہ ہوتے ہیں اور یہ مصلحت و حکمت سے خالی نہیں اور حکمت جلدی (ظاہر ہو) یا دیر سے یہ اس کے عمل کا کفارہ اور بدلا و جزاء ہے اور ثواب و کرامت ہے اس کی محبت کی وجہ سے اور اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ہماری مصلحتوں اور انجام کو جانتا ہے تو وہ ہمیں بیماری وغیرہ پہنچا کر ارادہ کرتا ہے کہ ہمارا انجام اچھا ہو، یہ ایسے ہی ہے جیسے ہم فصد کھلواتے ہیں (نثر لگانا) کچھنے لگواتے ہیں اور داغ دے کر علاج کرتے ہیں کہ یہ مصلحتاً مباح ہے (ثانی حال میں) اگرچہ فی الحال درد اور دکھ محسوس ہوتا ہے۔

معزلہ کا مسلک

مگر معزلہ نے ان سب باتوں کا انکار کیا اور انہوں نے کہا: یہ عوارض بقضائے الہی نہیں ہوتے بلکہ باقتضائے طبع ہوتے ہیں یا غذا خراب ہونے سے یا ہوا خراب ہونے سے یا تبدیلی ایام سے اور جو کسی فعل کو غیر اللہ کی طرف بہ طریق ایجاد و خلق منسوب کرے وہ کافر ہے۔

پھر اگر کہا جائے کہ اس میں کون سی حکمت ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں سے کفر کا ارادہ کرے؟ ہم کہیں گے کہ بے شک اللہ تعالیٰ قادر ہے کہ شروع سے اخیر تک ان کو مطیع اور مؤمن پیدا کرے بلکہ معصوم پیدا کرنے لیکن اس نے بندوں کو تفاوت احوال کی وجہ سے اپنے ارادہ سے چھوڑا بعد اس کے کہ وہ جانتا ہے ان سے اظہارِ غفوَ و مغفرت و رحمت کے لیے جس کو وہ بخشنا چاہے اور اپنی صفات کے لیے قہر انتقام و مجازات جس پر اس کا عقاب ہو اور ان صفات حمیدہ کی تاثیر ظاہر ہوگی، کفر و معاصی کے ساتھ اس سے بڑھ کر کیا حکمت ہوگی کہ اپنی صفات قہریہ کا اظہار فرماتا ہے اور اپنے دشمنوں سے انتقام لیتا ہے؟

دوسری بات یہ ہے کہ ان سے کفر و معصیت کو جانتا ہے تو اگر ارادہ کرے اس کے خلاف اور نہ ہو وہ جس کا ارادہ کیا تو وصف کیا جائے گا بجز و حقارت سے اور یہ جائز نہیں اس لیے کہ تمام مخلوق اللہ کے بندے اور غلام ہیں اور مولیٰ کو حق ہے کہ اپنے بندوں میں جو چاہے تصرف کرے اور جب چاہے کرے۔

حشویہ

اور بعض حشویہ نے کہا: رزق اور مصالح عباد بندوں پر ہیں اللہ کے ذمے کچھ نہیں اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت بندوں پر واجب ہے تو مصالح بہ طریق اولیٰ ان پر واجب ہونے چاہئیں اور یہ قول فاسد ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "إِنَّ اللَّهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِينُ" (الذاریات: ۵۸) بے شک اللہ تعالیٰ رزاق ہے اور زبردست قوت والا اور فرمایا: "وَمَا مِنْ ذَاتِئَةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا" (صود: ۶) زمین پر چلنے والا کوئی ایسا جانور نہیں کہ جس کا رزق اللہ تعالیٰ کے ذمہ کرم پر نہ ہو۔ زمین میں جتنی مخلوق ہے اس کا رزق ہمارے ذمہ کرم پر ہے۔

حضور نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: "الرزق مقسوم و مفروع یاتی ابن آدم علی ای میسرۃ سارھا" رزق مقسوم و مفروع ہے آدمی جہاں بھی ہو اسے ملے گا۔ بعض نے کہا: کسب اور مصالح کی طلب فرض ہے بندوں پر کسی وجہ سے ہو اور بعض نے کہا: کسب اور طلب مصالح حرام ہے اور مال حلال کا رکھنا حرام ہے۔

صحیح تر یہ ہے کہ بہ وقت ضرورت کسب فرض ہے اور جب ضرورت نہ ہو تو رخصت ہے

اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

فَإِذَا قُضِيَتْ الصَّلَاةُ فَانْتَشِرُوا
فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللَّهِ.
جب تم نماز ادا کر چکو تو پھر زمین میں
منتشر ہو جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو۔

(النساء: ۱۰۳)

اور اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ فرض کی ہے اور اس کا سبب اموال ہیں اور اگر مال
حلال کا رکھنا حرام ہوتا تو پھر ان پر زکوٰۃ واجب نہ ہوتی تو ثابت ہوا کہ جو ہم نے کہا وہ صحیح

ہے۔



نواں باب

دین اور شرائع کا بیان

اس میں تین قول ہیں۔

پہلا قول

مہتدی ابوشکور سالمی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: قول اول اصول دین اور ہر اس چیز کے بیان میں جس پر اعتقاد واجب ہے۔

ابوشکور سالمی فرماتے ہیں: جاننا چاہیے کہ اصول دین وہ اعتقاد اور شرائط ایمان کو قبول کرنا، احکام وغیرہ اور ہر وہ شئی کہ جس پر اعتقاد واجب ہے اور ہر وہ شئی کہ جو اللہ تعالیٰ کے دین کے موافق اور محبوب و مرضی (پسندیدہ) ہو یہاں تک کہ اگر بندہ خلاف دین کسی چیز کا ذکر کرے یا اس پر اعتقاد رکھے جو اللہ کی رضا و محبت کے خلاف ہو تو وہ کافر ہو جائے گا اور ایسے ہی اشارہ اس مسئلہ میں بہ منزلہ عبادت کے ہے، بیان اس اجمال کا یہ ہے کہ اگر کسی کے سامنے ذکر کیا جائے کہ فلاں شخص کو یا فلاں چیز کو اللہ پسند کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس سے محبت فرماتا ہے اور وہ سن کر کہے: میں پسند نہیں کرتا یا محبت نہیں کرتا تو وہ کافر ہے اور ایسے ہی اگر سر کے اشارہ سے یا ہاتھ کے اشارہ سے یا ڈاڑھی کے اشارہ سے یا کسی اور چیز سے اشارہ کرے یا استہزاء یا مخالفت کے طور پر کرے تو کافر ہو جائے گا اور ایسے مبغوضات الہی کو اگر کہے: میں مبغوض نہیں رکھتا کافر ہو جائے گا اور ایسے ہی محبوبات و مرضیات نبی کریم ﷺ میں اعتقاد و موافقت واجب ہے، جیسے اول میں ہے اور اگر حضور ﷺ کی مرضیات و محبوبات (مرضی و پسند) کے خلاف اعتقاد رکھتا ہے خواہ قولاً ہو یا فعلاً جب کہ استخفاف (ہلکا جاننا) اور تحقیر کے طور پر ہو تو کافر ہو جائے گا۔ تو واجب ہے کہ مرضیات الہی اور مرضیات رسول کریم ﷺ کو دینا

اور اعتقاد اپنہ کرے، اگرچہ طبیعت کے خلاف ہو اور اسی طرح مبغوضاتِ الہی اور مبغوضاتِ نبی کریم ﷺ کو دینا و اعتقاد مبغوض سمجھے، اگرچہ طبیعت اس کو پسند کرتی ہو، اس لیے کہ اللہ و رسول جل جلالہ و ﷺ کی پسندیدہ اور محبوب اشیاء کو پسند کرنا اس کی موافقت اعتقاداً و دیناً واجب ہے، اگرچہ طبعاً وہ چیز پسند نہ ہو تو طبیعت کا مقابلہ طبیعت پر جبر کر کے مرضیاتِ اللہ اور مرضیاتِ رسول اللہ ﷺ کو پسند کرے اور اللہ و رسول کے ناپسندیدہ اشیاء کو مبغوض و ناپسندیدہ کرے۔

اس لیے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے عبادات و احکام و شرائع میں محنت اور آزمائش کو رکھا ہے کہ کون اوامر و نواہی الہی اور سنتِ رسول کریم ﷺ کی موافقت کرتا ہے اور کون مخالفت کرتا ہے؟ اور صادق، کاذب، فاسق و مطیع، مخلص و منافق میں امتیاز ہو جائے اور سب جان لیں۔

دوسرا قول

محنت و مشقت اور ابتلاء کا بیان

اہل سنت و جماعت فرماتے ہیں کہ محنت و مشقت اور ابتلاء کی وضع اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں پر جائز ہے۔

کرامیہ نے کہا کہ محنت و ابتلاء واجب ہے۔

اور معتزلہ نے کہا کہ محنت و مشقت میں بندوں کو ڈالنا قطعاً جائز نہیں، اس لیے کہ حکمت کے خلاف ہے کہ بندوں کو محنت و مشقت میں ڈال کر ان کا امتحان لے یا دنیا میں ان کو سزا و عقوبت دے اور دنیا دار الجزاء و عقوبت نہیں ہے۔

اور اس لیے کہ آلام و شدائد بدلا دینے کو ہوتے ہیں اور عقوبت و محنت اور ابتلاء و آزمائش حصول علم کے لیے اور اللہ تعالیٰ کو بندوں کا حال معلوم ہے تو اس کو ابتلاء و آزمائش میں ڈالنا جائز نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ اس کا محتاج نہیں، بلکہ کل بلائیں آزمائشیں بندہ کی طرف سے ہوتی ہیں، جیسے لغزش، فقر، بھوک، پیاس، مار دھاڑ، ناحق قتل و خون ریزی یہ سب جرائم

بندوں کی طرف سے ہوتے ہیں، لیکن آلام (درد) بخار، مرض اور اسی طرح کی بیماریاں وغیرہ بندوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہوتیں، یہ چیزیں طبیعت کی وجہ سے ہوتی ہیں یعنی طبعی چیزیں ہیں، کیوں استحالہ لازم آتا ہے کہ اس کو امتحان و ابتلاء میں ڈالنے کی حاجت نہیں کہ یہ علم حاصل کرنے کے لیے ہوتے ہیں اور خدا بندوں کو پہلے ہی جانتا ہے۔

اہل سنت و جماعت کے دلائل

اہل سنت اس آیت سے دلیل دیتے ہیں: ”وَإِذِ ابْتَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ“ (البقرہ: ۱۲۴) جب اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو چند کلمات سے آزمایا۔

اس آیت میں خبر دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو آزمایا اور ان کو آیات کے ساتھ بتلا کیا اور نبی کریم ﷺ نے مہاجر عورتوں کے امتحان کا حکم دیا، فرمایا: ”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا جَاءَ كُمُ الْمُؤْمِنَاتُ مُهَاجِرَاتٍ فَاْمْتَحِنُوهُنَّ“ (الممتحنہ: ۱۰) اے ایمان والو! جب مسلمان (کفر سے) ہجرت کرنے والی عورتیں تمہارے پاس آئیں تو ان کا امتحان کرو اور فرمایا: ”الَّذِي خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا“ (الملك: ۲) وہ جس نے موت اور حیات کو پیدا کیا تاکہ تمہیں آزمائے کہ کون تم میں سے اچھے عمل والا ہے۔ ان آیات سے ثابت ہوا کہ امتحان و ابتلاء اللہ تعالیٰ کی طرف سے جائز ہے۔

دنیا میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کا امتحان جائز ہے؟

حدیث پاک سے دلیل: نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”البلاء والهواء والشهوة معجونة بطينة آدم عليه السلام“ مصیبت آزمائش، خواہش اور شہوت حضرت آدم علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کے خمیر میں گوندھی گئی ہیں۔

دوسری حدیث مبارک: اور حضور ﷺ نے فرمایا: ”اشد البلاء علی الانبياء ثم الاولیاء ثم الامثل فالامثل“ سب سے زیادہ سخت اور کڑی آزمائش انبیاء کی، پھر اولیاء کی اور پھر جوان سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔

ابتلاء و امتحان کا فلسفہ کیا ہے؟

دراصل یہ جو ہم کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے امتحان و آزمائش جائز ہے باوجودیکہ وہ بغیر امتحان و آزمائش کے جانتا ہے اس امتحان کا فائدہ الزام حجت ہے اور جو کچھ

بندہ میں ہے اس کا اظہار و اعلام کہ اس کے کروت اس کو دکھائے جائیں۔

مصائب و آلام کا راز

دکھوں اور بیماریوں میں مبتلا کرنا کفارہ گناہ کا باعث ہے اور بلندی درجات کا موجب ہے اس کی دلیل یہ حدیث مبارک ہے: حضور ﷺ نے فرمایا کہ ”حمی لیلۃ کفارۃ سنۃ“ ایک رات کا بخار برس دن کے گناہوں کا کفارہ ہے۔

ابتلاء و آزمائش کے من جانب اللہ جائز ہونے پر عقلی دلائل

دریافت طلب امر یہ ہے کہ امراض و آلام اللہ تعالیٰ مخلوق ہیں یا غیر مخلوق؟ اگر کہو کہ مخلوق ہیں تو آزمائش وغیرہ کو منجانب اللہ مان لیا۔ اور اگر کہیں کہ غیر مخلوق ہیں تو اس میں کلام ہے اس لیے کہ اللہ کے سوا دوسرا خالق و محدث محال و ناجائز ہے اور تیسری صورت یہ ہے کہ اگر کہا جائے کہ اگر حدوث فعل طبیعت کی طرف سے یا بندے کی طرف سے ہو اللہ تعالیٰ کے احداث و ایجاد (پیدا کرنا) کے بغیر تو اس میں خدا سے استغناء و بے نیازی کے علاوہ یہ بھی لازم آتا ہے کہ حدوث عالم بغیر صانع کے پایا جائے تو اس میں الوہیت کی نفی ہوتی ہے اور تعطیل کا موجب ہے اور یہ کفر ہے اور اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا فرمایا وہ سب اللہ کے بندے ہیں اور فقر بندے کی صفت ہے اور عبودیت سخت آزمائش ہے اور محنت و مشقت اور فقر و احتیاج فضل ہے۔

اور اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے قید کو کفار کے حق بشرائط ہی (قید) مباح قرار دیا ہے اور قید، مشقت، محنت پہنچانے کو واجب کرتی ہے، جیسے فقر، خدمت اور ذلت سے دکھ اور مصیبت پہنچتی ہے اور اسی طرح اہل حرب کے موشیوں کے بچے جب کہ ان کا دارالاسلام کی طرف چلنا ناممکن ہو ان بچوں کو قتل کرنا مباح ہے اور یہ مشقت و آلام کے پہنچانے کو واجب کرتا ہے تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امتحان جائز ہے۔

زراعت سے دلیل

اور ایسے ہی ہمارے لیے زراعت کھیتی باڑی اور حرفت کو مباح قرار دیا اس میں بھی مشقت ہے۔

نماز و وضو سے دلیل

اور اسی طرح نماز بغیر وضو کے جائز نہیں اور وضو بغیر پانی کے ممکن نہیں اور بعض اوقات پانی بغیر کنواں کھودنے کے حاصل نہیں ہوتا، یہ بھی باعث محنت و مشقت اور کلفت ہے۔

موسموں سے استدلال

اور اس لیے کہ خدا نے گرمی کو گرم پیدا کیا اور سردی کو ٹھنڈا جس سے لوگوں کو اذیت و تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے، یہ سب کچھ دو حال سے خالی نہیں، یا تو سب خدا کی جانب سے ہوں گی یا غیر خدا کی جانب سے؟ اگر کہو کہ یہ سب غیر خدا کی طرف سے ہیں تو اس میں خالق و صانع کی الوہیت کی نفی ہے اور یہ کفر ہے اور اگر کہا جائے کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں تو ثابت ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ نے اسباب کو پیدا کیا ہے۔ مشقت و محنت اذیت و تلف اور جب یہ جائز ہوا تو جائز ہو گیا کہ فقر، ذلت، ابتلاء و امتحان وغیرہ اس لیے ہم نے کہا کہ یہ سب بقضاء اللہ ہیں اور اس کی تقدیر و فیصلے سے ہیں۔

تیسرا قول

استطاعت اور تفویض کا بیان

قدریہ، معتزلہ، جہمیہ، روافض اور کرامیہ کہتے ہیں کہ بندہ میں کسی فعل کو سرانجام دینے سے پہلے اس فعل کی استطاعت موجود ہوتی ہے اور بندہ بذات خود بغیر تقدیر اور اللہ تعالیٰ کے پیدا کرنے کے اپنے ذاتی افعال کی قدرت و استطاعت رکھتا ہے اور بندہ اپنے اچھے برے کاموں کا خود خالق ہے۔

جبریہ کا نظریہ

جبریہ نے کہا کہ بندے کا کوئی فعل نہیں ہے اور نہ بندہ فعل پر قادر ہے اور وہ اپنے نیک و بد افعال میں مجبور ہے اور کافر اپنے کفر میں معذور ہے اور بندہ کی حرکت درخت کے پتوں کی طرح ہے کہ بغیر اختیار کے وہ حرکت کرتے ہیں۔

بعض کا مسلک

بعض نے کہا کہ فعل بندے اور خدا کے درمیان موقوف ہے، ہمیں اس چیز کا ادراک نہیں ہے کہ فعل خدا کی طرف سے ہے یا بندے کی طرف سے ہے۔

اہل سنت و جماعت کا موقف

اہل سنت فرماتے ہیں کہ بندہ اپنے ذاتی افعال میں استطاعت رکھتا ہے لیکن بذات خود نہیں، بلکہ اللہ عین اس وقت بندے میں یہ قوت پیدا فرمادیتا ہے اور یہ قوت فعل سے متصل اور مقرر ہوتی ہے، فعل سے مقدم (پہلے) یا مؤخر (بعد) نہیں ہوتی۔

استطاعت کی قسمیں

استطاعت تین قسم کی ہوتی ہے (۱) استطاعت اموال (۲) استطاعت افعال (۳) استطاعت احوال۔

پہلی قسم (یعنی استطاعت اموال) جیسے حاجی کے لیے زاد راہ اور سواری وغیرہ اور استطاعت افعال سے مراد ہے جسم اور اعضاء کا تن درست اور صحیح و سلامت ہونا اس لیے استطاعت کا فعل سے مقدم ہونا جائز ہے بخشی طور پر بھی اور حکماً بھی فعل سے پہلے قوت کا پایا جانا جائز ہے۔

اور استطاعت احوال فعل پر وہ قوت و قدرت ہے جو نہ فعل سے مقدم ہوتی ہے اور نہ مؤخر بلکہ مقارن (ساتھ) فعل ہوتی ہے۔

معزلہ کا قرآن سے استدلال

معزلہ کی حجت یہ آیت ہے: "لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا" (البقرہ: ۲۸۶) اللہ تعالیٰ کسی جان کو تکلیف نہیں دیتا مگر اس کی طاقت کے مطابق۔ اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ بندہ فعل پر قدرت و استطاعت رکھتا ہے۔

دوسری آیت: "وَلِلَّهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مِنْ اسْتِطَاعِ الْيَدِ سَبِيلًا" (آل عمران: ۹۷) اور اللہ تعالیٰ کے لیے ہے لوگوں پر بیت اللہ کا حج جو اس کی طرف راستے (سفر) کی طاقت رکھتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو مخاطب کیا اور ان کو حکم دیا نماز، حج وغیرہ کا، تو اگر نماز وغیرہ شروع کرنے سے قبل توجہ خطاب کے وقت استطاعت ادا نیگی نماز وغیرہ نہ ہو تو پھر نماز کا خطاب صحیح نہ ہوتا اس لیے کہ خطاب بجوم وقت کے ساتھ متوجہ ہوتا

ہے تو بسا اوقات نماز آخر وقت میں شروع کرتا ہے تو یہ مقتضی ہے کہ نماز پڑھنے کی طاقت بجوم
وقت کے وقت ہو، لیکن خطاب کا متوجہ ہونا صحیح ہوا۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگر ہم یہ کہیں کہ استطاعت ساعۃ ساعۃ (لحہ بہ لحہ) پیدا ہوتی ہے
تو یہ چیز جبر و تسلیط کا موجب ہے اور واجب کرتی ہے کہ قبائح کی اضافت و نسبت اللہ کی طرف
ہو، اس لیے کہ زانی اور لوطی جب زنا اور لواطت کریں تو ایلاج و دخول علی الترتیب والترادف
ہوگا تو ہر حرکت اور ایلاج (دخول) محتاج ہوگا حدو ث قوت و قدرت کا۔

اور اگر ہم کہیں کہ اللہ تعالیٰ اسی ساعت دوران عمل میں قدرت کو پیدا کرتا ہے تو یہ اس
فعل پر تسلیط (مسلط کرنا) ہے جو کہ جائز نہیں ہے۔

اور بندہ کے لیے یہ ممکن ہے کہ اس فعل کو غیر کی طرف پھیر دے اس لیے کہ قوت اخراج
(نکالنے کی مدت) نکالنے کے وقت پیدا ہوگی اور داخل کرنے کی قوت داخل کرنے کے وقت
پیدا ہوگی اور فعل ایلاج و اخراج (داخل کرنا اور نکالنا) زنا ہے اور یہ ناممکن ہے کہ اس کا فعل واقع
ہو اور زنا میں نہ ہو بلکہ زنا ہی میں واقع ہوگا، سو اس میں اختیار کی نفی ہو جاتی ہے اور یہ جائز نہیں۔
جواب: اس آیت سے معتزلہ کے استدلال کا جواب یہ ہے کہ یہ آیت ”لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ
نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا“ نفقہ ازواج کے متعلق نازل ہوئی ہے۔

آیت مذکورہ بالا کے نفقہ ازواج کے بارے میں نازل ہونے کی دلیل یہ آیت ہے:
”لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا مَا آتَاهَا“ یہ آیت مفسر ہے اور پہلی جمل ہے اور مجمل کا حمل
مفسر پر کیا جاتا ہے تو اعتراض لازم نہیں آیا۔

”مَنْ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا“ کا جواب یہ ہے کہ حدیث میں وارد ہے کہ حضور علیہ
السلام نے فرمایا: ”الاستطاعة هو الزاد والراحلة“ یعنی استطاعت سے مراد زاد اور راہ اور
سواری وغیرہ ہے، لیکن ان کا یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ نے نماز کا حکم دیا ہے تو واجب ہے کہ بندہ
خطاب کے متوجہ ہونے کے وقت نماز ادا کرنے کے لیے استطاعت رکھتا ہو، اس کے جواب
میں ہم نے کہا کہ ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ استطاعت تکلیف کے وقت موجود ہے اور وہ
(استطاعت) اعضاء سلیمہ ہیں اس لیے کہ تکلیف اعضاء ہی کو ہوتی ہے اور لیکن ادائے قوت و
قدرت سے ہی ہوتی ہے اور یہ کسب کے وقت پیدا ہوتی ہے جب نماز شروع کرنے لگتا ہے۔

دلیل اس کی یہ ہے کہ قوت و قدرت کے اثبات کے لیے فعل اور حرکت کے علاوہ کوئی دلیل نہیں ہے اور اس فعل و حرکت سے قبل اس فعل پر قوت و قدرت کو ثابت کرنے کی اس میں کوئی دلیل نہیں ہے۔

اگر کوئی کہے کہ فعل و حرکت جو موجود تھی، قبل اس کے دلیل ہے اس فعل کے اثبات پر اور ایسے ہی مابعد کے۔ ہم نے کہا: وہ فعل اور حرکت دلیل ہے اس قوت پر جس سے یہ فعل و حرکت حاصل ہوا ہے، لیکن اس کے غیر پر نہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ قدرت علی الصلوٰۃ توجہ خطاب کے وقت موجود ہے اس لیے کہ آلہ اور قوت ثابت ہے اور یہ قدرت صلاحیت رکھتی ہے نماز کے لیے جیسے یہ قوت صلاحیت رکھتی ہے غیر صلاۃ کے لیے دلیل اس پر یہ ہے کہ محمد بن حسن رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ فرمایا: استطاعت جس کے ساتھ تو ایمان لایا ہے یہی استطاعت ہے جس کے ساتھ کفر کرتا ہے اس کے معنی یہ ہیں: جس استطاعت سے تم ایمان لائے ہو وہی استطاعت صلاحیت رکھتی ہے کہ کفر کرے۔

مہدی ابوشکور سالمی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: استطاعت کو جب ایمان کی طرف صرف کیا تو پھر ممکن نہیں کہ ایمان کے بعد کفر کی طرف صرف اس لیے کہ استطاعت عرض ہے اور عرض دو زمانہ تک باقی نہیں رہتی تو ممکن نہیں کہ قبل از فعل موجود ہو اور پھر بعد از فعل باقی نہ رہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ وہ استطاعت جو قبل از فعل موجود تھی تو ضم کے نزدیک وہ استطاعت قریب زوال تھی حال ثانی میں اور ہمارے نزدیک استطاعت فی الحال موجود ہے اور عنقریب حال ثانی میں موجود ہوگی۔

پھر جب اس استطاعت کے ساتھ جو فی الحال موجود ہے اور لیکن بحال ثانی موصوف بالزوال ہے خطاب الہی کا متوجہ ہونا جائز ہے تو ایسے ہی جائز ہے کہ خطاب متوجہ ہو اس استطاعت کے ساتھ جو فی الحال موجود ہے اور بحال ثانی (آئندہ وقت میں) موجود ہوگی۔

تمہید شریف میں عربی عبارت اس طرح ہے: "وعندنا الاستطاعة موجودة (والصحيح معدومة) في الحال او (والصحيح الواو) على شرف الوجود... ثم لما جاز توجه الخطاب بالاستطاعة التي هي موجودة... يجوز توجه الخطاب بالاستطاعة التي هي موجودة (الصحيح معدومة) في الحال"۔

فقیر کی دانست میں جس طرح کی عبارت ہوئی چاہیے اس کی نشاندہی اس عبارت میں تو سمین کے درمیان کر دی گئی ہے۔ ترجمہ بھی اس کے مطابق کیا گیا ہے۔

اس کی دلیل یہ ہے کہ تمام افعال بندے کے اختیار سے ہوتے ہیں اور اختیار عرض ہے تو اگر ہم یہ کہیں کہ جائز ہے کہ باقی رہے تو یہ مودی ہوگا اس بات کی طرف کہ کافر اپنے کفر پر باقی رہے جبراً اور یہ محال ہے۔ بیان اس کا یہ ہے کہ اختیار کا آلہ جب اپنے اختیار سے کفر میں مشغول رہے تو اس سے اس کا اختیار زائل نہیں ہوگا تو یہ ممکن نہیں ہوگا کہ وہ اسلام کو قبول کرنے ساتھ زوال کے ثانی حال میں عدم اختیار کی وجہ سے تو اس کا کفر پر باقی رہنا مجبوراً ہوگا اور اس کے ہوتے ہوئے اس سے ایمان کا خطاب جائز نہ ہوگا اور یہ محال ہے۔

اشکال: اور ان کا یہ کہنا کہ استطاعت ساعۃ ساعۃ (لمحہ بہ لمحہ) پیدا ہوتی ہے تو اس میں تسلیط ہوگی اور قبائح کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہوگی۔

جواب: ہم نے کہا: ایسا نہیں ہے اس لیے کہ بندہ محتاج استطاعت ہے اپنے امور کے مصالح کے لیے اور اپنے اعمال کے لیے مصلحہ للمعیشہ اور ایک وقت تک بقاء عالم کے سبب سے تو اللہ تعالیٰ لمحہ بہ لمحہ بغیر انقطاع کے استطاعت کو پیدا کرتا ہے۔ جیسے پانی کا پیدا و جاری کرنا ہوا کا چلنا پھر بے شک اللہ تعالیٰ نے بندے کو حکم دیا ہے کہ بعض استطاعت کو بعض اوقات میں صرف کرنے عبادات کی طرف شکر ادا کرنے کے لیے اور منع فرمایا اس کو استطاعت کے صرف کرنے سے معاصی اور قبائح کی طرف امتحان اور آزمائش کے لیے۔

اگر ہم کہیں کہ اللہ تعالیٰ استطاعت کو معاصی کی طرف پھیرنے سے منع کر دے جبراً کیونکہ بندہ طاعت کو ترک کرتا ہے اور استطاعت کو عبادات کی طرف اپنے ذاتی اختیار سے صرف نہیں کرتا اور شبہ کا دعویٰ کرے اور حجت اللہ تعالیٰ پر بائیں معنی کہ مجبور تھا ایک وقت میں دوسرے وقت میں اور ایسے ہی دعویٰ کر لے جبر کا اس وقت میں تو اس کو شبہ ہو جائے گا اس کا اور یہ جائز نہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگر ہم کہیں کہ امر (معاملہ) بندوں کے سپرد ہے اور وہ اپنے افعال کے خود خالق ہیں تو اس میں ربوبیت کا بندوں کے سپرد کرنا اور تفویض کرنا لازم آتا ہے اور یہ محال ہے۔

مسئلہ تفویض اور امام ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

سیدنا امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے حضرت امام جعفر بن محمد صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے دریافت کیا کہ اے ابن رسول ﷺ! کیا اللہ تعالیٰ نے امر (معاملات) بندوں کے سپرد کر دیا ہے؟

امام جعفر نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اس سے بلند اور اعلیٰ ہے کہ ربوبیت بندوں کے سپرد کرے پھر عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کو مجبور کیا ہے؟ اور ان پر تسلط فرمایا ہے اعمال کے باب میں فرمایا: اللہ تعالیٰ اس سے اعلیٰ و برتر ہے کہ بندوں پر جبر فرمائے اور پھر ان کو عذاب دے۔

اور ان کا یہ کہنا کہ قبائح کی نسبت اللہ کی طرف ہوگی؟ ہم کہتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے کیونکہ جب یہ جائز ہے کہ اللہ بندوں کو پیدا کرے اور جانتا ہے کہ بندہ یہ فعل کرے گا اور اس کے منع پر بھی قادر ہے کہ وہ یہ فعل نہ کرے اور پھر منع نہیں فرماتا تو فعل کی قباحت و عیب بندہ کی طرف راجع ہے تو ایسے ہی جائز ہے کہ اس کے لیے ان افعال کی قدرت پیدا فرمادے اور اس قدرت کو معاصی (گناہوں) کی طرف پھرنے سے منع نہ فرمائے علی سبیل الجبر باوجود ان افعال سے منع کرنے کے پھر عیب و قبح بندہ کی طرف راجع ہے جیسا کہ علم اور تخلیق میں۔

اس کی تحقیق یہ ہے کہ تخلیق امر اور تخلیق قدرت میں کچھ فرق نہیں پھر جب جائز ہے کہ آلات پیدا کرے اور ان آلات سے وہ گناہ اور معصیت کرتا ہے تو عیب عاصی (گنہگار) کی طرف رجوع کرتا ہے۔

دوسرے یہ کہ اس میں اوصاف جمیلہ کا اظہار ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ عفو و غفران (درگزر اور بخشش) کی صفت سے موصوف ہے اور صفت قہر و انتقام سے بھی موصوف ہے پھر ان صفات کی تاثیر حالات کے بدلنے کے ساتھ ظاہر ہوگی تو ہم کہتے ہیں کہ بتقاضائے حکمت جائز ہے کہ اللہ تعالیٰ اس فعل سے منع کرنے اور حجت لازم کرنے کے بعد اس قدرت کو سلب کر لے تاکہ ظاہر ہو قہر و انتقام اور عفو و غفران اور اس معنی کے لحاظ سے ہم نے کہنا کہ بندوں کے افعال اللہ تعالیٰ کے پیدا کیے ہوئے ہیں برخلاف اس کے معتزلہ نے کہا: ہماری دلیل ان پر یہ ہے: "وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُونَ" (الصافات: ۹۶) اللہ تعالیٰ نے تم کو اور

تمہارے اعمال کو پیدا کیا۔

اگر کہا جائے کہ اس سے مراد معمولات ہیں۔ ہم نے کہا: ایسا نہیں ہے اس لیے کہ جس جگہ اللہ تعالیٰ نے ”ما تعملون“ فرمایا ہے اس سے عمل مراد لیا ہے۔

اس پر دلیل یہ آیت ہے: ”هَلْ تُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ“ (انمل: ۹۰) تمہیں کیا بدلہ ملے گا مگر اسی کا جو تم کرتے تھے۔ اور اگر بندہ ہی افعال کا خالق ہوتا تو اس کی قدرت عدم پر نافذ ہے تو پھر خالق و مخلوق میں فرق نہ رہے گا اور اگر بندہ قادر ہے کہ اپنے آپ کو پیدا کر لے تو وہ قادر ہوگا کہ کوئی اور شئی پیدا کرے اور یہ کفر ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ”فَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَرَهُ تَقْدِيرًا“ (الفرقان: ۲) پس اس نے ہر چیز پیدا کی اور اسے درست اندازہ پر رکھا۔

استطاعت دو طریق کی ہے

بعض فقہاء فرماتے ہیں کہ استطاعت دو وجہ پر ہے: تکلفی و توفیقی۔ تکلفی اعضاء سلیمہ میں ہے اور یہ افعال سے قبل موجود ہوتی ہے اور توفیقی وہ قدرت علی الأداء سے عبارت ہے اور یہ قدرت فعل کے ساتھ اداء کے وقت پیدا ہوتی ہے۔

جبریہ اور مسئلہ جبر و قدر

جبریہ کہتے ہیں کہ بندے کوئی ہے اور اسے فعل پر قدرت ہے۔

بندہ مجبور محض ہے؟ جبریہ کے دلائل

(۱) جبریہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”وَلَنْ تَسْتَطِيعُوا اَنْ تَعْدِلُوا بَيْنَ النِّسَاءِ“ (النساء: ۱۲۹) اور تم ہرگز طاقت نہ رکھو گے کہ انصاف کر سکو عورتوں میں۔

(۲) ارشاد فرمایا: ”لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ“ (آل عمران: ۱۲۸) یہ بات آپ کے ہاتھ میں نہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ بندہ کے لیے کسی امر اور فعل پر قدرت و استطاعت نہیں اور یہ اس باب میں نص ہے۔ (جبریہ نے مزید کہا کہ) اور ہمارا اجماع ہے کہ فعل عرض ہے، عرض دو زمانوں تک باقی نہیں رہتا تو جب پایا جائے گا تو ایک لطیف سی ساعت اور ایک لمحہ میں مٹ جائے گا اور بندہ جب کسی خیر و شر اچھے یا بُرے کام میں مشغول ہوتا ہے تو اسی لمحہ میں قدرت پیدا ہوتی ہے تو اس کے لیے ناممکن ہے کہ

قدرت کو دوسری طرف پھیر دے اور قدرت کو دوسرے امر کی طرف پھیرنا باقی نہیں رہتا۔

اور اس لیے کہ اقوی الاحوال وہ اختیار ہے جو اسے اعمال پر حاصل ہوتا ہے اور اختیار ہوتا ہے ضمیر و خطرہ سے اور بندہ کو خطرہ کے پیدا کرنے اور منع کرنے پر قدرت نہیں ہے کیونکہ خطرہ بندے کے عمل دخل کے بغیر پیدا ہوتا ہے (بندے کا اس خطرہ کی ایجاد یا عدم ایجاد میں کوئی رول یا کردار نہیں ہوتا) تو یہ لامحالہ جبر کو واجب کرتا ہے اور جب یہ اختیار و خطرہ میں صحیح ہے تو تمام احوال میں صحیح ہے۔

جوابات

جبریہ کے اس آیت ”وَلَنْ تَسْتَطِيعُوا بَيْنَ النَّسَاءِ“ سے قائم کردہ استدلال کا جواب یہ ہے کہ عدل عورتوں میں قوت و فعل سے نہیں بلکہ نفقہ سے ہے اور ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ بندہ عورتوں کے درمیان عدل کرنے میں کبھی تو انفاق مال سے استطاعت رکھتا ہے اور کبھی طاقت نہیں رکھتا تو لازم نہیں۔

دوسری دلیل کا جواب

اور ”لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ“ سے کیے گئے استدلال کا جواب دیتے ہوئے ہم کہتے ہیں کہ اس (امر) سے مراد فعل نہیں بلکہ حکم مراد ہے یا جزاء مراد ہے۔ دلیل یہ ہے کہ فرمایا: ”أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ أَوْ يُعَذِّبَهُمْ“ (آل عمران: ۱۲۸) یا انہیں توبہ کی توفیق دے یا انہیں عذاب دے۔ یعنی بدلہ دینا آپ کے اختیار میں نہیں اور تعذیب و مکافات (سزا وغیرہ) بھی آپ کے اختیار میں نہیں اور ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ یہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی صفات خصوصیہ میں سے ہے۔ کسی بندے بشر کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے اختیار سے کسی کو عذاب دے یا اس کی بخشش کر دے۔

تیسری دلیل کا جواب

اور ان کا یہ کہنا کہ فعل عرض ہے دوزمانوں تک باقی نہیں رہتا ہم کہتے ہیں کہ بے شک بجا ہے کہ فعل عرض ہے دوزمانوں تک باقی نہیں رہتا ہر لحظہ پیدا ہوتا رہتا ہے اور بندہ کو ہر لحظہ اختیار ہے جس طرف چاہے قدرت کو صرف کر لے قدرت دونوں کی صلاحیت رکھتی ہے۔

پھر ظہور قدرت علی الشربہ سبب عادت اور اللہ تعالیٰ کے بندہ کو رسوا کرنے کے سبب ہے اس نے قدرت کو شر کی طرف پھیرا یہ واجب نہیں کرتا کہ اس کے حق میں عذر و جواز کو اس لیے کہ فعل سے قبل نہیں وارد ہو چکی ہے اور عند الفعل اختیار موجود ہے اور وہ اپنے آپ کو اس فعل بد سے روکنے پر قدرت رکھتا ہے جیسے اس کے کرنے پر قدرت رکھتا ہے تو اس کو کوئی عذر نہیں اور منع پر اور لانے پر کوئی منت نہیں اس کی دلیل یہ ہے: "فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ" (الزلزال: ۷-۸) پس جو ذرہ برابر بھلائی کرے وہ اسے دیکھ لے گا اور جو ذرہ برابر بُرائی کرے اسے بھی دیکھ لے گا۔

اور اس کا یہ کہنا کہ اختیار خطرہ سے ہوتا ہے اور خطرہ اس کا فعل نہیں تو جب اس کے دل میں اس بات کا خطرہ (کھٹکا) پیدا ہوا تو دوسرا خطرہ لانا ناممکن ہے تو ہم نے کہا کہ ہاں! تمام خطرات اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں بغیر مباشرت عبد کے مگر اللہ تعالیٰ نے کبھی تو اشیاء کو پیدا کیا بنفسہ بلا واسطہ اور کبھی پیدا کیا بواسطہ اور واسطہ جائز ہے کہ فرشتہ ہو یا واسطہ شیطان ہو اور جائز ہے کہ طبیعت اس پر غالب آجائے تو ہر خیر و طاعت ضمیر و خطرہ و اختیار سے ہے۔

اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کو بلا واسطہ یا بواسطہ ملک (فرشتہ) اور ہر شر و قبائح بواسطہ شیطان پیدا فرماتا ہے اس لیے کہ شیطان و سوسہ ڈالتا ہے اور اللہ تعالیٰ پیدا فرماتا ہے پھر خطرہ اولیٰ اور اس کے مثل مقتضی ہیں خیر کو اس لیے کہ یہ افعال عبد سے نہیں اور نہ اس کے اختیار و مباشرت سے تو ثواب و عقاب کا موجب نہیں جیسا کہ یہ ثابت ہے اس لیے کہ بندے کے دل میں خیر و شر کا خطرہ پیدا ہوتا ہے پھر اسی ساعت اس کے منقض خطرہ پیدا ہوتا ہے۔ پس خطرہ اور ضمیر پر تمسک بھی کار بند رہنا اور اس شئی کا اختیار کرنا عزیمت و قصد ہے اور یہ بندے کے اس فعل کو پسند کرنے اور ثابت کرنے سے ہوتا ہے تو جب کسی پر تمسک کیا اور اس کو اختیار کیا تو فعل حاصل ہوا اور ثابت و اختیار بندہ کی جانب سے ہے تو یہ ثواب و عقاب کا موجب ہے اور حد جبر سے خروج اس کے فعل اور اختیار کے سبب سے ہے۔ پس خطرہ اولیٰ سے احتراز ممکن نہیں ہے سو تمسک سے احتراز ممکن ہے۔



دسواں باب

تکلیف و طاقت کا بیان

اس میں سات قول ہیں۔

پہلا قول

تکلیف اور طاقت کا بیان

جاننا چاہیے کہ اہل سنت و جماعت کے نزدیک تکلیف مالا یطاق جائز نہیں ہے اور معتزلہ، جہمیہ اور حقیقہ نے کہا کہ جائز ہے اور اس آیت سے استدلال کرتے ہیں: "وَلَنْ تَسْتَطِيعُوا اَنْ تَعْدِلُوا بَيْنَ النِّسَاءِ" (النساء: ۱۲۹) اور تم ہرگز طاقت نہیں رکھ سکو گے کہ عورتوں میں انصاف کرو۔ اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ ان میں عورتوں کے درمیان عدل کرنے کی استطاعت نہیں اور پھر عدل کا حکم دیا کہ فرمایا: "اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ" (النحل: ۹۰) بے شک اللہ تعالیٰ عدل اور احسان کا حکم دیتا ہے۔

اور فرمایا: "اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تَقَاتِهِ" (آل عمران: ۱۰۲) اللہ تعالیٰ سے ڈرو جس طرح اس سے ڈرنے کا حق ہے۔ پھر اس آیت سے کہ "فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ" (التغابن: ۱۶) پس اللہ تعالیٰ سے حسب طاقت ڈرو سے آیت مذکورہ الصدر کا حکم منسوخ فرما دیا تو نسخ سے قبل اس کو طاقت و وسعت نہ تھی۔

اور اللہ تعالیٰ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف سے خبر دیتا ہے: "وَلَا تَحْمِلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا" (البقرہ: ۲۸۶) اور ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جس کی ہم میں طاقت نہیں۔ تو اگر تکلیف مالا یطاق جائز نہ ہوتی تو نبی کریم ﷺ ایسی دعا نہ کرتے اور جب دعا کی تو ثابت ہوا کہ جائز

ہے۔

اور حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”من صور صورة كلفه الله تعالى بان ينفخ فيه الروح وليس بنافخ“ یعنی جس نے ذی روح کی صورت بنائی اللہ تعالیٰ قیامت میں اس کو تکلیف دے گا کہ اس میں جان ڈالو اور (حالانکہ) وہ جان نہ ڈال سکے گا۔

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”أَنْبِئُونِي بِأَسْمَاءِ هَؤُلَاءِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ“ (البقرہ: ۳۱) مجھے ان چیزوں کے ناموں کی خبر دو اگر تم سچے ہو اور وہ عاجز تھے تو ثابت ہوا کہ تکلیف مالا یطاق جائز ہے۔

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ”إِنِّي سَأَطُوعًا أَوْ كَرِهًا“ (فصلت: ۱۱) کہ دونوں حاضر ہو خوشی سے یا ناخوشی سے۔ معدوم کو خطاب فرمایا اور معدوم میں طاقت نہیں۔ تو ان دلائل سے ثابت ہوا کہ تکلیف مالا یطاق جائز ہے۔

اہل سنت و جماعت کی طرف سے جوابات

”وَلَنْ تَسْتَطِيعُوا“ کا جواب یہ ہے کہ اس سے مراد استطاعت از روئے قوت نہیں بلکہ عورتوں پر مال خرچ کرنا اور عادت کے مطابق معروف طریق سے ان کے امور زندگی کا خیال رکھنا اور ان کی بہتری اور بہبود کے لیے مقدور بھر کوشش کرنا ہے۔

پھر ہم کہتے ہیں کہ مرد کے لیے ناممکنات میں سے ہے کہ عورتوں میں وہ عادتاً موافقت و مصالحت قائم رکھ سکے۔ لیکن استطاعت و قوت کے پہلو سے دیکھا جائے تو ایسا ممکن ہے۔

دوسری آیت کا جواب کہ فرمایا: ”إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ“ (النحل: ۹۰) اس سے مراد عدل ہے جو جور (ظلم) کی ضد ہے اور سیدھی سی بات ہے کہ اس پر استطاعت ثابت ہے۔

تیسری آیت کا جواب

”فَاتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تَقَاتِهِ“ (آل عمران: ۱۰۲) یہ بھی ”تکلیف علی الطاقہ“ تھی اس لیے کہ انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کرام اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے تو یہ خطاب انبیاء کرام اور اولیاء اللہ کو ہے۔ اور ”فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ“ (التغابن: ۱۶) یہ خطاب عام لوگوں کو ہے اور تکلیف مالا یطاق نہیں بلکہ تکلیف علی ما یطاق ہے (لہذا معتزلہ وغیرہ

کا کہنا درست نہیں کہ تکلیف مالا یطاق جائز ہے کیونکہ یہ تکلیف مالا یطاق ہے ہی نہیں بلکہ تکلیف مایطاق ہے اور نیز یہ کہ آیت منسوخ بھی نہیں ہے (اور اس میں اور اس میں کوئی فرق نہیں اور اس آیت کا جواب کہ ”رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا“ (البقرہ: ۲۸۶) سے مراد دوام ہے جیسا کہ ام سابقہ پر محنت شاقہ تھی اور اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو بھی تکلیف علی مالا یطاق نہیں دی تھی لیکن تعسر و دشواری تھی تو نبی کریم ﷺ نے ہمارے لیے تخفیف اور آسانی و سہولت کی دعا فرمائی تو اعتراض لازم نہیں آتا۔

اور حضور ﷺ کا ارشاد ”من صور صورة“ میں اللہ تعالیٰ نے نفخ روح (جان ڈالنے) کی تکلیف نہیں دی کہ ان میں روح پھونکو بلکہ ان کے عجز کا اظہار کیا ہے اور ان کو عاجز ٹھہرایا کہ تم روح نہیں ڈال سکو گے اور بوجہ تصویر سازی ان کو عذاب دیا جائے گا اور یہ بھی آخرت میں ہوگا دنیا میں نہیں اور آخرت دارالتکلیف نہیں وہ تو دارالجزاء ہے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو عاجز قرار دیا پھر ان کو تصویر سازی کی سزا دی جائے گی جو دنیا میں تصویر کھینچتے تھے۔

دلیل کا جواب

اور ”اَنْبِئُونِي بِاسْمَاءِ هَؤُلَاءِ“ سے تکلیف مراد نہیں اس لیے کہ تکلیف موجب عقاب ہے اور یہاں اس کے برخلاف ہے بلکہ مقصود اظہار عجز ہے۔

دلیل کا جواب

اور ”اِنْتِيَا طَوْعًا وَ كَرْهًا“ والی دلیل کا جواب یہ ہے کہ یہ خطاب نہیں ہے اس لیے کہ ہمارے (اہل سنت) کے نزدیک معدوم کو خطاب نہیں کیا جاتا بلکہ یہ ایجاد و انشاء سے خبر دینا ہے اور حدوث کی اطلاع بہم پہنچانا ہے اور لفظ خطاب سے اعلان مراد لیا تو اعتراض لازم نہ آیا۔ دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا“ (البقرہ: ۲۸۶) یعنی بغیر طاقت اللہ تکلیف نہیں دیتا اور اسی طرح ارشاد فرمایا کہ ”فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ“ (التغابن: ۱۶) استطاعت اور ہمت و طاقت کے مطابق خدا سے ڈرتے رہو۔

اور نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں پر وہ بوجھ رکھا ہے جس کی وہ طاقت رکھتے ہیں اور جس کی وہ طاقت نہیں رکھتے اللہ تعالیٰ نے ان پر (وہ بوجھ) نہیں رکھا۔

نیز حضور اکرم ﷺ سے مروی ہے کہ جس سے طاقت سلب کر لی گئی اس سے اطاعت اٹھالی گئی ہے اور اس لیے کہ تکلیف دینے کی غرض مکلف بہ (جس چیز کی تکلیف دی گئی ہے) کا وجود میں لانا ہے اور جب مکلف میں طاقت ہی نہیں تو پھر تکلیف دینے میں کچھ فائدہ نہیں اور حکیم کا فعل حکمت سے خالی نہیں تو جب فائدہ پایا جائے گا اور وہ طاقت ہے اس فعل کے کرنے کی تو تکلیف دی جائے گی ورنہ نہیں۔

تکلیف کی قسمیں

تکلیف دو قسم پر ہے:

(۱) تکلیف الزام و ایجاب (۲) تکلیف اتیان و وجود!

اور مکلف بہ بھی چند وجوہ پر ہیں

(۱) بعض وہ ہیں جو مالا یطاق (۲) اور بعض وہ ہیں مالا یطوق (۳) اور بعض وہ ہیں جو مالا یکن (۴) اور بعض وہ ہیں جو محال ہیں (۵) اور بعض وہ ہیں جو لایجز کے زمرے میں آتے ہیں۔

اجمال کی تفصیل

اس اجمال کا بیان یہ ہے کہ تکلیف مالا یطاق یہ ہے کہ وہ شئی مکلفین کی طاقت سے باہر ہو جب کہ مکلف ایک جنس کے ہوں عادتاً تحت قدرت نہ ہو لیکن جائز ہے دوسری جنت کی حضرت مصنف نے آئندہ روزے اور حج کی مثال دی ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ تکلیف اتیان کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص کو ایک کام کرنے کا حکم یا جائے اور مقصد یہ ہو کہ وہ شخص یہ کام کرے اب اگر اس میں کام کرنے کی طاقت نہیں ہے تو اسے حکم دینا بے فائدہ ہے اور تکلیف وجوب کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص کے ذمہ ایک کام واجب اور لازم کر دیا جائے پھر اگر وہ طاقت نہیں رکھتا تو وہ اس کا متبادل پیش کر دے گا مثلاً شیخ فانی کے ذمہ روزہ حج واجب ہے وہ طاقت نہیں رکھتا تو روزے کی جگہ فدیہ دے دے اور حج کے لیے کسی شخص کی خدمت حاصل کرے۔

یہ حضرت مصنف کے زمانے کے اعتبار سے گفتگو ہے ورنہ آج تو ہوائی جہاز اور خلائی راکٹ کے ذریعے انسان کے سفر کی رفتار بہت تیز ہو گئی ہے۔

قدرت کے نیچے عادتاً داخل ہو جیسے ملائکہ اور جن اس لیے کہ پانی پر چلنا اور ہوا میں اڑنا دور دراز کے مصر (شہر) سے مکہ مکرمہ تک اور خراسان سے ہندوستان تک ایک دن میں جانا عادتاً آدمیوں میں اس کی طاقت نہیں، لیکن خلاف عادت اور نقص عادت تو وہ حجت نہیں اس لیے کہ وہ شاذ و نادر ہوتی ہے یا کرامت و معجزہ سے ہوتی ہے۔ پھر اس کی طاقت فرشتے، جن اور شیاطین رکھتے ہیں۔

پس آدمی کو پانی پر چلنا یا ہوا میں اڑنے کی تکلیف دینا جائز نہیں اس لیے کہ یہ شخص یا اس کا ہم جنس عادتاً قادر نہیں تو تکلیف دینے کا فائدہ نہ ہوگا کسی وجہ سے تکلیف دینا جائز نہیں نہ ایجاب و الزام کی جہت سے اور نہ ہی اتیان و وجود کے پہلو سے تکلیف دینا جائز ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے ہم کہیں کہ مریض اور شیخ فانی (انتہائی کمزور بوڑھا) روزہ رکھنے اور حج کے لیے مکہ معظمہ تک چلنے کی طاقت نہیں رکھتے، لیکن خطاب ایجاب و الزام ان کی طرف بھی متوجہ ہوگا یہاں تک کہ ان پر روزہ اور حج واجب ہے اور ادا کرنے کی تکلیف نہیں دی جائے گی، محض اس توہم کے باعث کہ کہیں ہلاکت کا شکار نہ ہو جائیں۔

مالا یمکن (ناممکن) سے مراد؟

مالا یمکن یہ ہے کہ اس کا وجود اللہ تعالیٰ کی قدرت سے دنیا میں متصور ہے، لیکن انسانی عادت سے عادتاً خارج ہے، جیسے آدمی کا اڑنا اور انشقاق قمر (چاند کے ٹکڑے کرنا) اللہ تعالیٰ کی قدرت سے ہو سکتا ہے، لیکن مخلوق کی قدرت سے خارج ہے۔

اور ایسے ہی تکلیف علی ما یتستحیل وہ یہ ہے کہ اس کا وجود من کل الوجوہ محال ہو۔ طعام کے وجود کے بغیر طعمہ (ذائقہ) کا پایا جانا اور جوہر کے وجود کے بغیر عرض کا پایا جانا محال ہے، ایسے ہی اللہ تعالیٰ سبحانہ کے لیے اثبات محال ہے تو بہر حال تکلیف اور ان دونوں معنی کے لحاظ سے جائز نہیں۔

اور تکلیف مالا یجوز وہ تکلیف دینا ہے معصیت پر کہ یہ شخص کر سکتا ہے اور اس کا وجود متصور ہو سکتا ہے، لیکن شریعت میں ممنوع اور منہی عنہ ہے تو اس کی تکلیف جائز نہیں، خواہ وہ ایجاب و الزام کی جہت سے ہو اور چاہے اتیان و وجود کے پہلو سے، کسی طرح سے جائز نہیں ہے۔ اس لیے کہ اگر معصیت کا ارتکاب کیا تو ممنوع نہیں ہے اور نہ مکلف ہوگا، بتکلیف

استطاعت اس معصیت کے وقت بغیر تکلیف و تسلیط کے تو بمقتضائے حکمت جائز ہے باوجود ان دونوں سے نہی وارد ہونے کے۔

دوسرا قول

زجر و امتناع (ڈانٹنے اور منع کرنے) کا بیان

جاننا چاہیے کہ زجر و تحریم اور منع درحقیقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں اور اللہ تعالیٰ ہی تحریم کو واجب کرتا ہے اور جو مباح قرار دے اور بلا عذر اور بغیر شبہ کے حلال جانے وہ کافر ہو جائے گا۔

روافض اور جہمیہ کہتے ہیں: ”تحریم“ کراہت کے معنی میں ہے اور زجر و حرمت کے معنی میں ہے۔

اور بعض نے کہا کہ جو چیز عین نص سے ثابت ہوگی تو وہ تحریم کی موجب ہے اور اس کے علاوہ دلالت، اشارت، تاویل اور مقتضی و قیاس سے جو ثابت ہوں گی وہ تحریم کو واجب نہیں کریں گی۔ اسی معنی کے لحاظ سے انہوں نے کہا کہ خمر (شراب) اور لواطت (بد فعلی) اور متعہ حلال ہے اور گانا بجانا، رقص و سرود اور شعر و شاعری حلال ہیں اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں صریحاً حرام نہیں فرمایا، کیونکہ قرآن پاک میں ”اجتنبوا“ ہے اور اجتناب کراہت پر دلالت کرتا ہے اور ایسے ہی لواطت (غیر فطری فعل) کو منکر کے نام سے بیان فرمایا۔

جواب: یہ ہے کہ خمر (شراب) کے حرام ہونے کی دلیل یہ ہے: ”إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ

..... رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ“ (المائدہ: ۹۰) بے شک شراب اور جوا۔۔۔۔۔

پلید ہیں اور شیطان کا عمل ہے۔ عمل شیطان حرام ہے اور ہر ”رجس“ حرام ہوتا ہے

اس دلیل سے کہ فرمایا: ”وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ“ (الاعراف: ۱۵۷) اور وہ ان پر

ناپاک چیزیں حرام فرماتا ہے۔

اور ”فاجتنبوا“ امر ہے اجتناب کے لیے اور اجتناب محض قبیح باتوں سے ہوتا ہے

اور فرمایا: ”فِيهِمَا اِثْمٌ كَبِيْرٌ“ (البقرہ: ۲۱۹) ان دونوں میں بڑا گناہ ہے۔ اور ”اِثْمٌ“ (گناہ) اور محرّمات (حرام شدہ) میں ہوتا ہے تو ثابت ہوا کہ حرام قطعی ہے جو حلال جانے وہ کافر ہو جائے گا اور حضور اقدس نے فرمایا: شراب بعینہ حرام کی گنی ہے تھوڑی ہو یا زیادہ اور ہرنشہ آور شراب حرام ہے حضور اقدس نے فرمایا: ”کل مسکر حرام و کل خمر حرام“ ہرنشہ آور حرام اور ہر خمر حرام ہے۔

اور ایسے ہی لواطت (بد فعلی) حرام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”اَتَاتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ“ (الاعراف: ۸۰) کیا تم وہ برائی کرتے ہو جو تم سے پہلے کسی نے نہ کی۔ اس کا نام فاحشہ رکھا پھر خبر دی کہ فواحش (بے حیائی کے کام) حرام ہیں دلیل یہ ہے: ”قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّي الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطْنٌ“ (الاعراف: ۳۳) آپ فرمادیتے تھے کہ میرے رب نے فواحش (بے حیائی کے کاموں) کو حرام کیا جو ظاہر ہیں اور جو باطن ہیں۔

لعنتی کون؟

اور نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ فرمایا: جو شخص ماں اور بیٹی کو نکاح اور ملک یمین میں جمع کرے وہ ملعون اور جو کسی کے زمین کے نشانات مٹائے وہ ملعون ہے جو جانور سے بد فعلی کرے وہ ملعون ہے اور جو قوم لوط کا عمل کرے وہ ملعون (لعنتی) ہے۔

لواطت کی حرمت اور سزا

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: فاعل اور مفعول بہ (بد فعلی کرنے والا اور بد فعلی کروانے والے) دونوں کو قتل کر دو۔ ثابت ہوا کہ لواطت (غیر فطری کام) حرام ہے اور جو حلال سمجھے کافر ہے۔

متعہ کی حرمت اور اس کا حکم

متعہ پہلے مباح تھا پھر خیبر میں گدھا اور ”متعہ“ حرام کر دیئے گئے اور ان کے منسوخ ہونے پر امت کا اجماع ہے اور جو متعہ کو حلال جانے کافر ہے۔

ناج گانے کا شرعی حکم

لہو و لعب (کھیل کود) رقص و سرور اور شعر و شاعری کو مباح سمجھنے والا فاسق ہے کافر نہیں۔ اس لیے کہ اس کی حرمت خبر آحاد سے ثابت ہے اور جو نہی نص یا دلالت النص اور خبر متواتر یا اجماع امت سے وارد ہو تو وہ لامحالہ موجب حرمت ہے اور اس کے وارد ہونے سے سابقہ احکام منسوخ ہوں گے اور جو اس کا منکر ہو وہ کافر ہے۔

خبر واحد اور قیاس کا حکم

اور جو خبر واحد اور قیاس کے حجت ہونے کا انکار کرے کافر ہے اور اگر یوں کہے کہ یہ خبر غیر صحیح ہے یا یہ قیاس غیر ثابت ہے تو کافر تو نہ ہو گا فاسق ہے اور اگر کوئی حکم قیاس سے یا خبر واحد سے ثابت ہو اور امت متفقہ طور پر اجماع کرے اور کوئی اختلاف نہ کرے تو یہ اجماع ہو گیا جو اجماع کا انکار کرے تو کافر ہو جائے گا۔

تیسرا قول

حدود و کفارات کا بیان

اہل سنت و جماعت فرماتے ہیں کہ حدود و کفارات تطہیر ہے (اس سے گناہوں سے پاک ہو جاتا ہے) اور اس کے عمل کی جزاء ہے اور اس کے کر تو توں کا کفارہ ہے اسی طرح جب بندہ کو تکلیف اور رنج و آلام پہنچتے ہیں تو وہ گناہوں کا کفارہ ہو جاتے ہیں یا کثرتِ ثواب ترقی درجات کا باعث ہوتے ہیں۔

معتزلہ اور روافض نے انکار کیا اس لیے کہ انہوں نے کہا کہ حدود و کفارات زجر و توبیخ کے لیے مشروع ہوئے ہیں کہ قبائح اور سیئات سے رکیں رنج و محن آلام و مصائب اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں اس لیے کہ دنیا دار الجزاء اور ثواب کا گھر نہیں جو ب ثواب کا سبب وہ اطاعت ہے اور ثواب آخرت میں ملے گا اور ایسے ہی تکفیر عقوبت سے ہوگی اور عقوبت آخرت میں ہوگی اور حدود و کفارات زجر و منع کے لیے مشروع ہیں اور اس کے علاوہ تکالیف اور مصائب و آلام وغیرہ خدا کی طرف سے نہیں۔

اہل سنت و جماعت نے کہا: رنج و محن، آلام و امراض سب کچھ خدا کی طرف سے ہوتے ہیں اور گناہوں کا کفارہ ہو جاتے ہیں اور اس کے عملوں کی جزاء اور انعام و اجر ہے اور یہ بدل سے خالی نہیں اس لیے کہ انبیاء علیہم السلام کو رنج و محن، تکالیف و مصائب پہنچے ان کے حق نہیں، عقوبت نہیں تو ثابت ہوا کہ ثواب و ترقی مدارج کے لیے ہیں اور آخرت میں اجر و ثواب ملے گا اور یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عدل ہے لیکن حدود و کفارات جزاء عمل ہے اور گناہوں سے پاک ہونے کا ذریعہ ہے، دلیل یہ ہے: "السَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوا أَيْدِيَهُمَا جِزَاءً بِمَا كَتَبْنَا نَكَالًا مِّنَ اللَّهِ" (المائدہ: ۳۸) چور مرد اور عورت دونوں کے ہاتھ کاٹ دو، یہ ان کے عمل کی جزاء ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے عبرت ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ یہ ان کے عملوں کی جزاء ہے۔

اور مروی ہے کہ ایک عورت حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کرنے لگی: یا رسول اللہ ﷺ! میں نے زنا کیا ہے مجھے پاک کر دیجئے۔ جب چار مرتبہ اس نے اقرار شرعی کیا تو آپ نے سنگساری کا حکم دے دیا اور یہ نہیں فرمایا کہ رجم گناہوں سے پاک کرنے والا نہیں ہے تو ثابت ہوا کہ حد مطہر الذنوب (گناہوں سے پاک کرنے والی) ہے۔ اور نیز حضور ﷺ نے فرمایا: تلوار گناہ مٹانے والی ہے۔

اور فرمایا حضور ﷺ نے: جب کبھی مؤمن کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو گناہوں کا کفارہ ہو جاتا ہے یہاں تک کہ لقمہ اس کے منہ میں پھنس جائے اور ایک روایت میں ہے کہ کانٹا چھبے۔ اور فرمایا: "الموت كفارة" موت کفارہ ہے۔ حضور انور ﷺ کا ارشاد ہے کہ موت ہر مسلمان کے لیے کفارہ ہے تو ثابت ہوا کہ حدود و کفارات گناہوں کا کفارہ ہیں اور ثواب و جزاء کا موجب ہیں۔

چوتھا قول

توبہ اور استعاذہ کا بیان

اہل سنت و جماعت فرماتے ہیں کہ بندے کی توبہ ہر گناہ سے جو اس سے سرزد ہوا ہو،

چاہے جان کر یا بھول کر قبول ہوتی ہے اور دعا، صدقہ اور استعاذہ (پناہ مانگنا) دنیا میں نفع مند ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ توبہ ہر گناہ کے لیے شرط ہے اور گناہ کو یاد کیے بغیر توبہ کرنا صحیح نہیں۔ اور بعض نے کہا کہ تمام گناہوں سے توبہ کرنا شرط ہے تب اس کی توبہ صحیح ہوگی۔

معتزلہ کے نزدیک توبہ کا مفہوم

معتزلہ کہتے ہیں کہ توبہ یہی ہے کہ اللہ عزوجل پر ایمان لائے اس لیے کہ ان کے نزدیک توبہ گناہ کبیرہ سے ہے اور بندہ ارتکاب کبیرہ سے ایمان سے نکل جاتا ہے تو اس کی توبہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے۔

دعا و صدقہ وغیرہ دنیا میں بے سود ہیں؟

معتزلہ کہتے ہیں کہ دعا، صدقہ اور استعاذہ دنیا میں نفع نہیں دیتے اس لیے کہ دعا و صدقہ اگر کسی خیر کے لیے کیے ہیں تو خیر قضاء الہی سے ہوتی ہے تو اگر خیر کا سوال کیا تو یہ اللہ کی قضاء کے موافق ہوگی سوال کرے یا نہ کرے خیر تو بقضاء اللہ ہوتی ہی ہے اور اگر وہ دعا موافق قضاء نہیں تو وہ دعا نفع نہ دے گی اور قضاء الہی کو نہیں بدلے گی۔

اور اگر دعا و استعاذہ شر سے ہے تو یہ اللہ کی طرف سے نہیں بلکہ شر سب بندہ کی طرف سے ہے اور بندہ ایک پہلو سے صاحب استطاعت بنایا گیا ہے تو یہ جہد و تقصیر کوشش اور کوتاہی بندے کی طرف سے ہے۔

صدقہ و خیرات کے متعلق معتزلہ کا مسلک

معتزلہ کے نزدیک زندوں کی طرف سے دیئے گئے صدقات و خیرات کا مردوں کو کوئی نفع نہیں پہنچتا۔ معتزلہ دلیل دیتے ہیں کہ ”کل نفس مرہونہ بما کسبت“ ہر جان اپنے اعمال کی مرہون اور پابند ہے جیسا کمائے گی ویسا پائے گی۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ”جز آء بما كانوا يعملون“ تو قیامت میں جو کام کیا ہے اس کا بدلہ دیا جائے گا اور غیر نے جو کام کیا ہے اس کا بدلہ اس کو نہیں ملے گا۔

تو دعا، خیرات و صدقات دوسرے کا عمل ہے لہذا غیر کے عمل کا اس کو نفع نہیں پہنچتا۔

اور اسی طرح ”لا حول ولا قوۃ الا باللہ العلیٰ العظیم“ نہیں کوئی نیکی کی توفیق اور برائی سے بچنے کی طاقت سوائے اللہ تعالیٰ بلند و برتر کے کے منکر ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ لوگوں کے منہ میں شیطان نے ڈال دیا ہے اور یہ کفر ہے اس لیے کہ جو شخص ”حسول و قوت“ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں سمجھتا وہ کافر ہے۔

”لا حول ولا قوۃ“ کی زبان رسالت سے تفسیر

اور نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ ”لا حول ولا قوۃ“ کی تفسیر دریافت کی تو فرمایا: ”لا عصمة من معصية الا بعصمة الله“ کہ اللہ تعالیٰ کی حفاظت و عصمت کے بغیر کوئی معصیت سے محفوظ نہیں رہ سکتا اور طاعت و عبادت کی قدرت اللہ تعالیٰ کی اعانت و امداد کے بغیر نہیں ہو سکتی۔

مسئلہ قدر اور امام زفر

حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سامنے امام زفر رحمہ اللہ تعالیٰ کا تذکرہ کیا گیا کہ وہ ”قدر“ کی طرف مائل ہیں۔ اتنے میں امام زفر مسجد میں داخل ہوئے اور فرمایا: ”لا حول ولا قوۃ الا باللہ العلیٰ العظیم“ نہیں کوئی نیکی کی توفیق اور برائی سے بچنے کی طاقت سوائے اللہ تعالیٰ بلند و برتر کے تو امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ زفر قدر کو دیکھتا ہے (یعنی ان کا عقیدہ قدر کے بارے میں درست ہے وہ مانتا ہے)۔

اہل سنت و جماعت کی حجت و دلیل اس مسئلہ میں کہ ایک توبہ تمام گناہوں کے لیے کافی ہے۔ جان بوجھ کر دانستہ طور پر کیے ہوں یا بھول کر سب کے لیے ایک ہی توبہ کافی ہے۔

ایک توبہ سب گناہوں کے لیے کافی ہے

ہر ایک گناہ کے لیے علیحدہ علیحدہ توبہ کرنا شرط نہیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”توبوا الی اللہ جمیعاً“ (المؤمنون: ۳۱) توبہ کرو اللہ تعالیٰ سے سب کے سب اور یہ نہیں فرمایا: جدا جدا گناہوں کی توبہ کرو۔ ایک دوسری جگہ اللہ جل مجدہ نے فرمایا: ”ثم توبوا الیہ“ (سورہ: ۵۲) اس کی طرف رجوع کرو۔ نیز فرمایا: ”غافر الذنب وقابل التوب“ (الغافر: ۳) گناہ بخشنے والا اور توبہ قبول کرنے والا۔ توبہ کا مطلقاً حکم فرمایا اور یہ شرط نہیں کہ تمام گناہوں کو یاد کر کے توبہ

کرو۔

توبہ کی خوبصورت اور جامع تفسیر

حضور اقدس ﷺ نے فرمایا: ”الندم توبۃ“ پشیمان ہونا توبہ ہے اور یہاں بھی گناہوں کی تفصیل کی شرط نہیں تو صحیح یہی ہے۔

دعا اور صدقہ کے دنیوی فوائد

دعا استعاذہ اور صدقہ دنیا میں بھی نفع دیتے ہیں۔ حضور نبی کریم ﷺ سے مروی ہے: ”الدعا یرد البلاء“ دعا بلا کو رد کرتی ہے۔

”والصدقة تطفی غضب الرب“ صدقہ اللہ کے غضب کو بجھاتا ہے (ٹھنڈا کرتا ہے)۔ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا: ”لو لا المشائخ الركع والصبيان الرضع والبهائم الرتع لصب عليكم العذاب صبا“ یعنی فرمایا: اگر بوڑھے عمر رسیدہ نمازی نہ ہوتے شیر خوار بچے نہ ہوتے اور چرنے والے چوپائے نہ ہوتے تو تم پر عذاب کی زوردار بارش ہوتی مگر ان کے طفیل تم بچے ہوئے ہو۔

زندوں کی دعا مردوں کو نفع دیتی ہے

زندوں کی دعا اور صدقات مردوں کو نفع دیتے ہیں۔ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب عالم یا طالب علم کسی گاؤں سے گزرتا ہے تو اس بستی کے قبرستان سے اللہ تعالیٰ چالیس دن کے لیے عذاب دور فرما دیتا ہے۔

نیز حضور اکرم ﷺ نے دو قبروں پر کھجور کی ہری بھری تر و تازہ شاخیں رکھیں اور فرمایا: جب تک یہ ٹہنیاں خشک نہ ہوں گی اللہ تعالیٰ ان قبر والوں کے عذاب میں تخفیف فرما دے گا ان کا عذاب ہلکا ہو جائے گا۔

حضور ﷺ نے عالم خواب میں مصنف ابوشکور سالمی کو تعلیم فرمائی

المہتدی ابوشکور سالمی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور پر نور سید عالم ﷺ

۱۔ کہ تمام گناہوں کے لیے ایک مرتبہ توبہ ہی کافی ہے خواہ ایسے گناہ یاد ہوں یا بھول چکے ہوں۔

کو خواب میں دیکھا کہ آپ ”حظیرہ مشبک“ میں جلوہ افروز ہیں اور کثرتِ نور اور وفورِ ضیاء کی وجہ سے میں (یعنی انوار و تجلیات کی فراوانی کی وجہ سے) صرف چہرہ انور کو دیکھ پایا تو میں نے سنا: حضور پر نور ﷺ فرماتے ہیں کہ جس نے ہر جمعہ کو دو من (دوسیر) روٹی یا دو درہم صدقہ کیے (راوی کو شک ہے کہ روٹی فرمایا یا درہم، غالب گمان یہی ہے) تو اللہ تعالیٰ اس کے ماں باپ کو قبر میں عذاب نہیں دے گا۔ یہ دلیل ہے کہ عذابِ قبر حق ہے اور دلیل ہے کہ صدقات اور زندوں کی دُعا مردوں کو نفع دیتے ہیں۔ واللہ اعلم

پانچواں قول

سعادت و شقاوت کا بیان

اہل سنت و جماعت کے بعض فقہاء کرام نے فرمایا: شقی (بد بخت) سعید (نیک بخت) ہو سکتا ہے اور سعید شقی ہو سکتا ہے۔ یہی قول حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ہے۔

اور بعض فقہاء فرماتے ہیں کہ سعید (نیک بخت) شقی نہیں ہو سکتا اور شقی سعید نہیں ہو سکتا ہے اور یہ قول عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما اور مجاہد کا ہے۔ یہی اختلاف اجل (عمر) اور رزق کے متعلق ہے۔

بعض نے کہا: رزق اور اجل (مدتِ حیات) میں کمی و بیشی ہو سکتی ہے۔

اور بعض نے کہا: رزق اور عمر میں کم و بیش ہونے کا امکان نہیں ہے۔

حاصل اختلاف یہ ہے کہ زیادتی و نقصان (کمی) اور احکام میں تغیر عند الخلق ظاہر ہوتا ہے اور مخلوق کے علم میں، لیکن اللہ تعالیٰ کے علم میں اور اس کے نزدیک تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔

رأس المفسرین محمد بن فضل نے فرمایا کہ لوح محفوظ میں یہ لکھا ہوا ہے کہ فلاں سعید ہے

اگر میں چاہوں اور فلاں شقی ہے اگر میں چاہوں۔

اور بعض فقہاء نے فرمایا کہ قضاء کی دو قسمیں ہیں۔

تقدیر کی اقسام

قضاء معلق اور قضاء مبرم۔

قضاء مبرم میں تغیر و تبدل جائز نہیں، جیسے وحی، نبوت اور انبیاء کرام علیہم السلام کی سعادت ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "لَا تَبْدِيلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ" (یونس: ۶۳) اللہ تعالیٰ کے کلمات تبدیل نہیں ہوتے۔

اور قضاء معلق میں تغیر و تبدل جائز ہے، جیسے مرض و شفاء، نیند، گفتگو اور تمام افعال و احوال عبادت کہ اس میں تغیر و تبدل جائز ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "يَمْحُو اللَّهُ مَا يَشَاءُ وَيُثَبِّتُ" (الرعد: ۳۹) اللہ تعالیٰ جو چاہتا مٹاتا اور ثابت کرتا ہے۔ یہ چاروں مسائل حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نزدیک قضاء معلق سے ہیں اور عبداللہ بن عباس اور مجاہد رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے نزدیک قضاء مبرم میں داخل ہیں۔

خلیفہ دوم حضرت امیر المؤمنین عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے اپنی دعا میں کہا: الہی اگر تو نے ام الكتاب میں مجھ کو شقی لکھا ہے تو اسم شقاوت مجھ سے مٹا دے اور مجھ کو سعید (نیک بخت) لکھ دے اس لیے کہ تو نے فرمایا کہ جس کو چاہے مٹائے اور جس کو چاہے ثابت رکھے۔

والدین سے نیکی کرنے اور تبلیغ دین کرنے سے تقدیر بدل جاتی ہے

فرمان رسول

اور حضرت شیر خدا علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ الکریم سے مروی ہے کہ انہوں نے حضور پر نور ﷺ سے دریافت کیا: "يَمْحُو اللَّهُ مَا يَشَاءُ" سے کیا مراد ہے؟ اور "يُثَبِّتُ" سے کیا مراد ہے؟ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ شقاوت و بدبختی کو مٹا دیتا ہے، مثلاً ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنے سے صدقہ دینے سے اور بھلائی کا حکم کرنے سے اللہ تعالیٰ شقاوت کو مٹا دیتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس و مجاہد رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے دلائل

حضرت ابن عباس اور مجاہد رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی دلیل یہ حدیث ہے 'عبداللہ بن مسعود نبی کریم ﷺ سے راوی ہیں' فرمایا: سعید (نیک بخت) وہ ہے جو ماں کے پیٹ میں سعید (نیک بخت) ہوا اور شقی (بد بخت) وہ ہے جو ماں کے پیٹ میں شقی ہوا۔ نیز حضور سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے حضرت یحییٰ علیہ السلام کو ان کی ماں کے پیٹ میں مؤمن سعید نبی پیدا کیا اور فرعون کو اس کی ماں کے پیٹ میں شقی کافر پیدا کیا اور نیز حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضور نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے جنت کو پیدا کیا اور اس کے لیے جنتی پیدا کیے اور دوزخ کو پیدا کیا اور اس کے لیے دوزخی پیدا کیے۔

ایک اجمال کا بیان

اور یہ جو ہم نے بیان کیا کہ زیادت و نقصان اور تغیر و تبدل بندوں کے نزدیک اور بندوں کے علم میں ہوتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کے نزدیک اور اس کے علم میں زیادت و نقصان اور تغیر و تبدل نہیں ہوتا تو اس اجمال کا بیان یہ ہے کہ ایک شخص دیوار کے نیچے بیٹھا یا مکان میں بیٹھا تھا اور دیوار یا مکان گرا اور یہ شخص دب کر مر گیا تو بندوں کے نزدیک اور بندوں کے علم میں تو یہ ہے کہ اگر یہ شخص دیوار یا مکان کے نیچے نہ بیٹھا تو امید تھی کہ دیر تک زندہ رہتا یا کسی نے قصداً کسی انسان کو قتل کر دیا اور وہ قصاص میں قتل کیا گیا تو اگر وہ قتل نہ کرتا تو وہ قتل نہ کیا جاتا اور بظاہر وہ عرصہ دراز تک زندہ رہتا اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: "وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ" (البقرہ: ۱۷۹) اے عقل مندو! تمہارے لیے قصاص میں زندگی ہے تو یہ قضاء معلق کی صفت ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کے علم میں زیادت و نقصان (زیادتی و کمی) تغیر و تبدل (تبدیلی) ممکن نہیں کیونکہ وہاں سہو و نسیان اور غلطی کا امکان ہی نہیں ہے اور اس لیے کہ اللہ تعالیٰ تمام اشیاء کو جانتا ہے، جیسی وہ ہیں تو وہ جانتا ہے اس کی موت کا وقت اور اس کی کیفیت تو اپنے علم کے مطابق کرتا ہے۔

اور ایسی ہی رزق، سعادت و شقاوت اس لیے کہ ارادہ و قضاء، علم کے مقتضیات میں سے ہیں تو جب اس کے علم میں ہے کہ فلاں شئی نے ہونا ہے فلاں وقت میں فلاں دن میں فلاں کیفیت کے ساتھ اور اس کی مقدار یہ ہوگی تو وہ اپنے علم کے مطابق ارادہ کرتا ہے اور فیصلہ

فرماتا ہے اس لیے کہ اس کا ارادہ اور قضاء (فیصلہ) اس کے علم کے خلاف نہیں ہو سکتے۔ اور جس نے یہ کہا کہ سعید شقی اور شقی سعید ہو سکتا ہے تو وہ بندوں کے نزدیک اور ان کے علم میں اس لیے کہ کافر لامحالہ شقی ہے مگر جب وہ مسلمان ہو گیا تو ہم کہتے ہیں کہ وہ لامحالہ مسلمان و سعید ہے مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ کے ارادہ پر موقوف ہے کہ انجام کیا ہوگا؟ اس لیے کہ ہم کسی مسلمان کو یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ قطعی جنتی ہے اور کافر کو یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ قطعی جہنمی ہے اس لیے کہ ہمیں خاتمہ اور انجام کی خبر نہیں مگر یہ کہیں گے: جو مسلمان مرا وہ جنت میں ہوگا اور جو کافر مرا وہ جہنم میں ہوگا۔

جبریہ کا مسلک

جبریوں نے کہا کہ مؤمن ایمان پر مجبور ہے اور کافر کفر پر مجبور ہے اور ابلیس جس وقت اسلام لایا اور خدا کی عبادت کی تو اس وقت بھی وہ کافر تھا اور ابو بکر و عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما جس وقت اسلام نہیں لائے تھے تب بھی وہ مسلمان تھے۔

دلیل یہ ہے: ”هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَمِنْكُمْ مُؤْمِنٌ“ (التغابن: ۲) وہ وہی ذات ہے جس نے تم کو پیدا کیا تو تم میں سے کوئی کافر ہے اور کوئی مسلمان اور فرمایا: ”وَلَا يَلِدُوا إِلَّا فِاجِرًا كَفَّارًا“ (نوح: ۲۷) اور وہ بدکار اور بڑی ناشکری اولاد جنیں گے۔

جبریہ کے ان آیات محولہ بالا سے استدلال کا جواب دیتے ہوئے ہم کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا کیا جب بھی کیا اشخاص و اعیان کی صورت میں ہم یہ نہیں کہتے کہ وہ مؤمن تھے یا کافر تھے مگر انبیاء کرام علیہم السلام کے حق میں یہ کہیں گے کہ وہ مؤمن ہی پیدا ہوئے پھر جو مخلوق میں سے ایمان لایا تو ان کے اعتقاد و اقرار کے ساتھ ایمان بھی پیدا کیا گیا اور ان میں سے جو کافر ہوا تو ان کے اعتقاد و عمل و قول کے ساتھ کفر بھی پیدا کیا گیا اور اگر ایک بھی کفر نہ کرتا تو اللہ تعالیٰ کفر کو پیدا نہ فرماتا۔

لیکن اللہ تعالیٰ کا فرمان ”فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَمِنْكُمْ مُؤْمِنٌ“ تو ہم کہتے ہیں کہ یہ آیت ہمارے لیے حجت ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ“ پھر فرمایا: ”فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَمِنْكُمْ مُؤْمِنٌ يَعْنِي مَنْكُم مِّنْ بَصِيرٍ كَافِرًا وَمِنْكُمْ مِّنْ بَصِيرٍ مُّؤْمِنًا“ یہ کہ اللہ نے فرمایا: وہ وہ ذات مقدس ہے جس نے تم کو پیدا کیا اور پھر تم میں سے کچھ کافر ہو

گئے اور تم میں سے کچھ مؤمن ہو گئے۔

اور ”وَلَا يَلِدُوا إِلَّا فَاَجْرًا كُفَّارًا“ کے معنی بھی یہ ہیں کہ عنقریب فاجر و کفار ہو جائیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کافر ہی پیدا ہوں اپنے ماں باپ کے تابع قرار دے کر حکماً انہیں کافر فرمایا۔

موت ایک ہے یا زیادہ؟

بعض معتزلہ کہتے ہیں کہ اجل ہے کیونکہ انسان قتل کیا جائے یا بغیر معالجہ کے مر جائے تو وہ بغیر اجل (موت) کے مرتا ہے۔

اہل سنت و جماعت فرماتے ہیں کہ جو شخص بغیر معالجہ کے مرتا ہے یا قتل ہو جاتا ہے خواہ کسی بھی وجہ سے قتل کیا جائے یہی اس کی اجل (موت) ہے۔

دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ”إِذَا جَاءَ أَجْلُهُمْ لَا يَسْتَأْجِرُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ“ (الاعراف: ۳۳) یعنی جب ان کی اجل (موت) آتی ہے تو نہ ایک ساعت آگے ہونہ پیچھے ہو۔ نیز اللہ جل مجدہ فرماتا ہے: ”تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَهُمْ لَا يُفِرُّونَ“ (الانعام: ۶۱) ہمارے فرشتوں نے اس کو وفات دی اور وہ روح قبض کرنے میں کوتاہی نہیں کرتے اور فرمایا: اور اس لیے کہ اللہ تعالیٰ حقیقتاً جانتا ہے اس کی اجل (موت) کو تو یہ محال ہے کہ اس کے خلاف ہو پھر یہ بھی ناممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قضاء اس کے علم کے خلاف ہو جیسا کہ ہم کہہ آئے ہیں اور معتزلہ کہتے ہیں کہ بقضاء اللہ نہیں اور یہ کفر ہے۔

معتزلہ کی طرف سے اعتراضات اور ان کے جوابات

اگر کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”ثُمَّ قَضَىٰ أَجَلًا وَأَجَلٌ مُّسَمًّى عِنْدَهُ“ (الانعام: ۲) پھر ایک مدت کا فیصلہ فرمایا اور ایک مقررہ مدت اس کے ہاں ہے اور اس لیے کہ اگر مقتول قتل نہ ہوتا تو آیا زندہ رہتا یا اسی وقت اچانک (طبعی موت) مر جاتا؟

ہم نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ”ثُمَّ قَضَىٰ أَجَلًا“ یعنی پیدا کیا جائے گا یہاں تک کہ مرے اور ”أَجَلٌ مُّسَمًّى عِنْدَهُ“ کے معنی ہیں: جب بھی مرے یہاں تک کہ اٹھایا جائے اور ان کا یہ کہنا کہ مقتول اگر قتل نہیں کیا جاتا تو کیا وہ زندہ رہتا یا مر جاتا؟

ہم کہتے ہیں کہ اگر اللہ کے علم میں یہ ہے کہ اس کی اجل (موت) قتل سے ہے تو اس

کے خلاف نہیں ہو سکتا اور اگر اللہ جانتا تھا کہ وہ قتل نہیں کیا جائے گا تو ایسا ہی ہوگا اور خلاف اس مسئلہ موت میں اور مسئلہ رزق میں برابر ہے۔

حرام کو رزق کہا جائے گا یا نہیں؟

معتزلہ کے نزدیک حرام رزق نہیں ہے اور حرام کا کھانا اللہ تعالیٰ کا رزق کھانا نہیں اس لیے کہ حرام اللہ تعالیٰ کی قضاء سے نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف اور اس کی قضاء سے ہوتا تو ملک حلال ہونا چاہیے تھے اور حرام ملک نہیں تو رزق بھی نہ ہوا۔

اہل سنت و جماعت فرماتے ہیں: رزق تو غذا ہے اور غذا حلال ہو یا حرام دونوں برابر ہیں غذا ہونے میں دونوں کا ایک حکم ہے۔

دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَعِيشَتَهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا" (الزخرف: ۳۲) ہم ان کی معیشت کو ان کی جیتی دنیا میں ان کے درمیان بانٹ دیتے ہیں اور فرمایا: "فَوَرَبِّ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ إِنَّهُ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَا أَنَّكُمْ تَنْطِقُونَ" (الذاریات: ۲۳) پس قسم ہے آسمان و زمین کے رب کی! بے شک وہ حق ہے جیسے تم بولتے ہو اور اگر رزق کے لیے ملک ہونا ضروری ہوتا تو حیوانات (جاندار) بہائم (چارپائے) طیور (پرندے) اللہ تعالیٰ کا رزق کھاتے ہیں حالانکہ وہ مالک نہیں ہیں نہ وہ ملکیت کے اہل ہی ہیں۔

اور جس نے کہا کہ حرام قضاء الہی سے نہیں ہے تو (اس شخص کے مذہب پر) پھر دوسرے قاضی کی حاجت ہوگی اور یہ (اللہ کے سوا کسی دوسرے کو تقدیر کا مالک ماننا) کفر ہے۔

مفروغیہ کا مذہب

اور بعض کہتے ہیں اور وہ مفروغیہ فرقہ ہے کہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی قضاء سے ہے طرفہ العین کے برابر نہ زائد ہونہ کم (یعنی اس میں ذرہ برابر کمی و بیشی ممکن نہیں) مگر اللہ تعالیٰ نے تمام چیزوں کو پیدا کیا اور ان کے ظاہر و باطن سب چیزوں کا اندازہ کر دیا یہاں تک کہ درختوں کے پھل پھول قیامت تک جو ہونا تھا وہ سب پیدا کر کے فارغ ہو گیا اور اب کچھ باقی نہیں ہے کہ پیدا کرے اب وہ پیدا کرنے سے فارغ ہے اور قضاء و قدر سے بھی فارغ۔ دلیل یہ ہے کہ "هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا" (البقرہ: ۲۹) یعنی وہ وہ ہے

جس نے تمہارے لیے پیدا کیا جو آسمان و زمین میں ہے اکٹھا (یعنی سب کچھ ایک دم پیدا کر دیا)۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اشیاء کو ظہور سے قبل پیدا نہیں کیا ہاں! جانتا اور ارادہ فرماتا ہے اور ہر چیز کی قضاء و قدر یعنی ان کا اندازہ اور فیصلہ فرماتا ہے اور ہر چیز کے لیے اس کی خوراک و روزی مقدر فرمادی اور پیدا کیا جب بھی پیدا کیا۔

دلیل یہ ہے کہ ”كُلُّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ“ (الرحمن: ۲۹) ہر دن وہ کام میں ہے۔

امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ سے دریافت کیا کہ ”كُلُّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ“ کے کیا معنی ہے؟ اور حالانکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ”هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا“۔ امام جعفر صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: اس کی شان یہ ہے کہ مقادیر کو موافقت پر چلاتا ہے (یعنی جو کچھ جس وقت میں ہونا مقدر ہو چکا ہے اس وقت میں اس کو پیدا فرماتا ہے)۔

”كل يوم هو في شأن“ کی دوسری تفسیر

حضرت علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ الکریم سے پوچھا گیا: ”كُلُّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ“ کا کیا مطلب ہے؟ فرمایا: اس کی شان یہ ہے کہ نطفہ کو باپوں کی پشت سے ماؤں کے رحم میں پہنچاتا ہے پھر اس کی صورت بناتا ہے پھر ماں کے پیٹ سے اس کو نکالتا ہے پھر اس کو دنیا سے نکال کر قیامت کے دن اٹھائے گا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ”كُلُّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ“ یعنی بمضیہ لا فی شأن یقضیہ۔ تو ثابت ہوا کہ اللہ کی قضا اور اس کا حکم اور اس کی تقدیر اور اس کا شقاوت و سعادت کے بارے میں علم اور اسی طرح رزق، موت، تمام اشیاء کا علم نہ متغیر ہونہ کم و بیش ہو یہ سب کچھ ہمارے ہاں ثابت ہے اور ہمارے علم میں ہے۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: ”المقدور کائن والہم فضل“ اور کہا گیا ہے: ”ان الہم من المقدور ایضا“ یعنی جو مقدور ہے وہ ہونے والا ہے اور قصد زائد ہے (اور کہا گیا ہے کہ قصد و تلاش معاش یہ بھی مقدور ہے)۔

پھر ہم کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تمام اشیاء کو چانتا ہے ان کے اوقات میں اور اللہ تعالیٰ کافروں کو چانتا ہے ان کے کفر کے وقت کہ یہ کافر ہیں اور مؤمنوں کو چانتا ہے ان کے ایمان

کے وقت مؤمن اور جانتا ہے اس سے قبل کہ مستقبل میں ایسا ہوگا، کافر کے کفر کو پہلے جانتا ہے کہ یہ فلاں وقت کفر کرے گا اور کافر کو کفر سے پہلے جانتا ہے کہ فلاں وقت ایمان لائے گا بلکہ ازل میں سب کو جانتا ہے کہ فلاں کافر اسلام لائے گا اور فلاں مسلمان کفر کرے گا، لیکن اللہ تعالیٰ جانتا ہے اس کے مسلمان ہونے کو دوسرے حال میں اس کے اسلام کے وجود سے پہلے تو یہ اس کے کفر کو واجب نہیں کرتا اور اللہ تعالیٰ کا جانتا کہ یہ کافر ہوگا دوسرے وقت میں واجب نہیں کرتا، اس کے ایمان کے سلب کو فی الحال تو کافر کافر ہوگا، وقت کفر حقیقتاً اللہ کے نزدیک فرشتوں کے نزدیک انسانوں کے نزدیک یعنی سب کے نزدیک اور کافر جب اسلام لایا تو وہ سعید ہے انسانوں کے نزدیک اور مسلمان وقت اسلام مسلمان ہوگا حقیقتاً اللہ کے نزدیک فرشتوں کے نزدیک انسانوں کے نزدیک تمام مخلوق کے نزدیک اور مسلمان جب کفر کرے گا شقی ہو جائے گا، یہ عند الناس حکم ہے مگر یہ امر خاتمہ پر موقوف ہے اور جو ہم نے ذکر کیا سعادت و شقاوت اس کی موقتہ ہے، مگر ہر شخص کا خاتمہ اور اس کا انجام علم الہی میں ہے جیسا کہ وہ جانتا ہے وہی ہوگا، اس کے خلاف ناممکن ہے اور حکم سعادت و شقاوت ہمارے نزدیک ثابت ہوں گے، بسبب الظاہر اور وہ اسلام و کفر ہے اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک شقاوت و سعادت اس کے ارادہ اور علم سے ثابت ہوگی، تو ہم نے کہا کہ سعید شقی ہو سکتا ہے اور شقی سعید ہو سکتا ہے، بسبب ظاہر ہمارے نزدیک اور اللہ کے نزدیک عند الخاتمہ جیسا وہ جانتا ہے۔

چھٹا قول

قضاء اور ادا کا بیان

اہل سنت و جماعت فرماتے ہیں کہ فرائض یعنی نماز، روزہ، زکوٰۃ وغیرہ جب اپنے وقت سے فوت ہو جائیں تو ان کی قضاء واجب ہے اور قضاء اسی فرض کی ہوگی جو فوت ہو گیا ہے اور فریضہ اس سے ساقط ہو جائے گا اور جس وقت اس کی قضاء کرے گا اور قضا سے بعینہ وہی حاصل ہوگا جو ادا سے حاصل ہوتا ہے۔

اس کی دلیل یہ ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”من نام علی صلوة او نسیھا

فلیصلیہا اذا ذکرہا "جو نماز کے وقت سو گیا یا ادا کرنا بھول گیا تو جب اس کو یاد آئے فوراً پڑھ لے۔ یہی اس کا وقت ہے اس کے غیر کا نہیں ہے اور "فلیصلہا" میں اس طرف اشارہ ہے کہ قضا بعینہا وہی عبادت ہے۔

معز لہ کہتے ہیں کہ قضا علیحدہ عبادت ہے اور حکمی طور پر اس کو اصل قرار دیا جاتا ہے اس لیے کہ جو فرض فوت ہو گئے ہیں وہ ساقط نہیں ہوئے اور اللہ تعالیٰ قضا کے ساتھ ثواب عطا فرمادیتا ہے اور فرض فوت ہو گیا اس کا عقاب دیا جائے گا۔

معز لہ کی ایک بات کی تردید

اور معز لہ کا یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ قضا اصل (ادا) کا بدل نہیں اس لیے کہ قضا اصل کا بدل ہے۔ دلیل یہ ہے کہ فریضہ اپنے وقت میں ادا کر لیتا قضا اس پر واجب اور اگر یہ (قضا) علیحدہ حکم ہوتا تو دونوں حالتوں میں واجب ہوتی۔ دوسری بات یہ ہے کہ قضا اسی ہیئت اور صفت پر ہوتی ہے جس ہیئت اور صفت پر فوت ہوئی اور اس پر واجب ہے کہ نیت کرے بعینہ فوت شدہ فریضہ کی تو ثابت ہوا کہ قضا فوت شدہ کا بدل ہے نہ اس میں کمی ہوگی نہ زیادتی اور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی فجر کی نماز فوت ہو گئی تھی تو اسی صفت و ہیئت پر حضور ﷺ نے اس کی قضا کی۔ ثابت ہوا کہ قضا ادا سے بدل ہے۔

ساتواں قول

اس شخص کے متعلق جس نے عمداً (جان بوجھ کر)

فرائض کو ترک کیا

جان بوجھ کر فرائض کو ترک کرنے والے کا کیا حکم ہے؟

حrud یہ یعنی خارجیوں کا عقیدہ ہے کہ جس نے قصداً نماز کو ترک کیا یا کسی منظور و ممنوع کا

ارتکاب کیا خواہ صغیرہ گناہ ہو یا کبیرہ وہ کافر ہو جائے گا۔

معز لہ کیا کہتے ہیں؟

معز لہ اس بات کے قائل ہیں کہ مرتکب کبیرہ ایمان سے خارج ہو جاتا ہے اور کفر میں داخل نہیں ہوتا۔

امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کیا فرماتے ہیں؟

امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس کی تکفیر تو نہیں کی جائے گی لیکن ایمان اس کا ناقص ہو گیا اور مباح الدم ہو گیا۔

احناف کا موقف

اہل سنت و جماعت اصحاب ابی حنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ نہ وہ مباح الدم ہے اور نہ ایمان سے خارج ہو اور نہ وہ کافر ہوا، مگر وہ مؤمن فاسق ہے۔

خوارج کی دلیل

خارجیوں نے یہ دلیل دی کہ

مَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِدًا فَجَزَاءُ هُ
جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيهَا. (النساء: ۹۳)

اس آیت میں خبر دی کہ وہ ”مخلد فی النار“ یعنی ہمیشہ آگ میں جلتا رہے گا اور کافر نہ ہوتا تو ہمیشہ دوزخ کی آگ میں نہ رہتا۔

جواب یہ ہے کہ یہ آیت اس شخص کے متعلق نازل ہوئی جو مؤمن تھا اور اس نے دوسرے مؤمن کو قصداً قتل کیا، پھر اسلام سے مرتد ہو گیا۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ خلود (ہمیشہ رہنے) سے مراد تابید (ابدی طور پر رہنا) نہیں ہے بلکہ مکث طویل مراد ہے (یعنی طویل مدت تک)۔

اس کی دلیل یہ آیت ہے: ”أَفَانُ مِتَّ فَهُمْ الْخَالِدُونَ“ (الانبیاء: ۳۴) یعنی ”فہم الباقون بقاء الدنیا“ یعنی اگر آپ انتقال فرمائیں تو کیا یہ کفار ہمیشہ دنیا میں باقی رہیں گے؟ تو ثابت ہوا کہ خلود سے مراد مکث طویل (یعنی عرصہ دراز تک رہنا) ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ جو مؤمن کے قتل کو حلال جانے وہ کافر ہے، ہمیشہ جہنم میں رہے گا

ہم بھی یہی کہتے ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا کہ آیت سے مراد یہی ہے اور اس کی دلیل کہ قاتل جب تک مؤمن کے قتل کو حلال نہ جانے کا فر نہیں۔ یہ آیت ہے: "يَسْأَلُهَا الَّذِينَ آمَنُوا كَتَبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ" (البقرہ: ۱۷۸) اے ایمان والو! تم پر قصاص فرض کیا گیا ہے اس آیت میں قاتل کو "مؤمن" فرمایا اگر مؤمن نہ ہوتا تو اس پر قصاص فرض نہ ہوتا۔

معزلہ کا استدلال

معزلہ اس آیت سے حجت قائم کرتے ہیں کہ "اَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا لَا يَسْتَوُونَ" (السجدہ: ۱۸) کیا جو مؤمن ہو فاسق کی طرح ہو سکتا ہے وہ برابر نہیں ہو سکتے۔ اللہ جل مجدہ نے فاسق و مؤمن میں فصل (فرق) کر دیا کہ فاسق اور مؤمن دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ اس پر ہم سب کا اجماع ہے کہ وہ فاسق ہے ہم نے یہ جانا کہ نہ وہ مؤمن ہے اور نہ وہ کافر۔ جواب یہ ہے کہ یہ آیت کریمہ ولید بن عقبہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے یہ شخص بڑا بولنے والا حسین و خوبصورت اور قوی ہیکل تھا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم سے کہنے لگا کہ اگر آپ حسین و جمیل ہیں تو میں بھی صاحب حسن و جمال ہوں اگر آپ کے پاس قوت ہے تو میرے پاس بھی قوت ہے اگر آپ لسان یعنی زور خطابت اور فصاحت و بلاغت کے مالک ہیں تو میں بھی کچھ کم نہیں منہ میں زبان رکھتا ہوں۔

حضرت مولیٰ علی شیر خدا رضی اللہ تعالیٰ نے فرمایا: خاموش! تو کافر ہے تو یہ آیت کریمہ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی موافقت میں نازل ہوئی اور اس کا کہنا کہ یہ شخص فاسق تھا ہم کہتے ہیں کہ ہر کافر فاسق ہے اور ہر فاسق کافر نہیں۔

اور اس کی دلیل یہ ہے کہ ایمان سے خارج نہیں ہوا اس لیے کہ معزلہ کے نزدیک بھی کافر نہیں۔ پھر خروج من الایمان موجب کفر ہے کیونکہ جس نے ایمان کو ترک کیا یا ایمان کا انکار کیا یا اسلام سے نکل کر مرتد ہو گیا تو وہ لامحالہ کافر ہو گیا اور ہمارا اجماع ہے کہ کافر نہیں ہوگا تو ہم نے جان لیا کہ ایمان سے نہیں نکلا۔

اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا فرمانا کہ وہ مباح الدم ہے تو ہم کہتے ہیں: ایسی کوئی بات ثابت نہیں اس بلا دلیل دعویٰ کی کچھ حیثیت نہیں ہے اس لیے کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ

تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”لا یباح دم واحد من اهل القبلة الا لمعان ثلث الزنا بعد الاحسان والكفر بعد الايمان وقتل النفس بغير حق“ اہل قبلہ میں سے کسی کا خون مباح نہیں مگر تین وجہ سے (۱) زنا بعد الاحسان (شادی شدہ زانی کا) (۲) کفر بعد الايمان (مرتد کا) (۳) اور ناحق قتل کرنے والے کا خون بہانا شرعاً مباح ہے۔



گیارہواں باب

خلافت و امارت کا بیان

اس میں آٹھ قول ہیں۔

پہلا قول

خلافت و امارت کا بیان

مہدی ابوشکور سالمی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ خلافت ثابت ہے اور امارت قائم و مشروع ہے اور لوگوں پر واجب ہے کہ وہ اسے از روئے کتاب سنت اور اجماع امت اپنے اوپر لازم سمجھیں۔

امارت کی مشروعیت و قیام کا قرآن سے ثبوت

کتاب اللہ سے دلیل یوں ہے کہ ارشاد فرمایا: "أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ" (النساء: ۵۹) اللہ تعالیٰ اور رسول اور تم میں سے حکمرانوں کی پیروی کرو اور سنت سے یوں کہ جب سرور عالم ﷺ کا وصال ہوا تو سقیفہ بنی ساعدہ خزرجی میں صحابہ کرام مہاجرین و انصار نے جمع ہو کر کہا کہ ہم نے آنحضرت ﷺ سے سنا ہے کہ جو بغیر امام کے مرے اس کی موت جاہلیت کی موت اور ہم ایک دن بھی بغیر امام کے رہنا پسند نہیں کرتے۔ یہ دلیل ہے اس کی کہ جو امام کو حق نہ جانے تو وہ کافر ہے۔

اجماع امت سے دلیل یہ ہے کہ صحابہ کرام جمع ہوئے اور سب نے بالاتفاق حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کو تسلیم کیا اور کسی ایک نے بھی انکار نہیں کیا اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت حضرت صدیق اکبر کے خلیفہ بنانے سے ہوئی اور اس

پر بھی کسی نے انکار نہیں کیا۔

پھر خلافت حضرت عثمان غنی اور خلافت حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما اجماع امت سے ہوئی۔ ان دلائل سے ثابت ہوا کہ خلافت حق اور ثابت ہے اور اس پر بھی ہمارا اجماع ہے کہ خلیفہ قریش سے ہوگا اور غیر قریش سے خلیفہ ناجائز ہے اور یہ بھی جائز نہیں کہ خلیفہ اولادِ حسن و حسین سے ہو۔

پھر اس میں بھی اختلاف ہے کہ امام کی کیا شان ہونی چاہیے؟ معزولہ کہتے ہیں کہ امام و خلیفہ کا معصوم ہونا لازم ہے اور اگر فاسق ہو تو اس کے پیچھے نماز جائز و صحیح نہ ہوگی۔

روافض کا مذہب

اور روافض کہتے ہیں کہ امام کا تعلیم یافتہ ہونا ضروری ہے اس نے خدا سے بلا واسطہ علم سیکھا ہو یا بواسطہ جبریل۔

امام شافعی کا ارشاد

امام شافعی رحمہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ امام و خلیفہ فاسق نہیں ہو سکتا کہ اگر خلیفہ ظلم کرے یا فاسق ہو جائے تو خود بخود معزول ہو جائے گا۔

اور ایسے ہی ہر قاضی (جسٹس) اور امیر جب کہ امام کی نیابت سے مقرر کیا گیا ہو، ظلم کرے یا فسق و فجور میں مبتلا ہو جائے یا رشوت لے یا ظلم کرے تو معزول ہو جائے گا، ایسے ہی امام صلوة اگر فاسق ہو جائے تو امامت سے معزول ہو جائے گا۔ امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ امام خلیفہ کے بنانے سے ہوتا ہے، امام بھی وہ جس کو لوگوں نے قبول کیا ہو یا اس کی امامت اجماع امت سے ہو تو امامت جب صحیح ہوگی جب کہ قریش سے ہو، نیک ہو یا بد ہو مگر قریشی ہو تو امامت اس کی صحیح ہے۔

اصل اختلاف کیا ہے؟

اور اصل مسئلہ یہ ہے کہ امام شافعی کے نزدیک فاسق اہل ولایت سے نہیں، حتیٰ کہ اگر فاسق اپنی چھوٹی بیٹی نابالغہ کا نکاح کر دے تو وہ نکاح صحیح نہیں ہوگا اس لیے کہ فاسق کو ولایت

حاصل نہیں۔

فاسق امام بن سکتا ہے

اور امام ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ نکاح صحیح ہوگا اس لیے کہ فاسق اہل ولایت سے ہے اور حضور پر نور سید عالم ﷺ نے فرمایا کہ ”صلوا خلف کل بر وفاجر“ یعنی ہر نیک و بد کے پیچھے نماز پڑھو (اگرچہ بوجہ فسق مکروہ تحریمہ ہوگی لیکن اصل فرض ہو جائیں گے۔ منہ)۔

پھر ائمہ اور امراء سے عہد صحابہ و تابعین میں ہی فسق ظاہر ہوا اور ظلم پھیلا جیسا کہ یزید اور اس کی اولاد اسی طرح مروان کی اولاد کہ ان میں فسق اور جور و ستم عام تھا لیکن اس کے باوجود صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم نے ان کے پیچھے نماز پڑھی اور ان کی معیت میں حج کئے اور اسی طرح تابعین نے نمازیں پڑھیں حج کیے اور ان پر خروج نہیں کیا حالانکہ انہیں قدرت و شوکت حاصل تھی تو ثابت ہوا کہ فسق و فجور سے امامت زائل نہیں ہوتی جب کہ مسلمان ہوں اور قریشی ہوں۔ علاوہ ازیں اگر امام کا معصوم ہونا واجب ہو تو نبی اور امام میں فرق نہ رہے گا۔ امام بھی معصوم اور نبی بھی معصوم حالانکہ معصوم ہونا خاصا نص نبوت سے ہے اور نیز فسق سے ایمان زائل نہیں ہوتا تو فسق موجب زوال امامت نہیں ہو سکتا اور عصمت ثابت کرنا امام سے پہلے شرط ہے اور نہ ہی امام ہونے کے بعد مطلب یہ ہے کہ امامت کے لیے عصمت شرط نہیں ہے۔

بعض حضرات کی طرف سے عائد کردہ امامت (کبریٰ) کی شرائط کا

بیان اور ان پر بحث و نظر

بعض نے کہا کہ امام کا اولاد حسن و حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے ہونا ضروری ہے اور براہ راست خدا سے تعلیم یافتہ ہوں یا جبرائیل کے واسطے سے انہوں نے خدا سے علم سیکھا ہو بہر حال ان کا تعلیم یافتہ ہونا ضروری ہے۔

اس کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ یہ قول صحیح نہیں اس لیے کہ حضرت امام حسن و حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے امامت حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سونپ دی اور دونوں نے حضرت معاویہ کی بیعت کی تو اگر امام کا اولاد حسن و حسین سے ہونا ضروری تھا اور بغیر اولاد

حسین کریمین کے امام نہیں ہو سکتا تو یہ خطا اور معاذ اللہ کفر ہوگا اس لیے کہ امام قائم کرنا بغیر حق کے کفر ہوگا (اور ظاہر ہے کہ حضرت معاویہ اولادِ حسین سے نہیں تو وہ مستحق امامت بھی نہیں، غیر مستحق کو حق دینا کفر ہوگا۔ العیاذ باللہ)۔

علاوہ بریں امام کا تعلیم یافتہ ہونا خدا سے یا جبرئیل سے مستوجب نبوت ہے کیونکہ تعلیم الہی یا تعلیم جبرئیل وحی ہوتی ہے اور جو حضور ﷺ کے بعد نبوت یا وحی تشریحی باستثناء حضرت عیسیٰ کسی کے لیے جائز سمجھے وہ کافر ہے تو ثابت ہوا کہ حقیقت امر وہی ہے جو ہم نے بیان کیا۔

دوسرا قول

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کا بیان

اہل سنت و جماعت فرماتے ہیں کہ امامت و خلافت کسی کے لیے مخصوص نہیں (کہ قرآن و حدیث میں خلافت کے لیے کسی کو نامزد کیا ہو)۔

بعض نے کہا کہ خلافت حضرت عباس کا حق تھا کہ وہ حضور اقدس ﷺ کے چچا اور عصبہ ہیں تو وہ دوسروں سے مقدم ہیں۔

اور روافض نے کہا کہ خلافت و امامت حضرت علی کے لیے مخصوص ہے اس لیے کہ حضور ﷺ نے ان کو اپنے بعد اپنا خلیفہ اور وصی بنایا جیسا کہ فرمایا: "اما تر ضی ان تکون منی بمنزلة ہارون من موسیٰ الا انہ لا نبی بعدی" حضرت علی سے فرمایا: تم راضی نہیں کہ مجھ سے وہ تعلق رکھتے ہو جو ہارون کو موسیٰ علیہ السلام سے تھا؟ مگر میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا۔ ہارون علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلیفہ تھے تو ایسے ہی حضرت علی حضور علیہ السلام کے خلیفہ ہوئے۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ حضور نے حضرت علی کو سب لوگوں کا والی بنایا جب مکہ معظمہ سے واپس ہوئے اور خم غدیر پر نزولِ اجلال فرمایا حکم دیا کہ اونٹوں کے کجاوے جمع کر کے منبر کی طرح بنا دیں اس پر حضور چڑھے اور فرمایا: "السنا باولی المؤمنین من انفسہم فقالوا

نعم“ یعنی فرمایا کہ کیا ہم مؤمنین کی جانوں سے زیادہ قریب نہیں؟ سب نے کہا: ہاں۔
پھر حضور ﷺ نے فرمایا: ”من كنت مولاه فعلي مولاه اللهم وال من والاه
وعاد من عاداه وانصر من نصره واخذل من خذله“ جس کا میں دوست اور مددگار
ہوں علی بھی اس کے دوست و مددگار ہیں، الہی جو علی سے محبت کرے اس سے تو بھی محبت کر اور
جو علی سے عداوت و دشمنی رکھے تو بھی اس سے دشمنی کر اور جو علی کی مدد کرے تو بھی اس کی مدد
فرما اور جو علی کا بے ادب ہو تو اس کو ذلیل کر۔

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”انما وليكم الله ورسوله والذين امنوا الذين
يقومون الصلوة ويؤتون الزكوة وهم راكعون“ (المائدہ: ۵۵) بے شک تمہارے
دوست اللہ اور اس کا رسول اور ایمان والے اور وہ لوگ ہیں جو نماز قائم کرتے اور رکوع کی
حالت میں زکوٰۃ دیتے ہیں۔ یہ آیت حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شان میں نازل ہوئی تو
ثابت ہوا کہ مولیٰ علی کرم اللہ وجہہ الکریم حضور کے بعد سب سے افضل ہیں اور حدیث شریف
میں وارد ہوا ہے کہ سب سے پہلے حضرت علی اسلام لائے تو ثابت ہوا کہ خلافت کے علی سب
سے زیادہ حق دار ہیں۔

اہل سنت و جماعت کے دلائل

اہل سنت و جماعت کی دلیل یہ ہے کہ امامت و خلافت منصوص نہیں اس لیے کہ صحابہ
کرام اسی دن جس دن حضور ﷺ کا وصال ہوا سقیفہ بن ساعدہ میں مہاجرین و انصار جمع
ہوئے اور انصار نے کہا: ”منا امیر“ ہم میں سے امیر ہوگا۔ مہاجرین نے کہا: ہم میں سے
امیر ہوگا۔ تو اگر خلافت منصوص و نام زد ہوتی تو ہرگز نہیں باور کر سکتے کہ ایسی جلدی حضور کے
وصال کے بعد دن سے پہلے ہی سب حضور کے امر اور وصیت کی مخالفت کرتے صحابہ کرام
سے یہ گمان ناممکن ہے۔

اور مروی ہے کہ حضرت صدیق اکبر نے فرمایا: ”نحن بيضة رسول الله“ اور تم نے
بھی اور ہم نے بھی سنا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ”الانمة من قریش“ امام و خلیفہ قریش
میں سے ہوگا۔ ”فمنا الامراء“ تو ہم میں سے امیر ہوں گے ”ومنکم الوزراء“ اور تم میں
سے وزراء ہوں گے۔ سعد بن معاذ نے کہا: ہم اس پر راضی ہیں۔ تم میں سے امراء اور ہم میں

سے وزراء ہوں تو سب کا اتفاق ہو گیا۔ پھر حضرت ابو بکر صدیق نے فرمایا کہ میرا گمان ہے کہ قوم کے نزدیک حضرت علی امامت و خلافت کی زیادہ صلاحیت رکھتے ہیں۔ یہ سن کر حضرت علی نے اپنی تلوار سونت لی اور کھڑے ہو کر صدیق اکبر سے فرمایا: ”قم یا خلیفۃ رسول اللہ“ اے رسول اللہ کے خلیفہ! اٹھیے ”قدمک رسول اللہ فمن ذا الذی یوخرک“ اے ابو بکر! جب حضور نے آپ کو (نماز کے لیے) آگے کیا تھا پھر کون ہے جو آپ کو پیچھے کرے۔ حضرت صدیق اکبر نے کہا: اے علی! تم امیر ہو۔ حضرت علی نے فرمایا: تم امیر ہو اے خلیفۃ رسول اللہ! آپ کو حضور نے حکم دیا تھا مجھ کو حضور نے حکم نہیں دیا (اشارہ تھا نماز کے لیے) آپ کو حکم دیا تھا کہ ”صل بالناس“ کہ لوگوں کو نماز پڑھاؤ۔ ہم اپنے دنیاوی امور میں راضی ہیں اس شخص سے جس سے حضور ہمارے دین کے معاملہ میں راضی ہوئے اور حضرت علی نے حضرت صدیق اکبر کو خلیفہ رسول اللہ کہا۔ اس لیے کہ حضور اقدس نے حضرت صدیق اکبر کو نماز کے لیے اپنا خلیفہ بنایا۔

بعض روایات میں ہے: سات دن یعنی پینتیس (۳۵) نمازوں میں خلیفہ بنایا، بعض میں تین دن ہے یعنی پندرہ (۱۵) نمازوں میں۔ یہ دلائل سن کر سب صحابہ مہاجرین و انصار نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بیعت کر لی اور کسی ایک نے مخالفت نہیں کی اور بیعت منعقد ہو گئی اس کے بعد حضور کے دن میں مشغول ہو گئے اس سے ثابت ہوا کہ خلافت منصوص نہیں اس لیے کہ اگر منصوص ہوتی تو صحابہ کرام ہرگز اختلاف نہ کرتے اور اگر دوسروں کو شک تھا تو مولیٰ علی کو ہرگز شبہ نہ ہونا چاہیے تھا اور جب حضرت علی نے خود بیعت کی تو ثابت ہوا کہ منصوص نہ تھی بلکہ خلافت اجماع صحابہ کرام سے منعقد ہوئی۔

اور بعض کہتے ہیں: حضرت علی نے تین دن کے بعد بیعت کی اور بعض کہتے ہیں: چھ مہینہ کے بعد بیعت کی، مگر یہ اقوال صحیح نہیں۔ بہر حال مخالفت کے اقوال مردود ہیں بوجہ موافقت کرنے حضرت علی کے اور بالفرض اگر حضرت علی نے صدیق اکبر کی بیعت نہ بھی کی ہو تو حضرت علی نے سکوت کیا اور مخالفت نہ کی تو بھی حضرت صدیق اکبر کے ساتھ موافقت ثابت ہوئی، حالانکہ ہم نے ثابت کر دکھایا کہ مولیٰ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیعت کی ہے اور اگر بالفرض ابو بکر صدیق کی خلافت صحیح نہ ہو اور وہ امام برحق نہ ہوں تو مولیٰ علی کا سکوت و چشم

پوشی ہرگز جائز نہیں اس لیے کہ جو باطل امام کی امامت پر راضی ہو وہ کافر ہے۔
مولیٰ علی صدیق اکبر کو خلیفہ بنا کر خوش تھے

اور اس امر کی دلیل کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت صدیق اکبر کی خلافت پر راضی تھے اور حضرت علی نے امام برحق سمجھ کر صدیق اکبر کی بیعت کی یہ ہے کہ مولیٰ علی کرم اللہ وجہہ الکریم جہادوں میں حضرت صدیق اکبر کی اطاعت کرتے اور مال سے حصہ لیتے رہے اور یہ بھی روایت ہے کہ حضرت صدیق نے مولیٰ علی کو ایک لونڈی مالِ غنیمت سے عطا فرمائی، حضرت علی نے اسے قبول فرمایا اور اس کے ساتھ صحبت بھی کی اور اگر خدا نخواستہ حضرت صدیق اکبر خلیفہ برحق نہ ہوتے اور ان کی خلافت حق نہ ہوتی تو حضرت علی کو ہرگز صدیق اکبر کی اطاعت و فرماں برداری جائز نہ تھی اور نہ مالِ غنیمت سے لینا حلال تھا اور غنیمت سے حصہ لینا جائز تھا۔

اور اگر ایسا ہوتا تو حضرت علی کو جاریہ (لونڈی) سے وطی و صحبت کرنا حلال نہ ہوتا بلکہ معاذ اللہ زنا ہوتا۔ تو ان وجوہ سے ثابت ہو گیا کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت برحق تھی اور وہ خلیفہ برحق تھے اور مولیٰ علی نے خلیفہ برحق سمجھ کر بیعت کی ان کی اطاعت کی غزوات میں شرکت کی غنیمت سے اپنا حصہ لیا جاریہ (لونڈی) سے حلال سمجھ کر وطی کی۔

روافض کے دلائل کا جواب

روافض کا یہ کہنا کہ حضرت علی حضور کے وصی تھے۔ ہم کہتے ہیں: آپ مطلقاً وصی نہ تھے بلکہ حضور ﷺ نے قرضوں اور امانتوں کی ادائیگی کے لیے حضرت علی کو وصی بنایا تھا لہذا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ خلافت کے لیے بھی وصی تھے۔

روافض کا یہ کہنا کہ حضرت علی کو حضور نے خلیفہ بنایا اور وہ بہ منزلہ حضرت ہارون کے تھے تو یہ حدیث بجائے خود ان کی تردید ہے اور ان کے خلاف جاتی ہے اس لیے کہ جب حضور اقدس ﷺ غزوہ تبوک میں تشریف لے جانے لگے تو حضرت علی کو مدینہ طیبہ میں امور داخلہ اور خانگی انتظامات و انصرامات کے لیے اپنے پیچھے چھوڑ دیا تو منافقوں نے زبان درازی اور طعنہ زنی شروع کی کہ حضرت علی کو اس قابل نہ سمجھا کہ جہاد میں ساتھ لے جائیں ان کو گھر میں چھوڑ گئے۔ جب مولیٰ علی کو منافقوں کی ان باتوں کا علم ہوا تو مغموم ہوئے اور حضور کے

پیچھے جانے لگے۔ حضور نے دیکھا کہ علی بھی پیچھے پیچھے آرہے ہیں فرمایا: کیا ہم نے تم کو پیچھے رہنے کا حکم نہیں دیا تھا؟ عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ مجھے عورتوں اور بچوں میں چھوڑ گئے اور منافقین زبان درازی کرتے ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ حضور علی کو اس لیے عورتوں اور بچوں میں چھوڑ گئے ہیں کہ آپ نے اس قابل نہ سمجھا کہ جہاد میں اپنے ساتھ لے جاتے۔ اس موقع پر حضور نے فرمایا: ”اما ترضی ان تكون منی بمنزلة هارون من موسى الا انه لا نبی بعدی“ کیا تم اس بات پر راضی نہیں کہ مجھ سے ایسے ہو جیسے ہارون موسیٰ (علیہما السلام) سے تھے مگر یہ کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں۔ سو ہم کہتے ہیں کہ اس حدیث سے حضرت علی کو حضرت ہارون پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے بلکہ متعدد فرق ہیں:

(۱) ہارون علیہ السلام نبی ہیں اور علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی نہیں۔

(۲) حضرت ہارون علیہ السلام حیاتِ طاہری میں خلیفہ تھے اور وفات کے بعد خلیفہ نہ تھے اس لیے کہ ہارون علیہ السلام کا موسیٰ علیہ السلام کے سامنے انتقال ہو گیا اور مولیٰ علی شیر خدا حضور ﷺ کے بعد زندہ رہے۔

(۳) نیز ہارون علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام کے بڑے بھائی تھے اور حضرت علی حضور کے چھوٹے بھائی تھے۔

(۴) نیز ہارون علیہ السلام حقیقی بھائی تھے اور حضرت علی چچا زاد بھائی تھے۔

(۵) حضرت ہارون علیہ السلام معصوم تھے اور مولیٰ علی معصوم نہیں لہذا ان کے مشابہ نہیں ہو سکتے۔

(۶) اور ان کا یہ کہنا کہ حضرت علی کو والی بنایا تو ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ہاں والی بنایا یعنی عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بعد آپ (علی) والی ہیں اور زمانہ معاویہ رضی اللہ عنہ میں بھی وہ ہی خلیفہ برحق تھے یہی ہمارا عقیدہ ہے اور انما ولیکم اللہ ورسولہ سے بھی یہی معنی مراد ہیں۔

نیز ہم کہتے ہیں کہ حضرت علی والی خلیفہ و امام ہیں اپنے وقت میں اور اپنے زمانہ میں وہ زمانہ ہے حضرت عثمان غنی کے بعد پہلے نہیں۔

سب سے پہلے کون اسلام لائے تھے؟

یہ کہنا کہ حضرت علی سب سے پہلے اسلام لائے تو اس کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ اس میں روایتیں مختلف ہیں۔ ایک روایت میں ہے: سب سے پہلے حضرت علی اسلام لائے۔ ایک روایت میں ہے: سب سے پہلے خدیجہ الکبریٰ اسلام لائیں اور بعض روایت میں ہے کہ زید بن حارثہ اسلام لائے اور بعض روایت میں ہے: سب سے پہلے ابو بکر صدیق اسلام لائے۔ ان اختلافات کی بناء پر مطلقاً یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ حضرت علی سب سے پہلے ایمان لائے۔ ہاں! ان روایتوں میں تطبیق یوں ہو سکتی ہے کہ عورتوں میں خدیجہ الکبریٰ اور بچوں میں سب سے پہلے حضرت علی اسلام لائے اور غلاموں میں سب سے پہلے زید بن حارثہ ایمان لائے اور بالغوں، عاقلوں، آزادوں میں ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایمان لائے پھر اس وقت ابو بکر ہی خلافت کے لیے زیادہ مناسب موزوں ترین اور زیادہ حق دار تھے اگر خلافت کی حاجت ہوتی۔ اس لیے کہ عورت، بچے، غلام خلافت کی صلاحیت و اہلیت نہیں رکھتے تو جب حضور اقدس ﷺ کے بعد خلافت کی ضرورت و حاجت ہوئی تو حضرت صدیق اکبر ہی حق دار و صلاحیت مند تھے تو ثابت ہوا کہ ابو بکر ہی خلافت کے حق دار اور بہتر صلاحیت رکھنے والے تھے۔

تیسرا قول

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کا بیان

اس پر ہمارا اجماع ہے کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر ابن خطاب (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کو خود خلیفہ مقرر کیا، حضرت ابو بکر صدیق نے اپنے وصال کے دن فرمایا کہ عمر کو حاضر کرو۔ جب حضرت عمر حاضر ہوئے فرمایا: لکھو اور وصیت فرمائی کہ لکھو: بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ یہ وصیت نامہ ابو بکر کی طرف سے ہے جو رسول کریم ﷺ کا خلیفہ ہے، یہ میرا دنیا میں آخری دن ہے اور آخرت کا پہلا دن ہے، جس دن کافر بھی ایمان لے آتا ہے اور فاسق و فاجر اپنے فسق و فجور سے رک جاتا ہے۔ میں تم پر حضرت عمر کو خلیفہ بناتا ہوں، اگر وہ

عدل و انصاف کریں اور ان کے متعلق یہی میرا گمان ہے اور اگر نا انصافی کریں تو غیب کا علم اللہ کو ہے۔ ”وَسَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَيَّ مُنْقَلَبٍ يَنْقَلِبُونَ“ (الشعراء: ۲۲۷) اور چند لوگوں کے سوا سب حضرت عمر کی خلافت پر رضا مند ہو گئے اور سوید بن علقمہ حضرت علی سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت علی نے فرمایا کہ میں راضی ہونے والوں میں ہوں۔ حضرت علی کی رضامندی اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ اپنی صاحب زادی ام کلثوم بنت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا نکاح حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کر دیا اور جو لوگ خلافتِ عمر کو پسند نہیں کرتے تھے، حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہنے لگے: جب آپ خدا کے سامنے جائیں گے کیا جواب دیں گے کہ آپ نے ہم پر ایسے شخص کو مسلط کر دیا جو درشت خو اور تند مزاج ہے؟ صدیق اکبر نے جواب دیا: مجھ کو میرے رب سے نہ ڈراؤ، میں یہ جواب دوں گا کہ میں نے ان پر خیر اہل اللہ کو مسلط کیا ہے اور یہ جملہ میں نے حضور سے سنا، حضور نے ارشاد فرمایا: عمر خیر اہل اللہ ہے یعنی اللہ کے خاص بندوں سے ہے اور حضرت ابوبکر کے وصال فرمانے سے قبل خلافتِ عمر پر سب راضی ہو گئے تھے اور رسول اللہ ﷺ کے حیاتِ ظاہری سے پردہ فرمانے کے بعد تمام صحابہ کرام صدیق و فاروق کی خلافت پر متفق ہو گئے، اس لیے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا کہ میرے بعد صدیق و فاروق کی اقتداء کرنا اور حضور نے فرمایا: داخل ہوا میں اور ابوبکر و عمر نکلا میں اور ابوبکر و عمر اور کھایا میں نے اور ابوبکر و عمر نے اور حضور سے مروی ہے کہ ایک دن حضور اقدس ﷺ مسجد میں تشریف لائے درآں حالیکہ دایاں ہاتھ صدیق اکبر کے کاندھے پر اور بایاں ہاتھ فاروقِ اعظم کے کاندھے پر تھا اور فرمایا: اسی طرح ہم زندہ رہیں گے اور اسی طرح ہم دنیا سے جائیں گے اور اسی طرح ہم دفن ہوں گے اور اسی طرح ہم قبروں سے اٹھائے جائیں گے تو ثابت ہوا کہ حضرت عمر تمام احوال میں تیسرے درجہ میں ہیں تو جب ابوبکر کا وصال ہوا تو عمر ہی خلافت کے حق دار تھے جب خلافتِ صدیق ختم ہو گئی۔

نیز رسول کریم ﷺ سے مروی ہے کہ جب میں شب اسراء بالائے آسمان پر تشریف لے گیا اور جنت میں فروکش ہوا تو میں نے ایک جاریہ (لونڈی) کو دیکھا جو اوصافِ حمیدہ سے موصوف تھی میں نے اس لونڈی سے کہا: تو کس کے لیے ہے؟ اس نے کہا: خلیفہ عمر رضی

اللہ تعالیٰ عنہ کے لیے تو حضور نے حضرت عمر کو خلیفہ کا لقب عطا فرمایا اس سے ثابت ہوا کہ حضرت عمر خلافت کے حق دار تھے اور یہ حدیث صدیق اکبر کی خلافت پر بھی دلیل ہے اس لیے کہ حضرت عمر صدیق اکبر کے خلیفہ بنانے سے خلیفہ بنے تو اگر صدیق اکبر کی خلافت صحیح اور حق نہ ہوتی تو حضرت عمر کی خلافت بھی صحیح نہ ہوتی ان کے خلیفہ بنانے سے اور جب فاروق اعظم کی خلافت صحیح و ثابت ہے تو صدیق اکبر کی خلافت بھی صحیح و ثابت اور حق ہے اور اس امر کی دلیل ہے کہ خلفاء اربعہ (ابوبکر، عمر، عثمان، علی) کی خلافت حق اور ثابت ہے۔ حضور کا ارشاد گرامی ہے: "الخلافة من بعدی ثلاثون سنة" خلافت علی منہاج الدعوة تیس سال رہے گی اور ان تیس سالوں میں انہی چاروں خلفاء راشدین کی خلافت رہی۔

پھر ابوبکر صدیق کو خلیفہ رسول اللہ کے نام سے بلایا جاتا اور فاروق اعظم کو خلیفہ خلیفہ رسول اللہ تو ایک دن فاروق اعظم نے سوچا کہ مجھ کو خلیفہ خلیفہ رسول اللہ کہا جاتا ہے اور میرے بعد خلفاء کا نام خلیفہ خلیفہ رسول اللہ رکھیں گے اور اس پے در پے اضافات میں لوگوں کو تکلیف ہوگی تو منبر پر تشریف لا کر فرمایا: میں تمہارا سچا امیر ہوں؟ سب نے کہا: ہاں! پھر فرمایا: تم سچے مؤمن ہو؟ سب نے کہا: ہاں۔ تو حضرت عمر نے فرمایا کہ مجھ کو امیر المؤمنین کہا کرو اس دن سے امیر المؤمنین مشہور ہو گئے۔

چوتھا قول

حضرت عثمان کی خلافت کا بیان

امت مسلمہ کا اس پر اجماع ہے کہ حضرت فاروق اعظم کے بعد خلیفہ برحق باجماع الامۃ حضرت عثمان ذوالنورین ہیں اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بذات خود کسی کو خلیفہ منتخب نہیں کیا، بلکہ پانچ جلیل القدر صحابہ کے مشورے پر چھوڑا کہ یہ حضرات جس کو چاہیں منتخب کر لیں۔ وہ پانچ افراد کی نفری یہ ہے: عثمان، علی، عبد الرحمن ابن عوف، طلحہ اور زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔ پھر جب فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا انتقال ہو گیا تو عبد الرحمن ابن عوف نے کہا: میں اپنا حق (خلافت) چھوڑتا ہوں اور حضرت زبیر نے کہا: میں اپنا حق خلافت چھوڑتا

ہوں۔ حضرت طلحہ نے کہا: میں بھی دستبردار ہوتا ہوں۔

اب رہ گئے عثمان و علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما، اب خلافت ان دونوں کے درمیان رہ گئی تو عبد الرحمن ابن عوف نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا: اپنا ہاتھ بڑھائیے میں آپ سے بیعت کرتا ہوں اس شرط پر کہ آپ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ اور سیرتِ شیخین (ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما) کے مطابق ہمارے معاملات میں حکم کریں گے۔ حضرت علی نے فرمایا: میں اس شرط پر بیعت لیتا ہوں کہ میں کتاب و سنت اور سیرتِ شیخین کے مطابق حکم کروں گا اور اجتہاد بھی کروں گا۔ چنانچہ عبد الرحمن ابن عوف نے پھر یہی بات دہرائی تو حضرت علی نے وہی فرمایا جو پہلی مرتبہ فرمایا تھا۔ پھر تیسری بار حضرت عبد الرحمن ابن عوف نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم سے وہ بات دہرائی جو پہلے کہی تھی، حضرت مولیٰ علی نے بھی وہی فرمایا جو پہلی مرتبہ فرمایا تھا۔ پھر حضرت عبد الرحمن ابن عوف نے حضرت علی کا ہاتھ چھوڑ دیا اور حضرت عثمان غنی کا ہاتھ پکڑ کر کہا: آپ ہمارے ساتھ بیعت کریں کہ آپ ہمارے درمیان کتاب اللہ، سنت رسول اللہ اور سیرتِ شیخین (ابوبکر و عمر) کے موافق حکم کریں گے۔ حضرت عثمان غنی نے کہا: میں نے یہ عہدہ قبول کیا اور میں بیعت کرتا ہوں کہ کتاب و سنت رسول اللہ کے مطابق حکم کروں گا۔ پھر عبد الرحمن ابن عوف کی معیت میں تمام صحابہ کرام نے بیعت کی اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم نے بھی بیعت کر لی۔ پھر عبد الرحمن ابن عوف نے کہا: میں پسند کرتا تھا کہ حضرت علی ہمارے امام بنیں لیکن ان کو چھوڑ دیا، ان کے اس ”اجتہاد فیہ برای“ میں اس میں اپنا اجتہاد بھی کروں گا فرمانے سے، پھر کسی صحابی نے بیعت عثمان میں نہ انکار کیا اور نہ مخالفت کی۔

پھر لوگ جمع ہوئے اور اس (میٹنگ) میں کچھ صحابہ بھی تھے۔ حضرت علی اس اجلاس میں کسی وجہ سے شرکت نہ فرما سکے، یہ اسی دن کا واقعہ ہے جس دن حضرت عثمان غنی شہید ہوئے تو لوگوں نے اس سے یہ گمان کر لیا کہ حضرت علی بیعت خلافت کے مخالف ہیں لیکن پھر جب ان کو یقین ہو گیا کہ حضرت علی مخالف نہیں تو انہوں نے توبہ کی اور جتنے صحابہ کرام تھے سب نے رجوع کیا اور حضرت علی اس وقت موجود نہیں تھے، جب آپ آئے تو آپ نے حسنین کریمین کو حضرت عثمان غنی کی مدد کے لیے بھیجا۔ پھر جب تمام صحابہ کرام مجمع میں سے چلے

گئے تو مصری لوگ تنہا رہ گئے اور صحابہ کرام میں سے ایک بھی ان کے ساتھ نہ رہا تو مصری بلوایوں نے دیوار میں نقب لگایا اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو مظلومانہ شہید کر دیا اور حضرت امام عالی مقام سید حسن اور حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما دونوں شہزادے دروازے پر کھڑے حفاظت فرما رہے تھے اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت کے خیال سے دروازہ پر ہی رہے اور حضرت شیر خدا مولیٰ علی کرم اللہ وجہہ الکریم حضرت عثمان غنی کے شہید ہونے سے قبل تلوار و ہتھیار لے کر بلوایوں (تخریب کاروں، فتنہ پردازوں) کے قتل کا ارادہ کر رہے تھے جب آپ سامانِ حرب تیار کر چکے تو حضرت عثمان غنی اس وقت تک قضائے الہی سے شہید ہو چکے تھے اس ظالمانہ قتل عثمان کا گناہ اور بوجھ مصریوں کے سر باقی رہ گیا اللہ جو چاہتا ہے حکم فرماتا ہے اور وہ ہر شئی پر قادر ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

پانچواں قول حضرت علی کی خلافت کا بیان

حضرت عثمان غنی کے شہید ہونے کے بعد حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم امام و خلیفہ مقرر ہوئے صحابہ کرام اور دیگر انسانوں نے جو اس وقت مدینہ منورہ میں حاضر تھے ان کی بیعت کی اور آپ کی خلافت متحقق ہو گئی اور (اس وقت) حضرت علی ہی اس خلافت کے لیے اولیٰ اور اہق تھے۔ حضور نے فرمایا تھا: ”اللہم ادر الحق مع علی“ الہی! حق کو علی کے ساتھ دائر کر۔ نیز حضور اقدس ﷺ سے مروی ہے آپ نے فرمایا: جہاں علی جائیں ان کے ساتھ حق ہے۔ حضرت علی نے کبھی ایسا کام نہیں کیا جو موجب انکار ہو اسی لیے کسی صحابی نے انکار نہیں کیا۔ پھر اس امر کی دلیل کہ عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بعد حضرت مولیٰ علی کرم اللہ وجہہ الکریم امام برحق تھے یہ ہے کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کنکر اٹھائے تو ان کنکریوں نے حضور کے ہاتھ مبارک میں تسبیح کی اور وہ ان کی تسبیح سنی جاتی تھی وہ یہ پڑھتی تھیں: ”سبحان اللہ والحمد للہ“ اللہ تعالیٰ پاک ہے اور تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں۔ پھر وہ کنکریاں رکھ دیں اور ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا: تم ان کنکریوں کو اٹھاؤ۔

جب انہوں نے کنکریوں کو اٹھایا تو آپ کے ہاتھ میں تسبیح (یعنی سبحان اللہ والحمد للہ کا ورد) کرنے لگیں۔

اسی طرح حضرت عمر، حضرت عثمان غنی، حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے ہاتھوں میں تسبیح کرتی تھیں۔ اس مجلس میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی تھے حضور اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: اے ابوذر! تم بھی اٹھاؤ، جب انہوں نے اٹھائیں تو ان کے ہاتھوں میں تسبیح نہیں کی۔ ابوذر نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! یہ کیا بات ہے کہ ان حضرات کے ہاتھ میں کنکریوں نے تسبیح کی اور میرے ہاتھ میں تسبیح نہیں کی؟ فرمایا: اے ابوذر! تم خلفاء راشدین (علیہم الرضوان) کے برابر ہونا چاہتے ہو؟ تو نبی کریم ﷺ نے ان چاروں کو خلفاء راشدین فرمایا اور علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان میں داخل ہیں، تو ثابت ہوا کہ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلیفہ برحق تھے۔

چھٹا قول

اس بارے میں کہ بعض صحابہ کو بعض صحابہ پر فضیلت حاصل ہے

اہل سنت و جماعت فرماتے ہیں: نبیوں، رسولوں اور فرشتوں کے بعد مخلوق میں سب سے افضل ابو بکر صدیق ہیں، پھر عمر فاروق، پھر عثمان غنی، پھر علی رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔ ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: سنت سے ثابت ہے کہ شیخین (یعنی ابو بکر و عمر) کو تو فضیلت دے اور ختین (دونوں دامادوں یعنی عثمان و علی) سے محبت کرے اور ان ہی سے روایت ہے کہ فرمایا: تم ابو بکر و عمر کو فضیلت دو اور عثمان و علی سے محبت کرو۔ ایک روایت میں ہے کہ علی و عثمان سے محبت کرو اور حضرت علی کی فضیلت حضرت عثمان پر وارد نہیں اس لیے کہ ترتیب فی الذکر ترتیب فی الحکم (یعنی اس روایت میں علی کا نام مبارک عثمان غنی سے چونکہ پہلے مذکور ہے، لیکن اس سے یہ دلیل نہیں دی جاسکتی کہ ان کو عثمان پر فضیلت حاصل ہے کیونکہ ذکر میں پہلے کسی نام کا آجانا فضیلت کی دلیل نہیں ہوتی) کو واجب نہیں کرتی۔

فقہاء کی ایک جماعت سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ صحابہ کرام کے متعلق ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے زیادہ اچھا قول ہم نے نہیں دیکھا۔

جیسا کہ علی ابن ابی طالب سے مروی ہے کہ آپ کو فہ میں منبر پر تشریف فرما تھے آپ کے صاحبزادہ محمد بن حنفیہ نے کہا کہ اس امت میں حضور کے بعد بہترین شخص کون ہے؟ حضرت علی نے فرمایا: ابو بکر صدیق! کہا: پھر کون؟ فرمایا کہ عمر! کہا: پھر کون؟ فرمایا: عثمان! کہا: پھر کون؟ تو حضرت علی خاموش ہو گئے! پھر فرمایا کہ اگر تم چاہتے ہو کہ میں تمہیں چوتھے کی خبر دے دوں؟ لیکن پھر حضرت علی خاموش ہو گئے! اس پر آپ کے صاحبزادہ محمد نے کہا: آپ ہیں؟ تو حضرت علی نے تواضعاً فرمایا: تیرا باپ ایک شخص ہے مسلمانوں میں سے اور نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ حضور نے ارشاد فرمایا: میں علم کا شہر ہوں اور اس کی بنیاد ابو بکر ہے اور اس شہر کی دیوار عمر ہیں اور اس کی چھت عثمان ہیں اور اس کا دروازہ علی ہیں اور بسند صحیح ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ ہم حضور ﷺ کے ساتھ بیٹھے تھے کہ ابو بکر آ گئے، حضور اقدس ﷺ نے فرمایا: مرحبا! اس کو جو اپنے جان و مال سے مجھ کو ایثار کرتا ہے۔

پھر عمر فاروق آئے تو فرمایا: مرحبا! میرے وزیر کو مرحبا! حق و باطل میں فرق کرنے والے پر مرحبا! اس کو جس کے ذریعہ اللہ نے دین کو کامل کیا اور جس کے واسطے تمہارا نام مؤمنین رکھا۔ پھر عثمان غنی آئے تو فرمایا: مرحبا! میرے داماد کو! میری بیٹی کے شوہر کو! وہ جس کے لیے اللہ نے دونوں جمع کیے، وہ جو سعید اور شہید ہے، ویل (ہلاکت و جہنم) ہے اس کے قاتل کے لیے۔

پھر حضرت علی آئے تو فرمایا: مرحبا! میرے بھائی اور میرے چچا کے بیٹے کو اور میرے بیٹے کے باپ کو اور میں اور وہ ایک ہی نور سے پیدا ہوئے۔

اے لوگو! ان چاروں کی محبت جمع نہ ہوگی مگر مؤمن کے دل میں اور جس کے دل میں ان کی محبت نہ ہوگی وہ منافق ہے جو ان سے محبت کرے گا تو وہ مجھ سے محبت کرے گا اور جو ان سے بغض رکھے گا تو وہ مجھ سے بغض رکھے گا۔ یہ چاروں مؤمنوں کے دنیا و آخرت میں سردار ہیں! ان سے بغض رکھنے والا شقی (بد بخت) ہے اور ان سے محبت کرنے والا مؤمن اتقی ہے! الہی! میں نے تبلیغ کر دی تو دیواروں کی جانب اور عقبہ باب مسجد سے آواز آئی کہ الہی جو ان

سے بغض رکھے ان پر لعنت کر تو دیواروں نے کہا: آمین! اس معجزہ کو دیکھ کر اس دن میں یہودی اور پچاس منافق ایمان لائے اور فضائل صحابہ بے شمار ہیں۔

ابوبکر تمام صحابہ سے افضل ہیں

اس کی دلیل کہ ابوبکر صدیق سب صحابہ کرام سے افضل ہیں وہ حدیث ہے کہ حضور نے فرمایا: ابوبکر کو فضیلت زیادہ نمازیں پڑھنے اور کثرت سے روزے رکھنے کی وجہ سے نہیں ہے یعنی کثرت صوم و صلوٰۃ ان کی وجہ فضیلت نہیں ہے بلکہ (ان کی وجہ فضیلت) ایک چیز ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں بھر دی ہے۔ ایک روایت ہے کہ صحابہ کرام حضور ﷺ کے در اقدس پر جمع ہوئے اور ان میں ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نہیں تھے ہر ایک اپنی فضیلت بیان کرتا تھا جب آوازیں بلند ہوئیں۔ حضور ﷺ کا شانہ اقدس سے باہر تشریف لائے اور فرمایا: کیا باتیں کرتے تھے کہ تمہاری آواز بلند ہوئی؟ عرض کیا: ہم فضیلت کا ذکر کرتے تھے فرمایا کہ تم میں ابوبکر بھی تھے یا نہیں؟ عرض کی: نہیں فرمایا: پھر تم میں کسی کو فضیلت نہیں۔ اگر کہا جائے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے افضل تھے اس لیے کہ انہوں نے کبھی شرک نہیں کیا اور بت پرستی نہیں کی۔

جو ابابہم کہیں گے کہ یہ صحیح نہیں حضرت علی تبعاً للوالدین پہلے مسلمان نہ تھے اور اگر وہ غیر مسلم نہ تھے تو دعوت اسلام کی ضرورت نہ ہوتی حالانکہ حضور نے ان پر اسلام پیش کیا اگر وہ مسلمان ہوتے تو اسلام پیش کرنے کی حاجت نہیں ہوتی پھر جب ان کا اسلام صحیح ہے تو یہ بھی صحیح ہے کہ ان کا کفر ثابت ہے والدین کی تبعیت میں۔

تو ہم کہتے ہیں کہ ابوبکر افضل الصحابہ ہیں پھر عمر فاروق پھر عثمان غنی پھر علی رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔ پھر چاروں خلفاء راشدین کے بعد افضل الناس اہل بیت ہیں اور اہل بیت وہ حضور کے گھر والے ہیں اور پھر وہ جن کو جنت کی بشارت و شہادت دی پھر اہل بدر پھر اہل حدیبیہ پھر بقیہ صحابہ کرام تمام امت سے افضل ہیں۔ پھر تابعین پھر تبع تابعین جیسا کہ نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ فرمایا: "خیر القرون قرنی" یعنی بہترین زمانہ میرا ہے پھر صحابہ کا پھر تابعین کا پھر تبع تابعین پھر اس کے بعد جھوٹ عام ہو جائے گا کہ کذب و دروغ گوئی پھیل جائیں گے (یہ طویل حدیث ہے)۔

حضرت عائشہ کی فضیلت

ام المؤمنین حضرت سیدہ عائشہ صدیقہ عقیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا تمام جہان کی عورتوں سے افضل ہیں جو گزر چکی ہیں اور جو موجود اور آنے والی ہیں سب سے افضل ہیں اور جو حضرت سیدہ فاطمہ الزہراء رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو حضرت عائشہ صدیقہ عقیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے علی الاطلاق افضل کہے تو یہ شیعہ و روافض کا مذہب ہے بلکہ حضرت عائشہ صدیقہ عقیقہ افضل ہیں اگرچہ حضرت فاطمہ کا نسب افضل ہے جیسے حضرت ابوبکر صدیق حضرت علی سے افضل ہیں اگرچہ حضرت علی ہاشمی ہیں اور بنی ہاشم کا نسب بنی تمیم کے نسب سے افضل ہے۔

رافضیوں نے کہا کہ اہل بیت وہ حضرت علی اور فاطمہ و حسن و حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہم ہیں اور یہ صحابہ کرام سے بھی افضل ہیں اور علی صحابہ میں داخل نہیں اس لیے کہ وہ قرابت دار ہیں اور اصحاب غیر رشتہ دار و قرابت دار سے ہوتے ہیں اور حضرت علی نبی کریم ﷺ کے بعد سب سے افضل ہیں اور وہ (علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ) صحابہ میں سے نہیں اور صحابہ میں افضل ابوبکر صدیق ہیں لیکن ان کا قول مردود ہے اس لیے کہ حضرت علی صحابہ سے تھے۔ دلیل یہ ہے کہ حضور نے فرمایا کہ ”اصحابی كالنجوم بايهم اقتديتم اهتديتم“ میرے اصحاب ستاروں کی مانند ہیں تم جس کی پیروی کرو ہدایت پا جاؤ گے اور حضرت علی بھی ان میں داخل ہیں۔

اور اگر ہم یہ کہیں کہ علی ان میں داخل نہیں تو اس میں ان کی توہین و منقصت ہے تو صحیح وہی ہے جو ہم نے کہا کہ ابوشکور سالمی (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) فرماتے ہیں کہ میں رافضیوں میں پھنس گیا اور میں ان سے زد و کوب کے خطرہ سے کانپ رہا تھا انہوں نے مجھ سے پوچھا: حضور کے بعد سب سے افضل کون ہے؟ میں نے جواب دیا کہ نبی کریم ﷺ کے اصحاب میں ابوبکر اور اہل بیت میں حضرت علی افضل ہیں یہ سن کر بہت خوش ہوئے اس لیے کہ وہ علی کو اصحاب میں داخل نہیں مانتے۔ علی کرم اللہ وجہہ الکریم کو اہل بیت میں داخل مانتے ہیں اور اہل بیت افضل الصحابہ ہیں۔ میرا عقیدہ (دل میں گمان) یہ تھا کہ علی اصحاب میں داخل ہیں اور اہل بیت بھی ہیں اور ابوبکر ان سے افضل ہیں اور خلفاء راشدین اہل بیت سے افضل ہیں اور روایت ہے کہ ایک رافضی قاضی ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ ان چار

کے بارہ میں آپ کیا فرماتے ہیں کہ پانچویں ان کے نبی چھٹے ان کے جبریل صلوات اللہ علیہم اجمعین ہیں۔ اس کی مراد اصحاب نہیں تھے ابو یوسف قاضی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پہچان لیا کہ یہ ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ پر طعن کرتا ہے تو آپ نے برجستہ فرمایا: تو ان دو کے بارے میں کیا کہتا ہے جن کا تیسرا خدا ہے وہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے: "ثَانِي اثْنَيْنِ اِذْهُمَا فِي الْغَارِ" (التوبہ: ۴۰) دونوں میں سے دوسرا جب وہ دونوں غار میں تھے۔ اور فرمایا: "اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا" (التوبہ: ۴۰) بے شک اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے۔

اور ہم سب کا اجماع ہے کہ جو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حضور ﷺ کا صحابی نہ مانے وہ کافر ہے اس لیے کہ وہ اس نص قرآنی کا منکر ہے کہ "اِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ" (التوبہ: ۴۰) جب آپ فرما رہے تھے اپنے ساتھی (صحابی) سے کہ غم نہ کر اور یہی قول حضرت امام شافعی کا ہے اور محمد ابن حسن سے بھی ایسے ہی مروی ہے۔ اور بعض فقہاء کافر نہیں کہتے اس لیے کہ نص میں یہ وارد نہیں کہ یہاں صاحب سے مراد ابو بکر صدیق ہیں۔

فضیلت ابو بکر آیت مصداق ابو بکر میں

اور روایت ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضور ﷺ نے ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا: "لَقَدْ بَلَّغْتَ مِنَ اللّٰهِ مَبْلَغَ الْاِفْتِخَارِ حَيْثُ اِثْنِي عَلِيكَ الْمَلِكُ الْجَبَّارُ" بقولہ "ثَانِي اثْنَيْنِ اِذْهُمَا فِي الْغَارِ" یعنی اے ابو بکر! تم مبلغ افتخار کو پہنچے کہ ملک جبار (اللہ جل جلالہ کے فرشتے) جل جلالہ نے فرمایا: ان دو میں کا دوسرا جب کہ وہ دونوں غار میں تھے۔

عربوں سے محبت کی تین وجوہ

یہ اظہر من الشمس اور اجلی من الامس ہے کہ غار ثور میں بالاتفاق ہجرت کے دن حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی حضور ﷺ کے ہم رکاب اور رفیق سفر تھے۔ پھر عرب موالی سے تین وجوہ سے افضل ہیں:

- (۱) پہلی وجہ تو یہ ہے کہ قرآن پاک عربی زبان میں نازل ہوا۔
- (۲) دوسری وجہ یہ ہے کہ حضور ﷺ بھی عربی ہیں۔

(۳) اور حضور ﷺ ربیعہ و مضر سے تھے اور پھر قریش سے تھے اس لیے بھی عرب کو شرف و بزرگی حاصل ہے۔

عربوں سے محبت رکھنے والا جنتی اور بغض رکھنے والا دوزخی ہے

اور نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا: تم مجھ سے بغض نہ رکھنا ورنہ جہنم میں جاؤ گے۔ سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کی: حضور! میں کس طرح بغض رکھ سکتا ہوں؟ خدا نے آپ کی بدولت مجھ کو ہدایت بخشی ہے۔ فرمایا: جب تو عرب سے بغض رکھے گا تو گویا مجھ سے بغض رکھتا ہے اور حضور نے فرمایا: عرب کی محبت ایمان کا حصہ ہے تو ہم عرب سے محبت رکھتے ہیں اللہ کے لیے اور رسول کے لیے کہ وہ (رسول) انہی سے بھیجے گئے۔

ساتواں قول

حضرت معاویہ کی امارت، بغاوت اور ان کے

پیچھے لگنے والوں کا بیان

اہل سنت و جماعت فرماتے ہیں کہ حضرت مولیٰ علی کرم اللہ وجہہ الکریم کی زندگی مبارک میں حضرت معاویہ اور ان کے ساتھ جو صحابہ تھے وہ سب دعویٰ امارت اور بیعت میں خطاوار تھے اور حضرت علی کے ساتھ مقاتلہ میں سب باغی تھے۔

حضرت معاویہ خطاوار تھے

اور یہ جو ہم نے کہا کہ حضرت معاویہ اور ان کے ساتھی خطاوار تھے اس کی دلیل یہ ہے کہ انہوں نے جو اجتہاد میں خطا کی ہے وہ محل اجتہاد میں خطا کی ہے نہ کہ وقت اجتہاد میں کیونکہ حضرت معاویہ حضرت مولیٰ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بعد خلافت کے اہل تھے اگر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان سے پہلے خلیفہ نہ ہوتے تو اس وقت ان کی خلافت صحیح تھی اس لیے کہ معاویہ قریشی ہیں۔

اور حضور ﷺ نے حضرت معاویہ سے فرمایا تھا: جب معاویہ حضور کے ہاں داخل ہوئے: اے معاویہ! جب تم والی بنائے جاؤ تو میری امت کے ساتھ رفیق و نرمی کرنا اور حضرت معاویہ کے دل میں یہ بات پیدا ہوئی کہ میں مستحق خلافت ہوں اس لیے قبل از وقت خلافت کے مدعی ہوئے اور من وجہ (ایک پہلو سے) مصیب (برحق) تھے اس لیے کہ خلافت کے اہل تھے اور من وجہ (ایک پہلو سے) خطا کی اس لیے کہ (اس وقت) خلافت و بیعت حضرت علی کا حق تھا اور حضرت علی ان سے سابق اور افضل و احق تھے کہ خلافت ان کی ہو، مومن علی کے وقت کسی کو خلافت کرنا جائز نہ تھا۔ حضرت معاویہ کی خلافت اور قریش میں سے دوسرے لوگوں کی خلافت کا وقت حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بعد تھا۔

حضرت معاویہ باغی تھے؟

اور ہمارا یہ کہنا کہ حضرت معاویہ حضرت علی سے جنگ کرنے میں باغی تھے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”وان طائفتان من المؤمنین اقتلوا فاصلحوا بینہما فان بغت احدہما علی الاخری فقاتلوا الی تبغی حتی تفی الی امر اللہ“ (الہجرات: ۹) اور اگر مومنوں میں سے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان دونوں کے درمیان صلح کرادو، پس اگر دونوں میں سے ایک دوسرے سے سرکشی کرے تو جو سرکشی کرے اس سے لڑو حتیٰ کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی طرف رجوع کر لیں۔ اللہ تعالیٰ نے طائفوں میں سے ایک کو باغی فرمایا، پس جو حق پر نہ ہو وہ باغی اور اس پر دلیل کہ وہ باغی تھے یہ ہے کہ قاضی جلیل ابن احمد بخاری سمرقندی نے نبی کریم ﷺ سے روایت کی کہ حضور نے عمار ابن یاسر سے فرمایا تھا: ”تقتلک الفتنۃ الباغیۃ“ کہ تجھے باغی گروہ قتل کرے گا اور ان کو حضرت معاویہ کے لشکر نے شہید کیا تو حضور اقدس ﷺ نے اس لشکر کا نام باغی رکھا۔

ابوحنیفہ اور حبّ علی

امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ اپنے اصحاب و تلامذہ سے فرمایا کہ تم جانتے ہو کہ اہل شام ہم سے کیوں بغض رکھتے ہیں؟ انہوں نے کہا: نہیں۔ فرمایا: اس لیے کہ ہم یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اگر ہم اس زمانہ میں ہوتے تو حضرت معاویہ کے مقابلہ میں حضرت علی کی مدد کرتے اور ان کے ساتھ ہو کر حضرت معاویہ سے

حضرت علی کی حمایت میں جنگ کرتے۔

بایں ہمہ (ان سب باتوں کے باوجود) ہم کہتے ہیں کہ باغی کی نہ ہم تکفیر کرتے ہیں نہ تفسیق اس دلیل سے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”وان طائفان من المؤمنین اقتلوا“ یعنی دونوں گروہوں کو مؤمن فرمایا اور دو طائفے یہی حضرت معاویہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کے لشکری ہیں۔

اور نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ حضور نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ”ان ابنی هذا سید سیصلح اللہ بہ بین الفتنین من المؤمنین“ یہ میرا بیٹا سردار ہے اور عنقریب اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے دو مسلمان جماعتوں میں صلح کرادے گا۔ تو نبی کریم ﷺ نے دونوں جماعتوں کو مؤمن فرمایا اور اس میں دلیل ہے کہ حضرت علی کے بعد حضرت معاویہ کو خلافت کا حق تھا اس لیے کہ حضور نے ان دونوں کے درمیان صلح کو جائز رکھا اور حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ صلح کرنے کے بعد عادل ہو گئے۔

ہم کہتے ہیں کہ باغی کی تفسیق نہیں کی جائے گی اس لیے کہ اس کی شہادت بالاتفاق جائز ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ باغی اپنے دعویٰ میں مأؤل ہوتا ہے۔

باغی کسے کہتے ہیں؟

باغی کی تعریف یہ ہے کہ وہ اپنا حق طلب کرتا ہے شبہ کے ساتھ اور حضرت معاویہ کو اپنے دعویٰ میں شبہ ہو گیا تھا اور وہ تاویل کرتے تھے اور تاویل کرنے میں ان لوگوں نے خطا کی اور ان کی خطا کبیرہ گناہ نہیں حتیٰ کہ مرتکب کبیرہ کی تفسیق کی جائے یا تکفیر۔

پھر حضرت معاویہ کے ساتھ کچھ صحابہ کرام بھی تھے جیسے حضرت طلحہ، حضرت زبیر، ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ عقیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور ان کے متعلق ہم اس بات کا وہم بھی نہیں کر سکتے کہ وہ دیدہ و دانستہ ایسے امر کے مرتکب ہوں جو موجب فسق و کفر ہو باوجودیکہ یہ لوگ اہل دیانت اور صاحب فقہ و دانش تھے پھر اس پر اصرار بھی کریں حالانکہ یہ سب عادل اور فقیہ و مجتہد تھے اور اس لیے بھی کہ باغی کی جانب سے ایام جمعہ، جماعت، صلوات، حج اور تولیت قضاء وغیرہ کی ولایت جائز ہے ثابت ہوا کہ وہ فاسق نہیں تھے۔

پھر حضرت معاویہ کی توبہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کے زمانہ میں ظاہر نہیں ہوئی لیکن حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت معاویہ سے صلح کر لی تھی اس بناء پر ہم کہتے ہیں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر لعن و طعن جائز نہیں اس لیے کہ حضرت علی نے صلح کر لی تھی اور اگر وہ مستحق لعنت ہوتے تو ان سے صلح کرنا جائز نہ ہوتا۔

پھر حضرت طلحہ اور حضرت زبیر نے بغاوت سے توبہ کر لی اور رجوع کر لیا اور ان کی توبہ ظاہر ہو گئی اسی بناء پر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت زبیر کے جنازہ کی نماز پڑھی کہ وہ بغیر بغاوت ناحق قتل کیے گئے اور حضرت زبیر لشکر معاویہ سے نکل کر اپنے شہر جا رہے تھے حضرت علی کے لشکر کے ایک آدمی نے ان کو قتل کر دیا اور اس کو معلوم نہ تھا کہ یہ توبہ کر کے جا رہے ہیں لاعلمی میں قتل کر کے ان کا سر حضرت علی کے سامنے اٹھا کر لے گیا تو علی کرم اللہ وجہہ الکریم نے یہ حدیث پڑھی کہ حضور نے فرمایا ہے: "قاتل الزبیر فی النار" زبیر کا قاتل جہنم میں ہوگا اور قصہ لمبا ہے۔ کتب سیر و تاریخ میں مذکور ہے۔

ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ عقیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا لشکر معاویہ میں تھیں لیکن آپ بغاوت کے لیے نہیں نکلیں بلکہ مصالحت کے لیے تشریف لائیں تھیں۔ یہ جو بعض لوگوں نے کہا کہ حضرت کے مقابلہ میں بغاوت کے لیے نکلیں صحیح نہیں لہذا ہم کہتے ہیں کہ وہ لشکر معاویہ سے واپس ہو گئیں انہوں نے بغاوت نہیں کی اور اس کا تو ہم تصور بھی نہیں کر سکتے کہ وہ باوجود علم و فصاحت اور فتنہ و فراست کے حضرت علی پر بغاوت کے لیے دل سے راضی ہوئی ہوں ایسا وہم بھی نہیں کیا جاسکتا اس لیے کہ انہوں نے حضور اقدس ﷺ سے سنا تھا کہ حضرت علی سے فرمایا: تم سے محبت نہ کرے گا مگر مؤمن اور تم سے بغض نہ رکھے گا مگر منافق تو ایسے میں ناممکن ہے کہ وہ بغاوت کی وجہ سے تشریف لائیں اس کا وہم بھی نہیں ہو سکتا۔

آٹھواں قول

حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کا بیان

اہل سنت و جماعت کہتے ہیں کہ حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ حق پر تھے اور ظلماً

شہید کیے گئے۔

اور محققین کہتے ہیں کہ حضرت حسین باغی تھے انہوں نے اپنے امام پر خروج کیا۔ ہمارا اس پر اجماع ہے کہ خلافت حضرت علی کے بعد حضرت معاویہ کے لیے تھی اور حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان سے مصالحت کر لی اور حضرت معاویہ کی تمام مسلمانوں کے ساتھ بیعت کر لی اور تمام صحابہ کرام نے بیعت کر لی۔

کیا یزید کو خلافت کا حق تھا؟

یزید ابن معاویہ کے متعلق بعض حضرات کہتے ہیں کہ یزید کی خلافت حضرت معاویہ کے خلیفہ بنانے سے تھی اور صحابہ و مسلمانوں کی بیعت سے تھی تو قیاس کی رو سے حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر یزید کی بیعت واجب تھی اور اسی طرح تمام مسلمانوں پر کہ وہ یزید کی بیعت کریں۔

مگر ہم یہ کہیں گے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ عالم متدین تھے فاسق نہ تھے ان میں دیانت تھی اور اگر وہ متدین نہ ہوتے تو ہرگز ان سے صلح نہ کی جاتی اور ان سے سوائے بغاوت کے اور کوئی بات نہیں پائی گئی۔ پھر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے مصالحت کی اس لیے کہ دورانِ بغاوت میں مسلمانوں پر ظلم نہیں کیا اور وہ مدعی حق تھے اور اللہ کے دین میں اور لوگوں کے معاملات میں عادل تھے اور یزید اس کے برخلاف تھا اس لیے کہ مروی ہے کہ وہ شرابی تھا اور لہو و لعب کا رسیا تھا گانے بجانے کا حکم کرتا تھا حق داروں کے حق کو روکتا تھا اور فسق و فجور کرتا تھا۔

بعض فقہاء نے فرمایا کہ امام جب فسق و فجور میں مبتلا ہو تو بغیر عزل (معزول و برطرف کرنا) کے خود معزول ہو جاتا ہے اس لیے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ فاسق اہل شہادت نہیں اور جب وہ اہل شہادت نہیں تو اہل ولایت کس طرح ہو سکتا ہے اور اہل حکم (حکمران) کس طرح ہو سکتا ہے؟ اور امام کو جائز ہے کہ سوائے حدود کے اپنی ذاتی رائے اور ذاتی علم کی بناء پر حکم کرے پھر فاسق جب کہ اس کا علم دوسروں پر بوجہ شہادت کے نافذ نہیں تو ایسے ہی بوجہ ولایت کے بھی نافذ نہیں ہوگا اس لیے کہ ولایت شہادت سے اقویٰ ہے۔

جب وہ فاسق مردود الشہادۃ ہے تو اس کی امارت و ولایت بھی ناجائز ہوگی۔ دوسری

بات یہ ہے کہ یہ صحیح نہیں کہ حضرت معاویہ نے اس کو خلیفہ بنایا، دلیل یہ ہے کہ اگر اس کو خلیفہ بنایا ہوتا تو وہ عمرو بن العاص سے بیعت طلب نہ کرتا، پھر بیعت صحابہ و مسلمین یزید پر متفق نہیں، جیسے عبداللہ ابن زبیر اور محمد بن حنفیہ اور حسین ابن علی اور بہت سے اہل بیت یزید پر متفق نہیں ہوئے۔ ثابت ہوا کہ وہ امام عادل نہ تھا۔ اس سے واضح طور پر معلوم ہو گیا کہ امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہرگز باغی نہ تھے اور انہوں نے امام برحق پر خروج نہیں کیا، اس کی دلیل درج ذیل ہے:

یزید یوں کو حضور نے باغی فرمایا تھا

جب حضرت امام حسین پیدا ہوئے تو حضور اقدس ﷺ آبدیدہ ہو گئے، عرض کیا گیا: حضور! آپ کے رونے اور گریہ فرمانے کا سبب؟ فرمایا: اس کو (یعنی حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو) باغی جماعت قتل کرے گی۔ حضور ﷺ نے یزید یوں کو ”فئسۃ باغیۃ“ (باغی گروہ) فرمایا اور ان کا نام باغی رکھا، ثابت ہوا کہ حضرت امام حسین حق پر تھے۔

یزید مستحق لعنت ہے؟

اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ یزید پر لعنت جائز ہے یا نہیں؟

- (۱) بعض نے کہا: لعنت جائز نہیں اس لیے کہ کئی سال تک مسلمانوں کا امام بنا رہا۔
- (۲) بعض نے کہا کہ یزید پر لعنت جائز ہے، اس لیے کہ اس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کیا کہ امام حسین کے قتل کو جائز رکھا اور اس پر راضی ہوا۔
- (۳) اور بعض نے کہا کہ یزید نے لوگوں کو امام حسین کے قتل کا حکم نہیں دیا تھا بلکہ حکم دیا تھا کہ ان سے بیعت لے لو یا ان کو اٹھا کر میرے پاس لے آؤ۔ ان خوشامدیوں اور بد بختوں نے اس کے حکم کے بغیر قتل کر دیا اور یہ بھی ثابت نہیں کہ وہ قتل حسین پر راضی ہوا۔ پس صحیح یہ ہے کہ اگر یزید نے قتل حسین کا حکم دیا اور ان کے قتل پر راضی ہوا اور اس نے اہل بیعت پر لعنت کو جائز رکھا تو یزید پر لعنت جائز ہے ورنہ پھر نہیں۔

اور ایسے ہی جس نے قتل کیا اور قتل کو حلال نہیں سمجھا اس پر بھی لعنت جائز نہیں اور قتل

حلال سمجھا تو وہ کافر ہے، اس پر لعنت بھی جائز ہے۔ واللہ تعالیٰ جل شانہ! علم حقیقہ الحال

نواں قول

عباسیوں کو خلافت سوچنے کا بیان

اہل سنت و جماعت فرماتے ہیں کہ خلافت بنی عباس کے لیے حق ہے اور ان کا حکم نافذ

ہوگا۔

روافض اور مسئلہ خلافت

رافضیوں نے کہا کہ خلافت اولادِ علی کرم اللہ وجہہ الکریم کے لیے ہے، کسی کی خلافت قبول کرنا جائز نہیں اور وہ بنی عباس پر لعنت کرتے ہیں کہ انہوں نے خلافت قبول کیوں کی اور ان کے یہاں جب تک اولادِ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے مخالفوں پر لعنت نہ کرے نماز جائز نہیں۔

اور (روافض) کہتے ہیں کہ لعنت کرنا ان پر واجب ہے اور جو ان سے دوستی کرے ان پر بھی لعنت واجب ہے اور یہ صحیح نہیں اس لیے کہ خلافت دو حال سے خالی نہیں بطور وراثت ہوگی یا بطور تفویض ہوگی۔ اگر بطور توریث ہو تو عباس چونکہ حضور ﷺ کے چچا ہیں وہ بہ نسبت علی کے کہ وہ چچا زاد بھائی ہیں، خلافت کے زیادہ حق دار ہیں کہ چچا کے ہوتے ہوئے بھائی مستحق میراث نہیں اور اگر تفویض کے طور پر ہے تو خلافت حضرت صدیق اکبر کو سپرد کی گئی۔

خلافت میراث نہیں

پھر اس کی دلیل کہ خلافت میراث نہیں اس لیے کہ حضرت عباس و علی اور ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے حضرت صدیق اکبر کی بیعت کی، سب اس بیعت پر متفق تھے اور راضی تھے تو یہ چیز دلالت کرتی ہے کہ خلافت تفویضاً تھی، تو رہا نہ تھی۔

پھر جب امت کی طرف سے تفویض خلافت حضرت صدیق اکبر اور حضرت عمر اور حضرت عثمان غنی اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے لیے جائز ہوتی تو امت کی طرف سے تفویض خلافت اولادِ عباس کے لیے بھی جائز ہوتی، اس لیے کہ یہ قریشی ہیں اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے: "الانمة من قریش" خلفاء قریش ہوں گے۔

پھر جب کہ اجماع امت حجت ہے اور تفویض خلافت مستحق خلافت کو صحیح ہے تو اس میں کوئی فرق نہیں کہ صحابہ کرام تفویض کریں یا غیر صحابہ تفویض کریں اس لیے کہ اجماع امت معتبر ہے بالا جمال تفصیل کی ضرورت نہیں۔ قرآن کریم میں ہے: "وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا" (البقرہ: ۱۴۳) اور اسی طرح ہم نے تم کو افضل امت بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو جاؤ اور رسول تم پر گواہ ہوں۔ اس میں صحابہ کرام اور غیر صحابہ کرام کی تفصیل اور فرق نہیں اور لفظ "امت" عام ہے سب کو شامل ہے۔ اول سے آخر تک اور ایمان کے حق میں سب مساوی ہیں تو جب تفویض خلافت باجماع متقدمین صحیح ہوئی تو متاخرین کے اجماع سے بھی تفویض خلافت صحیح ہونا چاہیے اس لیے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "لا تجتمع امتی علی الضلالة" میری امت گمراہی پر جمع نہیں ہو سکتی۔

اور جب لوگوں نے اختلاف کیا ہے وہ غرض فاسد کی بناء پر کیا ہے وہ معتبر نہیں جیسے دنیاوی غرض کے لیے اجماع معتبر نہیں تو ثابت ہوا کہ روافض کا خلاف موجب طعن نہیں خلافت بنی عباس میں باوجود اولادِ علی کے اور اگر خلافت اولادِ علی کو ہوتی تو بھی جائز تھی ہم اس کے منکر نہیں۔

اولادِ علی اور بنی عباس میں سے مستحق خلافت کون؟

حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ آپ سے ابو جعفر دو انقی نے سوال کیا کہ مستحق خلافت اور اولیٰ بالخلافت کون ہے؟

امام صاحب نے فرمایا: جعفر بن محمد الصادق پھر جب امامت و خلافت صحیح ہوئی باوجود اس کے کہ ان سے بہتر موجود تھے اور اس لیے کہ امارت کی بناء قہر و غلبہ پر ہے خصوصاً امام ابوحنیفہ کے نزدیک تو جب امامت صحیح ہوئی تو ان کی امارت صحیح ہوئی اور جب امارت صحیح ہوئی تو تقلید و تولیت قضاء نیابت تمام اشغال و اعمال میں صحیح ہوئی اور جمعہ و عیدین اور حج و جہاد ان کی معیت میں جائز ہے اور ان کے جمیع احکام نافذ ہیں جمیع معانی میں جس طرح خلفاء راشدین کے احکام نافذ تھے اور جب جمعہ و عیدین حج اور جہاد کرنا اور جمیع احکام باغی کے ساتھ جائز ہیں تو عادل و مستحق کے ساتھ بہ طریق اولیٰ جائز ہیں۔

اور بعض فقہاء نے فرمایا کہ حضرت علی اور حضرت معاویہ کے بعد عادل و باغی کے درمیان پہچان نہ رہی اور لیکن یہ قول صحیح نہیں ہے اس لیے کہ اگر یہ بات صحیح ہو تو مسلمانوں کے تمام لشکروں پر بغاوت کا حکم جاری کیا جائے کیونکہ بعض نے بعض کے ساتھ مقاتلہ کیا تو چاہیے کہ بغاوت کی وجہ سے مسلمان لشکروں کا خون مباح ہو جائے اور یہ صحیح نہیں۔

اور بعض لوگوں نے کہا کہ امام جب تک مطاع نہ ہو اور اسے قہر و غلبہ حاصل نہ ہو وہ امام نہیں ہو سکتا۔ ہم نے جواباً کہا: یہ صحیح نہیں کیونکہ طاعت امام لوگوں پر قرض ہے اور لوگ امام کی اطاعت نہ کریں تو وہ گنہگار ہوں گے اور ان کی نافرمانی اور عصیان امامت کو نقصان نہیں دیتے پھر لوگوں کے تمرُّد و سرکشی کی وجہ سے امام کو غلبہ حاصل نہ ہو تو اس کی امامت کو ٹھیس نہیں لگتی، کیا تم نے نہیں دیکھا کہ ابتداء اسلام کے وقت حضور ﷺ کی اطاعت سب نے نہیں کی اور دشمنوں پر غلبہ اور قہر بھی ممکن نہ تھا اور کافروں نے تمرُّد و سرکشی کی آپ کی امداد اور نصرت دین سے اعراض کیا تو کیا ہوا؟ حضور کی امامت و سیادت میں کیا فرق آیا اور معاذ اللہ ثم معاذ اللہ نبوت سے معزول نہ ہوئے تو اسی طرح امام برحق کی کوئی مخالفت کرے تو امامت سے معزول نہیں کیا جاسکتا اس لیے کہ خلیفہ اور امام لامحالہ حضور کا خلیفہ و نائب ہوتا ہے اور ایسے ہی حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم تمام مسلمانوں کے مطاع نہیں تھے اور باوجود اس کے وہ معزول نہیں ہوئے تو جو ہم نے کہا وہ صحیح ہے اور بالفرض تمام مسلمان مرتد ہو جائیں العیاذ باللہ تو امام اپنی امامت سے معزول نہیں ہوتا تو اسی طرح ان کی عصیان و نافرمانی سے معزول نہیں ہونا چاہیے۔ پھر امراء و سلاطین کے تمام نائبین کی نیابت صحیح ہوتی ہے اگرچہ وہ ظلم و جور کریں اور ان کا حکم نافذ ہوتا ہے سوائے اللہ کی معیت کے قرآن پاک میں ہے: "أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ" (النساء: ۵۹) اللہ اور رسول اور تم میں سے حکمرانوں کی پیروی کرو تو جیسے امام کا امر واجب الاتباع ہے اسی طرح اس کے نائب کا امر واجب الاتباع ہے اس لیے کہ امام کا نائب شرع کی جانب سے بہ منزلہ امام کے ہوتا ہے۔ پھر امام کے امر کو ترک کرنا اور اس پر خروج کرنا عصیان و بدعت کا موجب ہے تو اسی طرح نائب کے حق میں عدم اطاعت امر اور بغاوت موجب بدعت و نافرمانی ہے۔ دلیل یہ ہے کہ محمد بن سلام نے عبدالرحیم ابن یزید قتی سے اور انہوں نے چالیس تابعین سے جنہوں نے

ایک بدری یا دو بدریوں سے ملاقات کی سب کے سب حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا: سات (صفات) ہدایت کی ہیں اور ان میں نجات ہے جو ان سے نکلا وہ جماعت سے خارج ہو گیا۔

کسی اہل قبلہ کی کفر و شرک اور نفاق پر گواہی نہ دو ان کے باطن اور اندرونی معاملات کو اللہ کے سپرد کر دو اور جو اہل قبلہ سے مر جائے اس کی جنازے کی نماز نہ چھوڑو اور جمعہ اور پنجگانہ نمازیں باجماعت ہر امام کے ساتھ ادا کرو اور ہر خلیفہ کے ساتھ ہو کر جہاد کرو خواہ نیک ہو یا بد تم کو تمہارے جہاد کا ثواب ملے گا اور ان کو ان کے گناہ کی سزا ملے گی اور اپنے امام پر تلوار لے کر خروج نہ کرو اگرچہ وہ جور کریں اور ان کے لیے صلاح و فلاح (نیکی و کامیابی) اور عفو و مغفرت (درگزر و بخشش) کی دعا کرتے رہا کرو اور ان کے حق میں بددعا نہ کرو اور خواہشات نفسانی سے پرہیز کرو اس لیے کہ اس کا اول و آخر آغاز و انجام باطل اور بُرا ہے۔

اور نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ فرمایا: جس نے میری اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے خدا کی نافرمانی کی اور جس نے میرے امیر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی اور جس نے میرے امیر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی اور نبی کریم ﷺ احوال امت کو جانتے تھے اور خداوند تعالیٰ نے حضور ﷺ کو مبین بنا کر بھیجا ہے اور حضور اقدس ﷺ جو کچھ فرماتے ہیں حق فرماتے ہیں اور اس لیے کہ نفی امارت میں اور اس کے چھوڑنے میں احکام کی نفی ہے اور احکام کی تعطیل ہے اور بنو عباس کی خلافت پر امت کا اجماع و اتفاق ہے تو ضروری ہوا کہ ان کی خلافت حق ہو اور ان کے اوامر و نواہی اور احکام نافذ ہوں اور اس کی اصل (دلیل) یہ ہے کہ حضور ﷺ نے اپنے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ اور ان کی اولاد کو جامعہ امارت پہننے کی خبر دی اور ان کو امارت کی خوشخبری دی تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ (امارت) ان کا حق تھا۔



بارہواں باب

اہل السنّت والجماعت اور بدعتیوں کے ردّ کا بیان

اس میں سولہ اقوال ہیں۔

پہلا قول

اس بارے میں کہ دین صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے

ہدایت کا طالب ابوشکور سالمی کہتا ہے کہ دین صرف اور صرف اور خالص اللہ تعالیٰ کے لیے ہے جس کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ”وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ“ (البینہ: ۵) ”اور انہیں صرف اس بات کا حکم دیا گیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں دین کو اسی کے لیے خالص کرتے ہوئے“ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”إِلَّا لِلَّهِ الدِّينُ الْخَالِصُ“ (الزمر: ۳) ”آگاہ ہو جاؤ! دین خالص اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔“

پھر دین (اسلام) یہ اللہ تعالیٰ فرشتوں، رسولوں، نبیوں، اولیاء اللہ اور تمام مسلمانوں کا دین ہے اور جو ان تمام سے جدا ہو وہ دین سے بھٹکنے والا ہوگا اس پر دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: ”وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا“ (آل عمران: ۱۰۳) ”اور تم سب اللہ تعالیٰ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور فرقہ میں نہ پڑو“ یعنی اللہ تعالیٰ کے دین، سنت و جماعت سے جدا نہ ہو جاؤ۔

بہر حال سنت و جماعت سے جدا ہونا بدعت اور گمراہی ہے اور بدعت و گمراہی والا دوزخیوں میں سے ہوگا۔ اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد دلیل ہے: ”وَلَا تُكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا“ (آل عمران: ۱۰۵) ”کہ تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو جدا ہو گئے“۔ پھر فرمایا:

”أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ“ (آل عمران: ۱۰۵) ”یہی لوگ ہیں جن کے لیے بڑا عذاب ہے۔“

اور نبی کریم ﷺ سے روایت ہے کہ عنقریب میری امت میرے بعد تہتر (۷۳) فرقوں میں بھٹ جائے گی سوائے ایک کے سب دوزخی ہیں تو وہ ایک (فرقہ ناجیہ) اہل سنت والجماعت ہیں۔

اور حضرت عبد اللہ بن عمر نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے ارشاد فرمایا: میری امت گمراہی پر کبھی بھی جمع نہیں ہوگی اور یہ کہ اللہ تعالیٰ کا ہاتھ جماعت کے ساتھ ہے اور اسی طرح جماعت پر ہے پس تم بڑی جماعت کی پیروی کرو۔

اور حضرت عبد اللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے ایک دن اپنے دونوں ہاتھوں میں ایک سیدھی لکیر کھینچی اور فرمایا: یہ اللہ تعالیٰ کا دین ہے، پھر (ہتھیلی کے) دائیں اور بائیں کئی خط کھینچے اور فرمایا: یہ کئی راستے ہیں اور ان میں سے ہر راستے پر شیطان ہے جو اپنی طرف دعوت دیتا ہے پھر آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد تلاوت فرمایا: ”وَإِنَّ هَذَا صِرَاطِي مُسْتَقِيمًا فَاتَّبِعُوهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَن سَبِيلِهِ“ (الانعام: ۱۵۳) ”بے شک یہ میرا سیدھا راستہ ہے اس پر چلو اور دوسرے کئی راستوں پر نہ چلو کہ یہ تمہیں سیدھے راستے سے جدا کر دیں گے۔“

پھر سوادِ اعظم (بڑی جماعت) کے اصول رسول اللہ ﷺ کے اصحاب ان کے پیرو تابعین اور تبع تابعین ہیں جیسے حضرت ابوسعید خدری، حسن بن ابوسعید بصری، سفیان ثوری، اوزاعی، علقمہ، اسود، ابراہیم نخعی، شععی، مالک، حماد بن ابویسلی، امام ابوحنیفہ اور متاخرین اور ان کے شاگردوں میں سے جنہوں نے ان کی پیروی کی جیسے ابو یوسف قاضی، محمد بن حسن شیبانی، زفر، حسن بن زیاد، داؤد طائی، محمد بن ادریس شافعی اور ابو عبد اللہ مزنی اور خراسان کے فقہاء میں سے جیسے ابو مطیع بلخی، ابوسلیمان جرجانی، ابو حفص الکبیر بخاری، شقیق بن ابراہیم اور ابراہیم بن ادھم یہ سب امام جعفر بن محمد صادق اور امام ابوحنیفہ کے شاگرد تھے۔

اور فقہاء دین میں سے جس نے ان کی پیروی کی اور رسول اللہ ﷺ کے زمانہ سے آج تک کہ مسلمانوں میں سے ایک جماعت اور انہوں نے صحابہ کرام اور ان کے علاوہ ایک

جماعت کی زبان اور ہاتھوں سے دین کو بغیر کسی تنازع اور اختلاف کے لیا۔ پھر یہ اس بات پر دلیل ہے کہ اہل سنت والجماعت یہی مذکورہ شخصیات ہیں یعنی صحابہ کرام ائمہ اور مسلمین اور ائمہ میں سے جنہوں نے ان کی پیروی کی کیونکہ اہل اہواء اور اہل بدعت بہتر (۷۲) فرقوں میں تقسیم ہو گئے اور ان میں سے ہر فرقہ جب ایک مسئلہ میں اختلاف کرے گا تو اکہتر (۷۱) فرقے ہمارے ساتھ اس بات پر اتفاق کریں گے کہ ایک فرقہ ان کے مقابلہ میں خطا کا رہے اور اپنے دین میں نئی چیز نکالنے والا ہے۔

اور اسی طرح جب دوسرا فرقہ کسی مسئلہ میں اختلاف کرے گا تو پہلا فرقہ اپنی خطا اور بدعت میں ہمارے ساتھ موافقت کرے گا۔

ایک کی مخالفت ایک مسئلہ میں معتبر نہیں، اسی پر رد کر دیا جائے گا تو ثابت ہوا کہ اہل سنت و جماعت صحابہ اور تابعین اور تبع تابعین اور ان کے قبضین کے ساتھ ہیں، قیامت تک فقہاء سے اور مسلمانوں سے اور متابعت و موافقت متحقق ہے، ہمارے مشائخ و ائمہ ہدیٰ بلاد شرق و چین میں فقہاء خراسان اور ماوراء النہر اور بلاد غزنیہ اور دیار ترک میں اور ان سب کے ایک ہی طریق اور ایک وتیرہ پر قواعد دین اور ارکان اسلام ثابت کیے ہیں، اپنی حجتوں اور کتاب و سنت اور سیرت صحابہ و تابعین کے دلائل کے ساتھ، جن کا ذکر پہلے ہو چکا اور ان کے نام بھی بتا دیئے گئے، یہی سبیل اللہ (اللہ کا راستہ) پہلی سبیل مرسلین اور سبیل مسلمین ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "قُلْ هَذِهِ سَبِيلِي أَدْعُوا إِلَى اللَّهِ عَلَىٰ بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي" (یوسف: ۱۰۸) آپ فرمادے: یہ میری راہ ہے میں اللہ تعالیٰ کی طرف بلاتا ہوں، میں اور میرے پیروکار دل کی آنکھیں رکھتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ تم فرمادو کہ یہ میرا دین ہے جو کہ حجت رویت دلیل نور ضیاء اور بصیرت پر مبنی ہے پھر جو بغیر حجت کے راہ اختیار کرے گا وہ گمراہ ہوگا اور خطا کار و مبتدع ہوگا۔

دوسرا قول

بدعت کا حکم کیا ہے؟

اہل سنت و جماعت فرماتے ہیں: بدعت حرام ہے اور اس پر قائم رہنا فسق میں مبتلا

رہنے سے بُرا ہے۔

مبتدع پر لعنت اور اس کی بے عزتی کرنا جائز ہے۔ نوح بن ابی مریم، ابوزید مرقی سے اور وہ سعید ابن جبیر سے، وہ ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے اللہ کے لیے عمل کیا جماعت میں، اگر وہ عمل درست ہے تو اللہ تعالیٰ قبول فرماتا ہے اور اگر خطا کی تو اللہ معاف کر دیتا ہے اور جس نے اللہ کے لیے کوئی عمل انفرادی طور پر کیا تو اگر وہ درست ہو تو اللہ اسے قبول نہیں کرے گا اور اس نے خطا کی تو وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں ڈھونڈے۔

اور اوزاعی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا: ابلیس نے اپنے لشکر سے کہا: تم بنی آدم کے پاس کس طرح آتے ہو؟ لشکریوں نے جواباً کہا: ہم ہر طرح سے ان کے پاس آتے ہیں مگر وہ اللہ تعالیٰ سے معافی مانگتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو توحید کی حرمت سے بخش دیتا ہے۔ ابلیس نے کہا: میں انہیں ایسے گناہ میں ڈالتا ہوں کہ وہ توبہ کو نہ دیکھیں گے اور خواہشات ان میں ثابت ہو جائیں گی (یعنی خواہشات نفسانی کے پیرو ہو کر یہ سمجھیں گے جو ہم کر رہے ہیں درست ہے)۔

کیا بدعت فسق سے بری ہے؟ یہ جو ہم نے کہا کہ بدعت فسق سے بری ہے اس لیے کہ فاسق اپنے فسق پر اصرار نہیں کرتا اور اپنے اوپر توبہ کو واجب جانتا ہے، مبتدع اپنی بدعت پر مصر رہتا ہے اور اس بدعت کا معتقد ہوتا ہے اور توبہ کو واجب نہیں جانتا، اس لیے کہ وہ اپنی بدعت کو حق گمان کرتا ہے۔ فسق میں رہنا شیعہ ہونے سے اچھا ہے؟ کم بُرا ہے۔

ابن الحصین نے اپنے بھتیجے کو جب وہ اپنے فسق سے تائب ہو کر شیعیت میں داخل ہوا تو کہا: پہلی حالت اچھی تھی۔

ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ عقیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نبی کریم ﷺ سے راوی ہیں کہ حضور نے فرمایا: جس نے بدعتی کی عزت کی اس نے گویا اسلام کے منہدم کرنے پر اعانت کی، نیز حضور ﷺ نے فرمایا: جس نے اسلام میں نئی بات کا احداث کیا یا بدعتی کو اپنے یہاں ٹھہرایا اور پناہ دی، اس پر اللہ فرشتوں اور تمام لوگوں کی لعنت ہے، اللہ تعالیٰ اس کے فرض کو قبول کرے اور نہ نوافل مقبول ہوں۔ نیز حضور ﷺ نے فرمایا: تین آدمیوں کے عیب بیان

کرنا عیب نہیں: فاسق معلق و مبتدع اور ظالم بادشاہ۔

نیز حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”اترغبون عن ذکر الفاجر اذکروا الفاجر بما فیہ کسی بحذرہ الناس“ کیا تم فاجر کے ذکر سے اعراض کرتے ہو؟ فاجر میں جو عیب ہیں ان کا چرچا کرو تا کہ لوگ اس سے حذر کریں پس جو ہم نے کہا وہ صحیح ہے۔

تیسرا قول

اہل بدعت کے ساتھ مناظرہ کرنے کا بیان

اہل سنت و جماعت فرماتے ہیں کہ اہل بدعت و اہل اہواء کے ساتھ مناظرہ و مجادلہ جائز ہے۔

اور اہل ظواہر کہتے ہیں کہ جائز نہیں اس لیے کہ صحابہ کرام نے اس بارے میں کچھ نہیں فرمایا اگر جائز ہوتا تو وہ بھی شروع کرتے اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جھگڑا چھوڑ دے اگر چہ تو حق پر ہو۔ اس کا جواب یہ ہے کہ صحابہ کرام کے زمانہ مبارک میں مبتدعین نہ تھے اس لیے وہ مناظرہ میں شروع نہ ہوئے اور ان کے پاس تلوار تھی کفار سے جہاد کرتے تھے اور ہمارے زمانہ میں مبتدعین کثرت سے پیدا ہو گئے اس لیے مناظرہ کی ضرورت ہے اور مروی ہے کہ حضرت خلیفہ اول ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ نے ”مسئلہ قدر“ میں حضرت خلیفہ ثانی عمر ابن خطاب فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مناظرہ کیا اس کی تفصیل سے پہلے ذکر ہو چکا ہے اگر مناظرہ ناجائز ہوتا تو شیخین کریمین مناظرہ نہ فرماتے۔

اور حدیث ”دع المراءوان کنت محققا“ آدمی کو چھوڑ دے اگر چہ تو سچا ہو کا جواب یہ ہے کہ ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ مناظرہ اظہار حق کے لیے ہوتا ہے اور جب حق ظاہر ہو گیا تو جھگڑے کی ضرورت نہیں اور نہ مناظرہ اور حق ظاہر ہو جانے کے بعد بھی خصم حق کو قبول نہ کرے اور توبہ نہ کرے تو تلوار سے مقابلہ کیا جائے جھگڑا ظہور حق کے بعد جائز نہیں اور مبتدعین سے مناظرہ کے جواز کی دلیل یہ ہے: ”وجادلہم بالتی ہی احسن“ (انخل: ۱۲۵) اور ان سے احسن طریقے سے مجادلہ کریں۔ دوسری دلیل ”وَلَا تَجَادِلُوا أَهْلَ الْكِتَابِ إِلَّا

بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ“ (العنکبوت: ۴۶) اور ان سے مجادلہ نہ کریں مگر احسن طریقے سے۔ اللہ تعالیٰ نے مجادلہ مباح فرمایا، مگر صفت مذکور یعنی ”بالتی ہی احسن“ احسن اسلوب کے ساتھ۔ تیسری دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”وَمِنَ الْإِبِلِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْبَقَرِ اثْنَيْنِ قُلْ آءَ الذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ أَمِ الْإُنثَيْنِ“ (الانعام: ۱۴۳) اور ایک جوڑا اونٹ کا اور ایک جوڑا گائے کا، آپ فرماؤ کیا اس نے دونوں نر حرام کیے یا دونوں مادہ اور یہ مناظرہ نہیں تو اور کیا ہے؟

حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم سے مجادلہ کیا فرمایا: ”قَالُوا يَا نُوحُ قَدْ جَادَلْتَنَا فَآكْثَرْتَ جِدَالَنَا“ (ہود: ۳۲) انہوں نے کہا: اے نوح! آپ نے ہم سے مجادلہ کیا اور بہت زیادہ مجادلہ کیا۔

حضرت ابراہیم علی نبینا وعلیہ السلام نے نمرود بن کنعان سے مناظرہ کیا اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کے مناظرہ کی خبر دی: ”الْمُ تَرَ إِلَى الَّذِي حَاجَّ إِبْرَاهِيمَ فِي رَبِّهِ أَنْ آتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ إِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّيَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ قَالَ أَنَا أُحْيِي وَأُمِيتُ قَالَ إِبْرَاهِيمُ فَإِنَّ اللَّهَ يَأْتِي بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَأْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِي كَفَرَ“ (البقرہ: ۲۵۸) اے محبوب! کیا تم نے اس کی طرف نہیں دیکھا جو ابراہیم سے اس کے رب کے بارے میں جھگڑا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے بادشاہی دی جب ابراہیم نے کہا کہ میرا رب وہ ہے جو زندہ کرتا اور مارتا ہے اس نے کہا: میں بھی زندہ کرتا اور مارتا ہوں ابراہیم نے فرمایا: بے شک اللہ تعالیٰ سورج کو مشرق سے لاتا ہے تو مغرب سے لاؤ تو حواس باختہ ہو گیا جس نے کفر کیا۔

علم کو چھپانے والا بہت بڑا مجرم ہے

جابر بن عبد اللہ سے رسول کریم ﷺ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: جب آخری میری امت پہلی امت میری کی نفی کرے تو جس کے پاس علم ہو وہ اپنے علم کا اظہار کرے اس وقت علم کا چھپانے والا ایسے ہے جیسے میری وحی کو چھپانے والا۔

حضرت حماد ابن ابی حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ انہوں نے اپنے والد امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے دریافت کیا کہ اگر میں علم کلام کو نہ سیکھوں تو کیا مجھے نقصان ہوگا؟ فرمایا: من وجہ نقصان ہوگا اور من وجہ نقصان نہ ہوگا۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ مجھ سے یہ سوال نہیں کرے گا کہ علم کلام کیوں نہیں سیکھا؟ اس لحاظ سے تو نقصان نہیں اور اس حیثیت سے کہ

جب تم علم کلام نہیں جانو گے تو لوگوں سے مناظرہ نہیں کر سکو گے اس پہلو سے نقصان ہے۔ اور حضور ﷺ نے فرمایا: اسلام کی مضبوط ترین گره "الحب فی اللہ والبغض فی اللہ" ہے یعنی اللہ کے لیے محبت ہو اور اللہ کے لیے بغض ہو اور جب تک تم مبتدع اور غیر مبتدع کو نہ پہچانو گے تو کیسے اللہ کے لیے محبت کرو اور اللہ کے لیے بغض کرو گے؟

اے بیٹے! اس کی مثال اس کنویں کی سی ہے جو اوپر سے ڈھکا ہوا ہو اور جب تک تجھ کو علم نہ ہو تو تو کنویں میں گر جائے گا۔

پھر فرمایا: اے عالم! لوگ مجھے کہتے ہیں: اصحاب رسول ﷺ علم کلام نہیں جانتے تھے تو اے معلم! تو اس کا جواب دے کہ اصحاب رسول ﷺ کے در والے پر دشمن تلوار سونت کر نہیں حاضر ہوتا تھا اور ہماری یہ حالت ہے کہ دشمن شمشیر بکف ہو کر ہمارے دروازہ پر حاضر ہوتا ہے تو جس کے دروازہ پر دشمن ننگی تلوار لے کر آجائے تو اس پر واجب ہے کہ اس کے مقابلہ کے لیے تیار ہو جائے اور جس کے دروازہ پر دشمن تلوار سونت کر حاضر نہ ہو تو اس پر جنگ کی تیاری واجب اور ضروری نہیں ہے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ جب اہل قدر سے ملاقات ہو تو پہلے سوال کرو معلوم ہوا کہ اہل بدعت سے مناظرہ جائز و مباح ہے اور اگر ہوا، اور اہل بدعت اور دوسرے کافروں سے مناظرہ اور مجادلہ جائز نہ ہوتا تو یہ مذاہب باطلہ اہل اسلام پر غالب آجاتے اور حق و باطل میں فرق ظاہر نہ ہوتا اس لیے کہ حق دلیل و حجت کے ظاہر ہونے سے ظاہر ہوتا ہے اور دلیل و حجت کا اظہار مناظرہ سے ہوتا ہے لہذا بوقت ضرورت مناظرہ جائز ہے اور اس غرض سے علم کلام و علم مناظرہ، علم مجادلہ پڑھنا پڑھانا جائز ہے بلکہ فی زمانہ ضروری ہے۔ واللہ تعالیٰ جل شانہ اعلم

چوتھا قول

اہل اہواء اور اہل بدعت کی تکفیر کا بیان

بعض فقہاء نے کہا کہ بدعت کفر ہے اور مبتدع کافر ہے اس لیے کہ بدعت حرام ہے

اور جس نے بدعت کا اعتقاد کیا تو اس نے حرام کو حلال جانا اور جس نے حرام کو حلال جانا وہ کافر ہے۔

اور بعض نے کہا: مبتدع کافر نہیں۔ دلیل یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ اہل اہواء کی گواہی مقبول ہے تو جب ان کی گواہی مقبول ہے تو ثابت ہوا کہ وہ مسلمان ہیں۔

اور محمد ابن حسن رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: مبتدع کے پیچھے نماز جائز ہے، مگر مکروہ تحریمہ ہے، اس لیے کہ اس نے بدعت کو اپنے زعم میں حق سمجھا اور حلال جانا اور دوسری دلیل یہ ہے کہ وہ مؤول ہے اور تاویل سے اس مسئلہ کو حلال جانا لہذا تکفیر نہیں کی جائے گی۔

اور بعض نے کہا کہ جب اس کی خطا ظاہر ہو جائے اور توبہ نہ کرے، اپنے اس اعتقاد سے تو تکفیر کی جائے گی اور صحیح یہ ہے کہ تکفیر مطلقاً جائز نہیں، اس لیے اہل اہواء اور اہل بدعت کے احوال مختلف ہیں اور اہل اہواء کئی قسم کے ہیں تو بعض جگہ ان کی تکفیر کی جائے گی اور بعض مسائل میں ان کی تفسیق کی جائے گی اور بعض حالتوں میں بدعت سیئہ ہوگی، اس سے توبہ واجب ہوگی۔ بعض مسائل میں بدعت حسنہ ہوگی تو توبہ کی بھی ضرورت نہیں۔

ہم کہتے ہیں: بدعت کے بارے میں پانچ وجہ پر کلام کیا جائے گا:

(۱) ایک کلام اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کے متعلق۔

(۲) دوسرے کلام اللہ تعالیٰ کے کلام کے بارے میں۔

(۳) تیسرے کلام خدا کے قضاء و قدر میں۔

(۴) چوتھے کلام بندوں کے افعال کے بیان میں۔

(۵) پانچواں کلام اصحاب رسول ﷺ کے متعلق۔

تو جو شخص اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات میں یا کلام اللہ میں یا قضاء و قدر میں ناحق کلام کرے تو وہ بلا خلاف کافر ہے اور جو بندوں کے افعال میں یا اصحاب کرام کے بارے میں کلام کرے تو اگر نص صریح یا خبر متفق علیہ یا اجماع کے خلاف ہے تو بلا خلاف کافر ہے اور اگر اس کا کلام قیاس، خبر واحد کے خلاف ہے یا تاویل کرتا ہے تو محل تاویل میں بایں حیثیت کہ

شبہ کی گنجائش ہے تو یہ موجب کفر نہیں بدعت سینہ ہوگی اس سے توبہ واجب ہے۔
لیکن بدعت حسنہ جیسے قرآن پاک کو روانی اور غناء کے ساتھ پڑھنا جب کہ حد قراءت سے نہ نکلے، قرآن پاک کا جمع کرنا، قرآن پاک کا لکھنا، قرآن پاک کو تیس پاروں میں تقسیم کرنا، قرآن پاک پر اعراب لگانا، رکوع و منزل اور رموز لکھنا، اذان غنا (گا کر) کے ساتھ دینا، جب کہ حد سے باہر نہ ہو۔ یہ سب بدعت ہیں مگر بدعت حسنہ کہ (ان سے) توبہ واجب نہیں۔

پھر اہل اہواء اور اہل بدعت سے جنگ و قتال کرنا جب کہ ان کی بدعت حد کفر تک پہنچے تو اگر رجوع کر لیں اور توبہ کر لیں تو فہما (بہتر) ورنہ سب کا قتل کرنا مباح ہے اور اگر توبہ کر لیں اور تجدید اسلام کر لیں تو ان کی توبہ قبول کر لی جائے گی اور بعض نے کہا: سب کی توبہ قبولی کی جائے گی مگر افسیوں اور شیعوں میں سے جو اباحیہ اور عالیہ ہیں ان کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی، ایسے ہی قرامطہ اور زنادقہ فلاسفہ کے فرقے ہیں کہ ان کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی بلکہ توبہ کے بعد بھی قتل کر دیا جائے گا، جیسے توبہ سے پہلے قتل کیا جاتا اس لیے کہ وہ صانع (پیدا کرنے والا) کے معتقد نہیں تو توبہ کس کی بارگاہ میں کریں گے؟

اور بعض نے کہا: اگر پکڑنے سے پہلے اور اپنی بدعت کے اظہار سے قبل تائب ہو جائیں تو توبہ قبول کر لی جائے گی اور اگر گرفتار کرنے اور اظہار عقائد کے بعد توبہ کریں تو توبہ قبول نہیں کی جائے گی، قتل ہی کیے جائیں گے، یہی امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول ہے۔

کیا بدعتی پر ٹیکس لگایا جائے؟

اور مبتدع پر جزیہ مقرر نہیں کیا جائے گا، اگرچہ کافر ہے بدعت حد کفر تک پہنچی ہو اور نہ ان کو غلام بنایا جائے اور جب بدعت موجب کفر نہ ہو تو زجر و توبیخ اور منع واجب ہے اور تعزیر جس قدر ممکن ہو کی جائے کہ تعزیر سے وہ (بدعت سے) باز آجائیں گے اور اگر بغیر قید کرنے اور کوڑے لگانے کے زجر و منع ناممکن ہو تو جس (نظر بند) اور زد و کوب کرنا جائز ہے۔

بدعتیوں کے سرغننے اور لیڈر کو قتل کر دو

اور ایسے ہی بغیر تلوار کے باز آنا ناممکن ہو تو اگر وہ اس فرقہ کا سرغنہ اور رئیس و لیڈر ہے

اور ان کا مقتداء ہے تو اسے بدعات سے باز رکھنے کے لیے از روئے سیاست قتل کرنا روا اور جائز ہے اور ایسے ہی اہل شہر (اسلامی شہروں میں سے) دارالاسلام میں جب جمعہ و عیدین اور جماعت ترک کر دیں یا اذان و اقامت ترک کر دیں یا حکم و قضاء (عدالتی نظام اور فیصلوں) کو ترک کر دیں یا قراءت قرآن مجید کو ترک کر دیں تو ان کو تکلیف دی جائے اور اگر زجر و توبیخ اور ڈانٹ ڈپٹ وغیرہ کی پرواہ نہ کریں تو تلوار سے سیدھے کیے جائیں۔ سو اگر ان کو قتل کر دیا تو گناہگار نہ ہوں گے اور ان کے قتل میں مضائقہ نہیں۔

اور ایسے ہی اگر کوئی شخص نماز، روزہ، جمعہ، جماعت اور عیدین، اذان و اقامت اور قراءت قرآن وغیرہ احکام مذکورہ میں کسی ایک کو چھوڑ دے تو اس کو تکلیف دی جائے اور اگر وہ زجر و توبیخ اور تہدید سے بھی باز نہ آئے اور اس کو قتل کر دیا جائے تو اس کا خون ساقط ہے، قصاص نہیں لیا جائے گا۔

اور مہدی ابوشکور سالمی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں نے شیخ امام زاید ابو بکر محمد ابن حمزہ خطیب سمرقند سے ۴۶۵ء کے لگ بھگ سنا، جب کہ ان سے فقہ پڑھتا تھا اور ان سے ”کتاب السرقة“ وغیرہ پڑھیں۔

جب قطاع الطريق (ڈاکوؤں) کے متعلق مسائل و احکام بیان فرمائے جو اس آیت کریمہ کا معنی تھا: ”انما جزاء الذین یحاربون اللہ ورسولہ..... الی عذاب عظیم“ (المائدہ: ۳۳) بے شک ان لوگوں کی جزاء جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں ”عذاب عظیم“ تک۔ تو فرمایا: (امام صاحب نے) ڈاکو اگر بغاوت سے راستہ کی ناکہ بندی کر دے پھر فرمایا: میں نے شیخ الاسلام رکن الدین والاسلام شمس الائمہ ابو محمد عبدالعزیز احمد بخاری رحمہ اللہ سے ذکر کیا، انہوں نے اپنی ”امالی“ میں ذکر کیا کہ ڈاکو جب راستہ بند کر دے اور مال لوٹ لے اور قتل نہ کرے اور اپنے خروج (بغاوت) سے راستہ منقطع (ناکہ بندی سے) نہ کرے تو سلطان (بادشاہ) کو از روئے سیاست اور زجر اس کا قتل کر دینا جائز ہے اور اس معنی میں ہم کہتے ہیں کہ بدعتی جب بدعت کی دعوت دے اور لوگوں کو بدعت کی طرف بلائے اور اس سے ملک میں بدعت پھیلنے کا اندیشہ ہے تو اگرچہ اس کے کفر کا حکم نہیں دیا جائے گا لیکن سلطان کو حق پہنچتا ہے کہ زجر و سیاست اس کو قتل کر دے اس لیے کہ اس کا فساد بڑھ گیا

عام ہو گیا اور موثر فی الدین ہے، لوگوں کا دین خراب کرے گا اور جب بدعت کفر کے درجہ میں ہو تو اس کا قتل عام جائز و مباح ہے اور اگر بدعت درجہ فسق میں ہو تو ان کا قتل عام مباح نہیں بلکہ جو ان کا رئیس و سردار اور سرغنہ اور معلم ہو تو قتل کر دیا جائے، زجر و امتناع کے لیے اہل سنت و جماعت کے نزدیک اہل قبلہ کا خون بہانا مباح نہیں، مگر تین باتوں میں سے اگر کوئی بات پائی جائے تو قتل جائز و مباح ہے: (۱) ایمان کے بعد مرتد ہو جائے (۲) احسان کے بعد زنا کا مرتکب ہو (۳) یا ناحق مسلمان کو قتل کرے۔

اور معتزلہ کے نزدیک اہل قبلہ کا قتل چار باتوں میں سے کوئی بات پائی جائے تو مباح ہے: (۱) گناہ کبیرہ کا مرتکب ہو (۲) بدعت پیدا کرے (۳) سلطان پر تلوار سونٹے (۴) یا فرائض میں سے کسی فرض کو معطل کر دے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

پانچواں قول فرقوں کا بیان

جان لو کہ دین جماعت کے ساتھ ہے اور جماعت سوادِ اعظم ہے۔

سوادِ اعظم کون ہیں؟

اور سوادِ اعظم جبر و قدر، تشبیہ و تعطیل اور نصب و رفض کے درمیان ہے۔

اہل سنت کون ہیں؟

امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے دریافت کیا کہ اہل سنت و جماعت کون ہے؟ فرمایا: جس میں نصب و رفض، جبر و قدر اور تشبیہ و تعطیل نہ ہو وہ سوادِ اعظم ہے۔

امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ امام جعفر ابن محمد صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے دریافت کیا کہ اے ابن رسول ﷺ! کیا اللہ تعالیٰ نے تمام امور بندوں کے سپرد کر دیئے ہیں؟ فرمایا: اللہ تعالیٰ اجل و اعلیٰ (بلند و بالا) ہے کہ ربوبیت بندوں کے سپرد کر دے۔

پھر سوال کیا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر جبر کرتا ہے؟

فرمایا کہ اللہ تعالیٰ عدل ہے کہ بندوں کو مجبور کرے اور پھر ان کو عذاب دے۔

عرض کیا: پھر کیا معاملہ ہے؟

فرمایا: بین بین ہے نہ جبر ہے نہ تفویض اور نہ اکراہ ہے نہ تسلیط۔

نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ آپ (ﷺ) نے فرمایا کہ بنی اسرائیل حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد اکہتر فرقوں میں بٹ گئے، سب فرقے جہنمی ہیں اور میری امت کے میرے بعد تہتر فرقے ہو جائیں گے، ایک کے سوا سب ناری ہیں۔ عرض کیا گیا: وہ ایک فرقہ ناجیہ کون سا ہے؟ فرمایا: جس پر میں اور میرے اصحاب ہیں، آج کے دن جو اس طریق پر قائم ہو گا وہ نجات پانے والا فرقہ ہے۔

حضور ﷺ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ بنی اسرائیل موسیٰ علیہ السلام کے بعد اکہتر فرقے ہو گئے اور عیسیٰ علیہ السلام کے بعد بہتر فرقے ہو گئے اور میرے بعد میری امت کے تہتر فرقے ہو جائیں گے، ایک فرقے کے سوا سب جہنمی ہوں گے اور روایت کیا گیا ہے کہ حضور اقدس نے فرمایا: بہتر فرقے ہلاک ہو جائیں گے اور ان میں سے ایک فرقہ ناجی ہو گا۔ نیز مروی ہے کہ بہتر فرقے ناری ہوں گے اور ایک جنت میں اور یہ بھی مروی ہے کل جنتی ایک ناری عرض کیا گیا: ناری کون ہے؟ فرمایا: قدریہ۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ قدریہ خدائے قدوس کی وحدانیت کے منکر ہیں۔

اور عبداللہ ابن عباس نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا: ”إِنَّ الْمُجْرِمِينَ فِي ضَلَالٍ وَسُعْرٍ“ (القم: ۴۷) بے شک مجرم گمراہی اور دیوانگی میں ہیں۔ یعنی دنیا میں گمراہی میں آخرت میں جہنم میں ”إِنَّا كُلُّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ“ (القم: ۴۹) ہم نے ہر چیز ایک اندازے سے پیدا کی اور قدریہ فرقہ اس کے منکر ہیں، اس سے پتا چلا کہ قدریہ کفار ہیں۔

حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا کہ ابلیس نے چالیس دن تک سمندر میں غوطہ لگایا اور ساتویں سمندر میں غوطہ لگایا، ہاویہ میں داخل ہو کر درکات جہنم کو دیکھا اور ہر قوم کے ”درکہ“ کو دیکھا: مالک علیہ السلام نے بہ حکم الہی اس کو علم و علامت دی اور اس کو بہتر رفتے دیئے، ہر رقعہ پر ہر بدعت کا نام لکھا۔ ابلیس نے ان رقعوں کو لے کر ان اہل بدعت میں پھیلا دیا، پھر یہ فرقے بہتر ہیں اور یہ چھ فرقوں سے نکلے ہیں: رافضیہ، ناجیہ، قدریہ، جبریہ، مشبہ، معطلہ۔ پھر ہر صنف سے بارہ فرقے نکلے تو یہ بہتر فرقے ہو گئے، ہم ان کے اصل اور

اعتقاد کو ذکر کریں گے اور ان کے نام بھی ذکر کریں گے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

چھٹا قول رافض کا بیان

رافضی کہنے کی وجہ

جاننا چاہیے کہ ان کو رافضی کیوں کہا جاتا ہے؟ اس لیے کہ انہوں نے دین اسلام کے بنیادی اصولوں کو توڑا ہے، خداوند تعالیٰ نے ان کا نام کفار رکھا ہے، جیسا کہ قرآن حکیم میں فرمایا: "لَيَغِيظُ بِهِمُ الْكُفَّارُ" (التح: ۳۹) تاکہ ان کے ذریعے کافروں کے دل جلیں اور نبی کریم ﷺ نے ان کا نام مشرکین رکھا، فرمایا: میرے بعد ایک قوم نکلے گی، ان کو رافضی کہا جائے گا، جب تم ان سے ملاقات کرو ان کو قتل کر دینا، اس لیے کہ وہ مشرک ہیں۔ ان رافضیوں کے مختلف اقوال ہیں۔ بعض کفریہ اقوال ہیں، بعض فسق و بدعت ہیں، ہم ان کے اقوال بالتفصیل بیان کرتے ہیں۔

بعض (رافضیوں) کا عقیدہ ہے کہ حضرت علی آسمان سے اترے اور صورت لاہوتیہ سے نکل کر صورت ناسوتیہ کو اختیار کیا اور ایسے افعال کیے جن سے ربوبیت ثابت ہوتی ہے۔ پھر اپنی یعنی آسمان پر چڑھ گئے، اس قوم نے حضرت علی کو خدا کہا تو حضرت علی نے ان کو جلا دیا اور جو لوگ باقی رہ گئے انہوں نے اعتقاد کیا کہ حضرت علی خدا نہ ہوتے تو آگ کا عذاب نہ دیتے، اس عقیدہ والے کافر ہیں، اس میں کسی کو اختلاف کی گنجائش نہیں ہے۔

اور بعض نے کہا کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نبوت میں حضور ﷺ کے شریک تھے اور یہ عقیدہ کفر ہے، اس لیے کہ جو نبی کا انکار کرے تو وہ کافر ہے اور جو نبی نہیں اور اس کو نبی مانے تو وہ بھی کافر ہے اور جو شخص غیر نبی کو نبوت میں شریک کرے وہ بھی کافر ہے۔

بعض کا عقیدہ یہ ہے کہ نبوت حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لیے تھی مگر جبریل خطا، اور غلطی سے نبی کریم ﷺ پر وحی نازل کر گئے اور جبرائیل حضور کی صداقت کی وجہ سے حضور کی طرف مائل ہو گئے اور یہ کفر ہے اور بعض کا عقیدہ یہ ہے کہ نبوت حضرت آدم علی نبیا وعلیہ

السلام سے لے کر قیامت تک متصل ہے اور یہ بھی کفر ہے۔

اور بعض نے کہا: جو اہل بیت کے علم کا حامل ہے، خواہ نبوت کا دعویٰ کرے یا اپنی نبوت کا اظہار نہ کرے، یہ عقیدہ بھی کفر ہے۔

بعض کا عقیدہ ہے کہ زمانہ کسی وقت امام سے خالی نہیں ہوتا اور امام اولادِ حسن و حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے ہوتا ہے اور وہ براہِ راست خدا سے علم حاصل کرتا ہے یا جبرائیل سے اور جو اس امام کو نہ پہچانے اور اس پر ایمان نہ لائے اور اسی حالت میں مر جائے تو وہ جاہلیت کی موت مرتا ہے، یہ عقیدہ بھی کفر ہے اس لیے کہ یہ نبوت کا ثابت کرنا ہے۔

بعض کا عقیدہ ہے کہ حضرت علی اور ان کی اولاد اور اصحاب دنیا کی طرف رجوع کریں گے اور اپنے دشمنوں سے انتقام لیں گے، یہ بھی کفر ہے اس لیے کہ نص اور قیامت کا انکار ہے۔ بعض کا عقیدہ ہے کہ حضرت علی اور ان کی اولاد کی روح دوسرے جسم میں داخل ہو کر دنیا میں لوٹ کر آئے گی اور اپنے دشمنوں سے انتقام لے گی اور وہ امام ہوں گے، یہ بھی کفر ہے۔

اور بعض خلاف ما انزل اللہ کتاب کی تاویل کرتے ہیں، یہ بھی کفر ہے۔

بعض کا عقیدہ ہے کہ مولیٰ علی رضی اللہ عنہ نے انتقال نہیں فرمایا کہ وہ اپنے روح و جسم کے ساتھ آسمان میں ہیں اور ہر آسمان میں علی موجود ہیں اور رعد حضرت علی کی آواز ہے، یہ بھی کفر ہے۔

بعض کے نزدیک بغیر گواہوں کے نکاح جائز ہے، اس لیے کہ حضرت علی اور ان کی اولاد حاضر ہوتے ہیں، یہ بھی کفر ہے اور بعض نے کہا کہ شراب، متعہ، لواطت حرام نہیں اور جو اپنی بیوی کو حالت حیض میں طلاق دے تو وہ طلاق واقع نہ ہوگی اور جو دفعۃً واحدة (یک بارگی) اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے تو واقع نہ ہوں گی اور یہ کفر ہے اور بعض نے کہا: حضرت علی حضور ﷺ سے زیادہ جاننے والے زیادہ فصیح اور زیادہ بہادر شجاع تھے، یہ بھی کفر ہے۔

اور بعض کا عقیدہ ہے کہ حضرت ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم نے کفر کیا کہ حضرت علی سے پہلے خلافت کو قبول کیا اور جن لوگوں نے ان سے بیعت کی وہ کافر ہیں۔

اور بعض نے کہا: حضرت علی نے بھی کفر کیا کہ انہوں نے خلافت و امارت کو چھوڑ دیا

حالانکہ ان کا حق تھا اور جو حق کو چھوڑ دے اور حق کو چھپائے وہ کافر ہے۔ یہ عقیدہ بھی کفر ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ امت نے اماموں کو نہیں پہچانا حالانکہ وہ بارہ امام ہیں ان میں سے آٹھ نے تو اپنی امامت کا دعویٰ کیا اور اپنا امام ہونا ظاہر کیا اور تین امام چھپے ہوئے ہیں اور ایک باقی ہیں وہ مہدی ہیں۔ ان سب کی بیعت واجب ہے اور جو ان کی مخالفت کرے وہ کافر ہے۔ ان کا یہ عقیدہ بھی کفر ہے۔

اور بعض نے کہا کہ حضرت علی حضور کے ولی عہد اور وصی قائم تھے جو ان کے سوا غیر کی بیعت کرے وہ کافر ہے یہ عقیدہ بھی کفر ہے۔ یہ مسائل اور ان جیسے اور مسائل کفر یہ ہیں اور بعض باتیں کفر نہیں بدعت ہیں جیسے کہ حضرت علی ابو بکر عمر عثمان سے افضل ہیں اگرچہ ان کی خلافت بالا جماع صحیح ہے۔

اور بعض نے کہا: جن صحابہ کرام نے حضرت علی پر خروج کیا (یعنی آپ کے خلاف بغاوت کی) ان پر لعنت کرنا واجب ہے جیسے حضرت معاویہ وطلحہ و زبیر اور حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔

اور بعض نے کہا کہ فاجر کے پیچھے نماز مطلقاً جائز نہیں ہے۔

اور بعض نے کہا: وصیت واجب ہے۔

اور بعض نے کہا: کچھ لوگ بنات آدم سے پیدا ہوئے ہیں اور کچھ لوگ حور العین سے پیدا ہوئے ہیں اس لیے کہ شیث علیہ السلام نے حور العین سے نکاح کیا تھا عربوں کی اصل ان ہی سے ہے۔

اور بعض نے کہا کہ آدم علیہ السلام کے زمانہ میں بہن سے نکاح جائز نہ تھا ان کا نکاح حور العین سے ہوتا تھا۔

انسان شریف یا شریر کیوں ہوتا ہے؟

بعض لوگوں کا عقیدہ ہے کہ جب نطفہ صدق نیت سے بیجان کرتا ہے تو اولاد انسان ہوتی اور جب نطفہ دوسرے شیطان سے بیجان کرتا ہے تو اولاد شیطان ہوتی ہے اور شیطان شریک ہوتا ہے "اللہ تعالیٰ کے اس قول کی وجہ سے کہ: وشارکھم فی الاموال والاولاد" (الاسراء: ۶۳) اور ان کو مال اور اولاد میں شریک کر۔ یہ تمام مسائل غیر صحیح ہیں اس لیے اللہ تعالیٰ

نے فرمایا کہ ”خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ“ (النساء: ۱) تم کو اس نے ایک جان سے پیدا کیا اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِثْلُكُمْ“ اور ”شَارِكُهُمْ فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ“ کے متعلق حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ اس سے مراد زنا ہے، شرکت نہیں اس لیے کہ زنا شیطان کے وسوسہ سے ہوتا ہے۔

بعض لوگوں کا عقیدہ ہے کہ حضرت علیؑ، حضرت ابوبکر و عمر و عثمان سے زیادہ علم رکھتے ہیں اور بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ حضرت علیؑ اور اہل بیت کی محبت سب سے زیادہ ہونی چاہیے۔ یہ مسائل سب کے سب فسق و بدعت ہیں، کفر نہیں۔

اصل ان مسائل میں یہ ہے کہ جس نے کلام کیا یا اعتقاد کیا ان امور کا، جس نے نص قطعی کا یا نص قطعی اس کے قائم مقام جیسے ”سنت ظاہرہ ثابتہ“ اور اجماع امت کا انکار کیا، وہ کافر ہے یا کوئی مؤمن شخص کسی مؤمن کو کہے: اوائے کافر! تو کہنے والا کافر ہو جائے گا یا مؤمن کے کفر کی شہادت دی تو وہ بہ طریق اولیٰ کافر ہے اور حضور نے فرمایا: جو اپنے مسلمان بھائی کو بلاوجہ کافر کہے تو وہ کفر اس کہنے والے پر لوٹتا ہے اور جو کوئی ایسا کلمہ کہے یا اس کا اعتقاد کرے کہ عامۃ الناس اس کے خلاف ہوں یا خبر واحد کے خلاف کرے اور اس کو اس میں شبہ ہو تو یہ بدعت ہوگا، کفر نہ ہوگا۔

ساتواں قول

ناصریہ کا بیان

معلوم ہونا چاہیے کہ ناصبیہ فرقہ خارجیہ ہی ہے اور انہی کو حرور یہ کہتے ہیں اس لیے کہ انہوں نے حضرت علیؑ کرم اللہ وجہہ الکریم کے خلاف مقام حرور میں بغاوت کی تھی اور حضرت علیؑ کو معاذ اللہ کافر کہتے ہیں اور جو (علیؑ) کو کافر کہے وہ خود کافر ہے۔

اور ان (حرور یہ) میں سے بعض وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو تو مسلمان سمجھتے ہیں، باقی تمام امت میں ہم کسی کو نہیں جانتے کہ مسلمان ہے یا کافر ہے؟ بلکہ سب منافق ہیں ان کا یہ عقیدہ کفر ہے اور بعض کہتے ہیں کہ ایمان مجہول ہے اور لوگ

پورا ایمان نہیں جانتے اس لیے وہ مؤمن نہیں یہ بھی کفر ہے۔
 اور بعض کہتے ہیں کہ جہاد ہمیشہ فرض ہے مسلمانوں اور مؤمنوں میں سے کسی کو جہاد ترک کرنا جائز نہیں مرد ہو یا عورت فقیر ہو یا غنی اور جو جہاد نہ کرے وہ کافر ہے۔
 اور بعض کہتے ہیں کہ زکوٰۃ کسی کو دینا جائز نہیں اس لیے کہ فسق و فجور اور منکرات ظاہراً ہو رہے ہیں ہم کافر و مؤمن کو نہیں پہچان سکتے اور یہ بھی کفر ہے۔

اور ان میں سے بعض کہتے ہیں کہ عورتیں پھولوں کی مانند ہیں تو ہر ایک کو ان کا سونگھنا جائز ہے اور ان سے وطی کرنا بغیر نکاح اور بغیر ملک یمین کے جائز ہے یہ بھی کفر ہے۔
 بعض ان میں سے وہ ہیں کہ جس نے کہا: "تحاکم" جائز نہیں اس لیے کہ حکم صرف اللہ کا ہے یعنی "إِن الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ" (الانعام: ۵۷) حکم صرف اللہ تعالیٰ کا ہے۔ جو اپنوں میں سے کسی کو حاکم بنائے وہ کافر ہے اور انہوں نے کہا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو "حکم" بنایا اور اللہ کے ساتھ کفر کیا یہ بھی عقیدہ کفر ہے۔

ان میں سے بعض کا عقیدہ یہ ہے کہ امام اور خلیفہ حق نہیں باطل ہے اور امراء و قضاة (ججوں) کو مقرر کرنا جائز نہیں۔ حکم (فیصلہ کرنا) جمعہ کا قیام اور جماعت جائز نہیں اس لیے کہ ہم نہیں جانتے کہ مسلمان کون ہے کافر کون ہے؟ اور نہ ہی ہم یہ جان سکتے ہیں کہ امامت کا اہل کون ہے؟ یہ عقیدہ بھی کفر ہے۔

ان میں سے بعض یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ صحابہ کرام نے آپس میں اختلاف کیا اور ایک دوسرے کے خلاف جنگیں کیں تو ہم پر معاملہ مشتبه ہو گیا ہم حق و باطل کو پہچان نہیں سکتے لہذا ہم توقف کریں گے نہ بیزاری کا اظہار کرتے ہیں اور محبت کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ عقیدہ بھی کفر ہے اس لیے کہ انہوں نے اجماع کو توڑا ہے اور انہوں نے کسی کو امام مقرر نہیں کیا اور ایسے مدعی امارت پر خروج کرنا جائز رکھا اور ایسے ہی انہوں نے کہا کہ مؤمن جب چھوٹا یا بڑا گناہ کرتا ہے تو کافر ہو جاتا ہے یہ سب کلمات ان کے کفریہ ہیں کیونکہ اس میں نص کا انکار ہے اور خرق اجماع ہے۔

حضرت علی بن ابی طالب سے مروی ہے فرمایا کہ میرے سبب سے دو جماعتیں ہلاک ہوں گی: محبت مفرط اور مبغض مفرط۔

اور روایت کیا گیا ہے کہ حضرت علی اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہما کٹھے مسجد میں داخل ہوئے تو حضور نے فرمایا: اسی طرح تم دونوں جنت میں داخل ہو گے اور جو تم دونوں سے محبت کرے گا وہ مؤمن ہے اور جو تم سے بغض رکھے گا وہ منافق ہے پھر ان کے بعض کلمات بدعت ہیں لیکن موجب کفر نہیں، مثلاً ان کا یہ کہنا کہ زندوں کی دعائیں اور صدقات مردوں کو نفع نہیں دیتے۔

اور ایسے ہی ان کا یہ کہنا کہ زمین پر پیشاب کرنا جائز نہیں، اس لیے کہ تمام زمین ہمارے لیے مسجد ہے، واجب ہے کہ کوزے میں پیشاب کر کے اس کو پانی میں ڈالے۔ بعض کہتے ہیں کہ کسی کے ساتھ ملنا جلنا، کھانا پینا جائز نہیں، اس لیے کہ ہم نہیں جانتے کہ پاک ہے یا ناپاک؟

بعض کہتے ہیں کہ لوہے کی وصیت کرنا واجب ہے کہ جس سے جہاد کرنا ممکن ہو، جس نے وصیت نہیں کی وہ ظالم ہے۔

بعض نے کہا کہ گوز باقی رہتا ہے، اس لیے پا جامے میں نماز جائز نہیں کیونکہ ممکن ہے اس میں گوز باقی ہو اور اسی طرح کی باتیں ہیں، سب بدعت ہیں، ان سے توبہ واجب ہے اور تکفیر واجب نہیں۔

آٹھواں قول

قدریہ کا بیان

فرقہ قدریہ کا گمان یہ ہے کہ قیاس عقلی ”دلیل شرعی“ سے اقویٰ ہوتا ہے، اگرچہ نص ہی کیوں نہ ہو اور اس طرح (ان کے نزدیک) قیاس سنت مشہورہ سے بھی اقویٰ ہے، لہذا اسی معنی کے لحاظ سے انہوں نے شر کے مقدر من اللہ ہونے کا انکار کر دیا اور انہوں نے (قدریہ) نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کے کام بندوں کے سپرد کر دیئے ہیں اور ان کو اپنے کاموں کی تخلیق اور ان کے بجالانے کا خالق و مالک بنا دیا ہے، گویا کہ تمام افعال کے خالق وہ خود ہیں اور امر و نہی ان کے لیے بیان کر دی ہے اور تخلیق، ارادہ، مشیت، قضاء و قدر غرضیکہ ان کے

افعال میں سے کسی چیز میں اللہ تعالیٰ کا کوئی امر بھی جائز نہیں ہے حتیٰ کہ وہ عذاب دینے میں حکیم و عادل کہلائے اور یہ ان کا کفر ہے اس لیے کہ انہوں نے اللہ کے سوا دوسرا خالق ثابت کیا۔

دو خالق ماننا کفر ہے

بعض لوگوں نے کہا کہ خیر اللہ کی طرف سے اور اس کی قضاء سے ہے اور شر (برائی) ہماری طرف سے یا ابلیس کی طرف سے ہے اور یہ عقیدہ کفر ہے اس لیے کہ انہوں نے اللہ کی ربوبیت کی نفی کر دی ہے۔

قدریہ کے چند چیدہ چیدہ عقائد باطلہ کی نشان دہی

- ☆ ان میں سے بعض وہ ہیں جنہوں نے تمام صفات کا انکار کیا ہے۔
 - ☆ اور ان میں سے بعض وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ قرآن مخلوق ہے۔
 - ☆ اور بعض یہ کہتے ہیں کہ جنت و دوزخ نہ مخلوق ہیں نہ باقی ہیں۔
 - ☆ بعض وہ ہیں جو صراطِ میزان اور حساب کا انکار کرتے ہیں اور یہ سب کفریات ہیں۔
- ایسے عقائد رکھنے والے کافر ہیں اس لیے کہ انہوں نے نص اور ربوبیت کا انکار کیا ہے۔

☆ بعض یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ خیر روح لاهوتی سے ہے اور شر روح شیطان سے ہے یہ بھی کفر ہے۔

☆ بعض کہتے ہیں: اعمال کو ہم نہیں جانتے کہ وہ اللہ کی جانب سے ہیں یا بندوں کی جانب سے ہیں اور یہ بھی نہیں جانتے کہ ان کو ثواب دیا جائے گا یا عذاب دیا جائے گا۔ یہ بھی کفر ہے اس لیے کہ نص کا انکار کیا اور اعمال پر ثواب و عتاب کے عقیدہ رکھنے کا انکار کیا ہے۔

☆ بعض کہتے ہیں کہ شیطان کو اللہ تعالیٰ نے پیدا نہیں کیا کیونکہ شیطان کے پیدا کرنے میں تخلیق کفر ارادہ کفر اور ارادہ شر پایا جاتا ہے۔ یہ عقیدہ کفر ہے اس لیے کہ اس میں نص کا انکار ہے اور دو قدیم ثابت کرنا لازم آتا ہے۔

☆ بعض کہتے ہیں کہ ایمان و کفر کے سوا تمام اعمال مخلوق ہیں۔ یہ بھی کفر ہے اس لیے کہ

انہوں نے اللہ کے سوا دوسرا خالق مان لیا۔

☆ بعض کہتے ہیں: نسخ جائز نہیں اور آسمان سے نازل ہونے والی ہر کتاب پر عمل کرنا واجب ہے۔ یہ بھی کفر ہے اس لیے کہ نص کا انکار کرے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ”وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُونَ“ (الصافات: ۹۶) تم کو اور تمہارے اعمال کو اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا ہے۔ دوسرا قول اللہ تعالیٰ ابلیس کے قول کی حکایت کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَخَلَقْتَهُ مِنْ طِيْنٍ“ (ص: ۷۶) یعنی مجھ کو آگ سے پیدا کیا اور آدم کو مٹی سے۔ صحیح یہ ہے کہ جو خدا کے سوا دوسرا خالق ثابت کرے وہ کافر ہے اور جس نے قدر کا انکار کیا اس نے اللہ کے سوا دوسرا خالق ثابت کیا تو وہ اللہ کے ساتھ کفر کرنے والا ہے۔

☆ بعض کہتے ہیں: لوگوں سے عہد و پیمان کرنا اور بیعت صحیح نہیں۔

☆ اور بعض کہتے ہیں: ہر حال میں کسب واجب ہے۔ یہ بدعت ہے اس سے توبہ کرنا واجب ہے، کفر نہیں ہے کہ اس میں تاویل ہو سکتی ہے۔

نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ فرمایا: ”اِذَا رَاَيْتُمُ الْقَدْرِيَّةَ فَاَقْتُلُوْهُمُ فَاِنَّهُمْ مَّجْسُوْسٌ هٰذِهِ الْاِمَّةُ“ یعنی جب قدریوں کو دیکھو تو ان کو قتل کر دو کہ وہ اس امت کے مجوس ہیں (یعنی آتش پرست)۔

نواں قول

فرقہ جبریہ کا بیان

جبریہ کا عقیدہ ہے کہ مخلوق کو نیکی کا ثواب ملے گا اور لیکن بُرائی پر عتاب نہیں کیا جائے گا۔ کفار اور گنہگار معذور ہیں ان سے سوال نہیں ہوگا اس لیے کہ تمام افعال اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں اور بندہ اس میں مجبور ہے اور یہ عقیدہ کفر ہے۔

روایت ہے کہ ایک شخص ابن مسعود اور عبد اللہ ابن عباس اور عبد اللہ ابن زبیر اور عبد اللہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے پاس حاضر ہوا اور ان سے کہا کہ جیسے کفر کے ساتھ طاعت نفع

نہیں دیتی ایمان کے ساتھ معصیت بھی نقصان نہیں دیتی ان سب نے فرمایا۔
اور اس مسئلہ کا نام مسئلہ عبادلہ ہے۔

نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ مرجیہ پر ستر پیغمبروں نے لعنت کی۔
مرجیہ کے دو گروہ ہیں: (۱) مرجیہ مرحومہ (۲) ملعونہ۔

مرجیہ مرحومہ وہ اصحاب رسول ﷺ ہیں اور مرجیہ ملعونہ جن پر لعنت کی گئی یہ وہ لوگ
ہیں جو کہتے ہیں کہ معصیت نقصان نہیں دیتی اور عاصی پر عذاب نہیں ہوگا۔

عثمان ابن ابی لیلیٰ سے مروی ہے کہ انہوں نے ابو حنیفہ رحمہ اللہ علیہ کو لکھا کہ آپ مرجیہ
ہیں؟ آپ نے جواب میں لکھا کہ مرجیہ دو قسم کے ہیں۔ ملعونہ ہم اس سے بیزار ہیں اور ایک
مرجیہ مرحومہ وہ اصحاب رسول ﷺ ہیں آپ نے اس میں یہ بھی لکھا کہ انبیاء کرام علیہم
الصلوٰۃ والسلام نے بھی ایسا ہی کہا۔ آپ نے دیکھا نہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام نے عرض کی: "إِنْ
تُعَذِّبُهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَإِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ" (المائدہ: ۱۱۸)
اگر تو ان کو عذاب دے تو وہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو ان کو بخش دے تو بے شک تو غالب
حکمت والا ہے۔

پھر مرجیہ اور جبریہ کے کلام سے جو کفر ہے وہ یہ ہے کہ نیکی اور بُرائی حقیقت میں
بندے کے افعال نہیں ہیں اور جو بندہ کرتا ہے فاعل اللہ تعالیٰ ہے لہذا یہ کفر ہے اس لیے کہ
انہوں نے اللہ تعالیٰ کو موصوف بہ قباح کیا ہے زنا وغیرہ سے کہ جیسے وہ خالق ہے ایسے ہی وہ
فاعل بھی ہے انہوں نے کہا کہ اگر ان کو قباح اور زنا وغیرہ پر عذاب دے تو یہ ظلم ہوگا اور یہ
عقیدہ کفر ہے۔

اور بعض کہتے ہیں کہ فعل بندے سے مجازاً ظاہر ہوتا ہے اور حقیقت میں ہمیں
استطاعت نہیں بندہ درخت کی مانند ہے جب ہو اس کو حرکت دیتی ہے تو وہ ہلتا ہے تو ایسے ہی
بندہ درخت کی طرح مجبور ہے اور یہ کفر ہے اس لیے کہ یہ تثلیث ہے اور کفر و معاصی اور
برائیوں پر مجبور کرنا ہے تو اللہ تعالیٰ کے لیے جائز نہیں کہ وہ سزا دے اور جو یہ عقیدہ رکھے وہ
کافر ہے۔

بعض نے کہا کہ اللہ تعالیٰ تمام چیزوں کو پیدا کر کے فارغ ہو گیا ہے اور تخلیق کر کے اب

آرام کر رہا ہے اور قلم خشک ہو گیا ہے اور جو چیز اپنے وقت میں ظاہر ہو رہی ہے بغیر اللہ تعالیٰ کے حکم کے ہو رہی ہے اور یہ کفر ہے۔ اس لیے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کو شغل اور فراغت کے وصف سے موصوف کیا ہے اور انہوں نے امر و نہی کے زوال کا عقیدہ رکھا اور اسی طرح ربوبیت و فعل کے زوال کا اعتقاد کیا یہ کفر ہے۔

بعض نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کافروں کو آگ میں جلائے گا اور انہیں مارے گا اور زندہ کرے گا پھر ان کو جلا اور مرا ہوا باقی رکھے گا اور یہ عقیدہ کفر ہے اس لیے کہ انہوں نے نص کا انکار کیا۔ بعض نے کہا: اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو عذاب دے گا مگر افعال پر نہیں یہ بھی کفر ہے۔

بعض نے کہا کہ جو دل میں خیر و شر کا خطرہ گزرے تو اس کا اتباع جائز ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوگا یہ بھی کفر ہے۔ اس لیے کہ انہوں نے وحی اور امر کو دل کے ساتھ ثابت کیا اور الہام کو جائز رکھا اور یہ کفر ہے۔

بعض نے کہا کہ بندہ جب غایت محبت کو پہنچتا ہے اور اس کا دل صاف ہو جاتا ہے اور جام محبت نوش کرتا ہے تو اس سے شرعی تکلیف ساقط ہو جاتی ہے اور اس سے عبادت اٹھ جاتی ہے اور تفکر ہی اس کی عبادت ہے۔ یہ بھی کفر ہے۔ بعض نے کہا: تفکر ادائے فرض سے افضل ہے یہ بھی کفر ہے۔

بعض کا عقیدہ یہ ہے کہ دنیا کا مال مشترک ہے تمام بنی آدم اس میں شریک ہیں۔ مال دنیا آدم و حوا کی وراثت ہے اور جو کوئی جس چیز کو لے لے وہ اسی کا حق ہے اور کسی کو منع کرنے کا حق اور جواز نہیں ہے یہ بھی کفر ہے۔

بعض نے کہا کہ جس نے علم سیکھا تو وہ لوگوں کے مال میں شریک ہے اور کہتے ہیں کہ جو اس کو منع کرے کافر ہو جائے گا اور یہ عقیدہ بھی کفر ہے۔

بعض نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کچھ فرض نہیں اگر چاہیں کریں اگر چاہیں چھوڑیں اور یہ بھی کفر ہے۔

بعض نے کہا: بندہ ایمان اور کفر کے بغیر اور کسی چیز کا مکلف نہیں ہے یہ بھی کفر ہے۔

بعض نے کہا کہ عبادات کا امر تکرار کو واجب نہیں کرتا اور یہ کفر ہے۔

اور بعض نے کہا کہ مؤمن حقیقت میں مؤمن نہیں ہے اور نہ ہی کافر حقیقت میں کافر ہے کیونکہ آخرت میں ان میں تغیر جائز ہے اور یہ بھی کفر ہے۔

بعض نے کہا: اپنے ایمان میں بھی شک ہے اور انہوں نے کہا کہ ایمان اور شہادت کیا یہ ایمان ہے؟ کیا کفر زائل ہو جائے گا؟ یہ بھی کفر ہے۔ ان کے کلام میں کچھ چیزیں وہ ہیں جو بدعت ہیں کفر نہیں ہیں مثلاً جیسے کہ ان کا کہنا کہ ثواب اور عتاب تقسیم کر دیا گیا ہے نہ زیادہ ہو نہ کم برابر ہے کوئی کرے یا نہ کرے اور یہ بدعت سینہ ہے اس لیے کہ افعال کے لیے تاثیر ہے جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”کل میسر لما خلق له“ ہر ایک کے لیے آسان کر دیا گیا ہے جس کے لیے وہ پیدا ہوا ہے۔

بعض نے کہا کہ قضاء سبقت کر گئی ہے نیک بخت کے لیے نیک بختی ہے اور بد بخت کے لیے بد بختی ہے۔

بعض (مرجیہ) کہتے ہیں: ایمان یہ ہے کہ حق و باطل میں سے تمام چیزوں کی پہچان ہو جائے اور اس کا وہ عالم ہو تو مؤمن ہے ورنہ نہیں اور یہ مسئلہ مسئلہ تقلید ہے۔ اور بعض نے کہا: ایمان عمل ہے اقرار اور تصدیق کا کچھ اعتبار نہیں۔ یہ بھی کفر ہے اس لیے کہ انہوں نے نص کا انکار کیا ہے۔ بعض کہتے ہیں: ایمان میں کمی زیادتی ہوتی ہے اور بعض نے کہا کہ ایمان میں استثناء و تخصیص جائز ہے اور اس کا ذکر ہو چکا ہے۔

اور بعض کہتے ہیں کہ قیاس حجت نہیں ایسے ہی رافضیوں نے قیاس کا انکار کیا کہ وہ حجت نہیں تو اگر ہر قیاس مراد ہے اور ہر قیاس کا انکار کیا تو یہ کفر ہے اس لیے کہ قیاس حجت ہے اور (اس کا حجت ہونا) نص سے ثابت ہے اور اگر بعض قیاس مراد ہے تو کفر نہیں بدعت ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

دسواں قول

مُعطلہ کا بیان

سب سے پہلا فرقہ سوفسطائیہ کا ہے اور وہ تین قسم کے ہیں۔

بعض نے کہا: اشیاء اور اسماء کی کوئی حقیقت نہیں جیسے آگ اور پانی کو آگ اور پانی کہا جاتا ہے اور بسا اوقات اس کا الٹ اور برعکس ہو جاتا ہے یعنی آگ پانی ہو جائے اور پانی آگ ہو جائے یہ بھی کفر ہے اس لیے کہ اس میں نص کا انکار ہے اور یہ عبودیت و ربوبیت اور احکام و نبوت سب کے معطل ماننے کے عقیدہ کی طرف پہنچا دینے والی بات ہے۔

اس لیے کہ جائز و ممکن ہے جو مرسل ہے وہ مرسل ہو جائے اور مرسل مرسل ہو جائے اور یہ بھی جائز ہوگا کہ بندہ رب ہو جائے اور رب بندہ ہو جائے۔

جواب میں یوں کہا جائے کہ تمہارے نزدیک نفی حقائق کی بھی کچھ حقیقت ہے یا نہیں؟ اگر وہ کہیں کہ ہے تو انہوں نے اپنے ہی قول کو باطل کر دیا کہ انہوں نے حقیقت کو ثابت کیا اور اگر وہ کہیں کہ نہیں تو ان سے کہا جائے گا کہ اگر نفی حقائق کی حیثیت نہیں ہے تو پھر ثبوت صحیح ہو گیا، یعنی حقائق اشیاء کا ثبوت ہو گیا۔

اور دوسری بات ہم کہتے ہیں کہ تم جانتے ہو کہ عالم کی کوئی حقیقت نہیں؟ تو اگر وہ کہیں کہ ہاں کوئی حقیقت ہے تو انہوں نے عالم کو ثابت کیا اور اپنے کلام کو باطل کیا اور اگر وہ کہیں کہ نہیں تو پھر ہم کہیں گے کہ تم نے نفی عالم کا حکم کس لیے کیا حالانکہ تم جانتے ہی نہیں؟ اور بعض نے حقائق اشیاء اور اسماء اشیاء میں شک کیا اور کہا کہ ہم نہیں جانتے کہ آیا اشیاء کی حقیقت ہے یا نہیں؟ تو ہم کہیں گے کہ تمہیں اپنے ”وجود“ میں بھی شک ہے؟ اگر کہیں: ہاں تو یہ اور فرقہ اولیٰ ایک (ہی تھیلی کے چٹے بٹے) ہو گئے اور اگر کہیں کہ ہمیں اپنے وجود میں شک نہیں تو انہوں نے حقائق کو ثابت کر دیا۔

بعض نے گمان کیا کہ اشیاء کی حقیقت ہے لیکن جو جس نے اعتقاد کیا کہ کسی چیز کی حقیقت کا وہی اس کی حقیقت ہے لیکن ان کا یہ کہنا صحیح نہیں اس لیے کہ بعض لوگوں نے اعتقاد کیا ہے کہ عالم قدیم ہے اور بعض نے اعتقاد کیا ہے کہ عالم حادث ہے اور اگر ایسا ہی ہو جیسا کہ وہ کہہ رہے ہیں تو ہم اعتقاد کرتے ہیں کہ ان کا قول باطل ہے تو ہمارا قول درست ہو جائے گا اور بعض نے کہا کہ صانع عالم حقیقت کو نہ پہچانتا ہے اور نہ ادراک کرتا ہے تو یہ بھی کفر ہے کیونکہ اوصاف معرفت نص سے ثابت ہیں اور جب حقیقتا وہ پہچانا ہی نہیں جانتا تو عالم میں کسی کا ایمان صحیح نہیں اور حالانکہ اللہ تعالیٰ نے مؤمن کا نام مؤمن رکھا ہے۔

اور بعض نے کہا کہ ہم نہیں کہتے کہ اللہ تعالیٰ شے ہے یا شے نہیں بلکہ اس میں توقف کرتے ہیں اور یہ کفر ہے اس لیے کہ نص کا انکار کیا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "قُلْ أَيُّ شَيْءٍ أَكْبَرُ شَهَادَةً قُلِ اللَّهُ شَهِيدٌ" (الانعام: ۱۹) تم فرماؤ کہ اللہ تعالیٰ سے کون سی شے بڑی ہے شہادت کے لیے؟ تم فرماؤ کہ اللہ ہی گواہ ہے۔ پھر شے اور ذات ایک چیز ہے یعنی شے کا انکار کرنا ذات کا انکار کرنا ہے۔

بعض کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر مکان (جگہ) میں اترا ہوا ہے اور اس سے کسی چیز کا بیان نہیں یہ بھی کفر ہے۔

بعض کہتے ہیں: اپنے نفس کے لیے رب کا ثابت کرنا اور اس کا انکار کرنا جائز نہیں۔ یہ بھی کفر ہے اس لیے کہ اس نے صانع اور نص کا انکار کیا۔

بعض کہتے ہیں کہ چار صفتیں: علم، قدرت، تخلیق اور مشیت غیر مخلوق ہیں باقی صفات مخلوق ہیں۔ یہ بھی کفر ہے اس لیے کہ ذات و صفات میں تغیر و زیادت کو جائز مانا جو کہ کفر ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ ہم قرآن کو مخلوق یا غیر مخلوق نہیں کہتے۔ یہ بھی کفر ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "وَكَلَّمَ اللَّهُ مُوسَى تَكْلِيمًا" (النساء: ۱۶۳) اللہ تعالیٰ نے موسیٰ سے حقیقتاً کلام فرمایا اور اس نے اس میں شک کیا یہ بھی کفر ہے۔

بعض کہتے ہیں: قراءت و قرآن ایک ہے لفظ و ملفوظ ایک ہے یہ بھی کفر ہے اس لیے کہ تخلیق قرآن کو جائز مانا۔ بعض نے قرآن کو مخلوق مانا یہ بھی کفر ہے۔ بعض کہتے ہیں: جنت و نار فنا ہو جائیں گی یہ بھی کفر ہے۔

اور بعض کہتے ہیں کہ مؤمن جہنم میں نہیں جائے گا اور "ورود" کے معنی حضور کے ہیں دخول کے نہیں۔ یہ بھی کفر ہے اس لیے کہ نص کا انکار کیا ہے "ورود" بمعنی دخول ہے اس کی دلیل یہ آیت ہے: "ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِينَ اتَّقَوْا وَنَذُرُ الظَّالِمِينَ فِيهَا جِثًا" (مریم: ۷۲) پھر ہم ڈروالوں کو نجات دیں گے اور ظالموں کو گھسنوں کے بل گرے ہوئے چھوڑ دیں گے۔

بعض کہتے ہیں: حوض، صراط اور میزان درحقیقت وہ نہیں جو ہم جانتے ہیں اس کے خلاف ہے۔ حوض سے مراد پانی ہے صراط سے مراد دین ہے میزان سے مراد عدل ہے اور

عرش سے مراد ملک ہے اور کرسی سے مراد علم ہے۔ یہ کفریات نہیں اس لیے کہ انہوں نے محل تاویل میں تاویل کرتے ہوئے خطا کی ہے کیونکہ ان چیزوں کے نام نص سے ثابت ہیں اور ان کی کیفیت معلوم نہیں۔ بعض نے عذاب قبر کا انکار کیا۔ بعض فقہاء نے فرمایا کہ کفر ہے کہ نص کے منکر ہیں۔ بعض فقہاء فرماتے ہیں کہ کفر نہیں کیونکہ یہ خبر واحد سے ثابت ہوا ہے اور صحیح یہ ہے کہ کفر ہے۔ بعض نے دیدار الہی کا انکار کیا اور اس کا ذکر ہو چکا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

گیارہواں قول مُشَبَّہہ کا بیان

جاننا چاہیے کہ مُشَبَّہہ نے اللہ تعالیٰ کی صفات ثابت کی ہیں اور اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے اور انہوں نے اپنی رائے سے دو حدیثوں پر تجاوز کیا بغیر علم کے اور بغیر معنی کے انہوں نے سماع سے تجاوز کیا جب کہ یہ دونوں طریقے فاسد ہیں اس لیے کہ علم و حکمت کے لحاظ سے جائز نہیں کیونکہ مجرد رائے موجب علم نہیں جب تک کسی شئی کا احاطہ دلیل سے یا خبر سے نہ کیا جائے اور ایسے ہی سماع بغیر معنی کے نہیں سمجھا جاتا اور ان لوگوں نے دلیل و احاطہ کو قیاس کے ساتھ چھوڑ دیا اور معنی کو چھوڑ دیا مجرد سماع سے۔ اسی وجہ سے بعض نے کہا: صانع عالم جوہر ہے اس لیے کہ موجود ہے اور ان کی یہ بات ”رائے بلا علم“ اور قیاس بالواسطہ ہے اور یہ کفر ہے۔

بعض (مُشَبَّہہ) کا عقیدہ یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ انبیاء کی صورت پر ہے اور ان کا یہ عقیدہ کفر ہے اور بعض کہتے ہیں کہ خدا (معاذ اللہ) جسم ہے مگر جسموں کی طرح نہیں یہ بھی کفر ہے اس لیے کہ انہوں نے اپنی رائے سے خدا کا وہ وصف بیان کیا جس سے اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو موصوف نہیں کیا اور نہ ہی علماء کا اس پر اتفاق ہوا۔ بعض کہتے ہیں کہ خدا انسان کی صورت ہے اور یہ کفر ہے۔

اور بعض نے کہا: اللہ تعالیٰ کے لیے ”معاذ اللہ“ گوشت و خون ہاتھ، ہتھیلی، انگلی (یعنی تمام لوازمات جسم) ثابت ہیں۔ جیسا کہ حضور اقدس سے مروی ہے کہ فرمایا: ”قلوب العباد

بین اصبعین من اصابع الرحمن“ بندوں کے دلِ رحمن کی انگلیوں میں ہیں۔ یہ ان کا کفر ہے اس لیے کہ سماع ہے اور معنی کچھ اور ہیں۔

حضرت اصمعی رحمہ اللہ تعالیٰ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: اصابع سے مراد لغت میں اثر ہے (یعنی اصابع از روئے لغت اثر سے عبارت ہے)۔ بعض نے کہا کہ اللہ کی صورت ہے، مگر ہم نہیں جانتے، یہ بھی کفر ہے اس لیے کہ معرفت کا انکار کیا۔

بعض کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ چمکتا ہوا نور ہے، یہ بھی کفر ہے اس لیے کہ نص کا انکار کیا۔ نص یہ ہے: ”لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ“ (الشوریٰ: ۱۱) اللہ کی مثل کوئی شئی نہیں۔

بعض (مشبہ) کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اترتا اور آتا ہے اب اگر انہوں نے آنا اور اترنا انتقال مکانی کے ساتھ کہا ہے تو یہ کفر ہے اس لیے کہ انتقال جائز رکھا اور اگر نزول و مجبئی (اترنا اور آنا) بغیر کیف و انتقال ہے تو کفر نہی، خطا ضرور ہے۔

بعض (مشبہ) نے کہا کہ خدا عرش پر موجود ہے اس نے عرش پر قرار پکڑا اور تکیہ لگایا۔ یہ کفر ہے اس لیے کہ نص کا انکار کیا اور ذاتِ خداوندی کو عرش پر یا فوق العرش ثابت کرنا یہ کفر ہے اور جہت ثابت کرنا بھی کفر ہے اس لیے کہ مخلوق سے تشبیہ دی اور اس کے لیے حد و نہایت، جانب و جہت ثابت کی اور یوں کہتے کہ اللہ تعالیٰ علی العرش بلا کیف اور بغیر ذات کے ہے تو کافر نہ ہوتے بلکہ خطاوار ہوتے۔

بعض نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کے قدم (پاؤں) ہیں اس لیے کہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا: جنہم پکارتا رہے گا: ”هل من مزيد حتى يضع الرب قدميه فيها“ کیا اور ہے؟ حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ اپنے دونوں قدم اس میں رکھ دے گا۔

ہم کہتے ہیں کہ اس سے مراد قدم بمعنی قدیم علم ہے جو کافر و فاجر اس کے علم قدیم میں (جنہمی ہیں) ان کو جنہم میں داخل فرما دے گا۔ دلیل یہ ہے کہ ”ان لهم قدم صدق عند ربهم یعنی سابقہ سعادتہم“ اور قدم کو قدم سے اس لیے موسوم کیا کہ تمام اعضاء سے پہلے قدم کو پیدا فرمایا۔

اگر کہا جائے کہ حدیث میں تو آیا ہے: ”يضع الرب رجلاه“ رب اپنا پاؤں رکھے گا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ روایت ثابت نہیں اور بالفرض اگر ثابت ہو تو ہم کہتے ہیں کہ

”رجل“ کے معنی جماعت کے ہیں جیسے عرب کا مقولہ ہے: ”مردت برجل جواد“ کہ میں ٹڈیوں کے لشکر و جماعت کے پاس سے گزرا۔

پھر ہم کہتے ہیں کہ ”نزول“ بمعنی ”انزال“ ہے جیسے ”ضرب الامیر فلانا یعنی امر بالضرب“ امیر نے فلاں کو مارا یعنی مارنے کا حکم دیا، اسی طرح یہاں بھی نزول و انزال کا حکم دیا نہ کہ خود اترا۔ دوسرے حضور سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ”ینزل بضم الیاء“ اور اگر یہ روایت صحیح ہے تو اشکال ہی اٹھ گیا۔

حضرت علی بن ابی طالب سے مروی ہے کہ ”النزول من الرب الافضال علی العباد“ نزول اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں پر فضل فرمانا ہے، اگر کہا جائے: اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ”وَجَاءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا“ (النجم: ۲۲) اور تمہارا رب اور فرشتے صف بہ صف آئیں گے اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”فَاتَى اللّٰهُ بُنْيَانَهُمْ مِّنَ الْقَوَاعِدِ“ (النحل: ۲۶) پس اللہ تعالیٰ نے ان کی عمارت کو بنیاد سے لیا اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”هل ينظرون الا ان ياتيهم الله في ظلل من الغمام“ (البقرہ: ۲۱۰) کس کے انتظار میں ہیں مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ کا عذاب ان پر آئے چھائے ہوئے بادلوں میں۔

ہم نے کہا: اس کے معنی: ”وجاء ربك“ ”ای حکم ربك و امر ربك“ یعنی تمہارے رب کا امر اور حکم اور معنی ”فاتى الله بنيانهم من القواعد“ یعنی ”استهلكهم الله“ اللہ تعالیٰ نے ان کو ہلاک کر دیا ”واستاصلهم“ اور ان کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا اور ”هل ينظرون“ الخ اور ”ظلل“ کے معنی ابر کے ہیں جو تحت العرش ہے نیز انہوں نے کہا کہ ”ياتيهم الله“ کا معنی ہے: ”ياتى الله حكم من الاحكام“ اللہ تعالیٰ کے احکام میں سے حکم آ جائے۔

پھر کلام لوثنا ہے حرف واحد کی طرف (یعنی پورے کلام کا مال کا ایک نکتہ ہے)۔

وہ یہ کہ اشکال از روئے لغت واقع ہوا ہے لفظاً جو کہ معنی کے موافق نہیں اور اہل لغت و

اہل تفسیر خوب جانتے سمجھتے ہیں اور ان کا اجتہاد معتبر ہے اور ان کا اجماع اس پر حجت ہے۔

اور ارباب لغت اور ارباب تفسیر متفق ہیں کہ ان آیات کو ظاہر پر محمول کرنا جائز نہیں

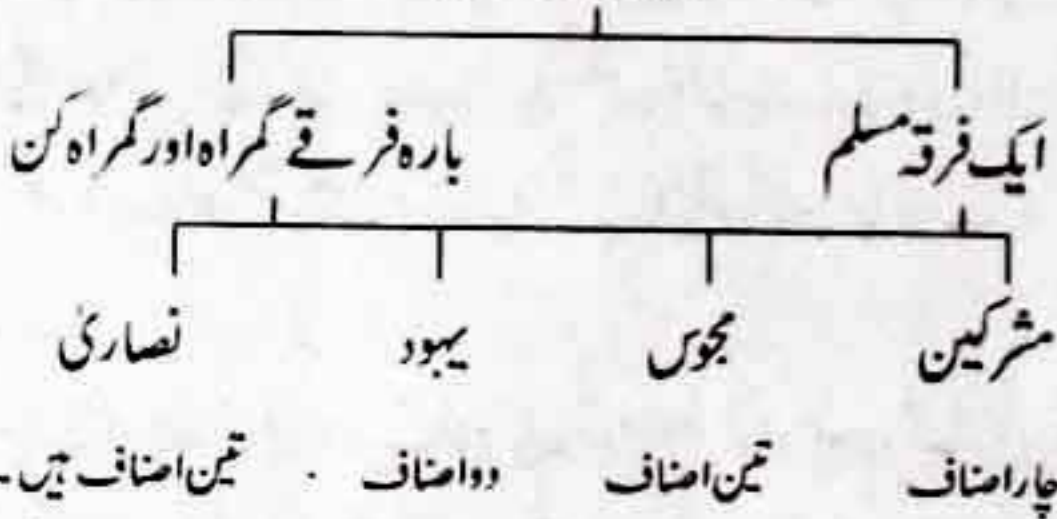
ابہام ان میں اولیٰ ہے۔ تاویل ان میں حسن ہے۔ اللہ تعالیٰ کو ایسی چیز کے ساتھ موصوف کرنا

کہ جس سے تشبیہ اور تغیر و حدوث ثابت ہو یا مخلوق کی صفات کے مشابہ ہو خواہ نص میں ہو یا غیر نص میں بلا خلاف کافر ہو جائے گا۔ ایسی نصوص میں یقیناً تاویل کرنا ضروری ہے۔
واللہ تعالیٰ اعلم

بارہواں قول کفر و شرک کا بیان

جاننا چاہیے کہ مخلوق تیرہ قسموں میں متفرق ہو گئی ہے۔

مخلوق کی کل قسمیں ۱۳



لیکن اصل شرک حضرت اخنوخ علیہ السلام جن کو ادریس علیہ السلام کہتے ہیں ان کے زمانہ میں ظاہر ہوا۔ حضرت آدم علیہ السلام کے وقت سے ادریس علیہ السلام تک مخلوق میں سے کسی نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرایا۔

بعض نے ذکر کیا کہ حضرت آدم علیہ السلام کے وقت میں کفر ہوا کہ قابیل اور اس کی اولاد نے آدم علیہ السلام کے حکم کو رد کر دیا لیکن اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کیا۔

کفر و شرک میں فرق

فرق یہ ہے کہ کفر کے معنی حق کو چھپانا ہے اور شرک اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک

ٹھہرانا ہے۔

یہود و نصاریٰ کون ہیں؟

یہود و نصاریٰ کفار ہیں مشرک نہیں۔ فرق اسم و صفت کے اعتبار سے ہے لیکن حقیقت

اور حکم میں شرک اور کفر کے درمیان کچھ فرق نہیں سوائے چند جگہوں کے وہ مقامات اور مواقع یہ اہل کتاب کا ذبیحہ ہمارے لیے حلال ہے ایسے ہی ان کی عورتوں سے نکاح کرنا مسلمانوں کے لیے حلال ہے اگرچہ کافر ہیں۔

بعض فقہاء نے فرمایا: کفر اور شرک الگ الگ دو چیزیں ہیں یہاں تک کہ اہل کتاب میں سے کوئی ایک یا کوئی مجوسی اپنی ملت کو چھوڑ کر شرک میں داخل ہو جائے تو اس کو مجبور کیا جائے گا اور تکلیف دی جائے گی کہ اپنی ملت کی طرف لوٹ جا اور یہ قول امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کا ہے اور امام ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مجبور نہیں کیا جائے گا اس کو چھوڑ دیا جائے اس لیے کہ کفر و شرک ایک چیز ہے۔

اور بعض کہتے ہیں کہ حقیقت میں کفر و شرک میں کچھ فرق نہیں اور یہ اختلاف اس معنی کے لحاظ سے واقع ہوا کہ اہل کتاب سے جزیہ (ٹیکس) لیا جائے گا اور جو ان کی مثل ہیں مثلاً مجوسی اور صابی وغیرہ سے اور مشرکین پر جزیہ (ٹیکس) مقرر نہیں کیا جائے گا یہ حکم امام شافعی کے نزدیک ہے۔

امام ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نزدیک تمام کافر خواہ یہود و نصاریٰ ہیں یا ہنود و مجوس سب پر جزیہ مقرر کیا جائے گا۔ اگر اہل کتاب میں سے کوئی اپنی ملت چھوڑ کر مشرکین کی ملت میں داخل ہو جائے تو امام شافعی کے نزدیک اس میں بیت المال کا حق باطل کرنا ہے اور اہل بیت المال کا نقصان کرنا اور انہیں ضرر پہنچانا ہے تو اس کو مجبور کیا جائے گا کہ اپنی ملت میں واپس آئے اور امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک جزیہ لیا جائے گا رجوع پر مجبور کرنے کی ضرورت نہیں، لیکن حقیقت میں کفر و شرک ایک چیز ہے۔ دلیل یہ ہے کہ سب جہنمی ہیں اور ہمیشہ جہنم میں رہیں گے۔

شرک کب شروع ہوا؟

یہ جو ہم نے کہا کہ شرک اخنوخ علیہ السلام کے زمانہ سے شروع ہوا اس لیے کہ یہ پہلے نبی ہیں ان پر اللہ تعالیٰ نے کتاب اتاری جس میں تمیں صحیفے تھے اور ان کو اسی وجہ سے ادریس کہتے ہیں کہ درس و تدریس میں کثرت سے مشغول رہتے تھے اور وہ علم نجوم بھی جانتے تھے۔ کیا ادریس علیہ السلام حیات ظاہری کے ساتھ زندہ ہیں؟ اس میں اختلاف ہے بعض

کہتے ہیں کہ ادریس علیہ السلام نے موت کا ڈانقہ چکھا اور دوزخ کو دیکھا اور وہ (ادریس علیہ السلام) جنت میں ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ انہوں نے موت کا ڈانقہ نہیں چکھا وہ زندہ ہیں اور ان کے شاگرد لوگوں کو ہدایت کرتے تھے اور انہوں (شاگردوں) نے حضرت ادریس علیہ السلام سے علم حاصل کیا اور وہ پانچ شخص تھے: ایک کا نام ڈڈ تھا دوسرے کا نام سواع تیسرے کا نام یغوث چوتھے کا نام یعوق اور پانچویں کا نام نسر تھا۔ جب ادریس علیہ السلام آسمان کی طرف اٹھائے گئے تو یہ پانچ شاگرد باقی رہ گئے۔

حضرت ادریس علیہ السلام کی جدائی اور مفارقت میں بہت غمگین تھے اور آپ کو انہوں نے نہیں دیکھا اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے۔ حضرت ادریس علیہ السلام کے آسمان کی طرف اٹھائے جانے کے بعد لوگوں کو علم سکھاتے جب ان پانچوں شاگردوں کا بھی انتقال ہو گیا تو لوگ حیران و پریشان تھے کہ کس سے احکام سیکھیں؟ اور اس پر ان کو بہت غم اور فکر تھا چنانچہ ان میں سے ایک گروہ نے کہا کہ اگر ہم ان پانچوں کی تصویر بنا کر رکھ لیں تاکہ ہمیں تسلی ہو اور عبادت میں مشغول ہوں تو انہوں نے ان پانچوں کی تمثال بنا کر انہی کے نام سے ہر ایک کو موسوم کر دیا اور ان کی طرف دیکھا کرتے اور اللہ تعالیٰ کی مورتیاں عبادت کرتے ان کو بھی اللہ تعالیٰ نے وفات دی اور یہ دین اسلام پر تھے۔ پھر جب ان کی اولاد (جوان) ہوئی تو ابلیس ان کے پاس آیا اور ان مورتیوں کے پیٹ میں داخل ہو کر کہنے لگا کہ "انا ربکم ورب ابائکم فاعبدونی" میں تمہارا اور تمہارے باپ دادا کا رب ہوں میری عبادت کرو کہ تمہارے باپ دادا بھی مجھ کو پوجتے تھے اور ان کو یہ علم نہ ہوا کہ ان کے باپ دادا بت پرستی نہیں کرتے تھے۔ اس کے بعد اعتقاد کر لیا اور ان کی مثل سونے چاندی اور تانبے کی صورتیں بنا لیں اور ان پانچوں کے نام رکھ دیئے اور نوح علیہ السلام کے زمانہ تک انہیں بتوں کو پوجتے رہے اور اپنی اولاد کو بھی وصیت کرتے رہتے کہ انہی بتوں کو پوجتے رہنا اور وہ سواع یعوق نسر یغوث کو نہ چھوڑنا۔

حضرت نوح علیہ السلام ان کو اسلام کی دعوت دیتے لیکن انہوں نے نوح علیہ السلام کی اطاعت نہیں کی تو نوح علیہ السلام نے دعا کی: "رب لا تذر علی الارض من الکافرین دیارا" (نوح: ۲۶) اے میرے رب! کافروں میں سے کوئی زمین پر بسنے والا نہ چھوڑ تو اللہ

تعالیٰ نے ان سب کو غرق کر دیا، ان میں سے اسی اشخاص باقی بچے جو اسلام پر قائم رہے۔ چالیس مرد اور چالیس عورتیں، پھر سب کا انتقال ہو گیا اور تین شخص باقی رہے جن کے نام درج ذیل تھے:

(۱) سام (۲) حام (۳) یافث۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی پشتوں سے اولاد آدم کو نکالا اور وہ اصنام (بت) کیچڑ میں چھپا دیئے گئے۔

پھر جب حضرت اسماعیل علیہ السلام مبعوث ہوئے تو ابلیس نے ان پانچوں بتوں کو کیچڑ سے نکال کر ایک غطفان نامی قبیلہ کو دیئے، پھر اور بت تراشتے گئے یہاں تک کہ ان کی تعداد تین سو ساٹھ ہو گئی تو مشرکین کی چار صنف ہو گئیں: (۱) ایک صنف نے کہا: فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں (نعوذ باللہ) (۲) ایک صنف نے کہا: اصنام (بت) اللہ کی بیٹیاں ہیں (۳) ایک نے کہا: اصنام اللہ کے شریک ہیں (۴) ایک نے کہا: فرشتے اور اصنام دونوں اللہ کی بیٹیاں نہیں ہیں نہ اس کے شرکاء ہیں، لیکن انہوں نے کہا کہ اصنام آسمان کی طرح ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ہماری سفارش کرنے والے ہیں جب یہ بت ہم سے راضی ہوتے ہیں تو آسمان کا خدا ہم سے راضی ہوتا ہے اور یہ ان کو پوجتے تھے۔

پھر ہمارا اجماع ہے کہ کفر بغض المبعوضات ہے۔ اللہ کے نزدیک یہاں تک کہ کافر جب کفر کرتا ہے تو قریب ہے کہ زمین و آسمان پھٹ جائیں اور اللہ تعالیٰ تمام مخلوق کو ہلاک کر دے، ان کی نحوست کی وجہ سے اور ان کی وجہ سے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "تُكَادُ السَّمَوَاتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْأَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًا أَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمَنِ وَلَدًا" (مریم: ۹۰) قریب ہے کہ آسمان اس سے پھٹ جائیں اور زمین شق ہو جائے اور پہاڑ ڈھ کر گر جائیں۔ اسی وجہ سے ہم کہتے ہیں کہ جو شخص کفر نہ کرے لیکن دوسرے کے کفر پر راضی ہو، اگرچہ ایک ساعت کے لیے ہو تو وہ کافر ہو جائے گا، یہاں تک کہ اگر کوئی کافر کہے: مسلمان کر لو اور یہ کہے کہ ایک ساعت صبر کر یا کہے کہ فلاں کے پاس جا تو کافر ہو جائے گا۔

ایسے ہی اگر ظلم و معصیت پر راضی ہو تو کافر ہو جائے گا اور اگر کفر و معصیت اور ظلم کو پسند کرے تو کافر ہو جائے گا اور ایسے ہی جو کفر و اسلام میں یا معصیت و طاعت میں فرق نہ کرے، کافر ہو جائے گا یا حلال و حرام میں فرق نہ کرے تو کافر ہو جائے گا اور ایسے ہی اگر

نیت کی کہ کفر کرے گا تو فی الفور کافر ہو جائے گا۔ ایسے ہی اگر کسی مسلمان کے کفر پر گواہی دے تو اسی وقت کافر ہو جائے گا اور اسی طرح اگر بغیر تقیہ کے شعائر کفر کا اظہار کیا تو کافر ہو جائے گا۔ اعاذنا اللہ تعالیٰ

تیرھواں قول آتش پرستوں کا بیان

جان لیجئے کہ مجوس (آتش پرست) تین قسم کے ہیں۔ ایک زمزمیہ اور وہ یہ کرتے ہیں کہ جب آتش کدہ میں داخل ہوتے ہیں تو منہ سے سیٹی بجاتے ہیں اور اصل میں ان کی ابتداء اس وقت سے ہوئی جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ نے نہیں جلایا تو ابلیس نے آ کر ان سے سرگوشی کی اور کہا: حکیم و علیم کے لیے یہ اچھا اور مستحسن نہیں کہ ایک چیز کو پیدا کرے اور پھر اس کی ضد کو پیدا کر لے اور اس پر ضد کو مسلط کر دے یہاں تک کہ اس کو ہلاک کر دے لیکن (بلکہ) ہر حسین و جمیل نافع ہے نور ہے وہ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور ہر قبیح گمراہ اور گمراہ کن چیز نقصان دہ اور نار ہے وہ ابلیس کی طرف سے ہے اور یہ دونوں بھائی ہیں (یعنی اچھی چیزوں کو پیدا کرنے والا خدا ہے اور بری اور نقصان دہ اشیاء کا پیدا کرنے والا شیطان ہے یہ شیطان نے نظر یہ پیش کیا)۔

ایک کا نام یزدان ہے اور دوسرے کا نام اہرمن ہے اور ان دونوں میں پہلے سے عداوت تھی یہ (متذکرہ بالا فرقہ مجوس) اس پر اعتقاد رکھتے ہیں اور آپ کی پوجا کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام کو آگ نے اس لیے نہیں جلایا کہ وہ آگ کی پوجا کرتے تھے اور ہم بھی اس لیے آگ کی پوجا کرتے ہیں تاکہ آگ ہمیں آخرت میں نہ جلائے۔

اور بعض نے ایک دوسری علت نکالی کہ قابیل کی قربانی کو آگ نے اس لیے جلایا کہ آتش پرست تھے اور ہابیل کی قربانی کو آگ نے جلا دیا کہ وہ آتش پرست نہ تھے اور یہ لوگ منہ بند رکھتے ہیں تاکہ آگ کو ان کے سانس سے تکلیف نہ پہنچے اور نیز آگ کے سامنے سوتے نہیں اور آگ بجھنے نہیں دیتے۔

مجوسیوں کے ایک فرقہ کا نام شامیہ ہے، وہ آفتاب پرست ہیں۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ سورج اللہ کا بڑا نور ہے۔

اور تیسری صنف کو شمسیہ کہتے ہیں، یہ قوم ہر نور کو پوجتی ہے جیسے سورج، چاند، ستارے، آگ وغیر ذلک اور کہتے ہیں کہ یہ تمام انوار اصل میں ایک ہی نور تھا جب مخلوق یعنی عرش، لوح، آسمان پیدا نہیں ہوئے تھے۔ جب اللہ تعالیٰ نے ان اشیاء کو پیدا کیا یہ انوار متفرق ہو گئے اور یہ دیکھنے میں متفرق ہیں اور حقیقت میں ایک ہی نور ہے اور وہ اللہ کا نور ہے۔

اور اس قول کا مال و مرجع بھی دراصل تناخ ہی قرار پاتا ہے اور جو ہر بسیط میں قول فلاسفہ کے مشابہ ہے۔

دیگر فرقوں کا بیان

اور ایسے ہی وثنیہ، برامہ اور شمذیہ اہل ہیبت میں سے اور حلویہ بلاذخا قانیہ سے سب یہی عقیدہ رکھتے ہیں اور پھر مجوس کا حکم رتبہ میں اہل کتاب کی طرح ہے۔ اس لیے کہ ان کے پاس شبہۃ الکتاب ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ مجوس کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے کتاب ہے اور ان میں ایک عادل بادشاہ تھا اور لوگ اس سے اس کے عدل کی وجہ سے محبت کرتے تھے، پھر یہ بادشاہ اپنی بہن پر عاشق ہو گیا اور اس سے صحبت کر بیٹھا، اس (بہن) نے لوگوں سے راز فاش کر دیا اور (اپنے بھائی) بادشاہ کی شکایت کی اور لوگ یہ سن کر بادشاہ کے خلاف نکل کھڑے ہوئے۔

بادشاہ اپنے محل پر چڑھا اور کہنے لگا: اے لوگو! ہم جنات کی اولاد ہیں؟ سب نے کہا: ہم آدم کی اولاد ہیں۔ بادشاہ نے کہا: کیا آدم علیہ السلام کی شریعت تھی؟ سب نے کہا: ہاں تھی۔ تو بادشاہ نے کہا: ان کی شریعت اولیٰ ہے (یعنی اس میں بہن سے نکاح جائز تھا)۔ سب نے کہا: تو سچ کہتا ہے، پھر بادشاہ لوٹ آیا اور اپنی بہن سے نکاح کر لیا اور اپنے حوالہ نکاح میں لے لیا، پھر جب رات کو سویا تو اللہ تعالیٰ نے کتاب اٹھالی۔

اور بعض نے کہا کہ ان کے پاس کتاب کے مشابہ ہے، اس معنی کے لحاظ سے کہ ان میں متنبی تھا، اس کو زردشت کہتے ہیں، اس نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا اور ایک کتاب اس نے لوگوں کے سامنے پیش کی، اس کو ژند و پاژند کہا جاتا تھا اور اس نے کہا: یہ کتاب اللہ کی طرف سے ہے،

اس میں احکام و قصص اور امر و نہی وغیرہ بہت سی باتیں ہیں جو سب خلاف شرع ہیں اور اس کتاب (ژند و پاژند) کی زبان ایسی ہے کہ کسی نے اس زبان کے ساتھ تکلم نہیں کیا اور یہ تین قسم ہیں:

(۱) زرادشتہ (۲) مردکیہ (۳) نوشیروانیہ اور ان کا کفر ظاہر ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے

دامن رحمت میں پناہ دے۔

چودھواں قول یہودیوں کا بیان

معلوم ہونا چاہیے کہ یہود کی دو قسمیں ہیں: (۱) عزیز یہ (۲) سامریہ اسی کو سامریہ بھی کہا جاتا ہے۔ یہود حضرت عزیر علیہ السلام کے زمانہ میں ظاہر ہوئے اس لیے کہ بخت نصر نے جب بیت المقدس کو خراب کیا اور ان کے بچوں کو قیدی بنا لیا اور حضرت عزیر بھی قیدیوں میں تھے اور وہ کم سن تھے اور ان کو قید کر کے سرزمین عراق میں پہنچا دیا چنانچہ جب بخت نصر فوت ہو گیا اور اس کی جگہ دوسرا بادشاہ تخت نشین ہوا اور اس نے بنی اسرائیل کی ایک عورت سے نکاح کر لیا اور وہ عورت اسے بہت محبوب تھی اس کو بہت چاہتا تھا۔

ایک دن بادشاہ نے کہا: مانگ جو تیری حاجت ہو۔ اس پر وہ (اس کی محبوب بیوی) کہنے لگی: بنی اسرائیل (جو قید تھے) مجھے بخش دے۔ اسی نے بنی اسرائیل اسے بخش دیئے اور ان سب کو بیت المقدس بھیج دیا اور حضرت عزیر علیہ السلام جب جوان ہو گئے حضرت جبرائیل علیہ السلام تشریف لائے اور ان کے دہن اقدس میں دم کیا پھونک ماری تو حضرت عزیر علیہ السلام کو تمام ”تورات“ حفظ ہو گئی پھر جب تمام قیدی بیت المقدس بھیج دیئے گئے اور بیت المقدس میں کچھ بچے کھچے بوڑھے آدمی رہ گئے تھے ان قیدیوں نے ان مشائخ کو خبر دی کہ ہم میں ایک شخص ”تورات“ کا حافظ ہے تو مشائخ نے کہا کہ ہاں! ہم نے بھی سنا ہے کہ قیدیوں میں ایک شخص ہے جس کو ”تورات“ حفظ ہے تو انہوں نے ”تورات“ طلب کی آپ نے ”تورات“ پڑھ کر سنائی تو ان میں سے ایک آیا اور کہنے لگا: میں نے اپنے والد سے سنا

ہے کہ اس نے ایک جگہ ”تورات“ چھپا رکھی ہے چنانچہ نو آدمیوں نے مزید گواہی دی اور اس کی تصدیق کی کہ جبات مصفوفہ میں ”تورات“ چھپائی ہوئی ہے جو ایک انگور کے باغ میں ہے لہذا سب وہاں گئے اور تلاش و جستجو کے بعد انہیں ”تورات“ کا ایک نسخہ مل گیا اب انہوں نے اس دریافت شدہ نسخہ کا اس نسخہ سے مقابلہ کیا جو حضرت عزیر علیہ السلام نے لکھوایا تھا تو انہوں نے اس میں ایک لفظ کی بھی زیادتی یا کمی نہ پائی تو اب ابلیس آیا اور اس شیطان مردود نے لوگوں کو اس طرح بہکایا کہ کہنے لگا کہ اگر عزیر علیہ السلام خدا کے بیٹے نہ ہوتے تو ”تورات“ انہیں حفظ نہ ہوتی یہ اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں، منجی بنے ہوئے ہیں اور ”تورات“ چالیس جزوں پر مشتمل تھیں چار آدمیوں کو پوری حفظ تھی: (۱) موسیٰ (۲) ہارون (۳) یوشع (۴) عزیر علیہم السلام۔ جمعین اور ان یہودیوں کے پاس ایک دو صحیفہ تھے۔ ابلیس نے کہا کہ یہ ابن اللہ (اللہ کے بیٹے) ہیں خدا نے ان کو بیٹا بنایا ہے لوگ معتقد ہو گئے اور ”عزیر ابن اللہ“ کہنے لگے۔

یہود کی دوسری قسم

یہود کی صنف ثانی سامریہ ہے یہ وہ لوگ ہیں جو گوسالہ پرستی کرتے یعنی پچھڑے کی پوجا کرتے تھے یہ اس لیے کہ سامری نے ایک پچھڑے کا مجسمہ بنایا جو آواز نکالتا تھا اور سامری نے کہا تھا کہ ہمارے جسم ناپاک ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی خدمت کی صلاحیت نہیں رکھتے اور یہ گائے پاک ہے ہم اس کی عبادت کریں تاکہ یہ اللہ کے حضور ہماری شفاعت کرے یہ لوگ اور بت پرست برابر ہیں۔ ان یہودیوں اور بت پرستوں میں کچھ فرق نہیں۔

اور یہودیوں میں سے بعض یہ کہتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت سے پہلے کوئی شریعت نہ تھی اور ان کے بعد بھی کوئی شریعت نہیں اور موسیٰ علیہ السلام کے سوا کوئی پیغمبر صاحب شریعت نہیں اور کہتے ہیں کہ اللہ کا دیدار نہ ہوگا اگر دیدار جائز و ممکن ہوتا تو موسیٰ علیہ السلام کو کیوں منع کیا گیا اور جب منع کیا گیا تو یہی صحیح ہوا کہ خدا کا دیدار نہ ہوگا۔

بعض یہودی وہ ہیں جو حضور اقدس ﷺ کو عرب و عجم کے لیے صاحب شریعت مانتے ہیں کیونکہ ان (عرب و عجم) کے پاس شریعت نہ تھی تو اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ کو ان کی طرف بھیجا اور بنی اسرائیل کے پاس تو کتاب و شریعت تھی لہذا کتاب و شریعت کا نسخہ جائز نہیں۔

اور اس کا جواب پہلے دیا جا چکا ہے اور یہی منصوص ہے اللہ تعالیٰ کے اس قول سے کہ
 ”وما ارسلناک الا کافة للناس بشیرا و نذیرا“ (سبا: ۲۸) اور ہم نے آپ کو نہیں بھیجا
 مگر تمام لوگوں کے لیے خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا۔ والحمد لله بکرۃ واصیلا۔

پندرھواں قول

نصاری کا بیان

نصاری کی تین قسمیں ہیں: (۱) ملکا یہ (۲) نسطوریہ (۳) مار یعقوبیہ۔

اور یہ فرقے اس لیے ظاہر ہوئے کہ ان کے اور یہود کے درمیان عداوت تھی اور سخت
 لڑائی جھگڑے رہتے تھے اور بے شمار یہودیوں کو نصاریٰ نے قتل کر دیا تھا۔

ایک یہودی عالم تھا اس کے سبب سے منازعت تھا اس نے ازراہ عذر تدبیر کیا اور اپنا
 ہاتھ اپنے چہرے پر مارا اور ایک آنکھ پھوڑ دی پھر نصاریٰ کے پاس آیا اور کہا: تم مجھ کو پہچانتے
 ہو؟ سب نے کہا: ہاں! پہچانتے ہیں۔ کہا کہ عیسیٰ علیہ السلام فلاں رات آسمان سے اترے اور
 فرمایا: ای فلاں! تو نے میری امت کے ساتھ کیا کیا اور ایک تھپڑ رسید کیا تو میری آنکھ پھوڑ دی
 تو میں نے اسی وقت یہودیت سے توبہ کر لی اور یہودی مذہب کا بطلان مجھ پر ظاہر ہو گیا اب
 میں عیسائی ہوں۔ لوگوں نے اس کو سچا جان لیا اور اپنے بیٹوں کو جمع کیا اور اس کے سپرد کر دیا
 کہ اس سے تعلیم حاصل کریں اس (یہودی عالم) نے ان میں سے تین آدمی چن لیے: ملکا،
 نسطور، مار یعقوب۔ جب ان تینوں نے خوب علم حاصل کر لیا اور اس کے معتقد ہو گئے تو ایک
 دن ملکا سے کہا کہ تو عیسیٰ علیہ السلام کو جانتا ہے؟ اس نے کہا کہ ہاں! وہ اللہ تعالیٰ کے رسول
 اور نبی اور روح اللہ ہیں۔ اس یہودی نے کہا: ایسی بات نہ کر ڈ کیا کسی نے مادر زاد اندھوں کو
 بینا کیا؟ کوڑھی اور برص زدہ لوگوں کو اچھا کیا؟ اور مردہ کو زندہ کیا؟ اور پرندہ کو پیدا کیا؟
 بلکہ وہ اللہ ہیں آسمان سے اتر کر جو کچھ کیا کر گزرے اور پھر آسمان پر چڑھ گئے۔

اور یہ بات کسی سے نہ کہنا صرف اپنے دل میں رکھنا اور اس نے اپنے دل میں رکھا اور

اعتقاد کیا۔

نسطور سے علیحدہ ہو کر کہا کہ عیسیٰ علیہ السلام کو جانتا ہے؟ اس نے کہا: ہاں! وہ اللہ کے نبی اور روح اللہ ہیں اور اس کے بندے تھے۔ اس یہودی نے کہا: ایسی بات نہ کرو کیا کسی نبی نے ایسا ایسا کیا؟ وہی بات اس سے بھی کہی جو ملکا سے کہی تھی اور کہا کہ وہ اللہ کے بیٹے ہیں آسمان سے اتر کر انہوں نے ایسا ایسا کیا اور پھر آسمان کی طرف لوٹ گئے۔ نسطور نے یہ بات مان کر اعتقاد کر لیا۔

پھر مار یعقوب سے کہا کہ عیسیٰ علیہ السلام کو جانتا ہے؟ اس نے کہا: ہاں! وہ اللہ کے نبی اور رسول اور اس کی روح ہیں رومیوں میں سے تھے۔ یہودی نے کہا کہ اس بات سے توبہ کرو اور یہ اعتقاد کرو کہ وہ الہ اور ابن الہ تھے اس لیے کہ لاہوت آسمان سے اتر کر ناسوت میں داخل ہوئے اور پھر عیسیٰ بن کر نکلے اور وہ تین میں کا تیسرا ہے اور اللہ تعالیٰ نے ان کے قول کی خبر دی: ”لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ ثَالِثُ ثَلَاثَةٍ“ (المائدہ: ۷۳) تحقیق کفر کیا ان لوگوں نے جنہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ تینوں میں سے تیسرا ہے اور پھر ان کے قول کا ابطال فرمایا: ”مَا الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ“ (المائدہ: ۷۵) مسیح ابن مریم نہیں ہیں مگر رسول کہ ان سے پہلے بھی رسول گزر چکے ہیں۔ پھر وہ حمر (عالم) ان کے پاس سے چلا گیا۔ ایک دن تینوں شاگرد جمع ہوئے اور ہر ایک نے کہا: دین یہ ہے دوسرے نے کہا: دین یہ ہے۔ تیسرے نے کہا: دین اس طرح ہے۔ پھر ان میں اختلاف ہوا اور قتل و قتال شروع ہو گیا یہاں تک کہ ان کے چالیس ہزار افراد ہلاک ہو گئے اور یہ اختلاف ان میں اسی طرح باقی رہا۔

اختلاف کی دوسری وجہ

بعض فقہاء نے فرمایا کہ ان میں اختلاف اس لیے پیدا ہوا کہ عیسیٰ علیہ السلام بیت المقدس میں داخل ہوئے اور نبوت کا دعویٰ کیا اور عزیر علیہ السلام کا ایک سو سال پہلے انتقال ہو چکا تھا اور ”تورات“ ان کے پاس موجود نہ رہی تھی تو بنی اسرائیل نے عیسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ اگر اللہ کے نبی ہیں تو ”تورات“ لائے اس لیے کہ عزیر علیہ السلام ہم سے ”تورات“ لے گئے۔ پھر عیسیٰ علیہ السلام نے اول سے آخر تک ”تورات“ بغیر کسی کمی و بیشی کے لکھ دی پھر اس میں لوگوں نے اختلاف کیا۔

بعض نے کہا: اس میں کمی بیشی ہے اور تغیر ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت عزیر علیہ السلام کو زندہ فرمایا۔ آپ اٹھے اور بیت المقدس میں داخل ہوئے اور لوگ عیسیٰ علیہ السلام سے مناظرہ کرنے لگے۔ صحرہ کے پاس جو مسجد میں ہے لوگوں نے آپ کو پہچان لیا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے حضرت عزیر علیہ السلام سے دریافت کیا کہ اے عزیر! تورات کہاں رکھی ہے؟ عزیر علیہ السلام نے فرمایا: اسی مسجد میں فلاں ستون کے نیچے۔ انہوں نے وہ جگہ کھودی اور وہاں سے ”تورات“ مل گئی پھر اس ”تورات“ کا مقابلہ اس ”تورات“ سے کیا جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے لکھوائی تھی اس کو ہو بہو وہی پایا بغیر زیادتی و نقصان کے ایک لفظ بھی بدلہ ہوا نہ پایا۔

ابلیس آیا اور ان کو بہکایا کہ عزیر اللہ کے بیٹے ہیں اس لیے کہ جو انسانوں میں سے مر گیا وہ قیامت کو اٹھایا جائے گا اور عزیر علیہ السلام مرے ہی نہ تھے بلکہ وہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے پاس چلے گئے تھے اور اب آسمان سے اترے ہیں۔

اور بعض نے کہا: مسیح ابن اللہ ہیں اس لیے کہ اگر وہ ابن اللہ نہ ہوتے تو ”تورات“ کے حافظ نہ ہوتے حالانکہ وہ بغیر حفظ کے حافظ تھے تو ان میں اختلاف رونما ہوا۔

نعوذ باللہ من وسوسة الشیطن

سولہواں قول

تناخیہ کا بیان

تناخیہ کی چار قسمیں ہیں۔ پھر ان سے (ذیلی شاخیں) چوراسی نکلتی ہیں گویا کہ کل ان کی چوراسی اصناف ہیں۔

صنف اول کے عقائد و نظریات

پہلی صنف اللہ تعالیٰ کو نور مانتی ہے اس کا کہنا ہے کہ تمام انوار اللہ تعالیٰ (جو کہ نور ہے) کے نور سے نکلے ہیں سورج، چاند، ستاروں کا نور اور اسی طرح آنکھ کا نور اور سماعت، قوت، کلام وغیر ذلک تمام اللہ کے نور سے ہیں اور روح اللہ کے نور سے ہے (یونہی) نار اور

دوسرے انوار بھی اللہ تعالیٰ کے نور سے ہیں اور یہ سب انوار کی عبادت کرتے ہیں اور بلاد ہند اور کشمیر میں براہمہ کا یہ مذہب ہے اور عرب و عجم میں مجوس کا یہی مذہب ہے اور ایسے ہی مجوس نے کہا کہ اللہ نے ابلیس کو نار سے پیدا کیا اور نار اللہ تعالیٰ کے نور سے ہے تو ابلیس اللہ کا بھائی ہے اور اللہ تعالیٰ ان کی بکواس سے بلند و بالا ہے۔ اسی وجہ سے وہ آگ کو پوجتے ہیں کہ ابلیس آگ سے پیدا ہوا ہے۔

دوسری صنف

یہ کہتے ہیں کہ تمام ارواح اور تمام اعیان صانع کا جز ہیں اس لیے کہ جب صانع نے تمام اشیاء کو پیدا کیا تو صانع کا فعل اور صنع اس سے شروع ہو کر مصنوع تک منتہی پذیر ہوا اور صنع و فعل مصنوع میں حلول کیے ہوئے ہے۔ پس مفعولات صانع کے جز سے حاصل ہوتے ہیں اور جو یہ کہے کہ تکوین اور مکون اور تفصیل و مفعول ایک ہیں تو یہ قول تناخہ سے لازم آتا ہے۔

مانو یہ کہتے ہیں کہ باری تعالیٰ بذات خود ہر مکان میں حلول کیے ہوئے ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ ہر شاہد (نظر آنے والی چیز) میں اللہ حلول کیے ہوئے ہے اور وہ ہر ایسی چیز کی عبادت کرتے ہیں جو ان کو آنکھوں سے محسوس ہوتی ہے جیسے انوار و اعیان پہاڑ اور پانی درخت گھوڑا اونٹ گائے بکری اور نباتات مردوزن وغیرہ اور یہ حلاجیہ میں حلولیہ کا مذہب ہے اور عالیہ روافض کا بھی یہی مذہب ہے اور اسی وجہ سے انہوں نے کہا کہ حضرت علی خدا ہیں۔

اسی وجہ سے ”فرقہ مانویہ“ جو بلاد چین، ختن، تبت، خنا اور خاقانیہ وغیرہ کی طرف ہیں وہ کہتے ہیں کہ انسان کو جس چیز کی بھی خواہش ہو مثلاً غیروں کی عورتیں اور ان کی لونڈیاں ان کی بیٹیاں بیٹے یہ سب مباح ہیں اور کہتے ہیں کہ جو منع کرے وہ کافر ہو جائے گا اس لیے کہ یہ اشتہاء اللہ کی طرف سے ہے اور اللہ اشتہاء کرتا ہے اپنے نفس کے لیے اپنی طرف سے بعض نصاریٰ کا بھی یہی مذہب ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے خواہش کی مریم سے اور مریم میں داخل ہوا اور مریم سے عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے یہ (نصاری) اس اعتقاد و بکواس کی وجہ سے کافر ہو گئے اور اللہ تعالیٰ ان خرافات اور صفات مخلوقات سے منزہ و مبرا ہے۔

تیسری صنف

انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نفس سے نور لیا اور اس کی تین قسمیں کیں تو پہلی قسم سے تو جنت کو پیدا کیا اور اس کا نام ”مکان الاماکن“ رکھا اور قسم ثانی سے فرشتوں کو پیدا کیا اور ان کا نام ”نفس روحانیہ“ رکھا اور تیسری قسم سے آدمیوں کی روحمیں پیدا کیں اور اس کا نام ”نفس انسانی“ رکھا۔

اور اس معنی کے لحاظ سے کہا کہ جنت قدیم ہے اور ملائکہ قدیم ہیں اور ارواح قدیم ہیں ان کا کفر ظاہر ہے۔

پھر کہا کہ اللہ تعالیٰ نے ارواح اور جنت سے نور لے کر دنیا جہاں کو پیدا کر ڈالا اس لیے کہ وہ کہتے ہیں کہ زمین و آسمان حادث ہیں تو پھر ان میں کون و فساد کہاں سے داخل ہوگا؟ پھر اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کا مکان جنت ٹھہرایا اور آدمیوں کی ارواح کا مکان دنیا میں اور آدمیوں کی ارواح نے اپنے بارے میں سوچا کہ ہمارا درجہ اور ہماری فضیلت فرشتوں کی روحوں سے زیادہ ہے اور مکان ان کا اعلیٰ و پائیدار ہے تو ہم محدث کیسے ہوئے؟

تو پھر انہوں نے آسمان پر چڑھنے کا عزم کیا یہ گمان کرتے ہوئے کہ ہم زبردستی فرشتوں سے وہ مکان لے لیں گے جو کہ جنت ہے اور یہ عزم تمام روحوں نے کیا بلکہ کافروں اور سرکشوں کی روحوں نے کیا اور ایمان والوں کی ارواح نے خوف و امید کے ساتھ بغیر قصد کے ان کی فرماں برداری کی اور ارواح انبیاء علیہم السلام جانتی تھیں کہ ایسا نہیں ہوگا اور اللہ تعالیٰ کے ارادہ کے خلاف نہیں ہو سکتا تو مجبوراً انہوں نے بھی متابعت کی۔

پھر جب یہ سب روحمیں آسمان پر چڑھیں اور ارواح ملائکہ کے ساتھ جمع ہوئیں تو انبیاء و علماء کی روحوں نے علم و حکمت سیکھ لی اس لیے کہ وہ مکرمین ہیں تو ان کو فضیلت حاصل ہے اور انہوں نے کہا کہ وحی و انباء (خبر دینا) اس علم و حکمت سے ہے۔ پھر قرآن و کلام وغیرہ روحوں کے لیے ہے اور وہ اس کے کلام اللہ ہونے اور جبریل کے لیے وحی کا انکار کرتے ہیں اور انہوں نے کہا کہ نبی علیہ السلام نے فرمایا ہے: ”الارواح جنود مجندة فما تعارف هناک ایتلف ہہنا وما تناکر هناک اختلف ہہنا“ انہوں نے اس حدیث کے پیش نظر کلام کے یہ معنی مذکورہ بالا لیے اور انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو سزا دی اور ان

کو آسمان سے زمین کی طرف دفع کر دیا اور انہیں زمین میں دھنسا دیا اور وہ مٹی اور کچھڑ میں خلط ملط ہو گئے اور یہ معنی ہیں اس آیت کے ”ثم رددناہ اسفل سافلین“ (التین: ۵) پھر ہم نے انہیں نچلے ترین طبقے میں لوٹا دیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے روئے زمین سے ایک مٹھی لی مع اجزاء و ارواح کے اور اس مشت خاک سے روحوں کو ظاہر کیا اور آدم علیہ السلام کو پیدا کیا، پھر نبات و زرع اور درخت اور پتھروں اور متحرک چیزوں کو جو بھی زمین سے نکلتی ہے، یہ نکلی ہوئی روہیں اور ان کی نشوونما روحوں کی تاثیر سے ہوتی ہے تو ہر وہ روح جس کے گناہ مٹا دیئے گئے۔

اس لیے کہ آدمی کل کو کھاتا ہے اور یہ جز آدمی کی روح سے متصل ہو جاتا ہے اور بعض بہائم کھا جاتے ہیں بعینہ گناہ کی وجہ سے، پھر آدمی جب اس حیوان کو کھاتا ہے تو بسا اوقات پرندوں اور درندوں کو کھاتا ہے۔

اور بعض اوقات کوئی بھی نہیں کھاتا، نباتات یا پھل اور بہیمہ مر جاتا ہے نجس، تو جو روح اس میں تھی وہ زمین کی طرف لوٹ جاتی ہے یا درندے اور کتے کی طرف تو پھر ایک شخص سے دوسرے شخص کی طرف اور ایک شئی سے دوسری شے کی طرف ہمیشہ منتقل ہوتی رہتی ہے، یہاں تک کہ گناہوں سے پاک ہو جانے کے بعد آدمی تک پہنچ جاتی ہے۔ پھر آدمی جب گناہ کرتا ہے اور مر جاتا ہے تو اس کی روح اس کے جسم سے نکل کر کتے یا خنزیر یا کافر کے جسم میں داخل ہوتی ہے تو اس میں اسے عذاب دیا جاتا ہے، اس کلام کا ما حاصل یہ ہے کہ آخر کار تمام روہیں گناہوں سے پاک ہو جاتی ہیں، کیونکہ سب نے اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹ جانا ہے اور دنیا میں کسی روح نے باقی نہیں رہنا تو اس وقت عالم فنا ہو جائے گا اور تمام روہیں بغیر عقاب و عذاب جنت میں ہوں گی اور یہ (سب بکو اس) کفر ہے۔

اور سب کچھ انہوں نے اس بنیاد پر کہا کہ انسان کبھی گھاس ہوتا ہے اور کبھی چوپایہ اور درندہ اور کبھی کافر و فاجر اور کبھی مؤمن ہوتا ہے اور کبھی نبی ہوتا ہے اور یہ اہل مصر وغیرہ کے بعض روافض کا مذہب ہے۔

صنف چہارم کے عقائد و نظریات

صنف چہارم کے نزدیک ارواح تین ہیں: (۱) روح کلی (۲) روح جزئی (۲) روح

متصل۔

روح کلی وہ ہے جس کے ساتھ اشیاء قائم ہیں، فلاسفہ اس کو جوہر بسیط کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور مراد اس سے صانع لیتے ہیں۔

روح جزئی وہ حیوان اور آدمی ہے۔

تیسری روح متصل ہے جز سے کل کی طرف اور وہ ہوا ہے اس لیے کہ کلام و سمع و بصر اور علم و حکمت اور برہان اور ذہن و عقل یہ سب روح کلی کے ساتھ اور روح جزئی کی طرف بواسطہ ثالث اثر کرتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہی معنی وحی کے ہیں اور دوسری وحی کی حاجت نہیں اور یہ کفر ہے۔

اور بعض نے کہا: ارواح مخلوق و محدث ہیں، لیکن ہر جسد کے لیے علیحدہ روح کی حاجت نہیں، روح ایک جسم سے نکلتی ہے اور دوسرے جسم میں داخل ہو جاتی ہے اور قیامت کے دن روحمیں بغیر جسد کے اٹھائی جائیں گی اور ثواب و عقاب روح کو بغیر جسد کے ہوگا۔

اور بعض نے کہا کہ جسد روح کے لیے اسی طرح ہے، جیسے بدن کے لیے کپڑا اور لباس ہوتا ہے، اس لیے کہ روح ایک جسم سے نکلتی ہے اور دوسرے جسم میں داخل ہوتی ہے تو اس کے درمند ہونے سے اس کو درد و الم سے دوچار ہونا پڑتا ہے اور اس کے متلذذ ہونے سے اس کو بھی لذت حاصل ہوتی ہے اور اس کے احساس کرنے سے یہ بھی احساس کرتی ہے اور یہ لوگ قیامت کے منکر ہیں اور انہوں نے یہ بھی کہا کہ خصومات (جھگڑے) کے فیصلے اور قرض کی ادائیگی سب کے سب دنیا میں ہوتے ہیں، اس کا بیان یہ ہے کہ جو شخص مر گیا اور دوسرے شخص کے ذمہ اس کے لیے مال ہے، پھر اس کی روح دوسرے شخص میں داخل ہوگی اور اس بدن میں واقع ہوگی، اگرچہ بہیمہ حیوان ہے یا انکار کرے اس کے پاس جب کہ درندہ ہو یا آدمی کسی وجہ سے بھی ہو، بہر حال یہ اپنا قرض اس سے لے گا اور وصول کر کے چھوڑے گا، خواہ ظلم سے لے خواہ ہدیہ یا ہبہ سے یا چوری وغیرہ کر کے اس سے لے گا ضرور اور اگر اس کی روح حیوان میں داخل ہوئی مثلاً گائے، بیل، اونٹ، گھوڑے وغیرہ میں تو اگر اس نے کوئی حق لینا ہے تو وہ بغیر خدمت کے مر جائے گا۔

پھر ان کے ساتھ مناظرہ کرنے میں اس بات کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ صانع کی

معرفت اور اس کا ثابت 'صفات باری کا اثبات اور یہ کہ صانع صفاتِ محدثات سے منزہ ہے پس اس لیے جائز نہیں ہے کہ وہ متحیز یا متبعض ہو اس کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں۔

اس کے بعد اثباتِ وحی اور صاحبِ وحی کے سچا ہونے کے متعلق گفتگو اور کلام کرنا چاہیے تو اس نے ان کے کلام کے خلاف خبر دی ہے اور صاحبِ وحی کی خبر صدق (سچی) ہے اور حجت ہے اور نصِ ناطق ہے اور ان کے کلام کے خلاف ثبوت اللہ تعالیٰ کا یہ قول مبارک ہے کہ "لَتَبْعَنَّ ثُمَّ لَتَنْبُنَنَّ" (التغابن: ۷) تمہیں ضرور اٹھایا جائے گا اور تمہیں (اعمال پر) آگاہ کیا جائے گا۔

اور اللہ تعالیٰ کا یہ قول کہ "الْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُونِ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ" (الانعام: ۹۳) آج تمہیں دردناک عذاب کی جزا دی جائے گی بہ سبب اس کے جو تم کرتے تھے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "الْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلَىٰ أَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَا أَيْدِيهِمْ وَتَشْهَدُ أَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ" (یسین: ۶۵) آج ہم ان کے مونہوں پر مہر لگا دیں گے اور ان کے ہاتھ کلام کریں گے اور ان کے پاؤں گواہی دیں گے بہ سبب اس کے جو وہ کمایا کرتے تھے اور اس لیے کہ اجسادِ روح کے ساتھ گناہ کرنے میں شریک ہیں تو جزا میں بھی یقیناً شریک ہوں گے۔

اور دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے کہ "يَوْمَ تَأْتِي كُلُّ نَفْسٍ تَجَادِلُ عَنْ نَفْسِهَا" (النحل: ۱۱۱) اس دن ہر جان اپنی ہی طرف جھگڑتی ہوئی آئے گی یعنی نفسِ روح کے ساتھ مجادلہ (جھگڑا) کرے گا بایں طور کہ نفس کہے گا: تو نے گناہ کیا ہے اور روح کہے گی کہ تو نے گناہ کیا ہے اور اللہ تعالیٰ کا یہ قول کہ "ثُمَّ إِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عِنْدَ رَبِّكُمْ تَخْتَصِمُونَ" (الزمر: ۳۱) پھر تم قیامت کے دن اپنے رب کے ہاں جھگڑو گے۔ اس کی تفسیر میں ذکر کیا گیا ہے کہ روح جسم سے اور جسم روح سے یعنی روح اور جسم آپس میں جھگڑا کریں گے اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے روح کو نورِ نار اور روح سے پیدا کیا ہے یعنی آدمیوں کی روحوں کو نور سے پیدا کیا ہے اور شیاطین کی روحوں کو آگ سے اور پرندوں کی روحوں کو ہوا سے پیدا کیا ہے۔

پھر ہم کہتے ہیں کہ ہر جسم میں جدا روح ہے اس لیے کہ ارواح جسموں کے ساتھ قیامت کے دن محشر میں ہوں گی اور حساب لینے کے بعد بدلہ دیا جائے گا۔

اور اگر ہر جسم کے لیے علیحدہ روح نہ ہو تو اس صورت میں حقیقت یہ ہے کہ نہ تو حشر ہو سکے گا اور نہ ہی ہر جسم اور روح کو علیحدہ علیحدہ حساب اور انہیں جزاء و سزا دی جاسکے گی۔

اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ”كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ“ (المدثر: ۳۸) ہر جان جو اس نے کمایا گروی ہے۔ پھر اس پر دلیل ہے کہ قیامت کے دن تمام اجساد حاضر ہوں گے اور ہر جسم گواہی دے گا روح، اعضاء اور نفس پر جو کچھ انہوں نے عمل کیا۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ”وَقَالُوا لَجُلُودِهِمْ لِمَ شَهِدْتُمْ عَلَيْنَا قَالُوا أَنْطَقْنَا اللَّهَ الَّذِي أَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ“ (نفلت: ۲۱) اور وہ کہیں گے اپنی جلدوں سے کہ تم نے ہمارے خلاف گواہی کیوں دی؟ تو وہ کہیں گی: ہمیں اس اللہ نے گویائی دی جس نے ہر چیز کو گویائی دی۔

اور اگر بعض اجساد حاضر ہوں اور بعض حاضر نہ ہوں تو جزا و سزا بعض کو ہوگی اور بعض کو نہیں ہوگی تو یہ عدل نہ ہوگا اور ہم نے دلائل منصوصہ سے ثابت کر دیا کہ جسم جلد اور تمام اعضاء سمیت حاضر ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ”الْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلَىٰ أَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَا أَيْدِيهِمْ وَتَشْهَدُ أَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ“ (نہین: ۶۵) آج ہم ان کے مونہوں پر مہر لگا دیں گے اور ان کے ہاتھ کلام کریں گے اور ان کے پاؤں گواہی دیں گے بہ سبب اس کے جو وہ کمایا کرتے تھے۔

پھر اس پر دلیل کہ روح مخلوق ہے یہ ہے کہ ”وَيَسْئَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي“ (الاسراء: ۸۵) اور وہ آپ سے روح کے متعلق سوال کرتے ہیں آپ فرما دیجئے کہ روح میرے رب کے حکم سے ہے یعنی تم فرماؤ کہ روح مخلوق ہے اور جسم میں داخل ہوتی ہے میرے رب کے حکم سے۔ پھر یہ بھی ہے کہ روح ما مور ہے اور ما مور مخلوق ہوتا ہے۔

اس پر دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ”وَقَدَّرَ فِيهَا أَقْوَاتَهَا فِي أَرْبَعَةِ أَيَّامٍ“ (نفلت: ۱۰) اور اس میں اس کے بسنے والوں کی روزیاں مقرر کیں چار دنوں میں۔

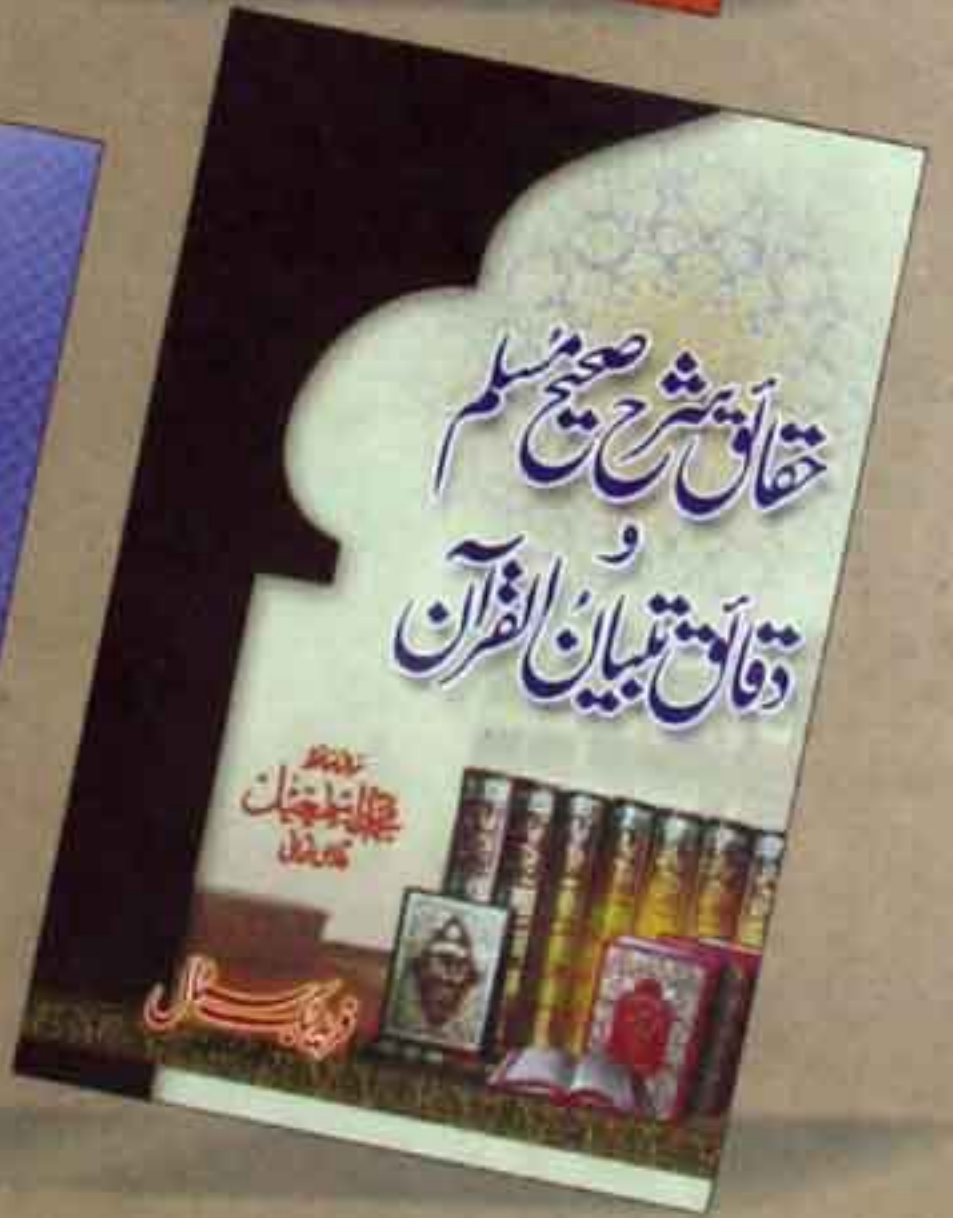
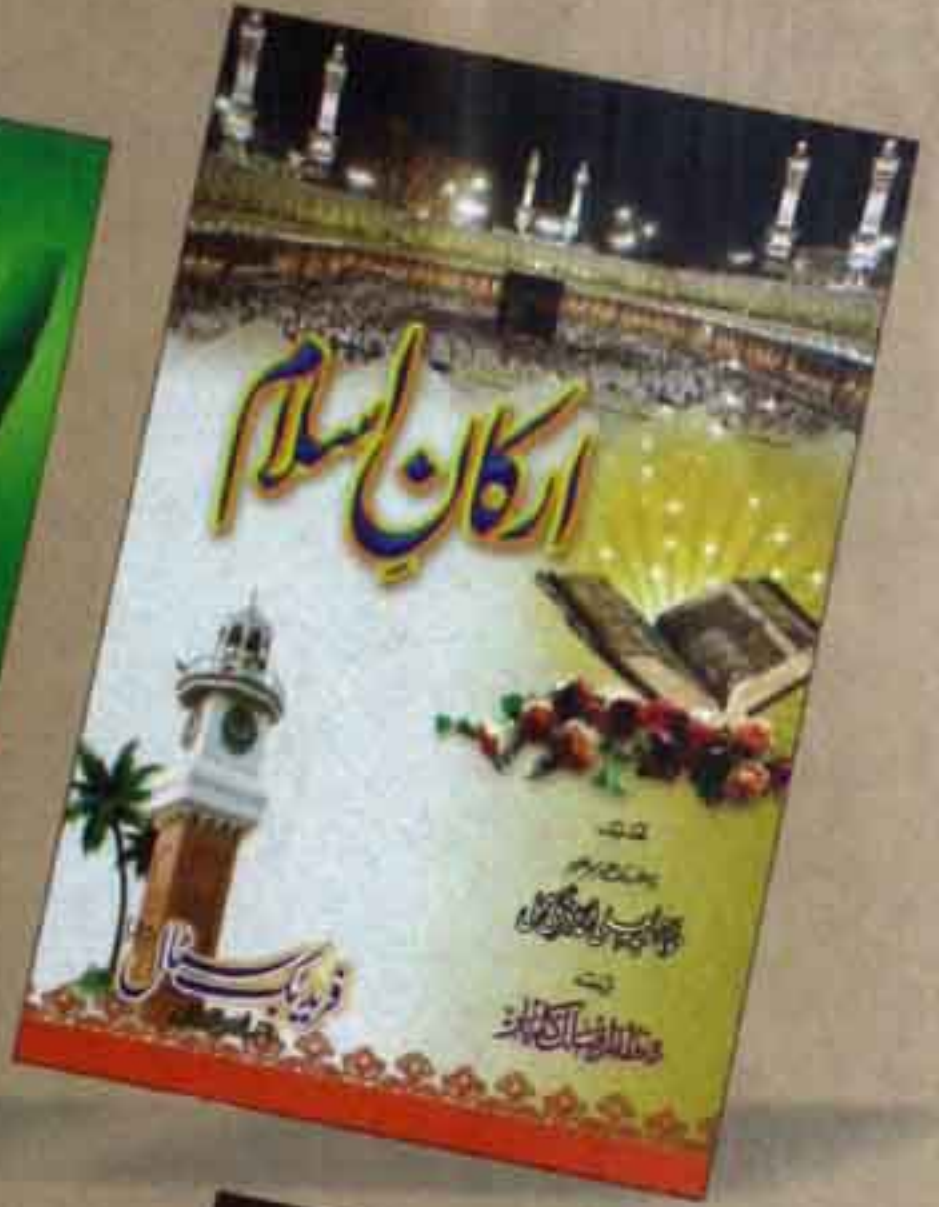
حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ رزقوں کا اندازہ فرمایا ان کے جسموں کے پیدا کرنے سے چار دن پہلے اور ہر دن ایک ہزار برس کے برابر ہے تو یہ روح کے مخلوق ہونے کی دلیل ہے۔

روح کے مخلوق ہونے پر عقلی دلیل

اور روح کے مخلوق ہونے پر عقلی دلیل یہ ہے کہ وہ جسم میں داخل ہوتی ہے اور جسم سے نکلتی ہے تو یہ تحویل اور انتقال ہے اور تحویل و انتقال حدث ہے اور جو حدث کو قبول کرے وہ محدث اور مخلوق ہے۔

تمت الكتاب بعون الملك الوهاب





فرید بک سٹال (رجسٹرڈ)

۳۸ اردو بازار لاہور

E-mail: info@faridbookstall.com
Web Site: www.faridbookstall.com

